OCTOBER 2011

ماہنامہ

کرن

اس شمارے کے ساتھ
کرن کتابچہ

بیادِ محمود بابر فیصل

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

اکتوبر 2011
جلد 34 شمارہ 7
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

[illegible] نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مُدیرہ

اداریہ

اکتوبر کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مون سون کی بارشوں سے ہونے والی قیامت خیز تباہی نے گوناگوں مسائل میں مبتلا پاکستانی قوم کو ایک نئے چیلنج سے دوچار کر دیا ہے۔

اللہ کی رحمت، حسبِ سابق ہمارے معاملات کے ذمہ داروں کی نااہلی اور بدانتظامی کی وجہ سے اللہ کے بندوں کے لیے عذاب بن گئی ہے۔ بارش اور سیلاب سے لاکھوں ایکڑ رقبے پر کھڑی فصلوں کو شدید نقصان پہنچا۔ ہزاروں مویشی سیلاب کی نذر ہوگئے اور مکانات زمین بوس ہو چکے ہیں۔ بے گھر ہونے والے لاکھوں افراد عارضی کیمپوں میں مقیم خوراک اور بنیادی سامان کے منتظر ہیں۔

حکمرانوں نے ہمیشہ کی طرح ان حالات سے نمٹنے کے لیے پیشگی انتظامات نہیں کیے جبکہ موسم میں عالمی سطح پر تبدیلی کا سلسلہ ہر سال جاری ہے۔ سیلاب کا معاملہ زلزلے کی طرح کسی اچانک ٹوٹ جانے والی آفت کا سا نہیں۔ مون سون کا موسم ہر سال اسی طرح آتا ہے اور تباہی چھوڑ جاتا ہے۔

اگر سیلاب سے روک تھام کے پیشگی انتظامات کیے جاتے تو کم سے کم لوگ متاثر ہوتے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ان مصیبت زدہ بھائیوں کی اعانت میں کوئی کسر نہ چھوڑیں اور ان کی امداد اور بحالی میں بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کریں۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)،

ماہ و سال کی ان بھول بھلیوں میں بہت سے عزیز از جان لوگ گم ہو جاتے ہیں لیکن دلوں میں ان کے انمٹ نقش ان کے اخلاق کی خوبصورتیوں کی بدولت رہ جاتے ہیں۔ محمود بابر فیصل بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ جن کا ہر پہلو دلچسپ تھا۔ ان کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ گو کہ ان کو ہم سے جدا ہوئے اٹھارہ برس بیت گئے مگر وہ ہمارے درمیان نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ ہم میں موجود رہیں گے۔ ان کی یادیں ہمارے لیے محبت اور رفاقت کا سرمایہ ہیں۔

25۔ اکتوبر کو محمود بابر فیصل کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ اپنے سایۂ رحمت میں رکھے۔ (آمین)

اس شمارے میں،

- بیادِ محمود بابر فیصل،
- اداکار "بابر خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "کنور نفیس" دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- "مجھ سے ملیے" نبیلہ عزیز کی باتیں،
- "آواز کی دنیا سے" ایف ایم کے پریزنٹر "افراز علی نازش" کی باتیں،
- فوزیہ یاسمین اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- "دیے کے اندر دیا" سعدیہ عزیز آفریدی کا دلچسپ مکمل ناول،
- "اور یے پیا" نایاب جیلانی کا طویل مکمل ناول،
- "متاعِ دل" کشش احمد کا مکمل ناول،
- روشنی بخاری، سفینہ یاسمین اور صنوبریہ ساحر کے ناولٹ،
- مہک رباب، لبنیٰ طاہر، اقرا عباسی اور رمشا خالد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت:

کرن کتاب "تندرستی ہزار نعمت ہے" ہر شمارے کے ساتھ [illegible]

حمد باری تعالیٰ

جو سوچتا ہوں اُس پہ مجھے اختیار دے
جو دیکھتا ہوں اُس پہ مجھے اعتبار دے

جو کچھ ملے اُسی پہ سدا مطمئن رہیں
آنکھوں کو چین اور دلوں کو قرار دے

مولا ترے کرم سے رہے ان میں روشنی
جو ماہ و سال زندگی مستعار دے

مولا بقدرِ شوق ہوں آنکھوں کی بستیاں
پہلے تو ان کو تاب دے، پھر انتظار دے

عمریں گزر گئی ہیں انہیں ڈھونڈتے ہوئے
اب تو ہمیں سکون کے لیل و نہار دے

یہ ناتواں سفینہ کہیں ڈوب ہی نہ جائے
اس پر نگاہ کر، سرِ ساحل اُتار دے

امجد ہے اب بھی وقت یہ پس ماندہ زندگی
یادِ خدا میں، عشقِ نبیؐ میں گزار دے

امجد اسلام امجد

نعت رسول مقبولؐ

ہر شے میں آشکار ہے صلِّ علیٰ کی شان
غارِ حرا کی شان ہے غارِ حرا کی شان

سارے ہی شان والے ہیں اللہ کے نبی
لیکن ذرا الگ ہے مرے مصطفیٰؐ کی شان

ختمِ دُعا سے قبل ہی ملتی ہے یاں مراد
کعبے میں جا کے دیکھیے اپنی دُعا کی شان

اس ساری کائنات میں جبریلؑ کی طرح
دیکھی نہیں کسی نے بھی خیرالوریٰ کی شان

دستک صبا کی لاتی ہے خوشبو حضورؐ کی
ہر رنگِ نوبہار میں دیکھی خدا کی شان

کعبے کی چھت پہ چڑھ کے جو دی تھی بلالؓ نے
شامل تھی ان اذانوں میں اُن کی وفا کی شان

امجد اسلام امجد

اے راحتِ دل کہاں ہے تو

مہناز عرفان

مسافروں کو تو جانا ہی ہوتا ہے، دھند کے اس پار جہاں اس کی منزل ہوتی ہے "کائنات کے ہر انسان کی آخری منزل" لیکن منزل پر پہنچنے سے قبل زندگی کے دشت کی سیاحی بھی لازمی ہے کسی کا یہ رشتہ بہت مختصر ہوتا ہے اور کسی کا طویل اور بابر صاحب کا دشت زندگی بھی بہت مختصر رہا وہ بہت جلد اسے پار کر گئے، دھند کے اس پار جہاں کوئی آنکھ انہیں نہیں دیکھ سکتی۔

اتنا عرصہ گزرنے پر آج بھی یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ ہمارے درمیان موجود ہوں اور مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میں ان کے آفس جاؤں گی اور دروازہ کھول کر اندر قدم رکھوں گی تو سامنے کرسی پر وہ موجود ہوں گے اسی طرح کرسی کی پشت پر ان کا کوٹ پھیلا ہوگا ان کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوگی جس کے دھوئیں کی پتلی سی لکیر اطراف میں پھیل رہی ہوگی چہرے پر وہی مصنوعی سی سنجیدگی، اے سی آن ہوگا اور آفس کی ایک خوشگوار اور بوجھل سی فضا، سامنے کیک رکھا ہوگا اور ہم چند لوگ اسی سالگرہ کو سیلیبریٹ کررہے ہوں گے۔

یہ منظر آنکھوں میں گویا جم سا گیا ہے "ایک ساکت منظر جو شاید ہمیشہ قائم رہے" یہ بابر صاحب سے میری آخری ملاقات تھی۔

اکتوبر کا مہینہ تھا اور تاریخ تھی چار گویا ان کا جنم دن۔ میں بس اچانک ہی پہنچ گئی تھی اور جب آفس میں داخل ہوئی تو ذرا دیر بعد ہی کیک آگیا تھا۔ بابر صاحب کی مسکراہٹ کے درمیان کیک کٹا تھا۔

"بھئی یہ کس خوشی میں ہے کون لایا ہے؟" میں نے پوچھا تھا۔

"ارے آج بابر بھائی کی سالگرہ ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی چھری سے کیک حلال ہوگیا۔

"بھئی ہمیں تو بڑا عجیب سا لگ رہا ہے خالی ہاتھ آئے۔ پتا ہوتا تو کچھ تحفہ ہی لے آتے۔"

بے حد لذیذ کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

"ارے سالگرہ کیسی بس بچوں کی خواہش تھی کیک آگیا۔" وہ یوں بولے گویا شرمندہ ہو رہے ہوں لیکن مجھے واقعی افسوس ہو رہا تھا تحفہ نہ لانے کا۔

اور یہ وہ آخری منظر تھا جس میں، میں نے انہیں جیتا جاگتا دیکھا اور یہ منظر گویا آنکھوں میں ٹھہر سا گیا شاید اس لیے بھی کہ اس کے بعد میں بھی آفس نہیں جاسکی تھی۔ نہ کہیں اور ملاقات ہوسکی تھی اور پھر

اچانک سماعت نے وہ خوفناک اور ناقابل یقین خبر سنی تھی کہ محمود بابر فیصل اب اس دنیا میں نہیں رہے تو یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہا تھا۔

فنا ہر ذی حیات کو ہے یہ ہم سب ہی جانتے ہیں لیکن جو اندوہناک خبریں اچانک سننے کو ملیں وہ ناقابل یقین ہی سی لگتی ہیں "ناقابل یقین سی یوں بھی کہ ابھی ان کے دنیا سے جانے کے دن تو نہ تھے" اگرچہ اس طرح کہنا کچھ مناسب تو نہیں کہ رب کائنات کی خدائی میں مداخلت کیسی وہ جس کو چاہتا ہے جتنی چاہتا ہے سانسیں عطا کرتا ہے۔ تاہم ایک احساس سا رہتا ہے کہ جو لوگ زندگی کی بہت سی منزلیں طے کرلیں ان کی سانسوں کے اختتام کا تصور تو ذہن میں آتا ہے لیکن جو لوگ ابھی عالم بہار میں ہوں ان کے بارے میں ایسا سوچنا، اور اگر یہ حادثہ وقوع پذیر ہو جائے تو شاک بھی لگتا ہے اور یقین بھی مشکل سے ہی آتا ہے اور ایسے ہی احساسات بابر صاحب کی وفات پر تھے۔

بہت عرصہ پہلے جب کرن جاری ہوا تھا تو کرن سے اسی وقت سے رفاقت تھی اور اسی حوالے سے بابر صاحب سے رابطہ رہا وہ اپنے ادارے کے لوگوں کے لیے بھائیوں کی طرح ہی تھے خیال رکھنے والے، دوستوں کی طرح مخلص سے۔ اسی طرح ہم لوگ بھی بلا تکلف ان سے اپنے مسائل ڈسکس کرلیا کرتے تھے۔

ایک بار مجھے ایک مسئلہ درپیش تھا جب میں نے بتایا تو اس وقت تو انہوں نے کوئی رسپانس نہیں دیا لیکن پھر ایک دن فون آیا تو بولے۔

"کہاں تھیں؟ تمہاری تلاش میں تو کنوؤں میں بانس الوانا پڑ گئے ہیں۔"

اور جب میں نے اس تلاش کی وجہ پوچھی تو بولے۔

"تمہارا کرن میں سوواں افسانہ آرہا ہے اسی کے ساتھ ایک سرپرائز ہے۔"

میرے بہت پوچھنے پر بھی نہیں بتایا اور جب چند دن بعد سوواں افسانہ شائع ہوا تو وہ سرپرائز بھی مل گیا جو میرے مسئلے کے حل کی صورت میں تھا۔ وہ تھے ایسے ہی با مروت سے۔

بابر صاحب کو گئے کتنے سال ہوگئے مگر وہ آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں وہ ایک مشفق انسان تھے اپنے والدین کے بے حد چہیتے اور لاڈلے، بہن بھائیوں کے بے حد پیارے بڑے بھائی اور دوستوں کے لیے پرخلوص ان کی ایسی ہی صفات ہیں جو ان کی یاد دلاتی رہتی ہیں وہ بظاہر بڑے سنجیدہ نظر آتے تھے، ماشاء اللہ شکل وصورت اچھی تھی۔ مگر چہرے پر چھائی سنجیدگی کچھ اور ہی تاثر دیتی تھی تاہم جب بندہ بے تکلف ہوتا تھا تو پتا چلتا تھا کہ وہ تو خاصے بذلہ سنج ہیں شگفتہ مزاج اور برجستہ جواب دینے والے، پھر ان سے باتیں کرکے خاصا لطف آتا تھا۔

ایسی پیاری شخصیت کو بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ خاص کر ان کی فیملی کے لیے ان کی جدائی ایک اذیت ناک عذاب ہی ٹھہری۔

اپنے ناول کا عنوان بھی انہوں نے "کہنا کہ مسافر تو گیا" ہی رکھا تھا شاید لاشعوری طور پر اس کو لکھتے ہوئے ان کی اپنی ذات ہی ان کے پیش نظر تھی۔ کبھی کبھی وجدان کچھ احساس دلا ہی دیتا ہے جو دوسرا سمجھ نہیں پاتا، انہیں بھی شاید ان کے وجدان نے کچھ احساس دلا دیا تھا۔

گو اب وہ بھائیوں جیسا پیارا سا انسان موجود نہیں مگر اس کی باتیں، جملے اور شوخیاں اب بھی یاد آتی ہیں۔ اور یاد آکر ہمیں دکھی کرجاتی ہیں۔

خدا سے دعا ہے کہ اپنے اس پیارے سے بندے کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔

بابر خان سے ملاقات

شاہین رشید

شوبز کی فیلڈ میں جب کوئی نیا چہرہ آتا ہے تو فوراً اپنی شناخت کروالیتا ہے۔ کیونکہ شوبز کی دنیا چند چہروں پر مشتمل ہے۔ ایسے میں اگر کوئی نیا چہرہ نظر آتا ہے تو توجہ حاصل کرلیتا ہے۔ اور اگر وہ اداکاری کے معاملے میں تھوڑا کمزور بھی ہوتا ہے تو یہ ایک امید ہوتی ہے کہ اگر یہ لڑکا مسلسل کام کرتا رہے گا تو ایک دن اپنے آپ کو منوالے گا۔۔۔ بابر خان' بھی شوبز کی ایک نئی امید ہیں۔ اس فنکار نے اب تک جتنے بھی ڈراموں میں کام کیا مایوس نہیں کیا آج کل بھی آپ انہیں کئی ڈراموں میں دیکھ رہے ہوں گے۔

★ "کیسے ہیں بابر؟ کیا مصروفیات ہیں آج کل شوبز کے حوالے سے آپ کی؟"

⁂ "جی میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور آپ سب کی دعاؤں سے مصروفیات بھی بہت زیادہ ہیں۔ کئی ڈرامے سیریلز' ٹیلی فلمز 'انڈر پروڈکشن ہیں اور بہت کچھ آن ایئر بھی ہے مختلف چینلز سے۔"

★ "تھوڑی تفصیل بتائیں؟"

⁂ "تفصیل کچھ یوں ہے کہ عارف خان کا ایک سیریل کر رہا ہوں۔ پہلے اس کا نام مجبوریاں تھا اب اس کا نام "میں اکیلی رہ گئی" ہو گیا ہے۔ اس میں میرا جو کردار ہے وہ پہلے فیصل قریشی کو آفر ہوا تھا اور یہ نگیٹو کردار ہے اور چونکہ فیصل بھائی ڈیٹ نہیں دے پا رہے تھے تو پھر عارف خان نے مجھ سے کہا کہ تم کرو۔"

★ "مگر آپ کی اور فیصل قریشی کی عمر میں تو خاصا فرق ہے؟"

⁂ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور عارف خان کو دو مسائل کا سامنا تھا ایک تو یہ کہ وہ ڈیٹ نہیں دے پا رہے تھے اور جو کردار تھا وہ بیس سے پچیس سال کے لڑکے کا تھا۔ مگر فیصل بھائی میں یہ خوبی ہے کہ وہ بڑی آسانی سے ینگ ٹو اولڈ کردار کر لیتے ہیں۔
ان میں یہ خوبی ہے کہ وہ بڑی آسانی سے پچیس سے چھبیس سال کے بن جاتے ہیں اور اس سیریل کے لیے ضرورت ہی پچیس سال کے لڑکے کی تھی تو پھر مجھے یہ رول مل گیا۔۔۔ زیبا بختیار کے سیریل "موم" کا سیکول بن رہا ہے تو اس میں بھی میں ہوں یعنی "موم" پہلے سیریل تھا اب سوپ ہو گیا ہے۔ اس کی شوٹ بھی چل رہی ہیں اور یہ آن ایئر بھی ہے۔"

★ "آن ایر کیا 'کیا آچکا ہے؟"

⁂ "Zip" آن ایئر آچکا ہے۔ 'حال دل' مدہوش' سوپ ہے وہ آن ایئر ہے۔ 'ٹیلی فلم "آپا" اور لمبی فہرست ہے۔"

★ "پہچان کس ڈرامے نے دی؟"

⁂ "پہچان مجھے سیریل "بند کھڑکیوں کے پیچھے" نے دی اور یہ بہت ہٹ گیا تھا۔ شکیل خان اس کے ڈائریکٹر تھے اور ناظرین نے اس میں مجھے بہت پسند کیا تھا ایک نجی چینل سے آن ایر ہونے والے سیریل "مالا" نے بھی مجھے پہچان دی اور اسی چینل کے پروگرام "نچ لے" میں میں نے ڈانس مقابلے میں حصہ لیا اور دوسرے نمبر پر آیا۔"

★ "ماشاء اللہ بہت اچھے پرفارم ہیں۔۔۔ آپ کا ہر سیریل کامیاب ہوتا ہے اور باتیں بھی ہوں گی پہلے کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ یعنی فیملی بیک گراؤنڈ؟"

⁂ "میرے والد کا تعلق کوئٹہ سے ہے اور ہم درانی کہلاتے ہیں اور میرا پورا نام بابر پل زمان خان درانی ہے۔ پل زمان میرے والد کا نام ہے۔۔۔ اور چونکہ ہم پٹھان ہیں تو پٹھانوں میں ایک کاسٹ ہوتی ہے اچکزئی تو ہماری کاسٹ اچکزئی ہے اور میری امی کشمیری پنجابی ہیں۔ لیکن گھر میں ہمیشہ اردو ہی بولی گئی ہے۔ اس لیے میری اردو صاف ہے ۔۔۔ مجھے ٹھیک سے پنجابی آتی ہے اور نہ ہی پشتو اور میرے والد انکم ٹیکس میں ایڈیشنل کسٹمز ہیں' میں 22 فروری 1987ء میں کراچی میں پیدا ہوا 5 فٹ 8 انچ میری ہائیٹ ہے Pisces میرا اسٹار ہے اور کراچی یونیورسٹی سے میں نے بی اے کیا ہے اور ایم بی اے کرنے کا ارادہ تھا مگر ٹائم بھی نہیں ہے اور میں اب کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اب اس فیلڈ کو پروفیشن بناؤں گا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں تین بہنیں اور تین بھائی میرا نمبر چوتھا ہے اور یہ میں خود ہی بتادوں کہ فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں کم سے کم 3'4 سال تو بالکل بھی نہیں ہے۔"

★ "اس فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی۔ اچانک یا پلاننگ کے ساتھ؟"

⁂ "اگر میں کہوں کہ اچانک تو شاید آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن سچ جانیے کہ ایسا ہی ہوا اور بہت ہی فنی طریقے سے ہوا' میرا ایک دوست ہے جو شوبز میں ہے۔ مگر زیادہ تر اس نے چھوٹے موٹے رول ہی کیے' ایک دن کہنے لگا کہ فلاں جگہ یہ آڈیشن ہو رہے ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ تم بھی چلے چلو اور قسمت آزمالو۔ مگر میں تو مذاق ہی مذاق میں اس کے ساتھ چلا گیا اور جب گیا تو دیکھا کہ تقریباً" ڈیڑھ دو سو لڑکے آڈیشن دینے

آئے ہوئے تھے..... اور یہ آڈیشن ہو رہا تھا ٹیلی فلم "چلو آ گئے" ان لڑکوں میں میں بھی شامل ہو گیا۔ پہلے دن آڈیشن دیا۔ تو دوسرے دن دوبارہ آڈیشن کے لیے بلایا گیا۔ پھر تیسرے دن بلایا پھر چوتھے دن آٹھ لڑکے رہ گئے ان آٹھ لڑکوں میں میں بھی شامل تھا مگر میرا وہ دوست شامل نہیں تھا جو مجھے لے کر گیا تھا وہ آج تک مجھے کوستا ہے۔ خیر فائنلی میرا انتخاب ہوا اس ٹیلی فلم کے لیے۔ اس میں کام کرنے کے بعد آفرز آنی شروع ہو گئیں ' ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری سے تیسری جگہ۔"

★ "بحیثیت فنکار اپنی پرفارمنس اسکرین پہ دیکھ کر کیسا لگتا ہے؟"

✳ "جب میں اپنا کام اسکرین پہ دیکھتا ہوں تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے کہ کتنا برا کام کیا ہے۔ پھر اپنے کام کو اچھا کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور ہر ڈرامے کے بعد یہی لگتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کسر رہ گئی ہے اور پھر کوشش کرتا ہوں کہ اپنی غلطیوں کو نہ دہراؤں۔"

★ "گھر والے خوش ہوئے اس فیلڈ کو جوائن کرنے پر یا برا بھلا کہا کہ کہاں چلے گئے ہو؟"

✳ "ابو نے تو بس یہی کہا کہ تمہاری مرضی ہے اس فیلڈ میں جاؤ یا بینک میں چلے جاؤ یا ایم بی اے کر لو..... جبکہ امی کا خیال تھا کہ مجھے اس فیلڈ میں کچھ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس فیلڈ میں نام ہے شہرت ہے عزت ہے۔ لوگ پسند کرتے ہیں۔ امی نے مجھے کافی سپورٹ کیا ہے۔"

★ "پہلے ڈرامے کا معاوضہ ملا تھا؟"

✳ "بالکل ' ایک ہفتہ شوٹ رہی تھی اور مجھے 2800 روپے ملے تھے۔ بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس کے بعد آفرز بھی بڑھتی گئیں اور پیسے بھی بڑھتے گئے۔"

★ "آپ نے بھی یہ سوچ لیا ہے کہ عمران عباس کی طرح ہلکی ڈاڑھی ہی رکھنی ہے؟ کبھی کلین شیو میں نہیں آنا ہے؟"

✳ "اس کی وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میں نے ایک پروجیکٹ کے لیے ڈاڑھی رکھی تو اسی دوران مجھے دوسرا پروجیکٹ آفر ہو گیا۔ اب یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ میں اسے صاف کروا لیتا۔ تو اس کے ساتھ میں نے دوسرا پروجیکٹ بھی کر لیا ' پھر ایک اور پروجیکٹ مل گیا تو مسلسل کام ملتا رہا ' اب ختم کروں تو کیسے ' میں نے سوچا کہ چلو ٹھیک ہے اسی کے ساتھ کام کرو جب پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو مجھے بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

★ "ہاں تو اچھے لگتے ہیں ' آپ کا ایک ڈرامہ میں نے کلین شیو میں دیکھا تھا تو اس میں آپ بہت ہی کم عمر لگ رہے تھے اور زیادہ اچھے بھی نہیں لگ رہے تھے؟"

✳ "وہ جو آپ نے مجھے کلین شیو میں دیکھا تھا وہ میرے بالکل شروع کے ڈرامے ہیں اور واقعی میری عمر بھی کم تھی..... خیر اب ان شاء اللہ دونوں انداز میں آپ مجھے دیکھیں گی۔"

★ اور ناظرین نے محسوس کیا ہے کہ "نیلم منیر" کے ساتھ آپ زیادہ نظر آتے ہیں اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

✳ نہیں جی..... ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔ بس اتفاق سے ایسا ہو گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ وہ میرے ایج گروپ کی لڑکی ہے۔ باقی جتنی بھی لڑکیاں ہیں وہ بڑی عمر کی ہیں یا پھر وہ بڑی نظر آ رہی ہوتی ہیں۔ لڑکیاں بیس سال کی ہوں گی تو پچیس کی لگیں گی اور لڑکا پچیس کا ہو گا تو بیس کا لگے گا۔ تو نیلم کے ساتھ بک کی جانے کی وجہ شاید یہی ہے کہ وہ میرے ایج گروپ کی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بابر جاوید کے ساتھ میں نے جتنے ڈرامے کیے ہیں ان میں انہوں نے مجھے بھی بک کر لیا اور نیلم کو بھی..... تو یوں اتفاق سے ہم دونوں ساتھ نظر آئے۔"

★ "ویسے آپ بہن بھائی زیادہ لگتے ہیں کیونکہ اس کے بھی چہرے پر تل ہے اور آپ کے چہرے پر؟"

✳ قہقہہ..... "سچ کہہ رہی ہیں اس کا اسٹار بھی Pisces ہے میرا بھی ' وہ بھی پٹھان ہے اور میں بھی پٹھان ہوں..... تو کافی ساری چیزیں کامن ہیں۔ لیکن اب میرے دیگر پروجیکٹ میں مجھے دوسروں کے ساتھ بھی دیکھیں گی۔ ان میں کہیں آپ کو نیلم نظر نہیں آئے گی۔"

★ "آپ نے کہا کہ اپنے ڈرامے دیکھ کر اپنی غلطیاں نوٹ کرتے ہیں۔ گھر والوں کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟"

✳ "گھر والے تو اچھی خاصی تنقید کرتے ہیں۔ خاص طور پر امی اگر وہ سپورٹ کرتی ہیں تو تنقیدی نگاہ سے میرے ڈرامے بھی دیکھتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ تم نے فلاں ڈرامے میں بھی ایسا ہی پرفارم کیا تھا جیسا اس میں کر رہے ہو۔ یوں کیا کرو یوں نہ کیا کرو۔"

★ "ینگ ہیں ظاہر ہے کہ ہیرو کے کردار ہی پسند ہوں گے۔ مگر پھر بھی میں پوچھوں گی کہ ہیرو کے علاوہ کون سے رول پسند ہیں؟ جیسے سنجیدہ یا مزاحیہ ' یا گیٹ اپ والے؟"

✳ "ایک تو ہوتی ہے آرٹ مووی جن کو دیکھ کر ہم گم ہو جاتے ہیں۔ لیکن کچھ فلمیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کو کچھ کرنے پر اکساتی ہیں۔ جیسے فلم "کچھ کچھ ہوتا ہے" میرا مطلب ہے کہ کچھ کامیڈی ہو۔ کچھ رومانٹک ہو۔ یعنی ایسا رول ہو کہ جس کو کر کے آپ کا دل خوش ہو جائے ' آپ ایک نئی دنیا میں چلے جائیں۔ تھوڑی دیر کے لیے آپ سارے غم بھلا دیں کچھ کمرشل ٹائپ کے رول کریں..... جس میں مزا ہی مزا ہو ' تفریح ہی تفریح ہو ' اس رولز میں بہت کچھ کرنے کو بھی ہوتا ہے۔"

★ "فلم میں بھی کام کریں گے؟"

✳ "بالکل کروں گا۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میں ڈراموں میں کھل نہیں پاتا ' ڈراموں میں آپ کو ایک

حد تک کام کرنا پڑتا ہے یعنی ایک حد تک کام کرنے کی اجازت ہوتی ہے جبکہ فلم ایک ایسا میڈیم ہے جہاں آپ کھل کر اداکاری کر سکتے ہیں۔ تو مجھے لگتا ہے کہ اگر میں فلم میں گیا تو پھر ڈراموں سے زیادہ بہتر کام کروں گا۔ گانے ہوتے ہیں ان میں بھی پرفارم کرنے کا موقع ملتا ہے۔ تو فلم کا تو مزا ہی کچھ اور ہوگا۔"

★ "آپ کے چہرے میں فیصل قریشی کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کی شکل کس سے ملتی ہے؟"

✳ "مجھے کہا جاتا ہے اور مجھے خود بھی لگتا ہے کہ فیصل بھائی سے میری شکل ملتی ہے اور جب میں اس فیلڈ میں آیا تھا تو میں کلین شیو تھا اور جب میں نے ڈاڑھی رکھی لوگوں نے کہا کہ تم نے داڑھی کیوں رکھی تو جب میں کلین شیو تھا۔ تو مجھے کہا جاتا تھا کہ تمہاری شکل دلیپ کمار سے ملتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ تمہاری آنکھیں فیصل قریشی سے ملتی ہیں۔ کچھ نے کہا کہ تم شاہ رخ خان کی طرح اداکاری کرتے ہو' حالانکہ میں نے آج تک کسی کو کاپی نہیں کیا اور نہ ہی مجھ سے کاپی ہوتی ہے اور میرے نزدیک دوسروں کی کاپی کرنا کسی کی نقل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اور اگر میں کر پاتا تو مجھے بڑا فخر ہوتا لیکن میں کر نہیں پاتا۔"

★ "اب جبکہ آپ ایک اسٹار بن گئے ہیں تو کیا اسٹار والے نخرے بھی ہیں آپ میں؟"

✳ "نہیں بالکل کوئی نخرہ نہیں ہے مجھ میں..... نہ ہی کھانے پینے میں' نہ ہی کسی اور بات میں..... شوٹ کے دوران مجھے بھوک لگتی بھی ہے تو میں وہ بندہ نہیں ہوں کہ میں شور مچادوں کہ مجھے تو پہلے کھانا چاہیے اور دوستوں کے ساتھ تو میں کہیں بھی جا کر کھانا کھا لیتا ہوں' میں ان اداکاروں کی طرح نہیں کہ جی ڈھابے پہ بیٹھ کر کھانا نہیں کھانا کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا' اسی طرح کوئی راہ چلتے مل جاتا ہے تو بہت خوش دلی سے ملتا ہوں کہ بھئی میں بھی ایک عام انسان ہوں۔"

★ "ابھی کھانے پینے کی بات ہو رہی ہے تو کبھی کسی غصے کے موقع پر کھانا کھانا چھوڑا؟"

✳ "بالکل چھوڑا اور کئی مرتبہ چھوڑا۔ کیونکہ پٹھان والا غصہ ہے مجھ میں اچانک سے دماغ گھوم جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے غصے کو اپنے قابو میں رکھوں۔"

★ "اپنا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں؟"

✳ "برائٹ ہی دیکھتا ہوں محنت میری ہوگی صلہ اللہ تعالیٰ دے گا اور مجھے اپنا فیوچر بنانے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے..... بہت محنت کرنی ہے۔"

★ "قسمت کو مانتے ہیں؟"

✳ "بالکل مانتا ہوں..... اللہ تعالیٰ نے ہماری قسمت میں جو لکھ دیا ہے ہمیں وہی ملے گا ہم دعا بھی اسی وقت مانگتے ہیں جب دعا مانگنی ہمارے نصیب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے اور قبول ہونا بھی قسمت میں ہی لکھا ہوتا ہے۔"

★ "کبھی الہامی کیفیت ہوئی؟"

✳ "اکثر ہوتی ہے جو کچھ ہونا ہوتا ہے اکثر پتا چل جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایکسیڈنٹ ہوا اور اس کا احساس مجھے صبح سے ہی ہو رہا تھا کہ آج میرے ساتھ کچھ برا ہونے والا ہے اور وہ ہو گیا شکر اللہ کا کہ اس نے جان محفوظ رکھی۔"

★ "شوبز میں برائی نظر آتی ہے؟"

✳ "شوبز میں ہی کیوں..... ہر شعبے میں برائی ہے۔ اگر آپ خود برے ہیں۔ مجھے تو اس فیلڈ میں برائیاں کم اور اچھائیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔"

★ "اس فیلڈ میں کون سے فنکار آپ کو بہت متاثر کرتے ہیں؟"

✳ "متاثر تو بہت لوگ کرتے ہیں لیکن ذاتی طور پر جو پسند ہیں ان میں شاہ رخ خان خاص طور پر شامل ہیں وہ مجھے بہت زبردست اداکار لگتے ہیں۔ پہلے تو دلیپ کمار بہت پسند تھے۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین فنکار تھے۔ پھر امیتابھ نے بھی بہت متاثر کیا اور آج کے دور میں تو شاہ رخ خان بہترین ہے۔"

★ "فضول خرچ ہیں؟"

✳ "نہیں فضول خرچ نہیں ہوں۔ ہمیشہ ضرورت کی چیزیں ہی خریدتا ہوں جیسے گاڑی لی اور گھر کی کوئی نہ کوئی چیز بنا لیتا ہوں' کھانے پینے کا شوق ہے تو اس پہ خرچ کرتا ہوں اور کچھ خرچ کرنے کو نہیں ہوتا تو پھر بینک میں جمع کرا دیتا ہوں۔"

★ "ملک سے باہر جانے کا اتفاق تو ہوا ہی ہوگا۔ کیا محسوس کرتے ہیں؟"

✳ "میں دوسرے ملک میں لوگوں کا رویہ دیکھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ وہ لوگ ہم سے بہت اچھے ہیں۔ بہت سچے اور تعاون کرنے والے لوگ ہیں۔ جبکہ ہمارے لوگ تو ایک دوسرے کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں ٹانگ کھینچتے ہیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتے ہیں جبکہ باہر لوگ ایک دوسرے کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔"

★ "اپنے آپ کو عام لوگوں سے کتنا مختلف سمجھتے ہیں؟"

✳ "بالکل مختلف نہیں سمجھتا' میری زندگی عام لوگوں جیسی ہے۔ ابھی تو اللہ کا شکر ہے کہ مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور نہ ہی آئے گی۔ لوگ دو ڈراموں کے بعد ہی بدل جاتے ہیں اور اپنی اوقات اور اپنے ماضی کو بھول جاتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ اللہ نے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔"

★ "آپ نے کہا کہ باہر جا کر بہت سی باتیں نوٹ کرتے ہیں۔ باہر جا کر اپنے ملک کے لیے کیا سوچتے ہیں؟"

✳ "یہی کہ کاش ہمارا ملک بھی اتنا ہی اچھا اور اتنا ہی ترقی یافتہ ہو جائے اور ہم سب کو ہدایت دے کہ ہم اپنے ملک کو اچھا بنا سکیں۔ ورنہ ہم سب دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہمارے ملک کا کتنا برا حال ہو رہا ہے۔ بہت کرائسس کا شکار ہے۔"

★ "نوجوانوں کو اس عمر میں سگریٹ' پان اور چھالیہ جیسی بہت بری عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ صبح اٹھتے ہی پہلا کام سگریٹ سلگانے کا کرتے ہیں آپ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✳ "سچ پوچھیں تو مجھے سگریٹ پان اور نہ ہی چھالیہ کی عادت ہے۔ اور نہ ہی مجھے یہ چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ صبح جلدی اٹھ جاؤں تو نماز اور تلاوت ضرور کرتا ہوں اور ویسے بھی رات کو سارا دن کی قضا نمازیں پڑھ کر سوتا ہوں۔"

★ "لوگ مل کر تعریف کرتے ہیں یا آٹوگراف مانگتے ہیں؟"

✳ "دونوں کام کرتے ہیں۔ لڑکیاں بہت بے وقوف ہوتی ہیں۔ اپنے ہاتھ پہ آٹوگراف مانگتی ہیں۔ شروع میں تو میں دے دیتا تھا۔ پھر سوچا کہ یہ کیا بے وقوفی ہے پھر میں نے ہاتھ میں آٹوگراف دینا چھوڑ دیا۔"

★ "اگر ملک کے کسی عہدے پر فائز ہو جائیں تو پہلا کام کیا کریں گے؟"

✳ "سب سے پہلے بجلی کا نظام ٹھیک کروں گا تاکہ سب سکون میں آجائیں اس کے بعد کھانے پینے کی چیزیں جو خاص طور پر غریب استعمال کرتے ہیں انہیں سستا کروں گا اور جو لوگ ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں ان کی ایسی کی تیسی کر دوں گا۔"

★ "دنیا گھومنے کی خواہش کس مشہور شخصیت کے ساتھ ہے؟"

✳ "کوئی لڑکی ہونی چاہیے جو مجھے اچھی لگتی ہو..... مگر یہ بہت سوچنے والا جواب ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی نہیں ہے کہ جس کے ساتھ دنیا گھومنے کی خواہش کی جائے۔"

★ "اور جب آپ ٹی وی آن کرتے ہیں تو سب سے پہلا چینل کون سا لگاتے ہیں؟"

✳ "دن میں آن کروں تو سب سے پہلے نیوز چینل' اگر رات کو آن کروں تو پھر اسٹار پلس لگاتا ہوں یا پھر کوئی انگریزی چینل اگر اچھی مووی آرہی ہو تو دیکھ لیتا ہوں..... مگر ایسا نہیں ہے کہ بس فلاں ہی چینل دیکھنا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے بابر خان سے اجازت چاہی۔

✡ ✡

کنور نفیس

شاہین رشید

1 "کوئی دو پسندیدہ نام؟"
"علی اور زیان۔"

2 "اپنے نام کی پسندیدگی کی دو وجوہات؟"
"نہیں مجھے اپنا نام پسند نہیں کیونکہ زیادہ تر لوگ میرے نام کو غلط تلفظ کے ساتھ بولتے ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ لوگ مجھے "راجپوت" سمجھتے ہیں جو کہ میں ہوں نہیں۔"

3 "آپ کے دو لکی نمبر؟"
"پانچ اور سات۔"

4 "دو تاریخی ادوار جن میں آپ جانا چاہتے ہیں؟"
"ایمانداری سے بتاؤں کہ کسی تاریخی دور میں نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ میں "حال" پہ یقین رکھتا ہوں۔ ہاں اپنی زندگی کے کسی دور میں جانا ہو تو پھر میں اس دور میں جاؤں گا جہاں میں نے کچھ غلطیاں کی تھیں۔ جیسے بچپن کا دور۔"

5 "کن دو افراد کے SMS کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"
"اول تو میں سب کے ہی ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دے دیتا ہوں لیکن فیملی کے جوابات فوراً" دیتا ہوں۔ دیر نہیں لگاتا۔"

6 "دو باتیں جو آپ کے اختیار میں نہیں ہیں؟"
"ایک میرا غصہ میرے اختیار میں نہیں ہے اور کسی کا انتظار کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے مجھے بہت کوفت ہوتی ہے جب کوئی وقت دے کر انتظار کروائے۔"

7 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتے ہیں؟"
"کہ میں جھوٹ نہیں بولتا.... جبکہ میں اچھا خاصا جھوٹ بولتا ہوں اور جھوٹ تو جھوٹ ہی ہے دو کیا اور چار کیا۔"

8 "کن دو باتوں کو سن کر بہت غصہ آتا ہے؟"
"کہ تم شادی کیوں نہیں کرتے۔ بھئی یہ میرا پرسنل معاملہ ہے۔ لوگوں کو کیوں فکر ہے اور "جاب" کیوں نہیں کرتے۔ کیا شوبز کو جاب میں شمار نہیں کریں گے۔"

9 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو آپ کے خیال سے پرچی سے آئے ہیں؟"
"ذاتی طور پر تو مجھے کوئی اینکر ایسا نہیں لگتا کہ وہ پرچی سے آیا ہوگا — کیونکہ مجھے سب ہی نیوٹرل لگتے ہیں اور سب ہی اچھا پروگرام کر رہے ہوتے ہیں۔"

10 مارننگ شو کے دو بہترین اینکر آپ کی نظر میں؟
"کوئی بھی نہیں ہے۔ پہلے ڈان نیوز میں عائشہ عالم پروگرام کرتی تھیں۔ اب انہوں نے بھی چھوڑ دیا اور جگن اچھی ہے ویسے سچ بتاؤں کہ مارننگ شو میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ جیسے اگر آپ سیلیبرٹی کو بلاتے ہیں تو ان کے لیے کوئی ایکٹوٹی ہونی چاہیے نہ کہ ان کی پرسنل لائف کو ڈسکس کرتے رہیں وہ تو پہلے سے ہی مشہور ہوتے ہیں اور لوگ ان کے بارے میں بہت کچھ جانتے بھی ہیں۔ اس لیے مجھے یہ شوز زیادہ متاثر نہیں کرتے۔"

11 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں؟"
"میں عموماً" بھروسہ نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی اگر مجھے کسی پر بھروسہ ہوتا ہے تو جو لڑکیاں میری دوست ہیں ان پر کرتا ہوں۔"

12 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتے ہیں؟"
"کترینہ کیف اور بالی ووڈ کی کسی اداکارہ کے ساتھ کیونکہ وہاں تو بے انتہا اچھی اداکارائیں ہیں۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتے ہیں؟"
"اپنی سالگرہ اور دونوں عیدیں۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"
"شام کا اور رات کا۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتے ہیں؟"
"ہائے اور مائی نیم از کنور۔"

16 "کن دو کھانوں سے کبھی دل نہیں بھرتا؟"
"دال چاول اور میٹھے میں کچھ بھی ہو جائے۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی؟"
"ایک تو میرا بھانجا جو کہ ابھی صرف دو سال کا ہے اور آپ کو بتاؤں کہ اپنوں سے معافی مانگنے سے میں شرما جاتا ہوں۔ لیکن کوئی ایسا بندہ جس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور جو بہت نرم مزاج ہو اور کلاس میں کم ہو اس سے معافی مانگنے میں آسانی محسوس کرتا ہوں۔ حالانکہ مجھ میں ایگو نہیں ہے مگر پھر بھی۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ دیکھتے ہیں؟"
"وسیم اکرم جو کہ بہت اچھا کھلاڑی ہے اور شاہد آفریدی جو کہ بہت اچھا انٹرٹینر (Entertainer) ہے۔"
19 "زندگی کے دو خوب صورت دن؟"
"میری سالگرہ کا دن جو کہ 14 جنوری کو ہوتی ہے اور اپنی شادی کے دن کا انتظار ہے۔"
20 دو چیزیں جنہیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"موبائل فون اور والٹ۔"
21 "دو الفاظ جو آپ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"
"But" اور یار۔
22 "دو پسندیدہ صحافی؟"
"آپ اور ابن آس۔"
23 "سات دنوں میں کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"
ہفتہ اور اتوار۔"
24 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"
"صرف جنوری...... میری سالگرہ کا مہینہ۔"
25 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"
"میرا بیڈ روم اور میرا واش روم۔"
26 "گھر کے دو کام جو آپ کو ناپسند ہیں؟"
"ماسی (نوکرانی) سے کمرہ صاف کروانا اور گھر کا سودا لانا بازار سے۔"
27 "دو پسندیدہ پکنک پوائنٹ یا تفریح گاہیں؟"
"ہمارے ملک میں اچھی تفریح گاہیں ہیں کہاں۔"
28 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"
"انڈیا اور چائنا۔"
29 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"
"بلیو اور بلیک۔"
30 اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو کیا چیزیں لینا پسند کریں گے؟"
"دیکھیں سونے سے کچھ نہیں ملتا۔ مثلاً اگر مجھے عزت چاہیے۔ شہرت چاہیے تو یہ سونے سے نہیں ملیں گی یہ مجھے میری محنت سے ملیں گی۔ اس لیے اگر ساری دنیا سو بھی جائے تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"
31 "لڑکیوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟"
"مردوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پائیں گی۔ جیسے مرد عورت کو سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پاتا اور دوسری نصیحت یہ کہ سچائی پر یقین رکھیں اور ڈپلومیسی سے پرہیز کریں۔"
32 "سال کے چار موسموں میں سے دو پسندیدہ موسم؟"
"بہار اور سردی اور سردی بھی نومبر دسمبر کی۔"
33 "لڑکیوں کی دو ناپسندیدہ باتیں؟"
"سچ کو چھپانا اور متضاد حرکتیں کرنا۔"
34 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام سب سے پہلے کرتے ہیں؟"
"دانت صاف کرنا اور پھر چائے پینا۔"
35 "دو خواتین جنہوں نے آپ کی زندگی میں اہم رول ادا کیا ہو؟"
"صرف اور صرف میری ماں۔"
36 "آپ کے نزدیک دنیا کی دو خوب صورت ترین خواتین؟"
"ایشوریا رائے اور دپیکا۔"
37 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں"
"قائد اعظم محمد علی جناب اور گاندھی جی۔"
38 "والدین کی دو نصیحتیں جو گرہ سے باندھ لی ہوں؟"
"جھوٹ نہ بولو اور بے ایمانی نہ کرنا۔"
39 "اپنے دو ڈرامے جو فراموش نہیں کر سکتے؟"
"آنچ اور The eye ٹیلی فلم تھی۔"
40 دو کردار جو آپ نے ابھی تک نہیں کیے؟"
"میں نے تقریباً" سارے ہی کردار کیے ہیں۔ ہاں البتہ "نانا، دادا" کا رول نہیں کیا اور کسی لڑکی کا رول بھی نہیں کیا۔ بس یہ دو کردار رہ گئے ہیں۔"

41 "غصے میں کون سی دو گالیاں منہ سے نکلتی ہیں؟"
"بہت بری گالیاں نکلتی ہیں لکھنے والی نہیں ہیں۔"
42 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے؟"
"میں تعریف میں کنجوس ہوں نہیں۔ اپنے بھانجے کی تعریف میں اور اپنی ماں کی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیتا۔"
43 "کن دو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں؟"
"کسی کی برائیاں کرنے سے اور بات کو ٹالنا ۔ کہ نہیں یہ کام آج نہیں کل کروں گا جیسی باتوں سے پرہیز کرتا ہوں۔"
44 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتے ہیں؟"
"فجر کی نماز رہ جاتی ہے۔ باقی کے لیے کوشش کرتا ہوں کہ پڑھ لوں عشاء اور عصر پڑھ لیتا ہوں۔"
45 "بیرون ملک شاپنگ میں کون سی دو چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟"
"کپڑے اور پرفیومز۔"
46 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"
"سافٹ ڈرنک اور جوسز وغیرہ۔"
47 "آج کے دور کے دو گلوکار جو آپ کو پسند ہیں؟"
"عاطف اسلم اور شفقت امانت علی۔"
48 "شادی کی دو رسمیں جو آپ انجوائے کرتے ہیں؟"
"مہندی کی رسم اور جب دولہا دلہن کو اٹھا کر کمرے میں لے جاتا ہے۔"
49 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"
"برائیاں کرنا اور بدتمیزی کرنا۔"
50 اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟"
"صاف ستھرے ہوں اور مجھ پر اچھے لگتے ہوں۔"
51 "دو چینلز جو آپ شوق سے دیکھتے ہیں؟"
"اسٹار ورلڈ اور نیوز چینلز۔"
52 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"
"کراچی اور لاہور۔"
53 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

"کافی فیصلے اپنے کیریئر کے حوالے سے' جاب کے حوالے سے کافی فیصلے غلط ثابت ہوئے۔"

54 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟"

"کوئی خاص نہیں کسی کے ساتھ بھی کر سکتا ہوں"۔

55 "دو کیڑے جن سے ڈر لگتا ہے؟"

"رینگنے والے اور اڑنے والے لال بیگ سے۔"

56 "دو ریسٹورنٹ جہاں سے کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

"پی سی کے چاندنی میں اور ہائی وے کے ریسٹورنٹ میں۔"

57 "ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتے ہیں؟"

"پارک ٹاور اور فورم۔"

58 "کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

"کیچپ اور اچار۔"

59 "کوئی دو تبدیلیاں جو اپنی شخصیت میں لانا چاہتے ہیں؟"

"بہت زیادہ خوش اخلاق ہونا چاہتا ہوں اور قوت برداشت لانا چاہتا ہوں۔"

60 لڑکیوں کی دو ناپسندیدہ باتیں؟"

"فلاں جگہ چل کر کھانا کھلاؤ اور سچ بات کو چھپاتی بہت ہیں۔"

61 "کن دو شخصیات کو اغوا کر کے تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"

"ایک اپنی گرل فرینڈ اور دوسری کترینہ کیف اور تاوان میں شادی چاہوں گا۔"

☆ ☆

مجھ سے ملیے

نبیلہ عزیز

(1) "نام بتایئے؟"

☆ "نبیلہ افضل۔"

(2) "تاریخ پیدائش/اسٹار؟"

☆ "2 دسمبر/قوس۔"

(3) "خدا سے تعلق؟"

☆ "میرا خدا سے تعلق' خدا بہتر جانتا ہے۔"

(4) "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"

☆ "بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر گپیں لگانا اور دوسروں کے مذاق بنانا' جب ہم لوگ مذاق کے موڈ میں ہوتے ہیں تو اچھے بھلے انسان کا نقشہ بگاڑ کے رکھ دیتے ہیں اور تصور کی آنکھ سے دیکھ کر خوب قہقہے لگاتے ہیں اور اس کام میں رافیہ' سعیدہ' سنعیہ بھابھی اور حسن پیش پیش ہوتے ہیں۔ تب فرصت کا وقت گزارنے کا مزا آجاتا ہے۔"

(5) "کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟"

☆ "شاپنگ اور ڈھیر ساری شاپنگ وہ بھی رافیہ کے ساتھ' لیکن جب سے فیری (میری بیٹی) پیدا ہوئی ہے شاپنگ کا مزا ادھورا ہو گیا ہے کیونکہ میں اور رافیہ ایک ساتھ مل کر شاپنگ نہیں کر سکتیں' فیری کے لیے کسی ایک کو گھر پہ رہنا پڑتا ہے کیونکہ فیری کو ساتھ لے کر شاپنگ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔"

(6) "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"

☆ "جب میں کسی ناول کو ختم کرنا چاہ رہی ہوتی ہوں لیکن وہ ختم ہی نہیں ہوتا' طوالت اختیار کر جاتا ہے۔"

(7) "مشکل ترین لمحہ......؟"

☆ "میرے لیے ہر وہ لمحہ مشکل ترین لمحہ ہوتا ہے جب فیری بیمار ہوتی ہے وہ وقت کاٹے نہیں کٹتا......"

(8) "بہترین تعریف جو وصول کی؟"

☆ "تعریف کرنے والا اگر سچے دل سے تعریف کر رہا ہو تو سمجھو کہ اس تعریف سے بہترین اور کوئی تعریف نہیں چاہے وہ ایک جملہ ہی کیوں نہ ہو؟ اور اللہ کا بڑا احسان ہے کہ میں نے ایسی کئی پر خلوص تعریفیں وصول کی ہیں "شرط" اور "کردار" ناول شائع ہونے کے بعد امثل آپی کی تعریف اور حوصلہ افزائی' کرن میں شائع ہونے والا ناول "کوئی ایسا اہل دل ہو" کے بعد ریحانہ آپی کی تعریف اور حوصلہ افزائی' اپنی کتابوں کی اشاعت پہ اپنے ابو جی کی تعریف اور ہمیشہ ہر تحریر کے بعد ملنے والے میرے عزیز قارئین کی تعریف ہی میرے لیے بہترین' اہم اور قیمتی ترین تعریفوں میں شمار ہوتی ہیں۔"

(9) "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"

☆ "فیس بک یوز کرنا اور دوسروں پہ بے وجہ کمنٹ پاس کرنا' جو فضول سے لوگوں کا فضول سا مشغلہ بن چکا ہے' اب ایسے لوگوں سے بندہ کیا کہے کہ اگر وقت ہی ضائع کرنا ہے تو کسی اچھے کام پہ ضائع کر لو' کم از کم کوئی فائدہ تو ہو۔"

(10) "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"

☆ "جب میرے لاڈلے بھائی حسن کا یونیورسٹی آف گجرات میں شدید ایکسیڈنٹ ہوا اور اس کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا تھا' ٹانگ کی ہڈی بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کی ٹانگ کا آپریشن ہوا اور ہڈی میں راڈ ڈالا گیا اور تین مہینے وہ بستر سے اٹھ نہ سکا' جون' جولائی اور اگست کے مہینے تھے گرمی اور لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اس کی حالت اور تکلیف دیکھ

کرہم تینوں بہنیں دکھ اور بے بسی کی وجہ سے اس سے چھپ چھپ کے روتی تھیں اور اس کے سامنے نارمل نظر آنے کی کوشش کرتی تھیں دن رات اس کی تیمارداری میں اور اس کا دھیان بٹانے میں گزر جاتے تھے اور جب اس نے اتنے مہینے بعد پہلی بار زمین پہ قدم رکھا اور اسٹک کے سہارے چلنا شروع کیا تو وہ دن ہمارے لیے اللہ کی طرف سے اس کے کرم اور عنایتوں کا دن تھا' لیکن آج بھی وہ وقت یاد آجائے تو روح کانپ اٹھتی ہے۔"

(11) "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"

☆ "گاڑی......!"

(12) "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"

☆ "طارق بن زیاد اور اسامہ بن لادن۔"

(13) "پسندیدہ ساتھی......؟"

☆ "حسین میرے ہزبینڈ۔" (ہائے پہلی بار ان کا ذکر کیا ہے' شرم آگئی ہے یار)

(14) "پسندیدہ ہستی؟"

☆ "میری ماں۔"

(15) "پسندیدہ پروفیشن؟"

☆ "بزنس۔"

(16) "بہترین کاوش؟"

☆ "میں اپنی کسی بھی کاوش کو بہترین کاوش نہیں سمجھتی' اگر میرے قارئین میری کسی تحریر کو بہترین کاوش کا نام دیتے ہیں تو یہ ان کی محبت' اپنائیت اور ذرہ نوازی ہے۔"

(17) "پسندیدہ ملکیت؟"

☆ "رافیہ اور فیری' ایک میری بہن اور ایک میری بیٹی۔"

(18) "زندگی کی خواہش؟"

☆ "میری زندگی کی بہت بڑی خواہش ہے کہ میں کبھی کراچی جاؤں اور ان سب اپنوں سے ملوں جو میرے بہت اپنے ہیں' جن سے میرا خون کا رشتہ ہے' جن سے میرا دل کا رشتہ ہے' لیکن نظر کا رشتہ کوئی بھی نہیں ہے' جن کو اک بار بھی نہیں دیکھا اور پتا نہیں زندگی میں ایسا ہوگا بھی یا نہیں خواہش حسرت بن جائے گی۔"

(19) "پریشان کن لمحہ؟"

☆ "جب رافیہ کوئی کام کہہ دے اور میں وقت پہ نہ کرسکوں' تب مجھے کوئی جائے پناہ نہیں ملتی' چھپنے کے لیے اور جان بچانے کے لیے۔" (ارے! آپ نے اس کا غصہ نہیں دیکھا اس لیے' ورنہ لگ پتا جاتا)

(20) "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"

☆ "ہر ایک سے خفگی' بے زاری اور کوفت سے بات کرتی ہوں' مطلب کہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہوں" (قہقہہ)

(21) "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ ہو سکوں؟"

☆ "بھائی چاند کے سامنے۔" (میرے بڑے بھائی)

(22) "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"

☆ "جب ایک سیزن کے کپڑوں کا فیشن دوسرے سیزن میں چینج ہوچکا ہوتا ہے' شارٹ شرٹ سے لانگ شرٹ اور لانگ شرٹ سے شارٹ شرٹ ان ہو چکی ہوتی ہے' تب بڑا نقصان ہوتا ہی اور فیشن پہ غصہ آتا ہے۔"

(23) "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"

☆ "جب انسان اپنے دل کو ٹوٹنے کے لیے دوسروں کی راہوں میں رکھ دیتا ہے۔"

(24) "کیا چیز جذباتی کردیتی ہے؟"

☆ "پاکستان' یہ چیز تو نہیں ہے مگر چیز بن چکا ہے۔ جس کا دل چاہتا ہے وہ خرید لیتا ہے' جس کا دل چاہتا ہے وہ اسے تہس نہس کر ڈالتا ہے اور اس کے یہی حالات اور واقعات جذباتی کرڈالتے ہیں۔"

(25) "زندگی کا یادگار دن؟"

☆ "21 جولائی جب ہم حسن کے ساتھ گھومنے کے لیے منگلا ڈیم گئے اور اسپیڈ بوٹ پہ بیٹھ کر ڈیم کے نیلے اور سبز پانیوں میں بہت دور تک جانا' شاپنگ اور ہولننگ کرنا' آج تک نہیں بھولا۔" (حسن دوبارہ کب پروگرام بنا رہے ہو......؟)

(26) "موسیقی میرے نزدیک؟"

☆ "سماعتوں کے لیے بہترین میٹھا اور سریلا ٹانک' جو کبھی کبھی اپنی سماعتوں کو ضرور پلانا چاہیے' چاہے کسی کوئل کی کوک ہو' چاہے کسی گلوکار کی ہوک۔"

(27) "پسندیدہ گانا؟"

☆ جانے کیوں لوگ محبت کیا کرتے ہیں
دل کے بدلے دردِ دل لیا کرتے ہیں

(28) "پسندیدہ فقرا؟"

☆ "اوئے جی کراں۔"

(29) "پسندیدہ کردار؟"

☆ "عشق کا عین ناول کا کردار الٰہی بخش۔"

(30) "سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"

☆ "میرے اپنے' میرے رشتے۔"

(31) "اچھا اور خوب صورت موسم؟"

☆ "پانچواں موسم! دل کا موسم جو باقی چاروں موسموں پہ حاوی ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔"

(32) "ناقابل فراموش واقعہ؟"

☆ "جب پاکستان انڈیا سے سیمی فائنل ہارا۔"

(33) "پہلی کاوش شائع ہونے پہ تاثرات؟"

☆ "نہ تو بہت زیادہ حیرت ہوئی تھی اور نہ ہی بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی بس نارمل سے انداز میں امی اور بہنوں کو بتایا تھا کہ میری تحریر شائع ہوئی ہے البتہ وہ بہت خوش ہوئی تھیں۔"

(34) "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"

☆ "جب شادی کے صرف آٹھ ماہ بعد وہ بیرون ملک جانے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے اور میں نے پوری رات روتے ہوئے گزار دی یہاں تک کہ رات بھر رونے اور جاگنے کی وجہ سے آنکھیں سوج گئی تھیں۔"

(35) "میرا خواب؟"

☆ "اپنے ہزبینڈ کے ساتھ حج پہ جانا اور ان کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کا طواف کرنا۔"

(36) "پسندیدہ مزاح؟"

☆ "کامیڈی ڈرامہ بلبلے۔"

(37) "حسد محسوس کرتی ہوں؟"

☆ "اٹلی کی گوریوں سے۔"

(38) "خوشبو پسند ہے تو کیوں ہے؟"

☆ "کیونکہ وہ ارباز خان کی بیوی ہے۔" (ہاہاہا)

(39) "پسندیدہ خوشبو؟"

☆ "گیلی اور خشک مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو مسرور کردیتی ہے۔"

(40) "آخری کتاب جو میں نے پڑھی ہو؟"

☆ "ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی "جوک در جوک"۔

(41) "پسندیدہ جگہ؟"

☆ "بھوربن' جھیل سیف الملوک۔"

(42) "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟"

☆ "چھوٹی پھوپھو کا گھر۔"

(43) "میری قوت ارادی؟"

☆ "زیرو بٹا زیرو۔"

(44) "گھر کا پسندیدہ کمرا؟"

☆ "اپنا بیڈ روم۔"

(45) "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"

☆ "قومی لباس۔"

(46) "پسندیدہ رنگ؟"

☆ "کالا رنگ۔"

(47) "پسندیدہ مصنف؟"

☆ "رفعت سراج۔"

(48) "پسندیدہ شاعر؟"

☆ "ابن انشاء' اعتبار ساجد' سعید واثق۔"

(49) "ویران سنسان جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کروں گی؟"

☆ "پانی تلاش کروں گی' کیونکہ مجھے بہت زیادہ پیاس لگتی ہے' جب تک پانی نہ پی لوں کوئی اور کام نہیں کر

سکتی۔"

(50) "خود اپنی بری عادت؟"

☆ "سستی۔"

(51) "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"

☆ "دریائے جہلم کا ریسٹورنٹ ٹیولپ اور دریائے چناب کا ریسٹورنٹ کنارا۔"

(52) "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟"

☆ "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو رائٹر ہوتی۔" (قہقہہ)

(53) "ایک لفظ جو مجھے واضح کردے؟"

☆ "نبیلہ عزیز۔"

(54) "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"

☆ "اچھے اور برے انسان ہر جنس میں پائے جاتے ہیں' برائی اور اچھائی کے لیے جنس کی کوئی قید نہیں ہوتی' جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح سب مرد اور سب عورتیں ایک جیسے نہیں ہوتے' اس لیے کسی کے بارے میں حتمی رائے دینا بے کار ہے۔"

(55) "محبت کے بارے میں خیال؟"

☆ "یہ ایک ایسا سوال ہے' جس کا جواب لکھنے بیٹھی تو میرے الفاظ اور آپ کے صفحات کم پڑ جائیں' ایک لفظ سے ایک جملہ' ایک جملے سے پیراگراف اور پیراگراف سے ناول بن جائے گا اور کبھی ختم نہیں ہوگا اس کی اقساط زندگی بھر چلتی رہیں گی۔"

(56) "پسندیدہ رشتہ؟"

☆ "اللہ اور انسان کا رشتہ' جو کسی اور کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا' انسان بلا جھجک اس سے مانگتا ہے اور وہ نوازتا ہے' انسان اپنا ہر دکھ رو رو کے اسے سناتا ہے اور وہ بڑے پیار اور دھیان سے سنتا ہے' انسان اپنے راز اس کے سامنے کہتا ہے اور وہ ہمیشہ ان رازوں پہ پردہ رکھتا ہے' وہ بے حد اچھا دوست ہے' وہ بے حد اچھی ماں ہے' وہ کیا ہے؟ ہم جان لیں تو سر نہ اٹھاسکیں۔"

(57) "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"

☆ "میری محبت کے نتائج میری بیٹی فریال کی صورت' سب کے سامنے ہیں۔"

(58) "پسندیدہ لو اسٹوری؟"

☆ "عاصمہ افضل اور محمد افضل کی۔" (امی' ابو)

(59) "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"

☆ "اپنی شادی کی فلم۔" (قہقہہ)

(60) "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"

☆ "بتاتے ہیں جی بالکل بتاتے ہیں' اچھا برا سب کچھ بتادیتے ہیں اور میں ایسی باریک بین ہوں کہ اک نظر میں دوسروں کا چہرہ دیکھ کر تاثرات بھانپ لیتی ہوں زیادہ تر رافیہ کا چہرہ ہی بھانپتی ہوں۔"

(61) "شاعری کے بارے میں خیال؟"

☆ "نہایت ہی شاندار' نیک اور اچھے خیالات ہر جناب' مختصر اور خوب صورت لفظوں میں اپنی کیفیت اور جذبات کے اظہار کا آسان طریقہ' عاشق ہوں میں شاعری کی۔"

(62) "میری جستجو' میری کھوج؟"

☆ "مسلمان سے مومن ——— بننے کی۔"

(63) "بہترین کامیابی؟"

☆ "ابھی تک نہیں۔"

(64) "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟"

☆ "صدقہ اور خیرات دیتی ہوں اور دل ہی دل میں اللہ سے خیر مانگتی رہتی ہوں۔"

(65) "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

☆ "بجلی۔"

(66) "بدترین ایجاد؟"

☆ "ایٹم بم۔"

(67) "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟"

☆ "اپنی ٹیچر میڈم صفیہ۔"

(68) "بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟"

☆ "اپنے موبائل پہ تمام میسجز چیک کرنے کے بعد موبائل کو سائلینٹ پہ لگانا۔"

(69) "ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟"

☆ "ایک بات پڑھی تھی کہیں کہ "ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ میری انگوٹھی میں کچھ ایسے لفظ کندہ کرواؤ کہ جنہیں میں اداسی میں پڑھوں تو خوش ہو جاؤں اور خوشی میں پڑھوں تو اداس ہو جاؤں' تب اس کے وزیر نے اس کی انگوٹھی میں ایک لفظ کندہ کروایا کہ 'یہ وقت گزر جائے گا" اور یہ لفظ اس وقت کے بادشاہ کو بے حد پسند آیا تھا اور پھر نبیلہ عزیز کو بھی۔"

(70) "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"

☆ "4 اگست۔"

(71) "پیغام قارئین کے لیے؟"

☆ "پیارے قارئین! آپ کی محبت' آپ کی رائے ہمارے لیے کتنی اہم ہے یہ آپ کبھی نہیں جان سکتے' آپ کی رائے کا ایک لفظ ہی ہماری ساری تحریر اور محنت کا حاصل ہوتا ہے' جس طرح آپ کو ہماری تحریر کا انتظار ہوتا ہے اسی طرح ہمیں بھی آپ کی رائے کا شدت سے انتظار ہوتا ہے آپ کا فرض بنتا ہے کہ اچھی اور مثبت رائے سے نوازیں اور پیاری قارئین' نواب زادی سولنگی' ام رومان' نوسیہ اکرم' نوشین اقبال' فوزیہ ثمر بٹ' سائرہ پرواکرن' سدرۃ المنتہیٰ' انیقہ انا اور میری پیاری سی حرمت ردا اکرم کی بے حد مشکور ہوں جو ہر ماہ میری تحریر پڑھ کر اپنی قیمتی آرا سے آگاہ کرتی ہیں میں آپ کو دعاؤں میں یاد رکھتی ہوں آپ بھی مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

(72) "کرن کے بارے میں رائے؟"

☆ "کہتے ہیں کہ ماں کی گود انسان کا پہلا مدرسہ ہوتا ہے جو ہمیں سبق اور شعور دے کر دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیز میں بھیجتا ہے اور ہمیں انٹیلی جینٹ بناتا ہے اور میں بھی یہی کہوں گی کرن ہمارے لیے ماں کی گود جیسا ہے' جس نے ہمیں شعور دیا ہے' پہچان دی ہے' نام دیا ہے جس کے لیے میں کرن کو اور اس کے اسٹاف کو سلام پیش کرتی ہوں' اللہ کرن کو دن دگنی ترقی دے۔" آمین

☆ ☆

آواز کی دنیا سے

افراز علی نازش

شاہین رشید

ٹی وی چینلز کی طرح FM کا بھی جال بچھ گیا ہے۔ سب سے پہلا چینل ایف ایم 100 تھا اس کی مقبولیت کے بعد ایف ایم کھلتے ہی چلے گئے اور اب ایف ایم سننے کی لوگوں کو اتنی عادت ہو گئی ہے کہ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھتے ہی لوگ پہلے ایف ایم لگاتے ہیں اور جو چینل پسند ہوتا ہے بس اسی کے آر جے کی باتیں دل کو بھاتی ہیں۔ ایف ایم 95 لاہور کے آر جے "افراز علی نازش" پنجاب کے رہنے والوں کے پسندیدہ آر جے ہیں ـــــــ۔ ان کی دلچسپ گفتگو ہوئی جو نذرِ قارئین ہے۔

☆ "جی افراز صاحب کیسے ہیں آپ؟"

* "جی الحمدللہ! آپ ٹھیک ہیں آپ کو اکثر پڑھتا رہتا ہوں ہمارے گھر میں آپ کے تینوں میگزین بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔"

☆ "بہت شکریہ ـــــ بذریعہ میگزین آپ سے میرا تعارف ہے؟"

* "جی بالکل ـــــ کیونکہ میں ماشاء اللہ کافی عرصے سے آپ کو پڑھ رہا ہوں۔ پہلے امی پڑھتی تھیں۔ پھر بہنیں ان کے ساتھ ساتھ مجھے بھی شوق ہوا اور جب سے آج تک آپ کے میگزین' آپ اور اس کے سب لکھنے والے سب ہمارے گھر کا ایک حصہ ہیں۔"

☆ "بہت شکریہ افراز علی نازش کیا یہ آپ کا اصلی نام ہے؟"

* "نہیں جی' میرا اصلی نام محمد خالد ارشد ہے اور افراز علی نازش میرا قلمی نام ہے۔"

☆ "تو کیا شاعری کرتے ہیں؟"

* "کرتا تھا لیکن نازش میرا تخیل ہے اسی کی تلاش میں آج تک میں نے شادی نہیں کی ـــــ وہ ملے شادی ہو گی۔"

☆ "کیا آئیڈیل ہے' کیا سوچا ہے کہ ایسی ہو گی ہو گی؟"

* "جی یہی سوچا ہوا ہے کہ یہ یہ خوبیاں ہوں گ جو آئیڈیل میں نے اپنی شریکِ سفر کے لیے بنایا ہو اس کا قصوروار میں آپ کے میگزین' خواتین' شہ اور کرن کو دوں گا کہ ان کو پڑھ پڑھ کر میں نے آئیڈ بنایا۔ میری ماں بھی یہ کہتے کہتے کہ بیٹا شادی کر لو دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ بہو لانے کی حسرت ان دل میں ہی رہ گئی۔"

☆ "تصوراتی دنیا میں رہنا آج کے دور میں کچھ ؟ سی بات ہے؟"

* "بس آپ اسے میری خامی کہہ لیں یا خوبی میرے تصور میں جو ہے وہ مجھے نہیں ملی۔ حقیقت ہے کہ میں کہانیاں لکھتا تھا ایک میگزین میں۔ ج میں بھی لکھا' خلیج ٹائم میں بھی لکھا۔ مختلف اخبار میں میں نے لکھا ـــــ کہانیاں لکھنا اور کہانیاں پڑھنا شوق تھا اور لڑکی کا جو تصور تھا میرے ذہن میں و رچ بس گیا کہ پھر اس سے باہر نکلنا میرے لیے مش ہو گیا۔"

☆ "کیا تصور ہے آپ کا ـــــ اور کیا آپ نے زندگی میں مشکلات پیدا نہیں کر دیں؟"

* "میری شریکِ سفر میری بیوی تو ہو مگر میری دو بھی ہو۔ مگر اتفاق دیکھیں کہ جن کو ہم نے پسند جنہوں نے ہمیں پسند کیا یہ دونوں خوبیاں کسی نہیں ہوتی تھیں۔ کوئی دوست کے روپ میں ا

لگتی تھی تو کوئی بیوی کے روپ میں اور یہ حقیقت ہے کہ میری اس سوچ نے میرے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں ـــــ لیکن کوئی بات نہیں جو نصیب میں لکھی گئی ہے وہ مل ہی جائے گی۔"

☆ "کوئی بھی انسان اس دنیا میں مکمل نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی آئیڈیل پہ پورا اترتا ہے خواہ وہ لڑکی ہو یا لڑکا؟"

* "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور میں خطا بچپن میں کر بیٹھا کہ "نازش" کا تخیل جو بنا لیا ہے اب اس پہ کمپرومائز کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا ـــــ انسان اور خاص طور پر میں دو تین چیزوں پر تو بالکل بھی کمپرومائز نہیں کر سکتا جیسے تعلیم' کم تعلیم یافتہ لڑکیاں پسند نہیں۔ مینرز کا ہونا بہت ضروری ہے اور خاندانی ـــــ بس تو کوئی نہ کوئی بات آڑے آ ہی جاتی ہے۔"

☆ "ایف ایم کا نام افراز تخیل نازش' اصلی نام خالد ـــــ لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟"

* قہقہہ "لوگ مجھے نازش کہتے ہیں لڑکے خاص طور پر اپنے موبائل پہ نازش کے نام سے میرا نمبر سیو کرتے ہیں تاکہ اپنی بیگمات کو تنگ کر سکیں تو جب میں فون کرتا ہوں تو نازش کا نام دیکھ کر وہ چونک جاتی ہیں کہ یہ نازش کون ہے لیکن خیر اب کافی بھابیوں کو پتا چل گیا ہے کہ یہ نازش کون ہے۔ ویسے میرا اپنا بزنس کا جو سرکل ہے وہاں مجھے افراز کہتے ہیں اور شوبز کے لوگ مجھے نازش کہتے ہیں۔"

☆ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

* "20 جون 1974ء میری تاریخ پیدائش ہے ملتان میں پیدا ہوا' اسٹار جمنائی ہے اور ہائیٹ 5 فٹ 11 انچ ہے اور تعلیمی قابلیت گریجویشن ہے اور ایک بھائی ایک بہن ہے۔ میں بڑا ہوں۔"

☆ "یہ پڑھ کر بھی آپ کے لیے رشتے آ سکتے ہیں؟"

* قہقہہ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ستارہ آپ کے ڈائجسٹ کے ذریعے سے ہی ملے گا۔"

☆ "آپ ایف ایم 95 سے وابستہ ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔ کچھ اس بارے میں بتایئے؟"

* "جی میں لکھنے کا زیادہ شوقین تھا۔ کہانیاں' مضامین اور کالم بھی لکھے' لیکن ایک وقت آیا کہ "سچ" کی قیمت لگنا شروع ہو گئی۔ ادارے بڑے تھے۔ نام بڑے تھے ـــــ وہ لوگ میرے فیچر آگے بیچ دیا کرتے تھے۔ میرا

سارا ریسرچ ورک بیچ دیا جاتا تھا تو پھر میں نے چھوڑ دیا۔ میں نے ان اداروں کے لیے تقریباً" دس سال لکھا۔ اس کے بعد پھر میں مارکیٹنگ کی طرف آگیا البتہ کالم وغیرہ میرے چلتے رہتے ہیں اور ملک سے باہر نکلنے والے اخبارات اور میگزین میں میرے کالم شائع ہوتے رہتے ہیں۔"

☆ "اور ایف ایم میں آمد کب ہوئی؟"

* "جب میں 1992ء '1993ء میں دبئی میں تھا تو وہاں ایک انڈین ایف ایم شروع ہوا تھا تو وہ میں نے جوائن کیا اور سرائیکی اور اردو میں غزل نائیٹ کے پروگرام کیے اور یہ دونوں پروگرام میرے بے حد مقبول تھے اور تقریباً" دو سال میں نے انڈین ایف ایم سے پروگرام کیے اور مجھے پروگرام کر کے بہت مزا بھی آیا۔ اور آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ 92 '1991ء کا پہلا ایشین گولڈ میڈل بھی حاصل کیا اور میں پہلا پاکستانی تھا کہ جس کو گولڈ میڈل ملا۔"

☆ "یہ کس صلے میں ملا آپ کو؟"

* "گورنمنٹ آف دبئی کی جانب سے گولڈ میڈل ملتا تھا اور ان لوگوں کو ملتا تھا جو مختلف کمیونٹی کے تحت اپنی سروس کو بہترین طریقے سے ادا کرتے تھے۔ اور یہ دیکھتے تھے کہ سیاسی پلیٹ فارم سے ہٹ کر کون بہتر کام کر رہا ہے..... تو مجھے جو ایوارڈ ملا وہ اسی وجہ سے ملا کہ 487 ایسے پاکستانی تھے جو غیر قانونی طور پر دبئی آئے اور پکڑے گئے اور ان کے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لیے رقم نہیں تھی اور کسی کو دس ہزار درہم جرمانہ ہوا تو کسی کو پانچ ہزار درہم اور وہ اپنی سزا پوری کر کے بھی جیل میں تھے کیونکہ ان کے پاس اتنا پیسے نہیں تھے کہ وہ جرمانہ ادا کر کے واپس پاکستان جا سکیں۔

میں نے ڈونیشن اکھٹی کر کے 422 پاکستانیوں کا جرمانہ ادا کر کے پاکستان واپس بھیجا اور وہ جرمانہ پاکستانی روپے کے حساب سے 37 لاکھ روپے بنتے تھے..... اور اس بات کو وہاں کے میڈیا نے بھی بہت ہائی لائیٹ کیا اور اس وجہ سے مجھے ایشین گولڈ میڈل ملا اور یوں پہلا پاکستانی تھا کہ جس کو یہ میڈل ..... ورنہ مجھ سے پہلے پاکستانی کمیونٹی 18 '19 گروپ میں کام کر رہی تھی اور میرے اس کام میں "کرنل ر (ریٹائرڈ) صاحب نے میری بہت مدد کی۔"

☆ "422 کو آپ نے ریلیز کروایا۔ باقیوں کا قصور تھا؟"

* "باقیوں کی سزا اس لیے معاف ہو گئی کہ مجھے گ میڈل ملا تھا تو یہ ایک بہت بڑی اچیومنٹ تھی میر لیے۔ تو بات ہو رہی تھی ایف ایم کی تو ایف ایم کا چ تو پڑ ہی چکا تھا تو ایف ایم۔ 95 میں نے 2008ء جوائن کیا۔"

☆ "ارے اتنی دیر میں..... اس دوران کیا کیا؟"

* "جب پاکستان آیا تو پھر میں پی ٹی وی سے منسلک گیا اور پی ٹی وی سے میں نے کرنٹ افیرز کے پروگر کیے..... لاہور سینٹر سے اور تقریباً" آٹھ نو سال م نے پروگرام کیے..... پنجابی میں بھی اور اردو میں بھ ..... 2008ء میں ایف ایم۔ 95 بنا جو کہ گورنمنٹ آف پنجاب نے بنایا تھا اور پنجابی کا چینل تھا۔ ایف ا۔ 95 کو جوائن کیے ابھی دو ہی مہینے ہوئے تھے کہ مج "پی ایم" (پروگرام منیجر) کے عہدے پر ترقی دے د گئی۔"

☆ "پہلا پروگرام کیا تھا اور دن میں کتنے پروگرا کرتے تھے؟"

* "پہلا پروگرام "سلام سحر" تھا جو کہ اردو کا تھا اور یہ گیا کہ پہلے آپ قومی زبان سے شروع کریں پھر ا کے بعد دوسری زبانوں کو ٹائم دیں۔ تو صبح کے وقت میں اردو کا پروگرام کرتا تھا۔ شام کو پنجابی میں اور را کو سرائیکی زبان میں پروگرام کرتا تھا میرے تی پروگرام روزانہ ہوتے تھے اور آج کل میں صرف پنج زبان میں پروگرام کر رہا ہوں کیونکہ اب یہاں بھ سرائیکی صوبے کی وجہ سے لینگوئج پرابلمز چل رہ ہیں اور اب سرائیکی اور اردو پروگرام بند کر دیے۔

بقیہ: صفحہ 265 پر

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گری

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی' جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے.... زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ' سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت ہے.... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم' ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب کو قبول کر لیتا ہے' اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے زخمی کر دیتا ہے۔

۱۹
انیسویں قسط

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے اس بات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی کہ گھر کتنا شاندار ہے یا وہ کتنی حسین لگ رہی ہے خود اپنا آپ اس نے آئینے میں بغور نہیں دیکھا تھا پارلر سے ایک بیوٹیشن نے آکر اسے تیار کر دیا تھا وہ تو محض اس کی ہدایت پر بغیر کسی تاثر کے آنکھیں کھول بند کرتی رہی تھی۔

اب بھی سب کے تبصرے اور خود پر رشک بھرے جملے اس کی سماعتوں تک پہنچ ضرور رہے تھے مگر اس کے ذہن تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہے تھے ذہن میں تو اس کے اپنے ہی کہے جملے کی بازگشت ہو رہی تھی۔

"دو دن بعد جس منگنی کا تم خواب دیکھ رہے ہو وہ بھی محض خواب ہی رہے گا۔"

اپنی ہی کہی بات اسے کسی تیز دھاری تلوار کی طرح لگ رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا الٹے قدموں لوٹ جائے لیکن اپنے گھر نہیں کسی ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو نہ خرم نہ عظمت خلیل اور نہ ہی کوئی اور۔

مگر وہ دل میں اٹھتی خواہش کو دل میں دبائے رومیلہ اور سنبل کے سنگ چلتی ایک اسٹیج پر رکھے صوفے پر بیٹھی۔

اسے پتا ہی نہیں تھا اس کے گرد کتنے لوگ جمع تھے کون اسے سراہ رہا تھا کون اسے مبارک باد دے رہا تھا البتہ ایک آواز اس کے کانوں میں اس طرح اتری تھی کہ اس کا منتشر ذہن ایک دم یکجا ہو کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔

بلیک تھری پیس میں چہرے پر بھرپور مسکراہٹ لیے وہ اس کے عین سامنے کھڑا تھا انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے نمل کو سلام کیا تھا مگر نمل کا جواب دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وہ عجیب سی نظروں سے اس کے پرسکون چہرے کو دیکھنے لگی جو گھر کی سجاوٹ کے لیے لگائی گئی بے تحاشہ لائیٹوں سے بھی زیادہ روشن تھا۔

آنکھوں میں فتح کا نشہ لیے وہ عین اس کے برابر میں بیٹھ گیا تو نمل فوراً "تھوڑا سا کنارے سرک گئی۔

اس کی اس حرکت پر خرم نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا تو نمل سر تا پا سلگ گئی۔

"تم تو کہہ رہی تھیں منگنی کا یہ خواب محض خواب ہی رہے گا پھر یہ حقیقت کیسے بن گیا۔" خرم نے اس کی طرف جھکتے ہوئے ایسے کہا کہ اردگرد کھڑے لوگوں کو لگے جیسے وہ اس کی تعریف کر رہا ہو۔

نمل اس کے دیے طعنے پر دل ہی دل میں بلبلا اٹھی تھی کتنے اعتماد سے اس نے یہ بات کہی تھی مگر قسمت انسانی دعووں سے نہیں چلتی۔

اس کا کہا ہر لفظ بے معنی ہو گیا تھا وہ سر جھکائے گود میں رکھے اپنے پرس کو دیکھنے لگی۔

"خرم ایسی بھی کیا تعریف کر رہے ہو کہ بھابھی کا سر اتنا جھک گیا ہے ذرا زور سے کرو ہم بھی سن لیں۔" ہارون کے منہ سے اپنے لیے بھابھی کا لفظ اسے تڑپا گیا تھا مگر ضبط کے علاوہ اور چارہ ہی کیا تھا بلکہ ہارون کے بعد وکی کی آواز پر اسے احساس ہوا کہ خرم کے صرف دوست ہی نہیں یونیورسٹی کے بہت سارے اسٹوڈنٹس نا صرف آئے ہیں بلکہ اسٹیج کے قریب ہی موجود ہیں۔

"ہاں خرم یہ بات تو ہے تھوڑا ہمیں بھی سکھا دو کل کو ہمارا بھی ٹائم آئے گا ہمیں بھی تو پتا چلے کہ تھپڑ سے انگوٹھی تک کا سفر کیسے طے ہوتا ہے۔" وکی کی بات پر زوردار قہقہہ پڑا تھا جس میں خرم بھی شامل تھا۔

وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوا تھا بھرے مجمع میں وکی کے مارے طعنے پر جبکہ نمل جز بز ہو کر رہ گئی تھی۔

سنبل اور رومیلہ بھی اسے بٹھا کر جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں اسے ان دونوں پر غصہ آنے لگا اصل میں اس نے دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ خرم کے کلاس فیلوز اسٹیج پر ایسی بدتمیزی سے چڑھے تھے کہ رومیلہ اور سنبل ان سے ٹکرانے سے بچنے کے چکر میں سیڑھیاں اترتی چلی گئیں۔

جس طرح سیاست میں کرسی کوئی نہیں چھوڑتا اسی طرح دولہا دلہن کے اسٹیج پر چڑھنے کے بعد وہ جگہ بھی کوئی

نہیں چھوڑتا للذا وہ سب پورے اسٹیج پر قابض ہو گئے تھے اور رومیلہ اور سنبل نیچے کھڑی بے بسی سے اس رش کو دیکھ رہی تھیں جس میں گھسنا "آبیل مجھے مار" کے مترادف تھا۔

"کیوں کیا تمہارا ابھی کسی سے تھپڑ کھانے کا ارادہ ہے جو پہلے سے طریقے پوچھ رہے ہو۔" ان کی کلاس کی ایک لڑکی نے بڑے شوخ سے انداز میں کہا تو ایک بار پھر سب ہنس پڑے۔

"ارے تم بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ چار دن پہلے تھپڑ پڑا اور چار دن بعد منگنی ہونے لگے۔" ایک لڑکے نے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے کان صاف کرتے ہوئے ایسے کہا جیسے ان لوگوں کی سوچ پر ماتم کر رہا ہو۔

"کیا مطلب؟" کئی لوگ یک زبان ہو کر بولے۔

"مطلب یہ کہ یہ سارا ڈرامہ تھا یونیورسٹی میں مشہور ہونے کے لیے۔" نمل کا دم گھٹنے لگا تھا ان سب کی گفتگو سے۔

آخر اس کے خاندان والے بھی آئے ہوئے تھے کسی کے بھی کان میں کوئی بات پڑ سکتی تھی ایسے میں بھلا اس کی کیا عزت رہ جانی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا یا تو ان لوگوں کو خاموش کرا دے یا یہاں سے اٹھ کر چلی جائے مگر فی الحال دونوں ہی باتیں ناممکن تھیں۔

"اتنا غصہ مت کرو چہرہ بالکل لال ہو گیا ہے کل کو جو بھی ہماری منگنی کی تصویریں دیکھے گا اسے لگے گا آگ کا گولا بیٹھا ہے لڑکی کے بجائے۔" خرم نے سرگوشیانہ لہجے میں شرارت سے کہا۔

اس کی یہ فقرے بازی نمل کی برداشت سے باہر تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ خرم کا منہ نوچ لے جو سب کو گفتگو میں مصروف دیکھ کر چپکے چپکے اس پر طنز کے تیر برسائے جا رہا تھا۔

"کبھی کبھی انسان خود کو کتنا بے بس محسوس کرتا ہے نا۔ دل چاہ رہا ہوتا ہے سامنے بیٹھے شخص کا خون کر دو مگر رسم و رواج اور قاعدے قانون ہمارے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔

"پتا ہے بعض لوگ جب یہ زنجیر نہیں توڑ پاتے تو اپنا پاؤں ہی کاٹ لیتے ہیں۔" خرم کا شوخ لہجہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

نمل بے اختیار پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی جو بالکل سپاٹ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ایسا صرف بے بسی کے انتہائی مقام پر پہنچنے کے بعد ہوتا ہے جب کوئی ایسا رشتہ جسے برداشت کرنے کی سکت نہ ہو اور توڑنے کی اوقات نہ ہو استوار ہو جائے تو انسان اپنی بے بسی کا تماشا دیکھنے کی بجائے خود کو ختم کرنے کے طریقے سوچنے لگتا ہے۔" جتنا خرم کا لہجہ سخت تھا اس سے بھی کئی زیادہ نمل کی اپنے پرس پر گرفت سخت ہو گئی تھی۔

وہ تو خدا کا شکر تھا کہ اسی وقت خرم کی والدہ مسز فرقان کے اسٹیج پر آ جانے سے نا صرف خرم کے دوستوں اور کلاس فیلوز کا جمگھٹا نیچے اتر گیا بلکہ خرم کے طنز و طعنہ کو بھی بریک لگ گئے۔

☼ ☼ ☼

رومیلہ کی شادی کے ہنگامے شروع ہوئے تو نمل نے ہر احساس کو پس پشت ڈال دیا ویسے بھی خرم سے منگنی ہو جانے کے بعد اب یونیورسٹی میں لوگوں کے لیے کرنے کو زیادہ باتیں نہیں بچی تھیں۔

جب تک آگ نظر نہیں آتی لوگ دھوئیں کو دیکھ کر متجسس ہوتے ہیں ایک بار چنگاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھ

لو اس کے بعد بجھی راکھ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

سب کے خاموش ہو جانے کی وجہ سے نمل بھی کسی حد تک اعتدال پر آگئی تھی البتہ خرم سے سامنا ہونے پر اس کا دبا غصہ ابھرنے لگتا کیونکہ خرم اسے دیکھتے ہی دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجا لیتا۔

اس کے پاس سے گزرتے وقت کوئی نہ کوئی فقرہ اس کی طرف اچھال دیتا خاص طور پر اسے نمل کی بجائے مسز خرم کہہ کر تپا کر رکھ دیتا۔

مگر ان مواقع پر نمل ہمیشہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتی وہ یونیورسٹی میں مزید کوئی تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔

لوگوں نے ان دونوں کے بارے میں بات کرنی کم کر دی تھی ایسے میں وہ کوئی حرکت کر کے سرد پڑتی آگ کو ہوا نہیں دینا چاہتی تھی۔

پھر رومیلہ کی شادی نے بھی اس کی ذہنی توجہ وقتی طور پر ان باتوں سے ہٹا دی وہ اور سنبل ہر فنکشن کے لیے بڑے اہتمام سے کپڑے بنا رہی تھیں بلکہ زیادہ تر تو انہوں نے ریڈی میڈ کپڑے ہی لے لیے تھے کہ کپڑے سلوانے کا وقت نہیں تھا۔

وہ دونوں بازار جاتیں تو رومیلہ کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیتیں وہ بڑبڑاتی رہ جاتی۔

"اتنا خوار کرتے ہو تم دونوں بازار میں۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری دوکان کھنگالتے ہوئے تم دونوں کو تو فرق نہیں پڑتا مگر میری تو اسکن اور صحت دونوں خراب ہو رہی ہیں۔"

"او ہو۔" نمل اور سنبل بڑے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھتیں۔

"دلہن صاحبہ کو اپنی اسکن کی فکر ستا رہی ہے۔" سنبل رومیلہ کو کندھا مارتے ہوئے چھیڑتی مگر رومیلہ شرمائے بغیر ڈھٹائی سے کہتی۔

"ظاہری بات ہے مجھے فکر نہیں ستائے گی تو اور کسے ستائے گی دلہن بن کر چہرہ مرجھایا ہوا ہو تو کیا فائدہ اتنے مہنگے کپڑوں اور زیور کا۔"

"تمہارا دولہا اتنا گڈ لکنگ ہے کہ اسے دیکھتے ہی تمہارا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھے گا۔" نمل شرارت سے گویا ہوئی۔

"ہائے کاش میں نے بھی گلفام بھائی کو دیکھا ہوتا۔" سنبل حسرت سے کہتی پھر نمل پر بگڑنے لگتی۔

"تم ان کی ایک تصویر تک نہیں لا سکتی تھیں۔"

"ہاں یار یہ پچھتاوا تو مجھے بھی ہے۔" نمل دل مسوس کر رہ جاتی ایسے میں رومیلہ کو ہی تسلی دینی پڑتی۔

"چلو کوئی بات نہیں اب مہندی میں دن ہی کتنے ہیں انہیں روبرو ہی دیکھ لینا۔"

اور پھر واقعی وہ دن آ ہی گیا جب گلفام پوری آن بان کے ساتھ رومیلہ کے گھر کے دروازے پر آن پہنچا۔

وہ اپنے زیادہ رشتے دار نہیں لائے تھے مشکل سے پچیس تیس لوگ ہوں گے مگر وہ پچیس تیس لوگ بھی بڑی دھوم سے آئے تھے۔

نمل اور سنبل رومیلہ کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر گلفام اور لڑکے والوں کو ریسیو کرنے گیٹ پر پہنچ گئی تھیں۔

"ان میں گلفام بھائی کون سے ہیں؟" سنبل نے چار پانچ لڑکوں کو ایک ساتھ گیٹ سے داخل ہوتا دیکھ کر نمل کے کان میں پوچھا۔

ابرار بھائی ان سب سے ہی باری باری گلے مل رہے تھے وہ سب کم و بیش ایک سے ہی شلوار قمیص پہنے تھے دور سے سب ایک سے ہی لگ رہے تھے۔

"ان میں سے تو کوئی بھی نہیں لگ رہا۔" نمل انہیں بغور دیکھتے ہوئے الجھن کا شکار ہونے لگی۔

"وہ شاید پیچھے ہوں گے۔" سنبل نے رائے دینے والے انداز میں کہا۔

مگر پیچھے تو کوئی تھا ہی نہیں وہ چار خواتین اندر داخل ہوئیں جو اپنے بچوں کو سنبھالنے میں لگی تھیں اسی لیے سست روی سے چل رہی تھیں۔

"کیا گلفام بھائی نہیں آئے۔" سنبل نے ہاتھ میں پکڑی تھال کی آخری پتیاں نچھاور کرنے کے بعد حیرانی سے پوچھا۔

"آئے تو ضرور ہوں گے شاید میں دیکھ نہیں سکی۔" نمل نے مہمانوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہی تھا کہ لان کے وسط میں رکھی کرسی پر ان ہی چار پانچ لڑکوں میں سے ایک آکر بیٹھ گیا۔

"یہ کرسی خاص دولہا کے لیے رکھی گئی تھی اور ابرار بھائی نے اسے خاص طور پر وہاں لا کر بٹھایا تھا۔

"یہ ہوں گے نا گلفام بھائی۔ تم نے انہیں پینٹ شرٹ میں دیکھا تھا نا اس لیے شلوار قمیص میں پہچان نہیں سکی ہو گی۔" سنبل نے کہنے کے ساتھ ہی دولہا کی طرف قدم بڑھا دیے۔

وہ قریب جا کر اس کا بغور جائزہ لینا چاہتی تھی۔ چاہتی تو نمل بھی یہی تھی مگر اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔

وہ اتنی دور نہیں تھا کہ اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہ آتا اور نہ ہی نمل کی نظر اتنی کمزور تھی کہ وہ خود سے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر بیٹھے شخص کا چہرہ نہ پہچان سکے۔

پھر بھی نمل خود کو یہی تسلی دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگی کہ اس نے شلوار قمیص پہن رکھا ہے اور بال کچھ لمبے کر لیے ہیں اس لیے اس دن سے ذرا مختلف لگ رہا ہے۔

مگر آخر کب تک اس سے پانچ فٹ کی دوری پر پہنچ کر نمل کے پاس خود کو بہلانے کے لیے کوئی بہانہ نہیں بچا تھا۔

اس کے صرف بال اور کپڑے اس کینیڈا والے گلفام سے مختلف نہیں تھے بلکہ اس کی شکل ہی یکسر مختلف تھی۔

نہ وہ قد کاٹھ تھا' نہ وہ رنگ اور آنکھیں تھیں
نہ وہ لہجہ اور انداز تھا
اور نہ ہی یہ وہ بندہ تھا

نمل بالکل سن ہو گئی تھی وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اگر یہ گلفام تھا تو وہ کون تھا جس سے وہ مل کر آئی تھی اور اگر وہ گلفام تھا تو یہ کون ہے۔ جس سے رومیلہ کی تین دن بعد شادی ہونے والی تھی اور جس کے ساتھ آج رومیلہ کی مشترکہ مہندی تھی۔

نمل بالکل بت بنی کھڑی تھی سنبل بھی قریب سے اس کا جائزہ لینے کے بعد نمل کے پاس ہی آکھڑی ہوئی۔

"میرے ذہن میں گلفام بھائی کا نقشہ بالکل مختلف تھا میں نے کچھ اور ہی خاکہ بنا لیا تھا۔" سنبل کا انداز تھوڑا بجھا ہوا سا تھا۔

وہ اپنی دوست کے ہونے والے شوہر کے لیے کھل کر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ گلفام سے مل کر مایوس ہوئی تھی جو اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"تم نے بتانے میں ذرا مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔" سنبل نے اپنے انداز میں تھوڑی شوخی بھرنے کی کوشش

کی۔

"یہ وہ گلفام نہیں ہے، جس سے میں ملی تھی۔" نمل خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"کیا مطلب؟" سنبل چونکی پھر ایک نظر گلفام کو بے یقینی سے دیکھتی نمل کو دیکھ کر دولہا کی جگہ پر گلفام کو دیکھنے لگی۔

"میں جس گلفام سے کینیڈا میں ملی تھی وہ یہ نہیں تھا۔" نمل اب بھی بڑبڑانے والے انداز میں بول تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو نمل ہوش میں تو ہو۔" سنبل جھنجلائی تو نمل ایسے چونکی جیسے واقعی بے ہوشی ہوش میں آئی ہو۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں یہ کوئی اور ہے یہ وہ نہیں ہے اور اگر یہ گلفام ہے تو وہ کوئی اور تھا جو مجھے کینیڈا میں تھا۔

اب ان دونوں میں سے اصلی گلفام کون ہے یہ بحث یہاں بالکل بے کار ہے سوال یہ ہے کہ مجھ سے یہ جھوٹ کیوں بولا گیا۔

ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ جس لڑکے سے وہ رومیلہ کی شادی کرنے جا رہے ہیں وہ جعفر بھائی کے سامنے لڑکے کو لائے ہی نہیں۔

جبکہ جس لڑکے کو وہ سامنے لائے تھے اس سے رومیلہ کی شادی ہو ہی نہیں رہی۔

یہ دھوکا انہوں نے صرف لڑکے کی شکل چھپانے کے لیے تو نہیں کیا ہوگا ضرور اس کے پیچھے اور بھی اسباب ہوں گے۔ جو شخص یہاں دولہا کی جگہ بیٹھا ہے اگر جعفر بھائی اس سے کینیڈا میں ملتے تو ممکن تھا وہ اس رشتے سے انکار کر دیتے۔

اسی لیے ان لوگوں نے ایک ایسے شخص کو سامنے کر دیا جس کے لیے جعفر بھائی منع کر ہی نہ سکیں۔

پتا نہیں رومیلہ کن فراڈ لوگوں میں پھنسنے جا رہی ہے مجھے ابھی اور اسی وقت پھوپھا (رومیلہ کے والد) سے بات کرنی چاہیے۔" نمل حیرت و فکر کے ملے جلے انداز میں کہتی چلی گئی۔

سنبل پریشان نظروں سے کبھی اسے اور کبھی دولہا کی جگہ براجمان شخص کو دیکھ رہی تھی نمل کو مڑ کر دوسری طرف جاتا دیکھ کر سنبل نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک۔۔۔ ایک منٹ نمل۔ اتنی جلد بازی صحیح نہیں۔ تمہارے امی ابو ابھی آنے والے ہوں گے۔ ایک بار امی آنٹی سے مشورہ کر لیتے ہیں۔"

"امی کیا مشورہ دیں گی سنبل۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہمیں جلد از جلد رومیلہ کے گھر والوں کو بتانا ہے دو دن بعد شادی ہے ہمارے پاس وقت کہاں ہے؟" نمل سنبل کی بات پر شدید حیرت کے ساتھ بولی۔

"یہی تو میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ دو دن بعد شادی ہے پرسوں بارات آنے والی ہے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اس وقت رومیلہ کے گھر والوں کو کچھ بھی بتانا صرف اور صرف انہیں پریشان کرنا ہے۔" سنبل ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی تو نمل نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے انہیں پریشان نہ ہونا پڑے اس ڈر سے کیا ہم رومیلہ کو ایک ایسے شخص کے ساتھ باندھ دیں جو زندگی کی ابتدا ہی جھوٹ اور دھوکے سے کر رہا ہو۔

پتا نہیں ان لوگوں نے کیا کچھ چھپایا ہوگا جب وہ اتنی بڑی چال چل سکتے ہیں تو کیا بھروسہ کہ وہ کتنے خطرناک اور فریبی لوگ ہوں آگے جا کر نہ جانے ان کے کردار وغیرہ کے بارے میں اور کیا کیا باتیں سامنے آئیں۔

ہم جانتے بوجھتے رومیلہ کی شادی ایسی جگہ پر کیسے ہونے دیں سکتے ہیں۔" نمل تپے ہوئے انداز میں کہتی تیزی سے پلٹ گئی۔

سنبل بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی اسے نمل کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا مگر اب جبکہ سب کو رومیلہ کی متوقع شادی کا علم تھا مہندی کا فنکشن شروع ہو رہا تھا سارے مہمان اکٹھا ہو چکے تھے ایسے میں نمل کے منہ سے نکلا ایک جملہ اس پورے ماحول کی رعنائیوں کو سوگواری میں بدل دے گا۔

اور پھر اس کے بعد کیا ہوگا کہ رومیلہ کے بابا اور ابرار بھائی اس جھوٹ کے کھلنے پر اس رشتے کو ختم کر دیں گے یا سب کچھ جانتے بوجھتے رومیلہ کا ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دے دیں گے جسے وہ جانتے تک نہیں۔

سنبل کچھ دیر وہیں کھڑی ہولتی رہی پھر بے اختیار اس کے قدم بھی نمل کے پیچھے اٹھنے لگے۔

نمل اس قدر آندھی طوفان کی طرح رومیلہ کے بابا جانی کے پاس پہنچی تھی کہ سنبل کے پہنچنے تک وہ انہیں لان میں مرزا صاحب کے پاس سے ہٹا کر گھر کے اندر ایک کمرے میں لے کر بڑھ رہی تھی۔

سنبل بھی ان کے ساتھ ہی اس کمرے میں داخل ہو گئی جسے اس نے نمل کے اشارہ کرنے پر فوراً ہی دروازہ بند کر کے لاک کر لیا۔

"کیا بات ہے نمل سب خیریت تو ہے نا۔" بابا جانی کے چہرے سے پریشانی صاف چھلک رہی تھی نمل کا انداز انہیں ہولا گیا تھا۔

نمل نے ایک گہرا سانس کھینچ کر اپنی ہمتیں مجتمع کیں اور پوری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

وہ فق ہوتے چہرے کے ساتھ نمل کو سنتے رہے اور پھر بالکل گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئے سنبل بھاگ کر ان کے لیے پانی لے آئی اس کے اصرار پر وہ صرف ایک گھونٹ پی کر رہ گئے۔

"پھوپھا میں جانتی ہوں یہ بہت کٹھن وقت ہے لیکن ہم رومیلہ کو ایسے آنکھیں بند کر کے تو کسی کو نہیں سونپ سکتے نا۔" نمل کا لہجہ ہی نہیں آواز تک فکر و پریشانی سے بوجھل ہو گئی تھی۔

"ہماری آنکھیں کھلی کب تھیں ہم تو کب سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں ابرار نے جو فیصلہ کر لیا اس کی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔" بابا جانی کا لہجہ بالکل رو دینے والا تھا نمل اور سنبل ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

کچھ دیر تک بابا جانی ایسے ہی نڈھال سے بیٹھے رہے آخر نمل کے ہی ہمت دلانے پر انہوں نے ابرار بھائی کو بلا کر ان سے بات کی۔

پہلے تو وہ بھی ششدر رہ گئے مگر جب اس صدمے سے باہر آنا شروع ہوئے تو وہ بابا جانی کی طرح شکست خوردہ انداز میں بیٹھ جانے کی بجائے غصے سے ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

"مرزا صاحب نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں، وہ ہمیں اتنی آسانی سے چِٹ کر جائیں گے اور ہمیں پتا ہی نہیں چلے گا۔"

"تو کہاں پتا چلا تھا تمہیں، وہ تو نمل نے اتنی دور جا کر اسے دیکھنے اور ملنے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو تمہیں کیا پتا چلتا کہ جعفر جس شخص سے کینیڈا میں ملا تھا وہ یہ نہیں کوئی اور تھا بلکہ وہ شادی کر کے رومیلہ کو اپنے ساتھ کہیں بھی لے جاتا اور روپوش ہو جاتا تو بھی تم نہ جان پاتے کہ یہ گلفام وہ گلفام نہیں ہے جو جعفر سے ملا تھا یا جسے جعفر نے پاس کیا تھا۔" بابا جانی، ابرار بھائی کو بے تحاشا غصے میں دیکھ کر تلخ ہو گئے تھے۔

جبکہ ابرار بھائی صرف بابا جانی کو دیکھ کر رہ گئے انہیں بابا جانی کا نمل کے سامنے اس طرح کہنا سخت ناگوار گزرا تھا۔

آخر نمل کے اس طرح کینیڈا چلے جانے پر سب سے زیادہ زہر انہوں نے ہی اگلا تھا پھر بھلا اس وقت وہ کے سامنے یہ کیسے قبول کر لیتے کہ اس کا گلفام سے جا کر ملنا بے سود نہیں تھا بلکہ اتنا اہم فیصلہ کرتے وقت یہ نمل کی بجائے انہیں اٹھانا چاہیے تھا۔

انہیں نمل کے سامنے سخت سبکی محسوس ہوئی تھی وہ تلملا کر رہ گئے تھے اسی لیے جھنجلا کر بولے۔

"ایسا کیسے روپوش ہو جاتا وہ رومیلہ کو لے کر' میری بہن کوئی اتنی فالتو نہیں ہے کہ وہ کچھ بھی کر لے اور دیکھتے رہیں ابھی بلا کر بات کرتا ہوں میں مرزا صاحب اور ان کے صاحبزادے کو۔" ابرار بھائی بھناتے ہو کمرے میں نکل گئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ انہیں لیے کمرے میں داخل ہوئے اور ان سے باز پرس شروع کی تو پہلے تو وہ دونوں ہی طرح گھبرا گئے اور کسی نہ کسی طرح بات بنانے کی کوشش کرنے لگے لیکن جب ابرار بھائی تمیز بالائے طاق رکھ گالی گلوچ پر اتر آئے تو گلفام نے بھی شرافت کا چولہ اتارنے میں دیر نہیں کی۔

"ہاں میں وہ گلفام نہیں ہوں جس سے آپ کا دوست کینیڈا میں ملا تھا وہ میرا دوست ہے فہیم۔

وہ وہاں فیم کے نام سے جانا جاتا ہے میں بھی کینیڈا میں رہتا ہوں میرا وہاں اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس جس میں کبھی فائدہ ہوتا ہے تو کبھی نقصان بھی ہو جاتا ہے۔

آپ اتنے پیسے والے لوگ ہیں میں نے سوچا میرا بزنس آپ لوگوں کو متاثر نہیں کر سکے گا اس لیے میں نے بجائے فہیم کو آپ کے دوست سے ملنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ بھی فوراً" تیار ہو گیا۔ اس نے میرے لیے اپنی میں اپلائی کر رکھا ہے اگر میری جاب وہاں ہو گئی تو میرا بھی وہی اسٹینڈرڈ ہو گا جو فہیم کا ہے۔

میں نے سوچا جس چیز کی وجہ سے آپ مجھے ریجیکٹ کرنے والے ہیں وہ پوائنٹ کچھ مہینوں میں ختم ہو ہی والا ہے پھر بھلا ....." ابرار بھائی نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اسے گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔

اس کا انداز تھا ہی طیش دلانے والا۔

لاپرواہی پر مشتمل بے نیاز سا لہجہ۔

جیسے جو کچھ بھی اس نے کیا بالکل جائز اور مناسب ہو۔

کوئی شرمندگی کوئی پشیمانی اس کے رویے سے ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔

جس طرح وہ اپنے بزنس کا ذکر کر رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی قابل ذکر کام تھا ہی نہیں بلکہ ہو سکا وہ کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث ہو تبھی وہ اسے بیان نہیں کر رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا اپنا بھانڈا پھوٹ جانے پر وہ وقتی طور پر ہراساں ہو کر واپس اپنے ازلی ڈھٹائی پر مبنی اعتماد میں تھا۔

یعنی اسے یقین تھا ایک نہ ایک دن یہ سب ہونا ہی تھا لہٰذا اگر ابھی ہو گیا تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔

فہیم کے آفس میں اپنی جس متوقع جاب کا وہ ذکر کر رہا تھا اس کے ملنے کا خود اسے بھی یقین نہیں تھا ورنہ اس کا بزنس کوئی خاص نہیں تھا تو اس جاب کے مل جانے کے بعد مرزا صاحب کو رومیلہ کے لیے رشتہ دینا چاہیے تھا۔

لیکن ان کی یہ دھوکے بازی ان کے گھٹیا کردار کو اچھی طرح آشکار کرنے کے ساتھ مستقبل کے ان کے ارادوں کی بھی بخوبی نشاندہی کر رہی تھی۔

ابرار بھائی کے بزنس اور حیثیت سے مرزا صاحب اچھی طرح واقف تھے رومیلہ سے اپنے بیٹے کی شادی کرنے کی صورت میں انہیں ایک اچھے خاندان کی خوب صورت پڑھی لکھی لڑکی ملنے کے ساتھ ساتھ ا

معاشی طور پر مستحکم سہارا بھی مل جاتا۔

ایک بار شادی ہو جانے کے بعد گلفام کے بارے میں کچھ بھی پتا چلتا وہ کون سا ان کا کچھ بگاڑ سکتے تھے بلکہ بہن کا گھر بسائے رکھنے کے لیے وہ چار و ناچار مالی طور پر اس کی مدد کرنے پر بھی مجبور رہتے۔

لیکن ابرار بھائی کی فطرت سے واقف نہیں تھے ان کے لیے بہن کی زندگی اور بہن کا گھر ثانوی چیز تھی اور اپنی حیثیت اور اپنا غرور اولین ترجیح تھی۔

شادی ہو جانے کے باوجود بھی وہ گلفام کی دھوکا بازی اور منصوبہ بندی کو کامیاب نہ ہونے دیتے۔

وہ اس کی معاشی طور پر مدد کرنا تو در کنار رومیلہ کو بھی اپنے گھر لا کر بٹھا لیتے اور اگر رومیلہ اس کے لیے تیار نہ ہوتی تو اس سے بھی قطع تعلق کر لیتے۔

پھر ابھی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا ابھی تو شادی سے پہلے ہی اس کی اصلیت سامنے آ گئی تھی چنانچہ انہوں نے بدنامی اور مہمانوں سے بھرے گھر کی فکر و لحاظ کے بغیر انہیں اسی وقت چپ چاپ واپس جانے کا حکم صادر کر دیا۔

"دل تو چاہ رہا ہے میں تمہارے خلاف قانونی کارروائی کروں مگر تم میری رشتے داری تو کیا' میری دشمنی کے بھی قابل نہیں ہو۔" ابرار بھائی نے زہر خند لہجے میں کہا۔

نمل اور سنبل اس صورت حال پر پریشان تو تھے مگر بابا جانی کی تو حالت غیر ہو رہی تھی شادی سے دو دن پہلے اس طرح رشتہ ٹوٹنے پر ان کی بیٹی کی کیا عزت رہ جائے گی سماج میں۔ وہ صدمے کے مارے کچھ کہنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

جبکہ ان کے خدشات کو گلفام نے بڑی تلخی سے زبان دیتے ہوئے کہا۔

"بچکانہ باتیں مت کریں ابرار بھائی۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ میرے خلاف اگر کوئی قانونی کارروائی کر بھی لیں تو عدالت میں کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے الٹا آپ کی بہن کی ہی بدنامی ہو گی۔

میری مانیں تو غصہ تھوک دیں اور رومیلہ کو چپ چاپ میرے ساتھ رخصت کر دیں اس طرح شادی سے دو دن پہلے اگر بارات لوٹ گئی تو وہ ساری زندگی آپ کی دہلیز پر بیٹھی رہے گی۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو۔" ابرار بھائی نے بری طرح طیش میں آتے ہوئے اسے دو چار گالیاں دیتے ہوئے کہا ہی نہیں انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

مرزا صاحب کے علاوہ کمرے میں موجود باقی تینوں نفوس ایک متوقع ہاتھاپائی پر دل تھامنے پر مجبور ہو گئے۔

"ہوش سے کام لیں ابرار بھائی۔" گلفام نے ان کے غصے سے متاثر ہوئے بغیر بڑے سکون سے اپنا کالر ان کی گرفت سے چھڑا لیا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں اگر میں بارات لے کر پرسوں نہیں آیا تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن رومیلہ کی زندگی برباد ہو جائے گی۔

کیا سوچیں گے لوگ اس کے بارے میں' جانے کیسا کردار تھا اس کا جو شادی سے دو دن پہلے اس کا رشتہ ختم ہو گیا ایسا معاملوں میں ملبہ صرف عورت پر گرتا ہے مرد پر تو حرف بھی نہیں آتا۔"

"بند کرو اپنی بکواس میں لوگوں کی باتیں بنانے کے ڈر سے تمہارے جیسے گرے ہوئے شخص کے ہاتھ میں اپنی بہن کا ہاتھ کبھی نہیں دوں گا۔

مجھے معاشرے اور سماج کی اونچ نیچ کے دائروں میں گھما کر تم اپنا مطلب نہیں نکال سکتے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں تم یہ سب رومیلہ کی فکر میں نہیں کہہ رہے بلکہ مجھے انڈر پریشر لانا چاہتے ہو مگر

تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے میں اس کے لیے تمہارے جیسے دس گلفام خرید سکتا ہوں۔" ابرار بھائی طور ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔
وہ اپنے سارے حربے بے کار جاتے دیکھ کر کچھ بے زار سا ہو گیا تھا تبھی کر بولا۔
"میرے جیسے ہی خریدنے ہیں تو مجھ سے ہی بیاہ دیں کیا ضرورت ہے اپنی عزت اور بہن کا تماشا بنانے کی۔
یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ جس لڑکی کی بارات دو دن پہلے واپس پلٹ جائے اس کے لیے کسی اچھے خاندان اچھے لڑکے کے والدین دست طلب نہیں پھیلاتے۔
اب آپ کو آپ کی حیثیت اور شان و شوکت کے مطابق کوئی رشتہ تو ملے گا ہی نہیں، کسی فٹ پاتھ پر بیٹھے روزگار نوجوان کو جہیز کا لالچ دے کر رومیلہ سے شادی پر رضامند کرنے سے تو بہتر ہے کہ آپ اسے اسی تار میرے ساتھ رخصت کر دیں جس تاریخ کے کارڈ آپ پورے شہر میں بانٹ چکے ہیں۔" ابرار بھائی کی برداش جواب دے گئی اور انہوں نے گلفام کے منہ پر مکوں کی بارش کر دی۔
گلفام نے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کی مگر جب کامیاب نہیں ہو سکا تو مرزا صاحب اس کی ڈھال بن گئے۔
"چھوڑ دو اسے ابرار۔ ہم، ہم جا رہے ہیں ابھی اور اسی وقت جا رہے ہیں۔" مرزا صاحب لجاجت سے بو۔
ابرار بھائی بھی رک گئے ویسے بھی وہ بری طرح ہانپنے لگے تھے اس پر ہاتھ اٹھا کر۔
"اگر اپنے بیٹے کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے فوراً یہاں سے لے جائیں۔ ابھی اور اسی وقت۔" ابرار نے غرا کر کہا۔
مرزا صاحب اس کی مدد کو آگے بڑھے تو گلفام نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا اور خود اٹھ کر دروازے کی طرف بڑ لگا ابھی اس نے دروازے کے ہینڈل کو اپنی گرفت میں لیا ہی تھا کہ ابرار بھائی ایک ایک لفظ چبا کر کہنے لگے۔
"اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ تمہارے بارات نہ لانے سے میری بہن اسی چوکھٹ پر بیٹھی رہ جائے گی۔
تم دیکھ لینا دو دن بعد اسی تاریخ کو رومیلہ کی شادی ہو گی جس تاریخ کے کارڈ میں پورے شہر میں بانٹ چکا اور وہ بھی کسی فٹ پاتھ پر بیٹھے بے روزگار جہیز کے لالچی سے نہیں بلکہ بہت اچھے خاندان کے بہت پڑھے کامیاب لڑکے سے جس کے ساتھ شادی کسی بھی لڑکی کے لیے باعث فخر ہو۔" ابرار بھائی کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔
گلفام اور مرزا صاحب تو کیا بابا جانی، نمل اور سنبل بھی حیران پریشان نظروں سے ابرار بھائی کو دیکھتے رہ گئے
باقی سب لوگ تو اپنی جگہ جوں کے توں ساکت کھڑے رہے البتہ گلفام سر جھٹکتا کمرے سے باہر نکل گیا صاحب ایسے کھڑے رہے جیسے کچھ کہنا چاہ رہے ہوں مگر ہمت نہ پڑ رہی ہو۔
"آپ کو جوتے پڑیں گے کیا تب ہی تسلی ہو گی ورنہ اسی آس میں کھڑے رہیں گے کہ ہم شاید اب بھی رشتے داری بخش دیں۔" ابرار بھائی نے ہتک آمیز لہجے میں کہا تو وہ بغلیں جھانکتے کمرے سے نکل گئے۔
ان کے کمرے سے نکلتے ہی سب ہوش و خرد کی دنیا میں واپس آ گئے۔
سب سے پہلے بابا جان نے کراہنے والے انداز میں ابرار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"یہ تم نے کیا کر دیا ابرار۔ ہم تو برباد ہو گئے۔"
"ہم برباد ہوئے نہیں برباد ہونے سے بچ گئے۔" ابرار بھائی اسی سابقہ لہجے میں بولے جس میں وہ گلفام مرزا صاحب سے مخاطب تھے۔
بابا جانی کچھ دیر تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھتے رہے پھر آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے گلوگیر میں بولے۔

"اتنا بڑا اور اہم فیصلہ اس قدر آنکھیں بند کر کے کیا تھا تم نے اور تمہارے ساتھ ساتھ میں نے بھی میں سب کچھ تم پر چھوڑ کر جانے کیوں اتنا مطمئن ہو گیا اگر پہلے ہی۔۔۔۔"
"اگر مگر کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، جو ہونا تھا سو ہو گیا رومیلہ کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔"
ابرار بھائی کسی طور اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔
سنبل اور نمل ان کی اس درجہ ڈھٹائی پر صرف ہونٹ چبا کر رہ گئیں نمل نے تو صرف بابا جانی کی حالت کے پیش نظر خود کو کوئی سخت بات کہنے سے روکا تھا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا انہیں کھری کھری سنا دے۔
"قسمت کو دہائی مت دو تم نے اس کی زندگی خراب کی ہے گلفام کے سامنے بڑے بڑے ڈائیلاگ بول دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔
سچ وہی ہے جو گلفام کہہ کر گیا ہے۔
کسی اچھے خاندان کا اچھا چشم و چراغ اس کا ہاتھ ہرگز نہیں تھامے گا کسی دولت کے لالچی۔۔۔۔"
"یہ وقت یہاں بیٹھ کر بین کرنے کا نہیں ہے۔" ابرار بھائی بری طرح چڑ کر بولے۔
اپنے باپ کی حالت کو سمجھنا اور انہیں تسلی دینا تو دور کی بات تھی انہیں تو بابا جانی کا افسوس کرنا بھی زہر لگ رہا تھا اور کیوں نہ لگتا۔
اس سب کے ذمہ دار ابرار بھائی ہی تو تھے وہ بھلے ہی دوسروں کو چیخ کر چپ کرا سکتے تھے مگر ضمیر کو کیسے خاموش کراتے۔
ان کا جھنجلایا ہوا غصے سے بھرا لہجہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ سب ان ہی کا کیا دھرا ہے اسی لیے وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت اور بگڑے ہوئے لہجے میں بولے۔
"رومیلہ کی شادی کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے وہ بہت اچھی جگہ ہو جائے گی۔
اصل مسئلہ اس وقت باہر موجود مہمانوں کا ہے اگر اس وقت گھر لوگوں سے بھرا ہوا نہ ہوتا تو میں اس گلفام کے بچے کو اتنی آسانی سے تھوڑی جانے دیتا۔
یہ لوگ مجھے جانتے نہیں ہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں اتنی آسانی سے تو میں انہیں معاف نہیں کروں گا۔
لیکن یہ سب باتیں بعد کی ہیں ابھی فوری طور پر جو مسئلہ درپیش ہے وہ باہر موجود مہمانوں کا ہے۔
باہر نکل کر دیکھیں مرزا صاحب نے ان کے سامنے کیا کہا ہے اگر مرزا صاحب اور گلفام کچھ کہے بغیر چلے گئے ہیں تو ہمیں بھی کسی پر کچھ ظاہر نہیں کرنا ہے۔
رومیلہ کی شادی دو دن بعد ایسے ہی ہو گی جیسے گلفام کے ساتھ ہونی تھی۔" نمل اور سنبل ابرار بھائی پر سے نظریں ہٹا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں۔
جبکہ بابا جانی پیچ و تاب کھاتے اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔
"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تم نے شادی بیاہ کو مذاق سمجھ رکھا ہے گڑیا گڈے کا کھیل ہے کیا۔" وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اس بار ابرار بھائی کی بجائے دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں خاموش ہونے پر مجبور کر دیا وہ تفکر بھری نظروں سے ابرار کو دیکھنے لگے جو اگر پریشان تھے بھی تو انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔
سامنے ان کے تایا زاد بھائی کھڑے تھے وہ حیران پریشان لہجے میں بولے۔
"تم سب کمرے میں کیوں بند ہو گئے ہو باہر لڑکے والے جا رہے ہیں بلکہ اب تک تو گاڑی میں بھی بیٹھ چکے

ہوں گے میں ہر کمرے میں تم لوگوں کو ڈھونڈتا ہوا آرہا ہوں سب خیریت تو ہے ناں ابرار۔"

"آں.....ہاں' ہاں خیریت ہے آپ نے دولہا یا اس کے والد سے پوچھا نہیں کہ وہ اس طرح اچانک کیوں جا رہے ہیں؟" ابرار بھائی نے کھوجتی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھا تھا وہ کہہ رہے ہیں کسی کا انتقال ہوگیا ہے اس لیے فورا" جا رہے ہیں مگر مجھے تو کچھ اور بات لگ رہی ہے۔

دولہا کے ساتھ آئے مہمان بھی حیران لگ رہے تھے اور پوچھے جا رہے تھے کہ کس کا انتقال ہوگیا ہے مگر دولہا کے والد صاحب کسی کو بھی جواب دیے بغیر باہر نکل گئے تو سب کو ان کے پیچھے جانا پڑا۔" ان کے تایا زاد جو عمر میں ان سے کافی بڑے تھے معاملے کی نزاکت کو بخوبی سمجھ گئے تھے۔

بابا جانی پشیمانی کے عالم میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھے جبکہ ابرار بھائی کے چہرے پر واضح طور پر سکون ابھرتا محسوس ہوا تھا۔

انہیں مرزا صاحب سے یہی امید تھی مہمانوں سے بھرے گھر میں جہاں وہ خود بھی اپنے چند ایک ہی سہی رشتہ داروں کے ساتھ ہی آئے تھے ان کے لیے بھی واپس لوٹنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔

فی الحال وہ صرف یہاں سے بھاگنے کا سوچیں گے بھلے ہی گھر پہنچ کر اپنے خاندان میں وہ رومیلہ کے کردار کو ہدف بنا کر شادی توڑ دینے کی کہانی سنا دیں لیکن یہاں کھڑے ہو کر وہ ایسا کوئی شوشا نہیں چھیڑیں گے۔

اور ابرار بھائی کے لیے اتنا ہی کافی تھا انہوں نے بڑے بھرپور اعتماد کے ساتھ کہا۔

"ارے بھائی صاحب آپ اتنے پریشان کیوں ہوگئے وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں ان کے خاندان میں کسی بزرگ کا انتقال ہوگیا ہے اس لیے وہ سب لوگ فورا" چلے گئے۔

مرزا صاحب ہمارے پاس کمرے میں یہی بات کرنے آئے تھے ہم نے بھی فورا" اجازت دے دی کون سا لوگ بارات لے کر آئے تھے مہندی کا ہی تو فنکشن تھا۔

ہمارے گھر کی لڑکیاں اب بھی انجوائے کرلیں گی لیکن میرا اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔

مجھے بھی ان کی طرف جانا چاہیے آپ پیچھے سب سنبھال لیجیے گا کوئی بھی مہمان کھانا کھائے بغیر نہ جائے ویسے بھی لوگ لڑکے والوں کو جاتا دیکھ کر جانے کیا کیا سوچنے لگے ہوں گے۔

اس صورت حال کو آپ ہی اچھی طرح ہینڈل کرسکتے ہیں۔" ابرار بھائی نے کمال خوب صورتی سے نا صرف اپنی جان چھڑالی بلکہ اپنے تایا زاد کی طرف سے۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

جیسی کسی بھی پیشکش کے آنے سے پہلے ہی ان کا پتا بھی کاٹ دیا۔

"ہاں ہاں ابرار تمہیں فورا" جانا چاہیے بلکہ چاہو تو اپنے ساتھ خاندان کے کسی اور فرد کو بھی لے جاؤ۔' فورا" متفق ہوتے ہوئے بولے۔

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسا ہی ہے تو میں راستے سے اپنے کسی دوست کو لے لوں گا۔" ابرار بھائی نے کہا اور پھر فورا" ہی کمرے سے نکل گئے۔

ان کے تایا زاد بھی بابا جانی کی حالت پر دھیان دیے بغیر واپس پلٹ گئے تو کمرے میں صرف وہ تینوں موجود رہ گئے۔

ابھی نمل اور سنبل نے یہ بھی سوچنا شروع نہیں کیا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے کہ بابا جانی نے انہیں حکم دینے والے انداز میں کہا۔

"تم دونوں جاؤ یہاں سے اور جاتے وقت کمرے کا دروازہ بند کردینا۔" بابا جانی دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئے نمل نے ان کی طرف چند قدم بڑھائے تو وہ بغیر اس کی طرف دیکھے سختی سے گویا ہوئے۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو جاؤ یہاں سے۔" نمل کے قدم اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔

اس نے پلٹ کر ایک نظر سنبل کو دیکھا وہ بھی آنکھوں سے اسے چلنے کا اشارہ کر رہی تھی تب نمل ایک نظر بابا جانی کو دیکھ کر کمرے سے نکل گئی۔

وہ دونوں سیدھی رومیلہ کے کمرے میں پہنچ گئیں جہاں وہ بالکل روایتی انداز میں پیلے کپڑوں میں ملبوس میک اپ کے بغیر بالکل سادے سے حلیے میں لڑکیوں میں گھری بیٹھی تھی ان پر نظر پڑتے ہی وہ بڑی بے چینی سے بولی۔

"نمل، سنبل تم دونوں کو کچھ پتا ہے باہر کیا ہو رہا ہے یہ سب کہہ رہی ہیں وہ لوگ واپس چلے گئے ہیں۔" اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی نمل اور سنبل ٹھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

وہ دونوں تو یہی سوچ کر یہاں آئی تھیں کہ رومیلہ کے پاس جاتے ہی اسے سب بتا دیں گی مگر اس کے پاس اتنے لوگوں کی موجودگی نے جہاں انہیں تھوڑا مضطرب کیا تھا وہیں اس کے احساسات کو محسوس کرتے ہوئے وہ دونوں بالکل ہی گم سم ہوگئی تھیں۔

"کیا بات ہے تم دونوں کچھ بول کیوں نہیں رہیں۔"

ان کی خاموشی نے ذرا سی ہی دیر رومیلہ کے چہرے کو اس کے کپڑوں کا ہم رنگ کردیا تھا۔

"آں.....وہ.....ان لوگوں نے یہ نہیں بتایا کہ مرزا صاحب کی فیملی میں کسی کا انتقال ہوگیا ہے اس لیے انہیں اچانک جانا پڑا۔" نمل نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے ان لڑکیوں پر نظر ڈالی۔

"نہیں یہ تو ان لوگوں نے نہیں بتایا۔" رومیلہ کو بھی عجیب سا لگا جو اس کے چہرے اور لہجے سے بھی ظاہر ہوگیا تبھی ایک کزن صفائی دینے والے انداز میں بولی۔

"یہ بات مجھے خود نہیں پتا تھی ابھی آپ کے منہ سے سن رہی ہوں۔" پھر آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"کس کا انتقال ہوگیا ہے ان کی فیملی میں اور انتقال کی خبر سنتے ہی اپنے گھر کا فنکشن اس طرح چھوڑ کر چلے جانے کی کیا ضرورت تھی۔

یا اگر اتنا ہی ضروری تھا تو خود چلے جاتے کم از کم دولہا کو تو چھوڑ جاتے۔" رومیلہ کے چہرے پر انتقال کی خبر سن کر جو تھوڑا سا اطمینان پھیلا تھا اس کزن کے تابڑ توڑ سوالوں نے اس اطمینان کو ایک بار پھر سوچ و فکر کے جال میں تبدیل کردیا تھا۔

"کوئی قریبی عزیز ہی ہوگا تبھی سب ایک ساتھ چلے گئے لیکن تم سب یہاں کیوں جمع ہوگئے ہو۔ نیچے جا کر بیٹھو اور رومیلہ کو آرام کرنے دو۔" نمل نے قدرے روکھائی سے کہا تو اس کی ایک کزن بدک کر بولی۔

"لو بھلا اب ہم نیچے جا کر کیا کریں سارے فنکشن کا تو بیڑا غرق ہوگیا ہے۔"

"ہاں' ایک تو لڑکے والوں کی فیملی میں سے گنتی کے چار لوگ آئے تھے وہ بھی محفل جمنے سے پہلے لوٹ گئے اب ہم نیچے جا کر کیا اچار ڈالیں۔" دوسری کزن کو بھی نمل کا اس طرح صاف کمرے سے نکال دینا سخت ناگوار گزرا تھا۔

وہ سب رومیلہ کی ددھیالی رشتے دار تھیں جبکہ نمل ننھیال کی تھی پھر بھلا وہ نمل کی خود پر برتری کیسے برداشت کرلیتیں۔
سنبل نے آنکھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا تو نمل بھی مزید کچھ نہ بولی۔
ان لوگوں کو یہاں سے ہٹانے کی کوشش کرنا بے کار تھا وہ اس صورت حال سے لطف لے رہی تھیں رو[illegible] کے چہرے پر پھیلی الجھن انہیں مزا دے رہی تھی۔
لڑکے والوں کے چلے جانے کے باعث امید تھی کھانا جلدی کھل جائے گا ایک بار کھانا کھا لینے کے بعد مہما[illegible] کو فوراً گھر بھاگنے کی جلدی ہوتی ہے تب وہ آرام سے بیٹھ کر رومیلہ سے بات کر سکتی تھیں۔
یہ اور بات تھی کہ رومیلہ کو سب بتانا بھی انہیں ایک مشکل مرحلہ لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جو مرحلہ اتنا مشکل لگ رہا تھا وہ اتنی خوش اسلوبی سے انجام پا رہا تھا کہ [illegible]یان سمیت ریاض غفار کی بھی سا[illegible] فکریں دور ہو گئی تھیں۔
ماموں جان، حامد کا رشتہ لے کر نہیں آئے تھے بلکہ مٹھائی لے کر بات پکی کرنے آئے تھے اور رشتوں میں اتنی دنیاداری دکھانے کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ ریاض غفار نے بھی اسی وقت سب کا منہ میٹھا کر دیا۔
توقع کے عین مطابق ماموں جان نے فوراً ہی شادی کی تاریخ مانگ لی اس پر ریاض غفار تھوڑا سا ہچکچا گئے ان لوگوں کے پر زور اصرار پر انہوں نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے دی جس پر شگفتہ غفار بھی گھبرا گئیں۔
مگر پیسے کی فراوانی ہو تو شادی کی تیاری میں کون سا وقت لگتا ہے ایک ماہ کے اندر اندر انہوں نے تمام انتظا[illegible] بڑے بہترین انداز میں کر لیے۔
الیان کے پاس بزنس کو دیکھنے کے بعد بہت کم وقت بچتا تھا کسی اور چیز پر دھیان دینے کا مگر بریرہ کے کھلتے چہ[illegible] نے جیسے الیان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔
وہ سارا دن آفس میں سر کھپانے کے بعد بھی شام میں اتنا چاق و چوبند ہوتا تھا کہ کارڈز کے انتخاب سے [illegible] ہال کی بکنگ تک سارے کام بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دے گیا تھا۔
اپنے فیصلے پر اب وہ سو فیصد مطمئن تھا کیونکہ بریرہ کی کھنکتی ہنسی اسے یقین دلاتی تھی کہ وہ بہت خوش ہے اسے خوش دیکھ کر الیان کی روح تک سرشار ہو گئی تھی۔
اس نے تمام انتظامات میں بہتر سے بہترین چیز کا انتخاب کیا تھا یہاں تک کہ جس پارلر میں بریرہ کو تیار ہونا[illegible] شہر کا سب سے بڑا پارلر تھا اور وہاں کی بیوٹیشن مہنگے ترین ریٹ پر دلہن تیار کرتی تھی۔
اسے اتنا شاہانہ خرچ کرتا دیکھ کر شگفتہ غفار تک اسے ٹوک بیٹھی تھیں۔
"الیان کیا ہو گیا ہے تمہیں ساری دلہنیں ایک سی تو لگتی ہیں پھر اتنا مہنگا پارلر کیوں بک کرایا ہے ان کے ر[illegible] تو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں آخر اتنا مہنگا میک اپ کرانے کی کیا ضرورت ہے چند گھنٹوں کی ہی تو بات ہے۔"
"تعجب ہے ممی یہ بات آپ کہہ رہی ہیں جو ہمیشہ اعلا سے اعلا چیز کی قائل رہی ہیں۔" ایسے جملے وہ ریاض غ[illegible] کے منہ سے کئی دفعہ سن چکا تھا لہٰذا اس وقت شگفتہ غفار کو ٹوکنا اسے مسکرانے پر مجبور کر گیا تھا۔
"میں اب بھی یہ نہیں کہہ رہی کہ کسی معمولی پارلر میں بریرہ کو تیار کرایا جائے مگر اتنا ایکسپن[illegible] (expensive) پارلر ہی کیوں؟
وہاں دوسرے پارلرز کے مقابلے میں چارجز میں جتنا فرق ہے کام میں ایسا کوئی ڈفرنس نہیں ہے اور چلو میک اپ تو ٹھیک ہے مگر بریرہ تو سروس بھی وہیں کی بک کرا آئی ہے۔
جو بل انہوں نے بریرہ کو پکڑایا ہے اسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے جب میں نے بریرہ کو ڈانٹا تو وہ کہنے لگی کہ مجھے تو بھائی ہی وہاں سے لے کر گئے تھے۔
تم تو گاڑی میں بیٹھے رہے اور وہ ایڈوانس بھی دے آئی۔" وہ کچھ بگڑے ہوئے انداز میں بولیں تو الیان بے ساختہ ہنس دیا۔
پھر انہیں کندھوں سے تھامتے ہوئے رسانیت سے کہنے لگا۔
"مجھے پتا ہے وہاں کتنا ایڈوانس لیا جاتا ہے میں نے خود ہی اسے پیسے دے کر اندر بھیجا تھا۔
ممی مجھے خود بھی احساس ہے یہ سب پیسے کا ضیاع ہے یہ کام اس سے کم ریٹس میں بھی ہو سکتے تھے۔
لیکن ہم کون سا ہر روز ایسی عیاشیاں کرتے ہیں کسی خاص موقع پر تھوڑی سی فضول خرچی تو کی جا سکتی ہے نا۔
وہ بھلے ہی چند گھنٹوں کی بات ہوتی ہے مگر وہ چند گھنٹے ہی اتنے اہم ہوتے ہیں کہ پوری زندگی پر محیط ہوتے ہیں اور پھر میری کون سی دس بہنیں ہیں سارے ارمان اسی شادی میں تو نکالنے ہیں۔"
الیان کی باتیں سن کر ان کی معمولی سی خفگی فوراً ہی دور ہو گئی وہ بھی مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔
"ہاں بہن تو واقعی ایک ہی ہے لیکن اللہ نہ کرے جو سارے ارمان تمہیں ایک ہی شادی میں نکالنے پڑیں خیر سے تمہاری بھی تو شادی ہو گی کچھ ارمان اس کے لیے بھی چھوڑ دو۔"
"میرا فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے کم از کم اگلے پانچ سال تک۔
میں ایک بہت بڑا پروجیکٹ شروع کر رہا ہوں میرے پاس ابھی کسی اور چیز پر دھیان دینے کا بالکل ٹائم نہیں ہے۔
لہٰذا جتنے بھی شوق اور ارمان دل میں موجود ہیں اسی شادی میں دل کھول کر نکال دیں میری طرف سے ابھی آپ صرف صبر کریں۔" الیان نے بڑی تفصیل سے جواب دیا تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئیں۔
شادی سے چار دن پہلے گاؤں سے نانی اماں، ماموں جان، شاہ جہان، ماموں، ممانی جان اور چھوٹی ممانی اپنے اپنے بچوں کے ساتھ شہر کے ایک ہوٹل میں آ کر ٹھہر گئے تھے۔
اسی ہوٹل سے وہ لوگ بارات لانے والے تھے رخصتی کے بعد بریرہ ان کے ساتھ ایک دن اس ہوٹل میں قیام کر کے اگلے دن گاؤں واپس جانے والی تھی جہاں ان کا ولیمہ ہونا قرار پایا تھا۔
ریاض غفار کے رشتے دار اور شگفتہ غفار کے رشتے دار بھی ولیمہ اٹینڈ کرنے ان کے ساتھ ہی گاؤں جانے والے تھے شگفتہ غفار کے رشتے دار تو اپنی دوہری رشتے داری کی وجہ سے بھی آ رہے تھے جبکہ ریاض غفار کے خاندان والے ریاض غفار کی خوش اخلاقی اور ہر موقع پر دوسروں کا خیال رکھنے کی عادت کی وجہ سے شرکت کرنے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔ غرض یہ کہ پورے خاندان میں بریرہ کی شادی کو لے کر کافی جوش و خروش پھیلا ہوا تھا۔
نانی اماں کی فیملی کا قیام بھلے ہی ہوٹل میں تھا مگر کیونکہ دونوں خاندان ایک ہی تھے اس لیے شادی سے پہلے کی رونقیں تمام کزنز نے بریرہ کے گھر میں ہی لگا رکھی تھیں۔
اکثر تو وہ لوگ صرف رات کو سونے کے لیے ہوٹل واپس جاتے ورنہ سارا دن اور رات دیر گئے تک تمام

محفلیں یہیں جمائے رکھتے۔
لیکن ان محفلوں میں صرف لڑکیاں شامل ہوتی تھیں شادی چاہے جتنی بھی قریبی کیوں نہ ہو لڑکے لڑکیوں مخلوط محفل کا ان کے گھرانے میں کوئی تصور نہیں تھا۔
یہی وجہ تھی کہ حامد ایک بار بھی ان کے گھر نہیں آیا تھا ریاض غفار نے تو کہہ بھی دیا تھا کہ۔
"یہ صرف تمہاری سسرال نہیں ہے بلکہ تمہاری سگی پھوپھی کا گھر ہے اس رشتے کے توسط سے تم بھی سب کے ساتھ تشریف لا سکتے ہو۔" ان کی بات پر حامد صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔
وہ اسے مذاق سمجھا تھا اور ریاض غفار نے کہا بھی مذاق کے ہی انداز میں تھا مگر الیان کو احساس تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہے بلکہ از حد سنجیدہ ہیں۔
وہ جس ماحول سے تعلق رکھتے تھے وہاں شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کا ساتھ گھومنا پھرنا اور شاپنگ کرنا بھی ایک بات تھی۔
ایسا نہیں تھا کہ ریاض غفار یا شگفتہ غفار بھی ان حرکتوں کو پسند کرتے تھے البتہ وہ ان طور طریقوں کے خلاف ضرور تھے۔
لہٰذا اب اس رواج سے ہٹ کر یکسر ایک مختلف انداز کی شادی جسے ان کی زبان میں پیور ارینج میرج کہا جاتا ان کے لیے ہضم کرنا تھوڑا مشکل تھا۔
الیان ان کے احساسات سمجھ سکتا تھا مگر اس کے نزدیک یہ باتیں اتنی معمولی تھیں کہ ان کو لے کر پریشان ہونے کی قطعاً "ضرورت نہیں تھی تبھی وہ ریاض غفار کی بات پر حامد کی طرح صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔
جیسے جیسے شادی کا وقت نزدیک آ رہا تھا شگفتہ غفار کی گھبراہٹ بھی سوا ہوتی جا رہی تھی حالانکہ اتنے کم وقت میں بھی ان لوگوں نے بڑی بہترین تیاری کر لی تھی جس کا نوے فیصد سہرا الیان کو ہی جاتا تھا پھر بھی شگفتہ غفار روایتی ماؤں کی طرح جو ہو گیا تھا اس پر خوش ہونے کی بجائے جو ہونا چاہیے تھا اس کے متعلق سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھیں۔
شروع میں تو الیان نے انہیں سمجھانے اور تسلی دینے کی کوشش کی پھر تھک کر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا کیونکہ شادی میں چار دن رہ گئے تھے اور اب اس کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ شگفتہ غفار کے پاس بیٹھ کر انہیں لمبے لمبے لیکچر دے پاتا البتہ ان کی بوکھلاہٹ دیکھ کر وہ آتے جاتے ایک جملہ ان کی طرف ضرور اچھال دیتا۔
"فار گاڈ سیک ممی اپنا بی پی ہائی مت کریں بریرہ کوئی غیروں میں نہیں جا رہی آپ کے سگے بھائی کے گھر جا رہی ہے۔"
"مجھے پتا ہے۔ لیکن بیٹا سسرال، سسرال ہی ہوتی ہے۔" شگفتہ غفار گردن ہلاتے ہوئے ایسے کہتیں جیسے بڑے پتے کی بات بتا رہی ہوں تب الیان ان سے بحث کیے بغیر ہی آگے بڑھ جاتا وہ ان کے جملے سے قائل تو نہ ہوتا البتہ ان ہی کی طرح اتنا ضرور سوچتا۔
"ماں، ماں ہی ہوتی ہے۔"
اس وقت بھی وہ آفس میں ایک پروجیکٹ کا سیمپل بنانے میں مصروف تھا جب اس کے موبائل پر شگفتہ غفار کی کال آئی۔
"ممی میں اس وقت بہت بزی ہوں آپ کو ایک گھنٹے بعد کال کرتا ہوں۔" الیان نے سلام کرتے ہی دوسری طرف کی بات سنے بغیر کہا۔

شگفتہ غفار پہلے ہی گھبرائی اور جھنجلائی ہوئی تھیں الیان کے چھوٹتے ہی کہنے پر بری طرح تپ کر بولیں۔
"الیان گھر میں بہن کی شادی ہے اور تم ہو کہ تمہارے پاس بات تک کرنے کی فرصت نہیں۔"
"ممی اصل میں، میں..... اچھا کہیں کیا بات ہے۔" ان کے لہجے کو مدنظر رکھتے ہوئے الیان نے ان کی بات سن لینے کو ترجیح دی کیونکہ وہ چاہے جتنی بھی اپنی مصروفیت انہیں سمجھاتا وہ سمجھ نہیں سکتی تھیں البتہ انہیں سمجھانے میں اتنا ہی وقت لگتا تھا جتنا ان کی بات سننے میں لگتا تو عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ انہیں بولنے دیا جائے۔
دوسری طرف وہ اس کا اشارہ پاتے ہی شکایتی انداز میں بولیں۔
"پتا نہیں کون سے پارلر میں تم نے بریرہ کی سروس کی اپائنٹمنٹ فکس کرا دی پچھلے چار گھنٹے سے وہ وہاں گئی ہوئی ہے اور ابھی بھی واپسی کے کوئی امکان نہیں۔" الیان ان کی بات سن کر جی بھر کر بور ہوا تھا۔
بھلا اس صورت حال میں وہ کیا کر سکتا تھا اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ پارلر میں چار گھنٹے لگنا ایک عام بات تھی یا کہ کوئی غیر معمولی تاخیر۔
وہ زچ ہونے کے باوجود رسانیت سے بولا۔
"ممی آ جائے گی بریرہ، آپ کیوں ٹینشن لے رہی ہیں۔"
"تمہاری ممانی اسے اپنے ساتھ بازار لے کر جانا چاہتی ہیں انہیں اس کی سینڈل خریدنی ہے شادی کے جوڑے کے ساتھ پہننے کے لیے۔
دو گھنٹے پہلے میں نے ان سے کہا تھا کہ بریرہ آئے گی تو میں آپ کو فون کر دوں گی آپ اسے پک کر لیجیے گا اب بھلا بتاؤ وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔"
"وہ کچھ نہیں سوچ رہی ہوں گی آپ انہیں بتا دیں کہ بریرہ پارلر گئی ہے وہ کل اسے بازار لے جائیں۔
بلکہ بریرہ کو فون کر کے پوچھیں کہ اسے مزید کتنا ٹائم لگے گا" الیان نے اس بار اپنی جھنجلاہٹ کو چھپائے بغیر بے زاری سے کہا۔
"بریرہ کا تو فون ہی نہیں مل رہا ایک ہی ٹیپ بجے جا رہا ہے۔
آپ کے مطلوبہ نمبر پر فی الوقت رابطہ ممکن نہیں۔" شگفتہ غفار نے تنک کر اس لب و لہجے میں کہا جس میں آپریٹر بول رہی ہوتی ہے۔
الیان کی ہنسی نکل گئی ان کی نقل اتارنے پر پھر مسکراتے ہوئے بولا۔
"اچھا آپ فکر نہ کریں میں ٹرائی کرتا ہوں اگر بریرہ کا نمبر نہیں ملا تو میں پارلر کا نمبر پتا کر کے وہاں فون کر لوں گا۔"
"ہاں ٹھیک ہے بس پانچ منٹ کے اندر اندر مجھے پتا کر کے بتاؤ۔" انہوں نے نروٹھے انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔
الیان نے پہلے تو بریرہ کے سیل پر ہی فون کیا مگر شگفتہ غفار کے سنائے ٹیپ کو دو دفعہ سننے کے بعد اس نے پارلر کا نمبر ڈائریکٹری کے ذریعے حاصل کیا اور فون ملنے کے بعد بریرہ کی تفصیل بتا کر اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو دوسری طرف موجود لڑکی کہنے لگی۔
"سر مس بریرہ تو ایک گھنٹہ پہلے ہی جا چکی ہیں۔"
"آپ ایک بار پتا کر لیں ہو سکتا ہے وہ ویٹنگ روم میں بیٹھی گاڑی آنے کا ویٹ کر رہی ہوں۔" الیان کو پتا تھا گھر آنے کے لیے بریرہ کو ممی کو فون کر کے ڈرائیور کو بلانا پڑتا تھا۔

الیان کی گزارش پر اس لڑکی نے ایک بار تصدیق کر کے وہ ہی جواب دہرا دیا تو الیان نے کچھ الجھ کر لائن کاٹ دی اور ایک بار پھر بریرہ کے موبائل پر رابطہ کرنے لگا۔

مگر اس بار بھی اسے کامیابی نہ ہوئی تو اس نے احتیاطاً" ریاض غفار کو فون کر لیا۔

"نہیں میرے پاس تو بریرہ کا کوئی فون نہیں آیا بلکہ میں تو خود اس وقت گھر سے باہر ہوں اگر وہ مجھے پک کرنے کہتی تو میرے پاس تو ابھی ٹائم نہیں میں اسے ڈرائیور کو بلانے کو ہی کہتا۔" ریاض غفار کی بات پر الیان مزید پریشان ہو گیا، تبھی فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکا۔

"الیان کیا بات ہے بریرہ کہاں گئی ہے؟" ریاض غفار کے لہجے سے بھی پریشانی عیاں تھی تبھی الیان سنبھل کر کہنے لگا۔

"بات کچھ بھی نہیں ہے وہ دراصل.... پارلر گئی ہے تو میں اسے پک کرنے جا رہا تھا تو میں نے سوچا نکلنے سے پہلے آپ سے کنفرم کر لوں۔

اگر آپ نے اسے پک کر لیا ہے تو مجھے اپنا ٹائم ویسٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" الیان نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"بھئی جب اس نے تمہیں پک کرنے کو کہا ہے تو وہ مجھے فون کر کے کیوں بلائے گی، تمہیں مجھ سے بات کرنے کی بجائے اسے ہی فون کرنا چاہیے تھا۔" ریاض غفار بور ہو کر بولے۔

"جی جی۔ میں اسے ہی فون کرتا ہوں اللہ حافظ۔" الیان نے فوراً" ہی لائن منقطع کر دی اور پارلر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا ویسے بھی اب اس کا ذہن کوئی نمونہ تیار کرنے کے قابل نہیں رہا تھا ایک عجیب سی گھبراہٹ سی ہو گئی تھی اس پر۔

سارے راستے وہ مسلسل بریرہ کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوششیں کرتا رہا مگر اس کے فون کو نہیں ملنا تھا نہیں ملا۔

پارلر پہنچ کر جب اس نے ریسپشن پر پوچھا تو وہاں موجود لڑکی نے بڑی کھا جانے والی نظروں سے الیان کو دیکھا اور بڑی بے زاری سے بولی۔

"میں نے آپ کو فون پر ہی بتا دیا تھا کہ مس بریرہ جا چکی ہیں اس وقت بھی انہیں گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے اب تو ڈیڑھ گھنٹہ ہونے والا ہے۔"

"جی بتایا تو تھا لیکن وہ گھر نہیں پہنچی ہے میں ایک بار ویٹنگ روم میں چیک کر لوں۔" الیان کے لہجے میں انکساری تھی کہ وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئی پھر گہرا سانس کھینچتے ہوئے اس نے سامنے بنے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

الیان تیزی سے مڑا اور کمرے میں داخل ہو گیا وہاں تین عورتیں اور دو لڑکیاں موجود تھیں باقی پورا کمرہ خالی تھا مختلف رسائل کی ورق گردانی کرتی ان عورتوں نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا ایک ہی نظر میں الیان کو ماننا پڑا کہ بریرہ یہاں نہیں ہے پھر بھی وہ کچھ لمحے وہیں کھڑا رہا جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ آگے کیا کرنا چاہیے۔

اور ابھی اس نے طے تو نہیں کیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے مگر ان پانچوں خواتین کی سوالیہ نظریں خود پر جمی دیکھ کر دروازہ بند کرتا ریسپشن پر واپس پلٹ گیا۔

"آپ اندر پتا کرائیں ہو سکتا ہے وہ ابھی فارغ نہ ہوئی ہو۔" ریسپشنسٹ فون پر کسی سے خوش گپیوں میں مصروف تھی الیان کی بات سن کر وہ رک کر اسے دیکھنے لگی اور جب بولی تو اس بار اس کی نظریں ہی نہیں لہجہ بھی

کاٹ دار تھا۔

"آپ کون سی زبان سمجھتے ہیں میں کہہ رہی ہوں نا وہ جا چکی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے آپ کسی اور کی بات کر رہی ہوں بریرہ نام کی کوئی اور کلائنٹ بھی آئی ہو اور آپ سمجھ رہی ہوں کہ وہ چلی گئی جبکہ میری بہن ـــــ"

"آپ کی بہن اپنی فل سروس کرانے آئی تھیں چار دن کے بعد ہمارے ہی پاس ان کی چار بجے کی برائیڈل اپائنٹمنٹ بھی ہے۔" اس نے بڑے یقین سے تصدیق کرنے والے انداز میں کہا تو فوری طور پر الیان کچھ کہہ ہی نہیں سکا تبھی وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔

"مجھے اچھی طرح پتا ہے آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں وہ صرف آئی بروز بنانے آئی ہوتی تو مجھ سے بھی غلطی ہو سکتی تھی مگر جو لڑکی اتنا کچھ کرا رہی ہو اسے پہچاننے میں کیسے غلطی ہو سکتی ہے۔" اس لڑکی کی بات میں وزن تھا۔

الیان بے چینی سے ریسپشن کاؤنٹر پر انگلیاں بجانے لگا جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کرے۔

اس کا دل چاہ رہا تھا اندر جا کر خود بریرہ کو ڈھونڈے پتا نہیں اخبار میں پڑھی کب کب کی کون کون سی سرخیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی تھیں۔

"پارلر کے اسٹاف نے بال کٹوانے آنے والی لڑکی کو غائب کر دیا۔"

"ماں پارلر میں اپنا فیشل کرا رہی تھی کہ ساتھ آیا بچہ اغوا ہو گیا پارلر کی مالکن فرار۔"

ایسی ایسی خبریں اس کی نظروں سے گزر رہی تھیں کہ کوئی اچھا خیال اس کے ذہن میں آ ہی نہیں رہا تھا۔

حالانکہ شگفتہ غفار کو فون کر کے بریرہ کی دوستوں کو فون کر کے چیک کرنے کا خیال اسے کئی بار آیا تھا مگر اس کی چھٹی حس اسے ایک فضول کوشش کہہ رہی تھی جس سے سوائے شگفتہ غفار کے پریشان ہونے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

مگر شاید اب انہیں پریشان کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا اسے شگفتہ غفار کو فون کر کے یہاں بلانا تھا تاکہ وہ اندر جا کر دیکھ سکیں۔

اتنی پریشانی میں بھی اس کا اخلاق اتنا نہیں گر سکتا تھا کہ وہ ایسی جگہ پر دندناتا اندر گھس جاتا جہاں عورتیں اپنے ذاتی کام کرانے آتی ہوں۔

اس نے پارلر سے باہر نکل کر پہلے تو ریاض غفار کو فون کیا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھتے ہوئے شگفتہ غفار کو یہاں بلانے کے ارادے کو ظاہر کیا۔

وہ الیان کی توقع سے زیادہ پریشان ہو گئے تھے تبھی بغیر سوچے سمجھے بولے۔

"شگفتہ کو بلانے سے کیا ہو گا پولیس کو فون کرو وہ ریڈ کرے گی پارلر میں تو پتا چلے گا ہماری بیٹی اتنی غیر ذمہ دار نہیں کہ بغیر فون کیے بغیر اطلاع دیے کسی دوست کی طرف نکل جائے۔ وہ یقیناً" پارلر میں ہے وہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"ڈیڈی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ پولیس کو بلانے کا مطلب جانتے ہیں آپ۔" الیان کو ان سے اس قدر جذباتیت کی امید نہیں تھی وہ تو حیران ہی رہ گیا۔

"ہاں جانتا ہوں لیکن تم نہیں جانتے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے معاملے کی سنگینی کا، دو گھنٹوں سے اس کا کوئی پتا نہیں ہے یہ موبائل پر اس کی دوستوں کو فون کرنے کا ٹائم نہیں ہے فوراً" ایکشن میں آنے کا وقت ہے۔"

"ایکشن میں آنے کا مطلب ہے ہم اس کے غائب ہونے کا ڈھنڈورا پورے شہر میں پیٹ دیں۔
ہرگز نہیں ڈیڈی یہ بات حامد کی فیملی کو تو کیا' کسی کو بھی پتا نہیں چلنی چاہیے۔
میں اس پارلر کے گیٹ سے ہٹنا نہیں چاہتا آپ ممی کو لے کر فورا" یہاں پہنچیں۔
وہ اندر جا کر ایک ایک کمرہ دیکھ کر آئیں اور اندر اسٹاف سے صاف کہہ دیں کہ اگر انہیں ایسا کرنے سے، تو پھر وہ پولیس کو لے کر آئیں گی۔
مجھے یقین ہے اپنی بدنامی کے ڈر سے وہ پولیس کو کبھی بلانا نہیں چاہیں گے اور ممی کو اندر تمام کمرے دیکھنے گے۔"
"مگر اس سے کیا ہو گا الیان۔ دو گھنٹے ہونے والے ہیں دو گھنٹوں میں تو بندے کو کہیں سے کہیں پہنچایا ہے۔" ریاض غفار چیخ کر بولے تو کچھ لمحوں کے لیے الیان نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا پھر اپنی آواز کو بمشکل سے روکتے ہوئے بولا۔
"ڈیڈی اگر اس طرح بریرہ نہیں ملی تو پھر ہم پولیس کو انفارم کریں گے مگر پہلے ممی کو ایک بار چیک کرنے دیں اور ان سے کہیں بریرہ کی جتنی دوستوں کو وہ جانتی ہیں راستے میں ان سب کو بھی فون کرلیں مگر اپنی کسی طرح سے یہ ظاہر مت ہونے دیں کہ ہم بہت پریشان ہیں ایسے پریٹینڈ کریں جیسے اس نے کسی دوست کے گھر جانے کی اجازت مانگی تھی مگر اس کا نام ذہن سے نکل گیا ہے۔
ہم اس معاملے کو جتنا سنجیدہ بنا کر پیش کریں گے بریرہ کے لیے آئندہ اتنی ہی مشکلات پیش آئیں گی ہمیں کچھ بالکل نارمل ظاہر کرنا ہے ان شاء اللہ بریرہ صحیح سلامت ہو گی اور مل بھی جائے گی پھر ہم کیوں خوامخواہ بدنامی مول لیں۔" ریاض غفار نے اس کی طویل بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا اور ایسے فون بند کردیا جیسے انہوں نے دعائیں پڑھنی شروع کردی ہوں۔
پتا نہیں ریاض غفار اس وقت کہاں تھے پتا نہیں انہیں گھر پہنچ کر شگفتہ غفار کو یہ سب بتانے میں کتنی دیر ہوتی الیان کو اگر کچھ پتا تھا تو محض اتنا کہ وہ آدھے گھنٹے میں اس کے روبرو تھے۔
شگفتہ غفار کا سفید چہرہ اور لال آنکھیں بغیر پوچھے ہی بتا گئے تھے کہ بریرہ کی کسی بھی دوست نے انہیں تسلی بخش جواب نہیں دیا۔
الیان کو اپنی بے چینی دس گنا بڑھتی محسوس ہوئی تھی مگر ریاض غفار اور شگفتہ غفار کی حالت کے پیش نظر خود کو زیادہ سے زیادہ نارمل ظاہر کرنا تھا وہ شگفتہ غفار کو لے کر فورا" اندر داخل ہو گیا۔
شگفتہ غفار تو ریسپشن پر پہنچتے ہی رو پڑیں تو وہ لڑکی بری طرح گھبرا گئی اس نے تو سیدھا اپنی اونر کو بلالیا۔
وہ ایک بہت ہی سلجھی ہوئی باوقار سی خاتون تھیں شگفتہ غفار کے ساتھ وہ بہت محبت سے پیش آئیں اور انہیں ایک ایک کمرہ چیک کرانے اپنے ساتھ لے گئیں۔
الیان کو تو ان کی ساری حرکتیں مکاری لگ رہی تھیں مگر شگفتہ غفار سارے کمرے دیکھنے کے بعد بڑے یقین سے کہہ رہی تھیں کہ بریرہ کے غائب ہونے میں ان لوگوں کا کوئی ہاتھ نہیں۔
الیان اور ریاض غفار جیسے الجھ کر رہ گئے تھے کہ اب ان کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے پارلر کی مالکن نے ان دونوں کو بھی اپنے آفس میں بٹھا کر بات کی بلکہ باہر گیٹ پر کھڑے اپنے گارڈ کو بھی بلالیا۔
بریرہ کا حلیہ بتا کر جب انہوں نے اس کی بابت پوچھا تو اس نے یہی کہا کہ ڈھائی گھنٹے پہلے ایسی ایک لڑکی وین میں بیٹھ کر گئی ہے۔

سفید رنگ کی وین جس کے شیشے کالے رنگ کے تھے۔
الیان کو تو یہ سب صاف صاف ایک اغوا کی کہانی لگ رہی تھی اگر پارلر والوں نے یہ سب نہیں کیا تھا تو بہرحال جس نے بھی کیا تھا تو بھی اس کی بہن کہیں غائب ہوئی نہیں تھی بلکہ اسے غائب کیا گیا تھا۔
اور یہ سب کچھ اس قدر ہوش ربا تھا کہ الیان کو دن میں تارے نظر آگئے تھے۔
وہ تو مرد تھا جب اس کی یہ حالت تھی تو شگفتہ غفار کو تو جو نہ ہو وہ کم تھا۔
گارڈ کے منہ سے بریرہ کا کسی گاڑی میں بیٹھ کر جانے کا ذکر سن کر شگفتہ غفار کا فق چہرہ خطرناک حد تک زرد ہو گیا وہ ایسے ساکت ہو گئی تھیں جیسے بالکل بے جان ہو گئی ہوں۔
الیان کی جیسے ہی ان پر نظر پڑی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے ان کی کرسی پر آیا اور انہیں کندھے سے پکڑ کر ہلانے لگا۔
"ممی، ممی آپ ٹھیک تو ہیں نا۔" الیان کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کرسی پر ایک طرف کو لڑھک گئیں۔
الیان کے ساتھ ساتھ ریاض غفار کے بھی اوسان خطا ہو گئے الیان نے فورا" انہیں اپنے بازوؤں پر اٹھالیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔
ریاض غفار کی مدد سے انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر الیان نے فل اسپیڈ میں گاڑی دوڑادی۔
چند لمحوں کے لیے بریرہ اس کے ذہن سے بالکل محو ہو گئی اس کی گاڑی تیزی سے ہسپتال کی طرف بڑھ رہی تھی فی الحال اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا اور بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔
(باقی آئندہ)

مہک رباب

ڈراپ سین

"اقبال بھائی آئے ہیں امی۔" رفعت نے نعرہ بلند کیا۔

"السلام علیکم۔ کیسی ہو رفعت۔"

"رفعت بھاگ کر قریب گئی تو اقبال نے اس کے سر پر ہاتھ پھرا اور پھر جلدی سے رومال نکال کر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"ارے رفعت اتنی بڑی ہو گئیں۔ ابھی بھی وہ عادتیں۔ کبھی نہا بھی لیا کرو۔"

"اتنے جڑے ہوئے بال اف ہاتھ چچپانے لگے۔"

"جی نہیں آپ کی طرح نہیں ہوں ابھی گھنٹا بھر پہلے میں نے بال شیمپو کیے ہیں۔"

اقبال صاحب نہیں ہیں کہ مہینہ مہینہ نہاتے نہیں۔" رفعت نے منہ چڑاتے ہوئے رکھا۔

"میری تو بات چھوڑو۔ ہم تو اسی مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ دنیا میں آئے تو دائی نے نہلا دیا جائیں گے تو مولوی نہلا دے گا۔ تم اپنی بات کرو سر میں بھینسیں پالی ہوئی ہیں کہ نہیں۔" اقبال نے رفعت کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"امی دیکھ رہی ہیں نا آپ اقبال بھائی مجھے کتنا تنگ کر رہے ہیں۔" رفعت نے مڑ کر منہ بسورتے ہوئے امی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا ایک ہی تو خالہ زاد ہے تمہارا ..... اب یہ بھی تم سے مذاق نہیں کرے گا تو کون کرے گا۔" نسیم نے اٹھ کر اقبال کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اور سناؤ بیٹا کبری کیسی ہے۔" نسیم نے حال دریافت کیا۔

"بھئی ویسی ہی ہیں جیسی پہلے تھیں۔ بالکل ٹھاک فٹ فاٹ۔ آپ کو سلام دے رہی تھیں بتائیں آپ لوگ کیسے ہیں کیا چل رہا ہے۔"

"بالکل ٹھیک ٹھاک' اللہ کا شکر ہے اچھی گز[ر رہی] ہے۔"

"رفعت بیٹا تم کھڑی کیا دیکھ رہی ہو بھائی کے [لیے] کچھ کھانے پینے کے لیے لے کر آؤ۔" نسیم [نے] رفعت کو مخاطب کیا اور رفعت کچن کی طرف [چلی گئی۔] اقبال اور نسیم بیٹھے ایک دوسرے کا حال [احوال] دریافت کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد رفعت [نے] دسترخوان بچھا دیا۔ اس میں مختلف چیزیں رکھی تھیں۔ چکن بریانی' چکن شیشلک قورمہ اور [سویٹ] ڈش کے طور پر ٹرائفل رکھا تھا۔ پھر وہ پریڈ کر[نے کے] انداز میں اقبال کے سامنے آئی اور بولی۔

"اقبال بھائی دشمن آپ کی زد میں ہے ایک [بھی بچ] کے جانے نہ پائے اٹیک" اور اقبال بے ساختہ [ہنسنے] لگا۔

"یہ ایک آدمی کا کھانا ہے یا پوری فوج کا۔" [اقبال] نے اٹھ کر بیسن پر ہاتھ دھوئے اور پھر دسترخوان [پر] بیٹھا ٹھیک اسی لمحے بہت سے رنگوں کا ایک طوفا[ن] گھر میں داخل ہو گیا۔

ڈارک گرین اور پرپل کلر کے سوٹ میں بالوں [میں] بڑے بڑے گھنگھرو والا رنگ برنگی پراندہ ڈالے وہ [لڑکی اما]می اور طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئی تھی۔

"رفعت میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں' [آئی] کیوں نہیں۔" اس نے آتے ہی بے تکان بولنا [شرو]ع کر دیا۔

[بھلا یہ کوئی بات ہے' ایسا بھی کیا انتظار کرواتا کہ بندہ [ہو]لا کر بیکن ہو جائے اور آپ الزبتھ ٹیلر بنی یہاں بیٹھی [ر]ہیں۔" اس نے رفعت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ [اس] نے ایک دم سے رفعت پر چڑھائی کر دی تھی اور [ا]رد گرد دیکھنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔

اقبال حیرت سے منہ کھولے اس عجوبہ روزگار [گو]لے گنڈے کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

"شش..." رفعت نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے [ہو]ئے کہا۔

"[تم] اپنی ہی بولے جا رہی ہو' کسی دوسرے کو بولنے کا موقع دو گی تو کوئی کچھ کہے گا۔ ملتان سے اقبال بھائی آئے ہوئے ہیں ہماری اکلوتی خالہ کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ بس میں کھانا وغیرہ بنانے میں جت گئی' اس لیے نہیں آئی۔ تب پہلی بار لڑکی نے اقبال کی طرف دیکھا۔

"ہا... ہائے... تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" لڑکی نے جلدی سے گلے میں پڑا ہوا دوپٹہ اٹھا کر سر ڈھانپتے ہوئے کہا۔

"تب [بھی] تم کسی کو بولنے کا موقع دو گی تو کوئی کچھ بتائے گا۔" رفعت نے ٹوکا اور لڑکی شرمندہ سے انداز میں دوپٹہ مروڑنے لگی۔

"بھئی رفعت یہ اتنا الم غلم جمع کر دیا میرے سامنے' میں اکیلا کھاؤں گا کیا۔"

"جی اقبال بھائی ہم نے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے کھانا کھایا ہے۔ سب آپ کو ہی ختم کرنا ہے۔"

"یہ بھی خوب رہی میرے پیٹ کو ڈھول سمجھ رکھا

ہے کیا۔"

"جی نہیں، ہم نے آپ کے پیٹ کو ہرگز ڈھول نہیں سمجھا، کیونکہ ڈھول کے پھٹنے کا خدشہ ہوتا ہے، ہم تو آپ کے پیٹ کو کنواں سمجھتے ہیں۔"

ٹھیک اسی لمحے لڑکی نے رفعت کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی تو دونوں کھی کھی کرنے لگیں۔

"خالہ جان آپ ہی آجائیں۔" اقبال نے نسیم کو مخاطب کیا۔ "نہیں بیٹا رفعت ٹھیک کہہ رہی ہے تمہارے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے ہم نے کھانا کھالیا ہے۔"

ناچار اقبال کھانا کھانے لگا، اس دوران کبھی کبھی اس کی نظریں اٹھتیں اور آنے والی لڑکی کے چہرے کا طواف کرنے لگتیں، جو ایک ٹک اسے ہی دیکھے جارہی تھی اور اقبال کو عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ جیسے تیسے جلدی جلدی جو کچھ بن پڑا اس نے کھانے سے انصاف کیا۔

"لو بھئی رفعت برتن اٹھالو۔" اقبال نے کہا اور اٹھ کر ہاتھ دھونے لگا۔

"ہائے میں مرگئی، میں تو ہنڈیا چولہے پر رکھ کر آئی تھی۔ وہ تو جل کر کوئلہ ہوگئی ہوگی۔" لڑکی کے چیخنے کی آواز بلند ہوئی تو اقبال نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ لڑکی جس تیزی سے نمودار ہوئی تھی اسی طرح "آناً فاناً" آندھی اور طوفان کی طرح غائب ہوگئی۔ اقبال ہاتھ دھو کر پلٹا تو خالہ جان بولیں۔

"بیٹا لمبا سفر کرکے آئے ہو کچھ دیر کمر سیدھی کرلو۔"

"امی کمر ہو تو سیدھی ہو یہ تو کمرہ ہے۔" رفعت نے ایک مرتبہ پھر شرارت کی۔

"اچھا کمرہ ہے تو کسی راج مزدور کو بلوا لو ان سے سیدھا کروا لیتے ہیں۔" اقبال نے رفعت کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے دھول لگائی اور جملہ مکمل کرکے کمرے میں داخل ہوگیا۔

ابھی وہ بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ رفعت بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئی اور پھر اس کے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"یہ جو کلثوم ہے نا۔"

"نہیں ہے۔" اقبال نے جواب دیا۔

"کیا نہیں ہے۔" رفعت نے حیرت سے پوچھ

"بھئی تم نے پوچھا کلثوم ہے نا میں نے کہا ہے۔"

"اوہو بھئی میں سنجیدگی سے بات کررہی آپ کو پتا ہے کلثوم کون ہے۔"

"نہیں مجھے تو یہ پتا ہے مظلوم کون ہے۔"

"اب یہ مظلوم کون ہے۔" رفعت نے پوچھ

"بھئی مجھ غریب کے علاوہ اور کون ہو سکتا تمہارے ہاتھ لگ گیا ہے۔"

اقبال نے مظلومیت سے کہا۔

"بھئی میں کلثوم کی بات کررہی ہوں، ابھی آئی تھی۔"

"اچھا تو کیا ہے اسے۔" اقبال نے سوال کیا۔

"پتا ہے جب آپ کہہ رہے تھے کہ کیا ا اکیلا کھانا کھاؤں گا تو وہ میرے کان میں کہہ ر اپنے بھائی سے پوچھو میں اس کے ساتھ کھالوں۔"

"لاحول ولا قوۃ بھئی بڑی ندیدی ہے تمہاری" اقبال نے مسخرہ پن سے کہا۔

"نہیں بھائی بڑی اچھی اور مال دار لڑکی ہے"

"اچھا۔" اقبال نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں بھائی ان کے آٹے کی چکی ہے او دھننے کی مشین بھی ہے ان کی اور پتا ہے چاول کی مشین بھی ہے ان کے پاس۔"

"اچھا اور کون سی مشینیں ہیں تمہاری ا کے پاس؟ مجھے تو لگتا ہے کہ باتیں بنانے کی م ہے اس کے پاس، کیسے قینچی کی طرح چل رہی کی زبان۔" اقبال نے مضحکہ خیز انداز میں بیڈ ہوئے کہا اور رفعت بھی دھپ سے اس کے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"سچی بھائی لڑکی بڑی مال دار ہے، ہم چاول

ان سے خریدتے ہیں ساٹھ روپے کلو، مجھے تو لگتا ہے کہ وہ آپ پر مرمٹی ہے۔"

"اچھا... اگر اتنا ہی مرمٹی ہے تو اسے بولو دس کلو چاول تو بھیجے۔"

"آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں، میں نے پتی بات بتائی ہے آپ کو۔" رفعت نے برا مانتے ہوئے کہا اور پھر بھنائے ہوئے انداز میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

دوسری صبح جب اقبال منہ ہاتھ دھونے کے لیے باہر نکلا تو صحن کے وسط میں ایک سفید رنگ کا تھیلا پڑا تھا۔

وہ بیسن پر کھڑا منہ دھو رہا تھا کہ رفعت آن دھمکی۔

"اقبال بھائی میں نے آپ کا پیغام کلثوم کو دے دیا تھا اور آپ کے دس کلو چاول وہ آئے پڑے ہیں۔"

اور اقبال کا ہاتھ بے ساختہ سر پر پہنچ گیا۔ اس نے سر کھجاتے ہوئے ایک نظر تھیلے کی طرف دیکھا اور پھر دل ہی دل میں لاحول ولا قوۃ پڑھتا کمرے میں گھس گیا۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ باہر چلا گیا اسے کچھ ضروری کام نبٹانے تھے۔ شام ڈھلے گھر آیا کھانا وغیرہ کھا کر اس نے بیگ کاندھے سے لٹکایا اور خالہ جان سے اجازت لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی وہ دروازے سے باہر بھی نہیں نکلا تھا کہ پیچھے سے خالہ جان کی آواز بلند ہوئی۔

"اقبال بیٹا۔"

اقبال نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا تو خالہ جان گویا ہوئیں۔

"بیٹا یہ اپنی کمائی تو ساتھ لیتے جاؤ۔" خالہ جان کا اشارہ سفید تھیلے کی جانب تھا۔ ایک لمحے کے لیے اقبال کو بڑی شرمندگی کا احساس ہوا۔ لیکن پھر وہ ...منائی کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے تھیلے کی جانب بڑھا اس نے تھیلا اٹھایا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔

دس کلو چاول جب تک استعمال ہوتے رہے اسے کلثوم یاد رہی۔ اس کے بعد دو، تین سال تک اقبال کا نسیم خالہ کی طرف جانا نہیں ہوا۔ اس دوران دو، تین مرتبہ رفعت کے خطوط موصول ہوئے، جن میں اکثر کلثوم کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہوتا تھا۔ وہ اکثر رفعت سے اقبال کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی اور اب رفعت سے چاولوں کے ساٹھ روپے بھی نہیں لیتی تھی اور رفعت اس بات پر بہت خوش تھی۔

عید کی آمد آمد تھی۔ ستائیسویں کی پوری رات اقبال نے عبادت کرتے ہوئے گزاری اور پھر نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ نسیم خالہ سے عید ملنے جانا ہے۔ لہٰذا ٹھیک عیدالفطر کے دن وہ نسیم خالہ کے گھر میں داخل ہوا۔ سلام دعا کے بعد اقبال بیٹھ گیا تو رفعت نے حسب معمول اس کا دماغ کھانا شروع کردیا۔

"اقبال بھائی کلثوم روزانہ دن میں چھ چکر لگاتی ہے اور ہر چکر میں آپ ہی کی باتیں کرنے لگتی ہے۔"

رفعت نے کلثوم کے اتنے قصیدے پڑھے کہ اقبال بلبلا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس مصیبت سے کیسے جان چھڑوائے ٹھیک اسی لمحے کلثوم اپنے مخصوص انداز میں یعنی آندھی اور طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئی۔ نظریں چار ہوئیں اور اقبال ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے منہ سے بے ساختہ ایک جملہ نکلا۔

اقبال کی آواز سن کر کلثوم وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ اسے جیسے ہزار والٹ کا الیکٹرک شاک لگا تھا۔ چند لمحے تک وہ عجیب سی نظروں سے اقبال کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ الٹے قدموں چلتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔

اقبال نے کہا تھا۔

"باجی عید مبارک"

☼ ☼

نایاب جیلانی

اور دیا

چوتھی قسط ۴

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" اس جھٹکے سے سنبھل کر ماہی نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم اچھی طرح سے سن بھی چکی ہو اور سمجھ بھی چکی ہو۔ میں بار بار ایک بات کو دہرانے کی عادی نہیں۔" میڈم تابندہ کے لہجے میں ازلی رعونت در آئی۔ اب وہ سر جھٹکتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"خوش نصیبی تمہارے دروازے پر خود چل آئی

مکمل ناول

ہے۔ اپنے قدموں پر چل کے شکرانے کے نوافل پڑھو' زوباریہ درانی کی نظر انتخاب تمہارے بیٹے پر ٹھہر گئی ہے۔"

"خوش نصیبی ہونہہ۔ ہماری جوتی کو بھی پروا نہیں' ماہیر عالم بیٹا ہے میرا' بکاؤ مال نہیں کہ تمہارے جیسی رئیس عورت کے ہاتھ بیچ ڈالوں۔" ماہی کا بھی ازلی جلال عود آیا' ابھی تک وہ زوباریہ کی ماں سمجھ کر خاموش اور کچھ شاک کی وجہ سے مہر بہ لب تھیں' زمیلہ برابر ماں کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ دراصل وہ زوباریہ سے دوستانے کے ناتے اس نئی رشتہ داری کے متعلق پہلے سے ہی سوچ رہی تھی یا پھر زوباریہ نے زمیلہ کو اپنا ہمراز بنالیا تھا۔ جو بھی وجہ تھی البتہ ایک چیز واضح ہو گئی تھی کہ زمیلہ اس رشتہ داری پر بہت خوش تھی۔ شاید اپنا اسٹیٹس ایک جھٹکے میں ہائی ہو جانے کی وجہ سے پرجوش تھی۔

"اپنے بیٹے سے تو پوچھ لو' امیرزادیوں کو ور
وقت غیرت نہ آئی۔ راتوں رات آسمان پر پہنچ
خواب دیکھتا ہے' تمہارا بیٹا۔ ایسے ہی تو زوبار
نہیں ہو رہی۔ کوئی بات ہے دونوں کے درمیان
بیٹی دو مرتبہ محض میری ضد میں اور مجھے رضامند
کی کوشش میں خود کشی کر چکی ہے۔ اس رشتے
کوئی اعتراض نہیں۔ ماہیر ذہین ہے' قابل ہے
سے بڑھ کر خوبرو ہے۔ ہماری سوسائٹی
سارے "گر" سیکھ جائے گا۔" وہ دور تک پلا
کر رہی تھیں۔ ماہی کے غصے کو انہوں نے کوئی
نہیں دی تھی میں نے تیسری سیڑھی سے ا
ہوئے ایک اور منظر دیکھا۔ میڈم تابندہ آہستہ
چلتے ہوئے عین ماہی کے مقابل آکھڑی ہوئیں
انہوں نے ماہی کا ہاتھ پکڑ کر بغور دیکھا۔ ماہی کی
انگلی میں سے ایک چھلا نما انگوٹھی اتار دی اور پھر
تمکنت سے پلٹتے ہوئے بولیں۔

"یہ رنگ میں زوباریہ کو تمہاری طرف پہناؤں گی۔ آج سے یہ رشتہ پکا سمجھ لو۔ ماہیر میری بیٹی سے منگنی ہو چکی ہے۔ اس بات کو ذہن کرلو۔ شادی دس سال بعد کروں گی۔ یاد رہے یو
دس سال بعد ابھی زوباریہ کو بہت سا پڑھنا ہے
کی ابراڈ جانے کی تیاریاں مکمل ہیں۔ اس عرصے
دوران میں ماہیر کو اسٹیبلش ہوتے دیکھنا چاہو
دس سال میں وہ کتنی ترقی کرے گا۔ کتنا آگے
گا۔ اس معاشرے میں اپنا مقام بنانے کے لیے

وقت درکار ہوگا۔ ویسے بھی مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو سیڑھیوں کی تلاش میں تاک لگائے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔" انہوں نے سرد آواز میں مامی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ماہیر آج سے ہمارا ہوا' یاد رکھنا۔"

"ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ زبان کھینچ لوں گی تیری۔ بڑی آئی میرا پلا پلایا بیٹا لینے والی۔" مامی کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید میڈم تابندہ کا میک زدہ چہرہ نوچ لیتیں۔

"تیرے لیے تو میں اتنے سال پالتی پڑھاتی رہی ہوں' جوان ہوگا تو تجھے طشتری میں سجا کر دے دوں گی۔ اپنی آوارہ اور بدلحاظ بیٹی کو سمجھا لینا۔ عزت داروں کی لڑکیاں اپنے منہ سے کسی غیر محرم سے عشق کا اقرار کریں تو انہیں ہمارے معاشرے میں طوائف کی گالی دی جاتی ہے۔ آوارہ اور اوباش عورت کہا جاتا ہے۔ چھی تھو۔"

"بس' رک جاؤ۔ خاموش ہو جاؤ' مزید ایک لفظ مت کہنا۔" میڈم تابندہ نے گویا اپنے ضبط کو آخری حد تک آزما ڈالا تھا۔

"وہ بے وقوف ہے اور مجھے اپنی بے وقوف بیٹی کے ہر احمقانہ فیصلے پر مہر لگانی پڑ رہی ہے۔ جیسی تم ماں ہو۔ میں بھی ایسی ہی ماں ہوں۔ یوں سمجھ لو' مجبور اور بے بس۔" میڈم تابندہ' مامی کی مزید گوہر افشانیاں سننے کے لیے رکی نہیں تھیں تاہم جاتے جاتے بھی انہوں نے آخری دفعہ بھی جتا دیا تھا۔

"زوباریہ کو اپنی ہونے والی بہو سمجھنا۔ خبردار جو کوئی لفظ میری بیٹی کے لیے تیری زبان سے نکلا۔"

"آخ۔ تھو' تیرے ہلکے کردار کی بیٹی' میری جوتی کے برابر۔" مامی نے دھاڑ کر کہا تھا۔

"میرا بیٹا اعلا سوچ رکھنے والا سچے موتی جیسے دل کا مالک' اس کے لیے تو میں آبگینہ لاؤں گی۔ چاندی کے پانی جیسی صاف اور نفیس' تم اپنی دولت سمیت بیٹی کو گھر میں رکھو۔" مامی گویا ہوا کے ہاتھ میڈم تابندہ تک سارا زہر سارا طیش پہنچا دینا چاہتی تھیں۔

"وہ چلی گئی ہیں امی! اب تو بس کریں' گھر آئے مہمان کے ساتھ کوئی یوں بھی کرتا ہے۔" زمیلہ پھٹ پڑی۔

"پانی تک نہیں پوچھا۔"

"مہمان۔۔۔" مامی نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"نیلا تھوتھا نہ گھول کر پلاتی' کیسے منہ پھاڑ کر بدبخت نے۔ ماہیر ہمارا ہوا' آگ پڑے تیرے ستیاناس' کیسے غرور سے بول رہی تھی۔ رشتہ ہونہہ۔"

"آپ نہ جانے کس دور میں زندہ ہیں' لوگ کے لیے بیساکھیاں ڈھونڈتے ہیں' سیڑھی کرتے ہیں۔ ادھر قسمت خود بخود مہربان ہو رہی مگر قدر نہیں کسی کو' تمام عمر ایک کنویں میں دیں۔ اس کنویں میں سے مت نکلیے گا' ساری قرض لے کر گزارا کیا ہے۔ مہینے کے آخری کنگال ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ بھائی بھی تمام عمر میں گردش کرتے رہیں گے۔" زمیلہ بلند آواز رہی تھی۔

"بکواس نہ کر۔۔۔ پہلے ہی دماغ پلپلانے لگا۔ جا' اسکوائش بنا کر لا۔" مامی ہانپتے ہوئے تخت گئیں۔ میں بھی ان کے قریب چلی آئی تھی۔ نے مجھے دیکھا اور پھر سے شروع ہو گئیں۔

"منع کیا تھا اس ناہنجار کو' نہ امیروں سے دو گانٹھ' بھگت لے نتیجہ اب' تحفے بٹورتی رہی سونے کا لاکٹ دے کر گئی تھی پرسوں زمیلہ کو۔ فیفا! ہمارا اور زوباریہ کا کوئی جوڑ بھی ہے۔" وہ سے سخت جلی بیٹھی تھیں۔ اول روز سے ہی زمیلہ اور زوباریہ کی دوستی پسند نہیں آئی تھی۔

"پہلے تیرے ساتھ چمٹی رہی' پھر زمیلہ کے ہار بن گئی۔"

"اسی مقصد کے لیے تو وہ زمیلہ سے دو جوڑے بیٹھی تھی۔" میں نے دبی آواز میں کہا

مبادا زمیلہ سن کر بھڑ نہ جائے۔ ان دنوں وہ زوباریہ کے لیے اسی طرح حساس ہو رہی تھی۔

"میں بھی ان کے مقاصد پورے ہونے نہیں دوں گی۔" مامی نے اپنے ارادے ظاہر کیے تھے۔

"کیا فرق پڑے گا' بھائی سے اس کی شادی نہ ہوئی' تو کوئی اور انہیں اپنے سرکل میں معیار کے مطابق مل جائے گا' نقصان تو سراسر آپ کا ہوگا۔ کبھی ان کا محل دیکھیں نا' تو رات بھر نیند نہ آئے آپ کو۔" زمیلہ کچن سے لپکتی باہر آئی تھی۔

"ہمیں محلوں کی کہانیاں نہ سناؤ بیٹی! اپنے دل کے ٹکڑے کو کیسے انہیں سونپ دوں۔" جوش نکالنے کے بعد اب وہ مسلسل رونے دھونے میں مصروف تھیں۔

"پوری برادری میں واہ واہ ہو جانی تھی۔ خاندان والے بس رشک کرتے رہ جاتے۔ نوابوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہنا تھا محل میں۔۔۔ وہ گھر زوباریہ کے نام ہے۔ زوباریہ کے ڈیڈی کا تھا نا۔ اس کی مما تو دوسرے گھر میں ہوتی ہیں۔" زمیلہ گویا خیالوں میں زوباریہ کے محل کی راہداریوں میں گھوم رہی تھی۔

"آپ نے اس عزت' شان اور ٹھاٹھ باٹ کو ہاتھوں سے نکال دیا ہے۔ اتنے امیر گھر سے بھولا کر تو آپ کی ساری حسوں کی تسکین ہو جانی تھی۔ شوق سے میکے اور پورے سسرال میں دھوم مچا دیتیں۔ سونے سے تول کر رکھ دینا تھا زوباریہ نے آپ کو۔" وہ ماں کی سوئی ہوئی شوبازی کی عادت کو جگانا چاہتی تھی' مگر مامی بھی شاید کوئی اٹل فیصلہ کیے بیٹھی تھیں۔

"بھولائی نہیں تھی۔۔۔ بیٹے کو رخصت کرنا تھا۔ وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔ کیا احمق سمجھ رکھا ہے مجھے۔" مامی چمک کر بولیں۔

"حریم کے گھر سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔" زمیلہ آگ بگولا ہو کر دھاڑی۔

"نہ سہی۔" مامی نے ہاتھ جھاڑے۔

"عزت تو ملے گی' جو وہ ساتھ لائے گی' عزت اور کردار سے بڑھ کر کچھ نہیں۔۔۔ تجھے اپنے بھائی کا نہیں پتا' دولت سے متاثر ہونے والا نہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو حریم سے شادی پر رضامندی نہ دیتا۔ اس پرکٹی کبوتری کو گھر لے آتا' جو اس پر مرمٹ گئی ہے۔"

"اونہہ۔۔۔ غربت میں لپٹی عزت کو چاٹتی رہیں۔ حریم کا افسر باپ کنگلا ہے کنگلا۔" زمیلہ تنفر سے بولتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ان دنوں اس پر زوباریہ سے محبت کا بھوت سوار تھا۔

چوبیس گھنٹے فون سے چپکی رہتی' زوباریہ بھی گویا زمیلہ کی دیوانی تھی۔ جب بھی آتی لدی پھندی آتی' کپڑے' جوتے' پرفیوم' جیولری' کاسمیٹکس کا گویا ڈھیر لگ گیا تھا زمیلہ کے کمرے میں' زمیلہ بہت اونچے اونچے خواب دیکھنے لگی تھی۔ اسے امید تھی کہ اگر زوباریہ' ماہیر کے ساتھ بیاہ کر ادھر آجاتی تو وہ بھی کسی اونچے گھرانے میں بیاہی جا سکتی تھی۔" فیفا ایک دم کھٹکے کی آواز سن کر خاموش ہو گئی تھی۔ راحت بیگم بولتی ہوئی سیدھی ادھر آگئیں۔

"حریم! دوپہر کی روٹی ہانڈی کا کچھ نہیں کرنا۔" انہوں نے دروازہ کھول کر کمرے میں جھانکا۔

"جی امی! ابھی آئی۔" حریم بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیفا سے کہا۔

"پھر آؤں گی' باقی کی داستان سننے۔"

"میں انتظار کروں گی۔" فیفا نے سمجھ کر سر ہلا دیا تھا۔ حریم پلٹ کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

زمیلہ آئی تھی۔ چہرے سے ہی بہت اپ سیٹ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر امی کے دل پر گھونسا پڑا۔

"کیسی صورت نکل آئی ہے چند دنوں میں میری بیٹی کی۔ تجھے کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔" وہ بار بار اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر پوچھتیں۔ پاس ہی حریم سبزی کی ٹوکری سامنے رکھے آلو کاٹنے میں مصروف تھی۔ نہ جانے کیوں، ماں، بیٹی کی اس محبت، توجہ کے مظاہرے دیکھ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ شاید اپنی ماں نہ ہونے کی وجہ سے یا پھر اپنی ممتا کے پیاسا رہ جانے کے احساس نے اس کی پلکوں کو بھگو ڈالا تھا۔

"نبیل تجھے اپنے پاس بلاتا کیوں نہیں۔" انہوں نے کئی مرتبہ کا گھسا پٹا سوال پھر سے دہرایا۔

"اتنی جلدی کاغذات نہیں بن جاتے۔"

"یہ فیفا کا تو ویزا بھی لگ گیا، ٹکٹ بھی آگئی، اگلے مہینے چلی جائے گی، نبیل سے کہو نا، کوشش تو کرے۔" وہ بے قراری سے بولیں۔

"لوگوں کے نصیب بڑے چمک دار ہیں، مٹی کو ہاتھ لگائیں تو سونا بن جائے، یہاں تو سونا بھی لوہے کے برابر، بے قیمت، زنگ آلود لوہا۔" زمیلہ کے لفظ لفظ میں تلخی رچی تھی۔

"میں نے بھی تجھے کہاں پھنسا دیا ہے۔"

"آپ کا کیا قصور؟ میرا نصیب مجھے وہاں لے گیا۔"

"تم نبیل کو بتاتی کیوں نہیں؟" اب کے ذرا دبی آواز میں کہا گیا تھا۔

"کیا بتاؤں؟ خالہ صباحت کی وہاں کوئی نہیں سنتا تو بری مجال کیا ہے۔ دادی صاحبہ ایسی چسکوری ہیں رنگ رنگ کے پکوان کھانے کو دل کرنے لگتا ہے۔ کبھی حلوے کی فرمائشیں، کبھی کھوئے کی کھیر، اتنی عمر ہو گئی ہے، بلڈ پریشر کی تکلیف بھی نہیں، ہشاش بشاش، ہٹی کٹی ہیں۔ بہوؤں پر رعب جمانے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔" زمیلہ نے جل کر کہا۔

"نبیل سے کہو تجھے علیحدہ سے خرچہ دے۔" امی کی آواز اب سرگوشی نما ہو چکی تھی۔

"ایسا سوچنے کی بھی جرات نہیں۔"

"بھلا کیوں؟ بیوی بنا کر لے کے گیا ہے یا باندی؟" امی کو جلال آگیا۔

"اونہہ، بیوی کہاں، باندھی سمجھ لیں۔" زمیلہ کلستے ہوئے کہا۔

"تم کہو تو میں بات کروں۔"

"ارے نہیں امی! کیوں بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا چاہتی ہیں۔" زمیلہ بے زاری سے بولی۔

"میری شہزادیوں جیسی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک، دیکھ لینا ایسی کھری کھری سنا کر آؤں گی۔" امی تڑپ اٹھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں، نبیل کی ماں کہیں گی میکے والوں کو گھر کی باتیں بتاتی ہوں۔"

"صباحت بھی تیرا ساتھ نہیں دیتی۔" امی نے صدمے سے ٹوٹے لہجے میں پوچھا۔

"اول تو ان کا پورشن الگ ہے اور پھر خالہ کی ساس کی نظر میں بھلا حیثیت کیا ہے۔"

"بڑھیا اتنی ڈرامے باز ہوگی، مجھے یقین نہیں آتا۔"

"ایسا خیال ان کا آپ کے بارے میں ہے۔ میرے سامنے آپ کو شاطر، تیز طرار، چالاک اور نہ جانے کیا کچھ کہتی ہیں، مگر میں خاموش رہنے پر مجبور ہوں۔" زمیلہ نے تلخی سے کہا۔

"کیا سمجھ رکھا ہے، اس خرانٹ بڑھیا نے۔ تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں۔" امی غصے کے عالم میں تنتنا اٹھیں۔

"آہستہ بولیں بھابھی سن لیں گی۔" زمیلہ نے ماں کو حریم کی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ٹہوکا دیا۔

"کال ملا کر دو مجھے، ابھی بات کرتی ہوں بڑھیا سے۔ کیا سمجھ رکھا ہے اس نے مجھے۔" امی پر غصہ کسی جن کی طرح سوار ہو چکا تھا۔

"امی پلیز!" زمیلہ کو ماں کی یہ جذباتیت ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

"پہلے اپنے گریبان میں جھانکیے۔"

"گریبان۔" راحت بیگم کچھ شرمندہ سی دائیں بائیں دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب ہے تیرا۔"

"وہ لوگ کچھ غلط تو نہیں کہتے، کیا دیا ہے آپ نے مجھے۔" زمیلہ نے شکووں سے بھرے بند رجسٹر کھول لیے تھے۔

"میری دیورانی فلیٹ، گاڑی اور سونے کی پوٹلیاں جہیز میں لائی ہے۔"

"میں نے کون سی کمی کی ہے۔" امی نے صدمے سے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

"لاکھوں کی مالیت کا جہیز دیا ہے، حسب توفیق سونا بھی چڑھایا۔ مہنگائی دیکھو آسمان کو چھو رہی ہے، ایک تمہارا بھائی ہے کمانے والا، باقی تو سب اس کا خون چوسنے کو بیٹھے ہیں، میں، مولی اور۔۔۔" وہ لب بھینچے اک کٹیلی نگاہ حریم پر ڈال کر رخ موڑ گئیں۔ اس نظر میں نہ جانے کیا کچھ تھا۔ حریم توہین کے احساس سے سفید پڑ گئی۔ امی کا موڈ صبح سے بگڑا بگڑا تھا۔ ماہیر نے انہیں خرچے کے علاوہ اضافی رقم دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ان دنوں نہ جانے کہاں غائب رہتا تھا۔ دفتر سے آ کر پھر سے نکل جاتا۔

امی بھی روایتی ساسوں کی طرح بہت جلد متنفر ہو جاتی تھیں۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتیں۔ پلک جھپکنے کے ساتھ مزاج برہم ہو جاتا۔ خوش ہونے پر آتیں تو معمولی سی بات پر کھل اٹھتیں۔ نہ جانے کیا نفسیات تھی ان کی۔ حریم تو ان گتھیوں کو سلجھاتے سلجھاتے خود بھی الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس کی نظریں اپنے وجود پر موجود اس گلابی سوٹ پر گویا جم کر رہ گئیں۔ یہ سوٹ رات کو ماہیر لایا تھا۔ اس کی سالگرہ کا تحفہ، شادی کی دوسری سالگرہ کا تحفہ۔

ماہیر کی محبت سے بڑھ کر کوئی زاد راہ نہیں تھا۔ ان دو سالوں میں وہ ہر طرح کے رویے کی عادی ہو چکی

تھی۔ وہ خود کو بے حس کہنے سے خوف زدہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہر احساس سے عاری نہیں سمجھنا چاہتی تھی۔ سو اسی لیے بہت سکون اور خاموشی سے حریم نے اس تیز نظر کا زہر اپنے اندر اتار لیا۔ کبھی کبھار امی اگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی تھیں تو اس میں حرج کیا تھا۔ ماہیر کی محبت کے صدقے سب قبول تھا۔ ہر تکلیف، ہر دکھ، ہر صدمہ۔

اس کے آس پاس رہنے والی بہت سی عورتیں تو صرف سمجھوتے اور مجبوریوں کے بندھن نبھا رہی تھیں۔ جن کے شوہروں کے پاس ان کے لیے محبت کے دو بول بھی نہیں تھے۔ حریم کا اس لحاظ سے پلڑا بھاری تھا اور اس کا قناعت پسند دل کسی اور شے کی طلب بھی نہیں کرتا تھا۔

"نہ جانے بعض لوگوں کے پاس کون سا ٹونا یا جادو ہوتا ہے۔ ایسے شوہروں پر تسلط جما لیتی ہیں۔" زمیلہ اتنا اونچا بول کر نہ جانے کسے سنا رہی تھی۔ حریم اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

"نہ یہ چالاکیاں اور ادائیں ہماری ماں کو معلوم تھیں۔ نہ آگے ماں نے مجھے سکھائیں۔ لوگ تو ساری پٹیاں پڑھ پڑھا کر آتے ہیں۔" وہ گویا دانتوں تلے چنے چبا رہی تھی۔ کڑکڑ کرتے زمیلہ کے سارے الفاظ حریم کے دل میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ جیسے گندھے آٹے میں پتھر کی گول گول گونیاں پوری قوت سے پھینکیں تو کھب کر رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح حریم کے دل میں زمیلہ کا لفظ لفظ چبھن دیتا، پیوست ہو رہا تھا۔

"میرے نصیب پھوٹے بھی تو کہاں، شوہر اتنی دور، دو، دو ساسوں کے درمیان پس رہی ہوں۔" زمیلہ نے آج سارا غبار نکال دینے کی گویا ٹھان رکھی تھی۔

"اگر کسی بھرے پرے کنبے میں بیاہی جاتیں محترمہ تو تب پتا چلتا۔" حریم وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ یہ ارشادات اسی کے بارے میں جاری کیے گئے ہیں۔ تاہم اس نے خود کو یوں لاپروا ظاہر کیا گویا وہ یہاں موجود ہی نہیں۔ اس کے باوجود کئی آنسو چپکے چپکے دل میں اترتے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ماسی کے مطالبے نے حریم کے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔ وہ صبح صبح جھاڑو بغل میں دبائے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اندر آئی تھی۔ ماہیر دفتر جا چکا تھا اور وہ بڑی تیزی سے کمرے میں بکھری چیزیں ٹھکانے پر لگا رہی تھی۔ ماسی کو صبح صبح سر پر تلوار کی طرح ٹنگا دیکھ کر وہ سمجھ نہ سکی تھی، تاہم ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"بی بی! صاحب سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں، زمیلہ بی بی کی شادی آگئی تو میں نے سوچا ابھی بات مناسب نہیں، ویسے بھی ان دنوں آپ کا ہاتھ بھی تنگ تھا۔ میں نے بھی تنگی کو بھگتانا ہے۔ ایڈوانس تنخواہ کی بات کی تھی۔ بڑی بی بی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"کب تک رقم چاہیے۔" وہ دل ہی دل میں جوڑتی حیران تھی کہ امی نے ماسی کو اس کے پاس بھیجا ہے۔ ماہانہ خرچ ماہیر ماں کے ہاتھ پر رکھتا تھا۔ گھر کی خزانچی وہ ہی تھیں۔ ان حالات میں حریم کے پاس بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

"اس مہینے کے شروع میں دے دینا۔" ماسی نے احسان عظیم کیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔"

"مہربانی بی بی! ورنہ میں تو کام چھوڑنے کا سوچ رہی تھی۔ شیخ صاحب نے بھی پورے سال کی ایڈوانس تنخواہ دینے کا لارا لگا رکھا تھا۔ کل بات پکی ہو گئی تھی مگر اب تم دینے کا وعدہ کر رہی ہو تو میں شیخ صاحب کو کام سے جواب دے دیتی ہوں۔" ماسی نے خوشی خوشی اپنے اگلے پروگرام سے آگاہ کیا تھا۔

"سال بھر کی ایڈوانس تنخواہ۔" حریم ہکلا کر رہ گئی۔ اس کے خیال میں ماسی کو دو، تین مہینے کی تنخواہ چاہیے تھی۔

"تو اور کیا بی بی! اگلی اور وڈی دونوں کی ایک کروں گی۔" ماسی نے سر پر دوپٹہ باندھ کر دھونے والے کپڑوں کی گٹھڑی کو اٹھایا۔

"رہنے دو ماسی! کپڑے میں خود دھو لوں گی۔"

"کیوں؟ میں صاف نہیں دھوتی کیا؟ پسند نہیں آتے۔" ماسی نے فکرمندی سے پوچھا۔

"نہیں ماسی! ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ جزبز سی ہو کر فرنیچر جھاڑنے لگی۔ اب بھلا ماسی کو کیا بتاتی کہ تم جس رفتار سے تنخواہ بڑھاتی جا رہی ہو اتنے میں صرف نیچے کی صفائی کروالی جائے تو تب ہی کچھ بچت ممکن ہو سکے گی۔

"بی بی! ایک بات تو بتاؤ۔" ماسی پلٹ کر واپس آگئی تھی۔

"ہاں... بولو۔"

"نہ پہلے وعدہ کرو، غصہ تو نہیں کرو گی۔" ماسی کچھ متامل سی کھڑی رہی۔

"نہیں۔"

"پکی بات ہے۔" ماسی کو یقین نہیں آیا۔

"بات کی نوعیت دیکھوں گی۔"

"وہ کیا بلا ہوتی ہے۔" ماسی نے ہونق پن سے کہا۔

"چھوڑو اس بلا کو، تم بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔" حریم نے پھول جھاڑ کر گلدان میں سجائے۔

"بڑی بی بی سے تو نہیں کہو گی۔" ماسی نے رازداری کا وعدہ لینا چاہا۔

"نہیں۔"

"یہ مکان کیا بیچ رہی ہو؟"

"تمہیں کس نے بتایا ہے۔" حریم نے چونک کر پوچھا۔

"اڑتی اڑتی میں نے بھی سن لی ہے۔" ماسی نے سیاست دانوں والا گول مول جواب دیا۔

"ہاں... شاید۔" حریم کا دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبنے لگا۔

"پر... کیوں؟" ماسی نے انجان پن سے پوچھا۔

"کسی مجبوری کے تحت ہی بیچیں گے ورنہ اپنا ٹھکانہ کون چھوڑتا ہے۔" حریم نے اک گہرا طویل سانس حبس زدہ فضا کے سپرد کیا۔

"کیسی مجبوری؟"

"ہر بات بتانے والی نہیں ہوتی۔" حریم کو ماسی کی تجسس والی اس خو سے شدید چڑ تھی۔

"ہر بات چھپانے والی بھی نہیں ہوتی۔" ماسی نے معنی خیزی سے دیدے گھمائے۔

"کیا مطلب؟" حریم ٹھٹکی۔

"جانتی ہوں سب۔"

"تو پھر چسکے کے طور پر وجہ معلوم کر رہی تھیں محض زخم ادھیڑنے کے لیے۔" حریم کو ایک دم غصہ آگیا۔ ماسی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس کی بڑائی کے خیال سے حریم غصے کا گھونٹ اندر اتار کر خاموش ہو گئی۔

"نہ بٹو، نہ غصہ مت کرو۔" ماسی نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے ماسی تم جاؤ، ماہیر سے بات کروں گی اگر مان گئے تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر کام پر صبح نہ آنا۔" حریم سرد آواز میں کہتی پردے برابر کرنے لگی تھی۔

"بڑی بی بی ویسے اچھا تو نہیں کر رہیں۔ منہ چھوٹا اور بات بڑی، بیٹیوں کو ان کا جہز (جائز) حق دینا چاہیے۔" ماسی نے تاسف کا اظہار کیا۔

"اب کیا کرایوں پر دھکے کھاؤ گی۔"

"ماسی! تم جاؤ۔" حریم نے خفگی سے کہا۔

"جانتی ہوں بٹی! خفا مت ہو، زمیلہ کے لیے سونے کی بھی بن جاؤ گی، تب بھی تمہارا مقابلہ زوباریہ سے کرے گی، یہ ایک حقیقت ہے۔"

"ماسی!" حریم ششدر رہ گئی تھی۔

"کیا تم بھی زوباریہ کو جانتی ہو؟" اس کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر لفظ ادا ہوئے۔

"تو اور کیا؟"

"کیا کچھ جانتی ہو؟" حریم کے لبوں سے سرگوشی نما آواز نکلی۔

"وہ سب کچھ جو تم اس گھر میں دو سال رہنے کے باوجود نہیں جان سکیں۔" ماسی نے اپنے دیدے گھمائے۔

"ایسا کیا ہے؟؟"

"بتاؤں گی، ضرور بتاؤں گی، کبھی بڑی بی بی کی غیر موجودگی میں۔" ماسی کا انداز بڑا پراسراریت لیے ہوئے تھا۔

"ماہیر اور زوباریہ کے متعلق بتاؤ گی؟؟"

"ہاں۔۔۔ اور موبی کے بارے میں بھی۔"

"موبی کا زوباریہ اور ماہیر کے معاملے سے کیا تعلق؟؟" حریم الجھی۔

"بہت گہرا تعلق ہے، تم تو بہت بھولی ہو حریم بی بی! کبھی ارد گرد کے حالات پر غور نہیں کرتیں، ورنہ بہت کچھ جان جاتیں۔ جو کچھ پردے میں چھپا ہے۔" ماسی کو شاید تجسس کی آگ بڑھا کر لطف آ رہا تھا۔

"تم کام چھوڑ دو گی کیا؟" حریم کو اچانک خیال آیا۔ اگر ماسی کام چھوڑ دیتی تو پھر ہمیشہ اس نے بے خبر ہی رہنا تھا۔ فیفا اور ماسی کے علاوہ کوئی تیسرا فرد ایسا نہیں تھا۔ جو پردے میں چھپی بہت سی ایسی چیزوں کو واضح کر دیتا جو غیر واضح تھیں۔ پوشیدہ تھیں اور حریم کی ظاہری اور باطنی آنکھ سے اوجھل تھیں۔

"نہیں بی بی! نچلے حصے کی صفائی کرنے تو آتی رہوں گی۔"

"حریم! او حریم! اوپر کون سے مذاکرات کرنے لگی ہو۔ نیچے آؤ، میرا دل گھبرا رہا ہے، ساری رات میاں کے ساتھ اوپر رہ کر دل نہیں بھرتا، اوپر جا کر نیچے آنا بھول جاتی ہو۔" راحت بیگم کی پاٹ دار آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ ماسی جھاڑو سمیت نیچے کی طرف بھاگی تھی۔ حریم بھی گہرا سانس خارج کرتے سیڑھیاں اترنے لگی۔

☆ ☆ ☆

ماہیر سے اس نے رات کو ہی بات کر لی تھی۔ کچھ پل تو وہ سوچ کے جنگل میں کھو گیا تھا۔ پھر بولا تو لہجے میں واضح تھکن تھی۔ وہ دو، دو نوکریاں بھگتا کر آ رہا تھا۔ اس وقت جوڑ، جوڑ تھکاوٹ کا شکار تھا۔ پور پور میں تھکن تھی۔ اوپر سے ماسی کے مطالبے کو سن کر وہ کچھ اور پریشان ہو گیا تھا۔

"اگر ماسی کی ڈیمانڈ پوری نہ کی تو وہ کام چھوڑ گی۔ تم پر کاموں کا بوجھ آن پڑے گا۔ ماسی کو ہماری مجبوری ہے، اسے تسلی دینا، کچھ دن تک کو کروں گا۔" ماہیر کے چہرے پر تفکر کے سائے جھ رہے تھے۔ حریم کو اس کا یہ خیال رکھنے والا انداز بھاتا تھا۔ تاہم وہ ماہیر کو پریشان کرنا بھی نہیں چا تھی۔

"زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ ماسی ص کرنے تو آتی رہے گی۔"

"اور اگر اس نے کام چھوڑ دیا۔" وہ فکرمندی بولا۔

"تو کیا ہو گا۔۔۔ یہ باندی، یہ کنیز کس لیے ہے۔" نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"یہ باندی، یہ کنیز صرف ہماری خدمت کرنے لیے ہے۔" ماہیر نے اسی کے انداز میں جواب لوٹایا "یاد رہے صرف ہماری۔ "خدمت" کا مطا سمجھتی ہو نا۔" وہ ایک آنکھ کا کونا دبا کر شرارتی انداز بولا۔

"اوپر والی "خدمتیں" کوئی خلائی مخلوق کر جایا کر گی۔" حریم سرخ چہرہ لیے مسکرائی۔

"مثلاً" کون کون سی۔" وہ نیم وا آنکھوں دیکھتا حریم کو بری طرح ہراساں کر رہا تھا۔ اوپر سے بازو بھی ماہیر نے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ پو طرح اس کی گرفت میں تھی۔

"کھانا پکانا، کپڑے دھونا، استری کرنا۔ صفائی ستھ وغیرہ وغیرہ۔"

"اس میں میرے "مطلب" کی تو کوئی با نہیں۔" ماہیر نے مصنوعی آہ بھری۔

"میں مطلبی لوگوں سے ذرا دور دور رہتی ہوں حریم نے ہنستے ہوئے اٹھنا چاہا۔

"ہمیں قریب کرنے کے سارے داؤ آتے ہیں وہ ایک جھٹکے سے اسے قریب کرتا نرمی سے بولا تھا۔

"اپنا "پھیلاوا" تو سمیٹنے دیں۔" حریم نے جوتو

موزوں، کارپٹ پر پھینکی ٹائی، صوفے پر پڑی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اسی طرح دفتر سے لائی گئی فائلیں بھی بے ترتیبی کا شکار تھیں۔ اور بے ترتیبی سے حریم کو سخت الجھن ہوتی تھی۔

"آپ کو اچھی طرح پتا ہے۔ مجھے بے ترتیبی سے چڑ ہے۔ الجھن ہوتی ہے چاہے وہ چیزوں میں ہو یا زندگی میں۔" اس نے گرفت ڈھیلی جان کر چپکے سے اٹھنا چاہا۔

"چیزوں کی بے ترتیبی زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے یا زندگی کی۔" ماہیر کے ہاتھ اس کی طویل چوٹی آ لگی تھی۔ چپکے سے اٹھنا بے کار گیا تھا۔ ماہیر کی تمام تر توجہ اس کے ارد گرد بھٹک رہی تھی۔

"چیزوں کو ترتیب دے لیا جاتا ہے۔ اپنی پسند سے۔ ردوبدل بھی کر لی جاتی ہے البتہ زندگی خدانخواستہ بے ترتیبی کا شکار ہو جائے تو اسے سنوارنا مشکل ہے۔" حریم نے پرسوچ انداز میں جواب دیا۔

"کتنی سمجھدار بیوی ہے میری۔" ماہیر کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"تم سے ایسے ہی عقل مندانہ جواب کی توقع تھی مجھے۔" وہ "مطلبانہ" انداز میں کہہ رہا تھا۔ تعریف کر رہا تھا۔ حریم اس کی نظروں کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے بری طرح جھینپ گئی۔

"امی نے مکان بیچنے کی دوبارہ بات تو نہیں کی۔" دفعتاً حریم کو ایک خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"اتنے رومانٹک ماحول میں یہ دل جلانے والا قصہ حریم کے علاوہ اور کون چھیڑ سکتا ہے۔" ماہیر بے حد بدمزا ہوا۔

"بتائیے نا۔" حریم نے اصرار کیا۔

"رومانس تو ادھر ہی پڑا ہے۔"

"کہاں پڑا ہے الماری، اسٹور میں یا کسی صندوق میں۔" وہ چڑ کر بولا۔ حریم ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

"امی صبح بتا رہی تھیں کیا کہہ رہی تھیں۔" حریم نے ہنسنے کے باعث آنکھوں میں در آنے والی نمی کو دوپٹے کے کونے سے پونچھ کر کہا۔ وہ اس وقت نیچے ٹی وی والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ماہیر چینج وغیرہ نیچے کر کے کھانا کھا کر اوپر جاتا تھا۔

"کوئی نیا ارشاد جاری کیا ہو گا۔" ماہیر ماں کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ لحاظ، احترام اور فرمانبرداری کے اس پردے کو چاک کرنا اسے کبھی گوارا نہیں رہا تھا۔ پھر حریم نے بھی آج تک کبھی شکوہ نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی پرامن ماحول کو ایک فرد کی طرفداری کر کے خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اگرچہ امی اس کے سامنے تو خاموشی اختیار کر لیتی تھیں تاہم وہ جانتا تھا اس کی غیر موجودگی میں وہ حریم کو ہر لحاظ سے زک پہنچانے کی کوشش کریں گی۔ بس انہی باتوں کو مدنظر رکھ کر وہ خاموش تھا۔ اور اس پرامن ماحول کا سارا کریڈٹ حریم کے سر تھا۔

ماہیر عالم جانتا تھا۔ اس کا دل گواہ تھا۔ اور وہ حریم کی تمام تر قربانیوں کی دل سے قدر کرتا تھا۔

تبھی تو یہ شیشہ دل لڑکی دن بہ دن اسے اپنا دیوانہ بنا رہی تھی۔ اس کی ہنسی، ایک مسکراہٹ، ذرا سی خوشی کے لیے ماہیر اپنی تمام تر تھکن بھلا کر چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگتا تھا تاکہ وہ جو دن بھر کی مصروفیات بلکہ تھکا دینے والی مصروفیت کے باوجود ایک ایک لمحہ اس کے گھر آنے کا انتظار کرتی تھی ماہیر کے چہرے پر پھیلی تھکن اور باہر کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے چھا جانے والی بے زاریت کو محسوس کر کے اپنے دل کی اس ننھی سی خواہش کو اس کے آرام کی خاطر گہری نیند نہ سلا لے۔

"ماسی سے مذاکرات چل رہے تھے۔ امی کو نیچے اختلاج ہونے لگا تھا۔ کہنے لگیں رات بھر میاں سے باتیں کر کے دل نہیں بھرتا۔ نیچے اترنے کا نام نہیں لیتی۔" حریم لبوں پر مسکراہٹ سجائے بتا رہی تھی۔

"امی بھی کمال کرتی ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں، امی نے اب کمال، دھمال ہی کرنا ہے۔ کچھ اور باقی جو نہیں رہ گیا کرنے کو۔ نند بیاہ کر گھر سے نکال دی۔ بہت بھاری تھی میری بیٹی بہو رانی پر۔ نجانے کتنی دعائیں مانگی تھیں اس نے زمیلہ کے گھر سے نکل جانے کی۔ ساس کو کان سے پکڑ کر کچن سے

فارغ کیا۔ پھر ایک کونے سے لگا کر چپکا دیا۔ یہی قدر ہے میری یہی عزت ہے میری۔ کسی معاملے میں مشورہ نہیں لیا جاتا۔ بیٹی میری چکی کے پاٹوں میں گنک کی طرح پیسی جارہی ہے۔ ہماری بہو کے سلیقے کی مثالیں زمیلہ کو دی جاتی ہیں۔ ان کے سگھڑاپے کی میری بیٹی کے سسرال میں دھوم ہے۔ اب سمجھی ہوں میں کیوں بھاگ بھاگ کر دعوتیں کی جاتی تھیں۔ صرف نند کا کلیجہ ساڑنے کے لیے۔ بیٹے کو فرصت نہیں' بیوی کی زلفیں سنوارے یا بہن کے معاملات پر نظر دکھے ہائے میری معصوم بچی۔" امی نے ایک بلند چیخ ماری تھی۔ حریم بے حد شرمندہ سی پشیمان ہو کر ماہیر سے الگ ہوئی تھی۔ جس طرح راحت بیگم دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ حریم گویا شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ البتہ ماہیر کے تاثرات مختلف تھے۔ اس کی پیشانی پر دو ناگوار سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ اور وہ غصے سے لب بھینچے شاید خود کو کچھ کہنے سے روکنا چاہ رہا تھا۔ جبکہ امی کو اپنی اس غیر اخلاقی حرکت پر قطعاً "کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ ان کا اپنا ہی واویلا جاری و ساری تھا۔

"آخری اس پوری تقریر کا کوئی مقصد بھی ہے۔" ماہیر کو بالآخر بولنا ہی پڑا۔

"دماغ چل گیا ہے میرا۔ پاگل کتنے نے کاٹ لیا ہے۔ اسی لیے بک بک کیے جارہی ہوں۔" امی کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔

"کچھ بتا بھی دیں۔" ماہیر نے ضبط کا دامن نہ چھوڑا۔

"کیا بتاؤں۔ کوئی ایک مسئلہ ہے۔" انہوں نے خود پر رقت طاری کرلی۔

"تمہاری بیوی میری عزت قدر نہیں کرتی۔"

"واٹ۔" ماہیر اس سفید جھوٹ پر حیران ہی تو رہ گیا۔

"امی! کیا بول رہی ہیں آپ۔"

"سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ اب بالکل بدلی ہوئی راحت بیگم لگ رہی تھیں۔ کسی نے خوب ہی پمپ کرر کھا تھا انہیں۔ اور یہ کوئی زمیلہ کے علاوہ اور ہو سکتا تھا۔

"کبھی ہانڈی پکانے سے پہلے یہ نہیں پوچھا' کون سبزی پکانی ہے۔ اس بڈھی کی پسند کی چیز ہی پکالو محض اپنے شوق اور اپنی خواہشوں کی تکمیل کی ج ہے۔" اس الزام پر چپ چاپ کھڑی حریم تڑ اٹھی۔

"امی! یوں تو نہ کہیں۔ میرے لیے آپ کی ذا کیوں اہم نہیں۔ شروع میں آپ سے پوچھا کرتی تو آپ کو بہت غصہ آیا کرتا تھا۔ آپ کہا کرتی تھیں باوا نے بغیر سکھائے پڑھائے بھیج دیا ہے۔ میں تو ا لیے۔۔۔"

"میری گزشتہ باتیں پکڑ پکڑ کر میرے ہی منہ مارو۔ یہی میری اوقات ہے۔ ہائے ایسی بد زبانی انہوں نے اپنے گال بے دردی سے پیٹے۔

"امی! پلیز۔" ماہیر ایک دم بلند آواز میں بولا۔

"کام کی بات کریں۔ یہ فضول کی تکرار۔"

"تیری ماں کے پاس اب بے کار کی باتیں ر ہیں۔ اپنی بیوی سے سنتے رہو' کام کے افسانے گیہ نغمے' گود میں لٹا کر لوریاں بھی سنالے گی۔" وہ جل ب کر گویا ہوئی۔ حریم مارے شرم کے سر نہیں اٹھا تھی۔ ماہیر کو اتنے کشیدہ ماحول میں بھی بے تحاشا آگئی۔ وہ ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ امی جان اور بھی ہو گئیں۔

"اڑالو' میرا مذاق۔" وہ غصے سے دھاڑیں۔

"یہی عزت ہے ماں کی بیوی کے سامنے مجھ ہنسو۔" وہ بات کو اپنے رنگ میں ڈھال لینا جا تھیں۔

"کتنا اچھا مشورہ دے رہی ہیں میری والدہ تمہیر کچھ سبق حاصل کرو۔ گود میں لٹا کر لوری' واہ۔" ا اس کی آواز بہت دھیمی' سرگوشی نما تھی۔ اور صر حریم کی سماعتوں تک پہنچی تھی۔ اور وہ مزید سر جھکا شرمندگی کے عمیق گڑھے میں گرنے کو بے تا تھی۔ ادھر راحت بیگم کو اپنے واویلے میں بات کی

نہیں آئی تھی تاہم انہیں بیٹے کے خوشگوار تاثرات سے اپنی بات کے رائیگاں جانے کا احساس ہو گیا تھا۔

"بہن ایک برزخ میں جل رہی ہے۔ کسی کو احساس نہیں۔"

"کون سے برزخ میں۔" ماہیر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔ حریم کو اس نے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تھا۔

"تم ذرا چائے بنا کر لاؤ۔"

"میری بات سنے بغیر کہیں نہیں جائے گی۔" امی نے گرجدار آواز میں کہا۔ ان کے لہجے کی کڑک نے حریم کو بری طرح سہما دیا تھا۔

"کون سی بات؟ کیسا برزخ؟ اس حریم کی بچی کو چھوڑیں۔ مجھے زمیلہ کے متعلق بتائیں۔ خیریت تو ہے نا۔" وہ ماں کا دھیان تھر تھر کانپتی حریم سے ہٹا کر ایک دفعہ پھر اپنی طرف متوجہ کرچکا تھا۔

"نبیل کی ماں اور دادی نے میری بچی کی زندگی اجیرن بنادی ہے۔ ہر بات میں کیڑے' ہر کام میں نقص کھانا پسند نہیں آتا۔ پہنے اوڑھے تو پھر بھی ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ ہر بات پر طعنے تیار کر رکھے ہوتے ہیں۔ بولتی ہیں' زمیلہ کو کپڑے سینا نہیں آتے۔ انہیں بہو چاہیے تھی یا درزن' میری نازوں پلی بیٹی سوکھ کر کانٹا بنتی جارہی ہے اوپر سے حریم کی مثالیں دے کر ساس' بہو میری' بچی کا جی بری طرح سے جلاتی ہیں۔ نگوڑیوں کو زمیلہ میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ بات بہ بات حریم کی تعریفیں۔ جانے کون سا ٹونا' جادو کردیا ہے اس بھولی صورت پر کوئی یقین نہ کرے۔ ہائے میں کس سے کہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔" راحت بیگم نے اب پھک پھک کر رونا شروع کردیا تھا۔

"اس ساری تقریر میں قابل اعتراض بات تو حریم کی تعریفیں ہیں۔ آخر زمیلہ کی ساس کو حق کیا پہنچتا ہے آپ کی بہو کی تعریف کرنے کا۔ یہ اختیار کس نے انہیں دیا۔ بھئی کمال ہے۔ بہو تو یہ آپ کی ہے۔ بیوی میری ہے اور لوگ فضول میں تعریفیں کرتے ہیں۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا پھر بھی حریم کو ہنسی آگئی جسے چھپانے کے لیے وہ قدرے رخ موڑ گئی تھی۔

"چٹکیوں میں اڑادو میری بات۔ بیوی کو آنسو بہاتا دیکھ نہیں سکتے۔ ماں چاہے ساری رات روتی تڑپتی رہے' تمہاری بلا سے۔" انہیں ماہیر کی اس قدر سنجیدگی پر بھی بہت تاؤ آیا۔

"اماں! میری پیاری اماں جان' ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے۔ خدانا خواستہ زمیلہ کے ساتھ کوئی بڑی پرابلم نہیں۔ ایسے مسئلے ہر گھر میں موجود ہیں۔ ہر لڑکی کو درپیش ہیں۔ صرف برداشت اور صبر کا مادہ ہونا چاہیے۔ ایکچوئلی' نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہوتے' ان کے رہن سہن کو سمجھتے ان کے مزاج آشنا ہوتے آخر وقت تو لگتا ہے۔ حریم کو دیکھ لیں۔ یہ بھی تو ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ کرچکی ہے۔ اسی طرح زمیلہ بھی کرلے گی۔" ماہیر سے روانی میں بولتے غیر دانستہ ایک غلطی پھر سے سرزد ہو گئی تھی یعنی حریم کی تعریف اور وہ بھی ان حالات میں جب امی کے غصے کا گراف بہت اوپر جاچکا تھا۔ اب بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ کمان سے نکلے تیر والا معاملہ تو ہو چکا تھا۔ امی ایک دم مشتعل ہو گئیں۔

"ہم نے کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے ہیں حریم پر' کون سی قیامتیں نازل ہوئی ہیں اس گھر میں تمہاری بیوی پر۔ بس یہی دن دیکھنے تھے میں نے ایسے مٹی کے مادھو تو نہ تھے کیا گھول کر پلا ڈالا ہے اس جادو گرنی نے تجھے۔"

"امی! پلیز کول ڈاؤن۔" اس نے فوراً" آگے بڑھ کر ماں کو بازو کے حلقے میں لے لیا۔

"حریم۔! امی کے لیے ٹھنڈا پانی لاؤ' بلکہ سیب کا جوس نکال لاؤ۔"

"جی اچھا۔" حریم تو جان بچ جانے پر شکر ادا کرتی لرزتی ٹانگوں سمیت کچن کی طرف بھاگی۔

"امی! تحمل سے میری بات سنیے۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں' زمیلہ کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کیا کریں۔ اگر اسے میکے جیسا ماحول میسر نہیں تو کچھ عرصہ صبر کرے' نبیل اسے اپنے پاس بلوالے گا۔ اچھا لڑکا ہے سمجھدار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فرمانبردار ہے۔

احساس رکھنے والا ہے۔ اپنے گھر والوں کے لیے بہت نرم ہے۔ میری طرح۔ سب ایسے ہی ہوتے ہیں کوئی دوسری عورت ماں اور بہن کا مقابلہ نہیں کر سکتی برابری تو دور کی بات ہے۔ بیویاں بھی مل جاتی ہیں۔ والدین سے رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ بہن بھائیوں سے محبت فطری ہے مگر جنہیں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر گھر لاتے ہیں۔ ان کے حقوق کے بارے میں رب کائنات کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اگر آپ کو حریم سے کسی بھی قسم کی شکایت ہو تو یوں سرعام واویلا کرکے ڈی گریڈ مت کیا کریں۔ اسے زمیلہ نہ سہی بہو سمجھ کر نرمی سے پیار سے اس کی غلطی کو بتایا کریں۔ نشاندہی کیا کریں۔ آپ میری ماں ہیں آپ کا درجہ' آپ کی حیثیت اور اہمیت' رتبے اور مقام تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بات سمجھ لیں ہمیشہ کے لیے۔ میں آپ کی دوائیاں لینے میڈیکل اسٹور جا رہا ہوں۔ کچھ اور چاہیے' کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتادیں۔" وہ ماں کے ہاتھ پر نرمی سے بوسہ دیتا کھڑا ہو گیا۔

"حریم! امی کی دوائیوں کا نسخہ تو لانا۔" وہ دور سے آواز دیتا سوچوں میں گم بیٹھی راحت بیگم کو بغور دیکھنے لگا تھا۔ ماہیر کے رواں لہجے' لفظوں کی مٹھاس نے ان کے دل کو اک عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ لفظ اک روشن دلیل کی مانند ان کے دل میں اتر گئے تھے۔

"تم نے کبھی نہیں سوچا' بہن کی سسرال چکر لگانے کا۔ وہ لوگ تو یہی سمجھتے ہوں گے' زمیلہ کے پیچھے کوئی نہیں۔" امی نے کھوئے کھوئے لہجے میں شکووں کی پوٹلی میں سے ایک ہلکا پھلکا سا شکوہ برآمد کر لیا تھا۔

"اکثر سوچتا ہوں بارہا سوچتا ہوں۔ مگر اس قدر ٹف شیڈول میں سے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔ دو دو جگہ جاب کرتا ہوں۔ آپ کے سامنے دن رات کی روٹین ہے۔ سنڈے صرف آرام کرنے کے لیے ہوتا ہے مگر اس اتوار کو میں اور حریم' زمیلہ کی طرف چلیں گے۔"

وہ حریم کے ہاتھ سے دوائیوں کا نسخہ پکڑ کر بائیک کی چابی لیے باہر نکل گیا۔

"تیری طرح سب کیوں نہیں سوچتے ماہیر! سب سے منفرد سب سے جدا کیوں ہے میرے بچے! اور تیری خوشیوں کو سلامت رکھے۔" وہ حیرت سے زیر لب بڑبڑا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اور ماہیر کی خوشیاں کیا ہیں؟ کس سے ہیں۔" نفیسہ پھوپھو تخت پر امی کے قریب بیٹھی تھیں۔ وہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی تھیں۔

"بھلا کس سے؟" انہوں نے ہونق پن کردی تھی۔

"بھابھی بیگم! آپ بھی بس بھلا گیا کہوں' ماہیر کی ہر خوشی آپ سے حریم سے وابستہ ہے اگر خوش ہوں گی تو ماہیر خود بخود ترو تازہ ہو جائے رہے گا' ذہنی اور قلبی سکون گھر سے اور گھر ہمراہی سے حاصل ہوتا ہے۔ تھکا ہارا مرد بیوی کی مسکراہٹ اور بچے کی قلقاری سن کر فریش ہو جاتا ہے۔" وہ لوہا نرم دیکھ کر چوٹ کرنے سے باز نہیں تھیں۔

"بچہ۔۔۔ میرے ماہیر کا بچہ۔" ان کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

"یہ سب کیا دھرا اس حریم کا ہے۔" انہوں نے جانے والی نظروں سے حریم کو دیکھا تھا۔ بہت دنوں بعد وہ اس موضوع کی طرف پلٹی تھیں۔

"اس میں بچی بے چاری کا کیا قصور۔" پھوپھو گویا ماتھا پیٹا۔

"ارے نفیسہ! تم نہیں جانتیں' یہ آج کل کی لڑکیوں کے ڈھونگ' چالاکیاں۔" انہوں نے ترخ کر نند کی ہر وقت بہو کی حمایت انہیں بہت کھٹکتی تھی۔ حریم نے اک زخمی سی نظر راحت بیگم کی طرف اچھالی۔ دل کے نہ جانے اس لمحے کتنے حصے ہوئے تھے۔

"بچے جھنجٹ لگتے ہیں' عذاب لگتے ہیں' یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے' سب جانتی ہوں

میری نظروں سے اوجھل ہو کر کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔" وہ دانتوں سے گویا پتھر توڑ رہی تھیں۔

"کون سا کارنامہ۔" پھوپھو بے چاری ہکا بکا رہ گئیں۔

"اس نے خود بچہ ضائع کروایا ہے' قتل کیا ہے اس نے میرے پوتے کو۔" ان کے وثوق بھرے لہجے نے حریم کے قدموں کو لرزا دیا۔

"بھابھی بیگم! خدا کے لیے' کیسی باتیں کرتی ہیں۔" نفیسہ پھوپھو بوکھلا کر دبی آواز میں بولیں۔

"بہو سن لے گی' کیا سوچے گی ہماری ذہنیت کے بارے میں۔"

"میں اس کی ذہنیت اور سوچ پر لعنت بھیجتی ہوں۔ ماہیر کی آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہے۔ اس حسین صورت کے پیچھے والا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ مگر میں تو سب جان چکی ہوں۔" وہ ترخ کر بولیں۔

"کیا جان چکی ہیں؟" اب برداشت اور صبر کا مظاہرہ کرنا پل صراط سے گزرنے کے مترادف تھا۔ حریم بپھر کر لاؤنج میں آتے ہوئے بولی۔ لال بوٹی آنکھوں میں وحشت آنسو بنی ناچ رہی تھی۔

"تمہارے سارے کرتوت۔" انہوں نے دوبدو جواب دیا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد پھر سے طوفان اٹھ آیا تھا۔ محض ماہیر کے گھر سے نکلنے کی دیر تھی۔ اور اب وہ تنہا اس طوفان کا مقابلہ کر رہی تھی۔

"کون سے کرتوت کھل کر بتائیے۔"

"حریم بیٹی! جاؤ تم' بھابھی بیگم ذرا غصے میں ہیں۔" پھوپھو بوکھلا کر بولیں۔

وہ تو اپنی بھابھی کے ہر رنگ سے واقف تھیں۔ عمر گزر گئی تھی ایک ساتھ رہتے ہوئے۔ ان کے پل میں تولہ' پل میں ماشہ والے بھیس بدلتے مزاج کو سمجھنا کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ رات کو خوش باش سویا کرتیں' صبح اٹھتے اکثر منہ پھولا ہوتا تھا۔ پوچھنے پر پتا چلتا کہ رات بھر مچھر کاٹتے رہے ہیں' مگر مزاج برہم مچھر کاٹنے کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا۔ سارا قصور اس کمرے کا تھا۔ جوان کی آرام گاہ تھی۔ کمرے کا روشن دان گلی میں تھا اور پچھلی دو انچ چوڑی گلی کھڑکیوں اور روشنی وغیرہ کے لیے چھوڑ کر پھر مکان کی چار دیواری تعمیر کروائی گئی تھی۔ گلی میں گٹر بھی تھا اور گھر کا فالتو کاٹھ کباڑ بھی پیچھے پھینک دیا جاتا تھا۔ اکثر کوڑا بھی وہیں رکھا نظر آتا' جس کی وجہ سے مکھیاں اور مچھر وافر مقدار میں پائے جاتے تھے۔ بھابھی بیگم کا خیال تھا محض انہیں ذہنی کوفت سے دوچار کرنے کے لیے ساس محترمہ نے یہ کمرہ عنایت کیا ہے۔

"پھوپھو! امی اکثر غصے میں زیادتی کر جاتی ہیں۔" حریم آنسو پیتی پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ امی کا کھانا اس نے تخت پر ٹرے میں سجا کر رکھ دیا تھا۔

"دیکھ رہی ہو اس کی بدزبانی دوسروں کے سامنے منہ میں گھنگنیاں ڈال کر کاموں میں جتی رہتی ہے۔ زمیلہ کی ساس ایسے ہی تو اس فراڈن کے عشق میں مبتلا نہیں۔ میری بچی کا جینا محال کر رکھا ہے۔ جب بھی بات کریں گی گویا پتھر پھوڑیں گی۔ اپنی بہو میں کوئی خوبی نہیں دکھتی۔ ہماری بہو کے گیت گائے جاتے ہیں۔ ان سب چالوں کو سمجھتی ہوں میں۔" وہ بھنا کر نند کے سامنے پوشیدہ رکھنے والی باتیں بھی ظاہر کر چکی تھیں۔ نفیسہ گویا تمام معاملہ سمجھ کر سر ہلانے لگیں۔ ان تمام جلی کٹی باتوں کا پس منظر معلوم ہو گیا تھا' کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"بھابھی بیگم! یہ آپ کے لیے تفخر کی بات ہے۔ لوگ حریم کی توصیف نہیں' بلکہ آپ کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہیں۔"

"ہمیں نہیں چاہیے لوگوں کی ستائش۔" انہوں نے تنفر سے سر جھٹکا۔ تب ہی ماہیر دوائیاں لے کر آگیا تھا۔ امی کے ماتھے پر موجود دو بل دیکھ کر اس نے گہرا طویل سانس کھینچ کر آہ بھرلی۔

"فطرت کبھی بدل نہیں سکتی۔"

☼ ☼ ☼

زمیلہ کے سسرال میں ان کی آمد بہت اچانک تھی۔ دادی' ساس (اماں بی) بخار میں پھنک رہی

تھیں۔ حریم کو دیکھ کر گویا ہشاش بشاش ہو گئیں۔ ان کے جوش و خروش اور والہانہ الفت کے اظہار سے یقین نہیں آتا تھا کہ زمیلہ کے ساتھ ان کا رویہ بہت برا ہو گا۔

"میں کہوں حریم بیٹی کو راحت نے کبھی آنے کیوں نہیں دیا۔ خود ہی بانہیں ہلاتی آجاتی ہے۔" اماں بی نے بڑی چاہ سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ ماہیر باہر ڈرائنگ روم میں مردوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حریم کو نازش (زمیلہ کی نند) اماں بی کے کمرے میں لے آئی تھی۔

"بس مصروفیت کی وجہ سے آ نہیں سکی۔" حریم نے کچھ تو کہنا ہی تھا۔

"خود بھی ہٹی کٹی ہے، بستر توڑنے کا سوا کام نہیں۔ گدھے پر بھی اتنا بوجھ نہیں لادتے۔" اماں بی نے ہمدردی سے کہا۔

"نن... نہیں، ایسی بات نہیں۔" حریم بری پھنسی تھی۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی۔ اسے زمیلہ کے اچانک آجانے کا خدشہ لاحق تھا۔ اماں بی کو تو گویا کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ اسی پل زمیلہ کی ساس بھی آگئیں۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی شکایتوں کے دفتر کھول لیے۔

"دس بجے شریفوں کی بیٹیاں اٹھتی ہیں کیا۔"

"اسے شروع سے عادت ہے۔" حریم نے دبی آواز میں کہا۔

"ہمارے ہاں رواج نہیں، دن چڑھے تک سونے کا، مہارانی صاحبہ اپنی مرضی سے نیچے اترتی ہیں۔" اماں بی نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"آہستہ آہستہ آپ کے ماحول میں ایڈجسٹ کر جائے گی۔" وہ تحمل سے بولی۔

"مجھے تو مہارانی کے طور طریقے ایسے نہیں لگتے۔ شادی سے پہلے چہرے پر کیسا بھولپن تھا۔ بس نظریں دھوکا کھا گئیں۔" اماں بی کا ملال پھر سے عود آیا۔ نازش ٹرالی میں چائے کے لوازمات لے آئی۔

"زمیلہ کہاں ہے؟"

"بھی آتی ہیں۔" نازش نے بے پروائی سے

"اپنے کمرے میں ہوگی۔" آنٹی جل بھن کر بولیں۔

"کھانا، پینا اور سونا، تین سبق پڑھا کر ماں ہے۔" اماں بی نخوت سے کہنے لگیں۔ بخار وخار چکا تھا۔ زمیلہ کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے وہ مکمل پرفام میں آچکی تھیں۔

"نہ کسی کا لحاظ، نہ ادب، نرے بے حیائی مظاہرے۔" آنٹی نے چائے کپ میں ڈال کر ح طرف بڑھائی۔

"نبیل سے روز فون پر چار، چار گھنٹے بات ہے۔ ہزاروں روپوں کے کارڈ جھونک ڈالتی ہے۔

"ہمارے بچے کو ورغلاتی ہے ہمارے خلاف، اکٹھے ہیں تو پھر الگ سے خرچے کا مطالبہ کس ل" آنٹی کا بھی دھیرے دھیرے اشتعال بڑھ رہا تھا۔

"پہلے پانچ سال تو میں ہرگز ساتھ نہیں بھیجوں نبیل ہر سال آتا ہے۔ ادھر جا کر تو اس نے سیدھے سے پوتے کو اپنے جال میں پھانس لینا۔ اتنا احمق سمجھ رکھا ہے ان ماں، بیٹی نے ہمیں۔ را فون کھڑکا دیتی ہے آئے دن، ویزا کیوں نہیں بھیجتا، ویزے کیا درختوں پر لگتے ہیں۔" اماں بی چ کی چسکیاں بھرتے ہاتھ نچا کر بولیں۔ یہ ہی زبان عرصہ پہلے شہد ٹپکایا کرتی تھی۔ ساس محترمہ کے ابھی تک حریم کے ذہن میں تازہ تھے۔ کتنے پیار کہا کرتی تھیں کہ آہستہ آہستہ زمیلہ کھانا پکانا جائے گی، بلکہ ہم خود سکھالیں گے اور شاید وہ اپنے پر صرف کھانا ہی نہیں بہت کچھ سکھانے کی کوشش تھیں۔

"ذرا ذرا سی بات پر آنسو بہانا شروع۔" نازش بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو، جاؤ یہاں سے۔" آنٹی نازش کو جھڑک کر اٹھا دیا۔ وہ بسورتی ہوئی اٹھ کر نکل گئی۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔ زمیلہ صاف کرنے میں جتی تھی۔ نازش کچھ دیر آنکھیں

پھاڑ کر دیکھتی رہی، پھر گلا کھنکار کر اندر آگئی۔

"آپ کی بھابھی شاید اگلے پچھلے حساب بے باق کرنے آئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" زمیلہ نے مڑ کر دیکھا اور پھر چولہا رگڑنے میں مصروف ہو گئی۔

"آپ کی شان میں قصیدے پڑھے جا رہے ہیں۔" نازش نے گویا زمیلہ کے بدلتے تاثرات سے لطف لیا۔

"امی نے بھابھی کو کیوں بھیجا ہے۔" وہ تلخی سے سوچنے لگی۔

"آپ اطمینان سے کچن کا کام ختم کرکے اندر آجائیے گا۔ حریم بھابھی سے ملنا ضروری نہیں، دوپہر کے کھانے کی تیاری زیادہ ضروری ہے۔" سیر کو سوا سیر مل گیا تھا۔ جس کا پلڑا ہلکا تھا۔ خاموشی اسی کا نصیب تھی۔ زبان بندی کا بھی اسی کو حکم دیا گیا تھا۔ زمیلہ بھرے دل کے ساتھ اب برتن مانجھنے لگی تھی۔

"بات سنو نازش۔" اسے پلٹتا دیکھ کر زمیلہ دبی آواز میں بولی۔

"میرا ایک کام کرو گی۔"

"کام..." نازش پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"برتن مجھ سے نہیں دھوئے جاتے، ہانڈی بھی نہیں پکاؤں گی۔"

"نہیں... کام کی نوعیت اور ہے۔"

"بھلا کیا؟" نازش نے دلچسپی سے پوچھا۔

"حریم بھابھی سے کہہ دینا میں بازار گئی ہوں۔"

"مگر کیوں؟" نازش حیران ہوئی۔

"بس ایسے ہی۔" زمیلہ کا دل اور بھی حریم سے کھٹا ہو گیا تھا۔

"نہ جانے کون کون سی میرے متعلق باتیں انہیں بتا رہی ہوں گی۔ امی کے گلے بھی الگ سے، دل کی بھڑاس نکالنے کو میرے سسرال والے ہی ملے تھے۔" تنفر سے سوچتی رہ گئی۔

"نا بابا! یہ کام میں نہیں کر سکتی۔" نازش نے جھٹ سے انکار کیا۔

"کیوں؟"

"اماں بی سے بے عزت نہیں ہونا، کیا خبر، حریم بھابھی کے سامنے شائستگی کا چولا اتار کر جوتی پکڑ لیں۔" نازش نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اچھا..." وہ بددل سی ہو گئی۔

"ماہیر بھائی سے مل لی ہیں، مگر بھابھی سے کیوں نہیں۔" نازش نے تجسس دبا کر پوچھا۔

"کیا کوئی رنجش چل رہی ہے۔"

"ایسی بات نہیں۔" زمیلہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

"ویسے آپ دونوں کی دوستی تو بالکل نہیں۔"

"میرے اور تمہارے درمیان بڑے بہناپے کے تعلقات ہیں۔" زمیلہ جل کر رہ گئی۔ تب ہی امی لشتم پشتم، کچن میں چلی آئیں۔

"تم نے کپڑے بھی نہیں بدلے، ہمارے سر میں ساہ ڈلوانا چاہتی ہو، یہ ماسی سی صورت لے کر بھاوج سے ملو گی، جاؤ جا کر کپڑے بدل کر آؤ۔" ساس نے دو پل میں جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنی ساس کی ساری زیادتیوں کا بدلہ وہ زمیلہ سے لیتے ہوئے بڑا اطمینان محسوس کرتی تھیں، کوئی تو تھا ان سے بھی دبنے والا۔

"بھابھی تو اپنی بھاوج سے نہیں ملنا چاہتیں۔" نازش کی زبان پر پھر سے کھجلی ہوئی۔

"کیوں؟" انہوں نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔ زمیلہ دہل کر رہ گئی تھی۔

"اپنی بھابھی کو پسند نہیں کرتیں شاید۔" نازش نے مزے سے کہا۔

"وہ تو اول روز سے نظر آرہا ہے۔ مفت میں ایک کنیز مل گئی ہے۔ خوب رعب جمائے جاتے تھے بے چاری پر، کبھی سکھ کا سانس نہیں لینا نصیب ہوا حریم کو۔" ان کے لہجے میں تاسف بھر گیا۔

"نہ جانے کون سے ظلم کی داستان سنا ڈالی ہے بھابھی نے انہیں۔ اب میری اور بھی شامت آجائے گی۔ بھابھی! آپ نے اچھا نہیں کیا۔" وہ بھرے دل سے سوچنے لگی۔

"اب کس مراقبے میں گم ہو چکی ہو۔"

"جی امی!" وہ منمنا کر رہ گئی۔

"بھاڑ میں گئی امی۔" انہوں نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"جاؤ کپڑے بدل کر آؤ' بیس دفعہ بکواس کی ہے۔ اثر نہیں ہوتا کسی بات کا' بکتے رہو ان کی بلا سے۔" وہ تڑختی ہوئی باہر نکل گئیں۔ زمیلہ کو کام ادھورا چھوڑ کر جانا پڑا۔ جلدی جلدی کپڑے پہن کر نیچے آئی تو پھر سے ساس محترمہ نے سرتاپا جائزہ لیا۔

"زیور کیوں نہیں پہنا۔" ان کی تنقیدی نظریں زمیلہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"تم نے کیا اپنی اماں کی طرح سب کو سمجھ رکھا ہے۔ بہو کا زیور نہ جانے کس کھوہ میں پھینک دیا۔ کان بھی خالی' ہاتھ بھی خالی' بیاہتا لڑکیاں زیور پہنے اچھی لگتی ہیں۔ گلے میں اور ہاتھوں میں کچھ پہن کر آؤ۔"

"جی امی!" وہ پھر سے پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"تمہیں اللہ ہی سمجھے حریم بھابھی! نہ جانے کون کون سے راز فاش کرنے چلی آئی ہو میری زندگی کو مزید جہنم بنانے' تمہیں ذرا بھی سکھ نصیب نہ ہو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دراز میں سے زیور نکالتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"اب نہ جانے کتنے مہینے اسی بات کی تکرار ہوتی رہے گی۔ اونہہ' بے چاری حریم! کوئی ہم سے پوچھے' کس قدر گھنی اور حسین ہیں' خاموش رہ کر پشت میں خنجر گھونپنے والی۔"

☼ ☼ ☼

"یہ پیٹھے کا حلوہ ہے۔" اماں بی نے اسٹیل کا ڈونگہ اٹھا کر پٹخا۔

"اپنی بھاوج سے کوئی ایک ڈش پکانا سیکھ لینی تھی۔"

"بڑا ذائقہ ہے بچی کے ہاتھ میں۔" فرحت بھی حریم کی تعریف میں سردھن رہی تھیں۔ زمیلہ آنسو پیتی ڈونگہ اٹھا کر کچن میں رکھ آئی۔ کتنی محنت سے پیٹھا چھیل کر پکایا تھا۔ ہاتھ تھک گئے تھے اتنا اور موٹا چھلکا اتارتے ہوئے۔ بھونتے ہوئے کتنا اتر گئے تھے گویا۔ کچھ دیر بعد نبیل کا فون آنے والا وہ سب سے نظر بچا کر موبائل اٹھائے چھت پر چڑھ گئی تھی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ پہلی بیل پہ نے یس کا بٹن دبالیا۔

"نبیل!" آنسوؤں کی یلغار نے حلق میں گولا دیا۔

"کیا ہوا؟ خیریت۔" نبیل نے بے قراری سے پوچھا تھا۔ نبیل کی بے قراری میں زمیلہ کا قرار تھا۔ تب ہی تو کچھ پل کے لیے وہ شانت ہوئی۔

"خیریت نہیں ہے۔" وہ آنسو روکتے ہوئے کی طرف بڑھ گئی۔ آواز حتی المقدور ہلکی رکھی تھی

"بتاؤ تو سہی۔" نبیل نے فکر مندی سے کہا۔

"امی اور دادی نے کچھ کہہ دیا ہے۔"

"وہ کب نہیں کہتیں' ہر وقت کے طعنے تشنے" زمیلہ نے تلخی سے کہا۔

"یار! برداشت کر لیا کرو۔" ہمیشہ کی طرح نبیل اس کا غصہ کم کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔

"کہاں تک برداشت کروں۔ ضبط کی ایک حد ہے۔" زمیلہ گویا پھٹ پڑی۔

"کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔"

"یہاں مسئلوں کے انبار ہیں' کیا کچھ بتاؤں۔" جل کر بولی۔

"کچھ نہ بتاؤ' کوئی اپنی بات کرو۔"

"ابھی میرا مزاج بہت برہم ہے۔"

"کب تک مطلع صاف ہوگا۔" نبیل شرارت سے بولا۔

"شاید کبھی نہیں۔" وہ پھر سے رونے لگی۔

"ہوا کیا ہے؟" نبیل فکر مند ہوا۔

"امی نے کیا کہہ دیا ہے آخر۔" وہ جھنجلایا۔

"امی کے کہنے سننے کا افسوس نہیں۔"

"تو پھر کیا دادی نے۔" نبیل کچھ پل کے خاموش ہوا۔

"بزرگ سمجھ کر درگزر کر دیا کرو۔"

"دادی کا بھی مسئلہ نہیں۔" زمیلہ کو نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا۔

"مسئلہ تو میرے اپنوں نے کھڑا کیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا' بھابھی میری زندگی میں تلخیاں گھولنے کی کوشش کریں گی۔"

"بھابھی! کون سی بھابھی؟" نبیل حیران ہوا۔

"حریم بھابھی!" زمیلہ نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"کیا کہا ہے بھابھی نے۔"

"جو نہیں کہنا چاہیے تھا' گھر میں سو طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ سارے کچے چٹھے کھول دیے ہیں۔ میری عزت دو کوڑی کی کر کے چلی گئی تھیں۔ اپنے گھر والوں کو تو آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ میرا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔" زمیلہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"ہمارے گھر کے معاملات میں انہیں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔" نبیل کو بے تحاشا غصہ آیا۔

"میں آج ہی ماہیر سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں' آپ بھائی سے کچھ مت کہیے گا' میں ابھی امی سے فون پر بات کرنے لگی ہوں۔" اس نے سوں سوں کرتے ہوئے نبیل کو منع کیا۔ فون بند کر کے وہ بھرے دل سے امی کو فون کرنے لگی تھی۔

"مجھے ستا کر تم کیسے سکون سے رہ سکتی ہو' حریم بھابھی!" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے امی کے فون اٹھانے کا انتظار کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

فلیٹ نمبر 777 کے سامنے رک کر وہ کچھ لمحے سوچتا رہا تھا۔ یہ فلیٹ عارضی طور پر زرجان کی قیام گاہ تھا۔

ورجینیا آئے تقریباً" دو ہفتے اسے ہو چکے تھے۔ آنے سے پہلے وہ ایک سپر اسٹور سے کچھ شاپنگ کرنے کی غرض سے لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور پر پہنچ گیا تھا۔ اسٹور کھانے پینے کی امپورٹڈ اشیا سے بھرا ہوا تھا۔

اس سے آگے ایک بزرگ نما انکل گھومتے پھرتے جوس پی رہے تھے۔ ساتھ ایک چھوٹی سی آٹھ سالہ بچی تھی' پوتی یا نواسی' زرجان کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مطلوبہ اشیا اٹھا کر باہر نکلنے لگا۔ جب انکل کو جھک کر ایک طرف کوئی چیز پھینکتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ زرجان نے کچھ آگے ہو کر ذرا غور کیا تو پتا چلا کہ انکل جوس کا ٹن ایک طرف پھینک کر آگے بڑھنے لگے ہیں۔ زرجان بھی سر جھٹک کے جانے لگا تھا جب آٹھ سالہ بچی کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔

"دادو! ٹن اٹھا کر یوز باکس میں ڈالیے۔" شستہ انگریزی میں وہ بچی بڑی نخوت سے کہہ رہی تھی۔ "مجھ سے اتنی دور یوز بکس تک نہیں جایا جاتا۔" دادو حد درجہ کاہل معلوم ہوتے تھے۔

"اٹھائیے بھی' ورنہ۔" بچی کا انداز دھمکانے والا تھا۔

"ورنہ کیا؟" دادو لاپروائی سے چاکلیٹ کا ریپر پھاڑتے ہوئے بولے۔

"پولیس کو بلالوں گی۔"

"مجھے ان دھمکیوں سے خوفزدہ کرنے کی ضرورت نہیں' اب مجھ سے کمر جھکا کر یوز باکس میں خالی ٹن نہیں پھینکے جاتے۔" دادو چاکلیٹ کھاتے مزے سے بولے۔

"آپ امریکہ کو گندا کرتے ہیں۔ آپ امریکہ میں رہنے کے اہل نہیں۔" بچی پوری امریکن تھی۔ زرجان ان کی تکرار سن کر بے حد حیران ہوا۔ اسے اس بچی پر ٹوٹ کے پیار آیا تھا' ہر دیس کا ہر بچہ ایسی سوچ رکھتا تو گندگی اور غلاظت کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا تھا۔ دادو کو خالی ٹن اٹھانا پڑا تھا۔ دادو کے منہ کے بگڑے زاویے دیکھ کر زرجان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس وقت بھی یہی بات سوچتے ہوئے قدرے اچھے مزاج کے ساتھ وہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

"تم۔" زرجان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ وہ صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی

تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔" راحت بیگم کا ازلی جلال عود آیا۔
"اس کی یہ جرات۔"
"یا اللہ خیر۔" حریم چھت پر کپڑے پھیلانے گئی تھی' واپس آئی تو امی کو غصے سے لال بھبھوکا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔
"ابھی پوچھتی ہوں۔" فون پٹخ کر وہ سیدھی مشین میں سے کپڑے نکالتی حریم کے سر پر پہنچ گئیں۔
"کیا بکواس کرکے آئی ہو۔"
"کون سی بکواس۔" حریم خوف زدہ ہوگئی۔ امی کے تیور بہت بدلے بدلے تھے۔ پہلے سے بہت مختلف' اس کی چھٹی حس کچھ غلط ہونے کا اشارہ کررہی تھی۔
"یہ چالاکیاں کسی اور کو دکھانا۔" وہ یک دم دھاڑیں۔
"امی! کچھ بتائیں بھی۔" حریم روہانسی ہوگئی۔
"بتاؤں گی تو تمہارے باپ کے سامنے' فون کررکھا ہے میں نے۔"
"امی! مجھ پر غصہ ہے' مجھے بتائیے' میرے باپ کو کیوں پریشان کرتی ہیں۔" وہ ایک دم فکرمندی سے گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔
"اپنے باپ کا بڑا غم ہے' میرا کلیجہ ساڑتے ذرا دل نہ تیرا کانپا حریم!" وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھیں۔
"زمیلہ کے خلاف اس کی ساس کو کون کون سی داستانیں سنا کر آئی ہو۔"
"بخدا امی! ایسا کچھ نہیں' میرا یقین کریں۔" وہ روہانسی ہوکر منمناتی رہ گئی۔
"کیا یقین کروں' کتنا مان تھا مجھے تم پر' تیری اچھی فطرت پر' تو بھی عام سی نکلی' فطری عورتوں جیسا جلاپا رکھنے والی۔"
"امی! آپ نے بابا کو کیوں بلوایا ہے۔"
"تجھے اس کے ساتھ بھیجنے کے لیے۔" انہوں نے حریم کے قدموں کے نیچے سے گویا زمین کھینچ لی تھی۔

"امی! آپ۔" وہ ششدر سی ان کا چہرہ دیکھتی گئی۔
"میرا قصور کیا ہے؟"
"بہت بھولی بنتی ہو زمیلہ کو طلاق دلوا کر اپنی لنگڑی بہن کا رشتہ کروانا ہے' ساری حقیقت جان گئی ہوں۔" انہوں نے دھواں دھار رونا شروع کردیا تھا۔ حریم پل کے لیے ذہنی طور پر خود کو ہر قسم کی صورت حال سے نبٹنے کے لیے تیار کرنے لگی۔ وہ اس روتی دھوتی خودساختہ غموں پر ماتم کرتی عورت کو بھلا کیا کہتی۔ تیزی سے انہیں دیکھتی حریم ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی تھی۔
"ہیلو... حریم! خیریت' تم ٹھیک ہو۔" حانی نے کپکپاتی آواز میں چھوٹتے ہی پوچھا۔
"ہاں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔" حریم نے بہت سے ٹھہرے لہجے میں کہا۔
"ابھی راحت آنٹی کا فون آیا تھا۔ وہ کیوں اس قدر غصے میں تھیں۔"
"امی کی طبیعت ٹھیک نہیں' بس کچھ اپ سیٹ تھیں' غائب دماغی سے فون کردیا ہے' کرنا کہیں اور تھا۔ میں نے سوچا تمہیں اور بابا کو بتادوں' بابا سے فکر کی کوئی بات نہیں۔" حریم نے دبی آواز میں تفصیل بتایا۔
"تھینک گاڈ! ہماری تو جان ہی نکل گئی تھی۔" حانی نے گویا تشکر کے کئی سانس خارج کیے۔ پھر وہ بابا سے فون پکڑے پکڑے مخاطب ہوئی۔
"بابا! سب خیریت ہے' ایسا ویسا کوئی مسئلہ نہیں۔"
"حانی! میں اب فون رکھتی ہوں۔"
"بات تو سنو۔" حانی چیخی۔
"رات کو فرصت سے کروں گی۔" حریم فون رکھ کر پلٹی تو راحت بیگم کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔
"بہن کو خوش خبری سنادی۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
"امی! خدا کے لیے۔" حریم گویا زچ ہو اٹھی۔
"جشن منا لینا' میری بچی کو اجاڑ کر۔" ان کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ناچ رہی تھی۔ حریم کو بے تحاشا خوف سا محسوس ہوا۔
"کیا کروں' امی کی طبیعت تو سچ مچ بگڑی بگڑی محسوس ہورہی ہے۔" حریم کے دل میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔
"زمیلہ کو کچھ مت کہنا' میری زمیلہ کو کچھ مت کہنا۔" اب وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔ پہلی مرتبہ اس تمام عرصے میں حریم کو کسی ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
"امی! آپ کو پانی دوں۔" حریم تقریباً بھاگتے ہوئے کچن کی طرف بڑھی۔ پانی کی بوتل نکال کر وہ جب لاؤنج میں آئی تو امی پھر سے فون پر مصروف تھیں۔
"امی! کسے فون کررہی ہیں؟"
"ماہیر کے ابو کو۔" انہوں نے مصروف انداز میں جواب دیا۔
"یا وحشت۔" حریم پر شدید گھبراہٹ طاری ہوگئی۔
"امی! ادھر لائیں' میں کال ملادیتی ہوں۔ آپ ادھر اطمینان سے بیٹھیں۔" حریم زبردستی انہیں تخت پر بٹھا کر فون کی طرف بڑھی۔ کانپتے ہاتھوں سے ماہیر کا نمبر ملاتی وہ بار بار امی کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"ماہیر! جلدی گھر آئیں' امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"
"ہوا کیا ہے؟"
"پتا نہیں' زمیلہ کا فون آیا تھا۔ پھر امی مجھ پر غصہ کرنے لگیں۔ بابا کو بھی فون کردیا۔ اب یوں لگتا ہے ان کی ذہنی رو بھٹک گئی ہے۔" حریم نے کانپتی آواز میں بتایا۔
"بلڈ پریشر چیک کیا ہے۔"
"نہیں۔"
"میں ابھی آرہا ہوں۔"
"جلدی آئیے گا۔" فون بند کرکے وہ بی پی آپریٹس اٹھا لائی تھی۔ کلائی پر... لگا کر وہ امی کے لیے گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔ اسی پل موبی نے کمرے سے جھانک کر دیکھا تھا۔ حریم کو تو موبی کی ذہنی کنڈیشن بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ عجیب بے ڈھنگے انداز سے ہنستا' ناچتا جھوم جھوم کر حریم کو دکھا رہا تھا۔
"بھابھی! ادھر دیکھنا۔" وہ پیروں کو ایک مخصوص انداز سے زمین پر مارتا ٹھمکے کررہا تھا۔
"موبی! امی کی طبیعت ٹھیک نہیں' جاؤ کمرے میں۔" حریم نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
"میں تو ٹھیک ہوں' امی بھی ٹھیک ہیں' تم بھی ٹھیک ہو۔" وہ تالی بجا تا ہنستا رہا۔
"موبی! سنا نہیں تم نے۔"
"نہیں سنا۔" وہ اسے چڑانے لگا۔
"جاؤ' اپنے کمرے میں۔"
"نہیں جانا۔" اسے بھی گویا ضد آگئی۔
"میں ماردوں گی۔"
"مار کر تو دیکھو۔" موبی نے پھر مخصوص ردھم میں پیر زمین پر مارا' حریم کچھ الجھ کر موبی کو دیکھنے لگی۔
"مارو گی؟ موبی کو مارو گی۔" موبی مسلسل اسے چڑا رہا تھا۔
"اسے اندر بھیجو' اسے کہو دفع ہوجائے میری نظروں سے دور ہوجائے۔" امی پر جنونی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ حریم گویا بے بس سی ان دونوں ماں اور بیٹے کو دیکھنے لگی۔
"جا' دفع ہو' میری نظروں سے دور ہوجا۔" وہ گویا اپنے آپے میں نہیں تھیں۔ مجبوراً حریم کو موبی کے قریب آکر جھڑکنا پڑا۔
"موبی! چلو اندر' دیکھو امی کی صحت ٹھیک نہیں' ضد نہیں کرو۔"
"نہیں جاؤں گا' نہیں جاؤں گا۔" وہ ضدی انداز میں گویا ہوا۔
"ابھی تمہیں بتاتی ہوں۔" حریم کچھ سوچ کر فون کی طرف بڑھی۔
"ماہیر کو فون کرنے لگی ہوں' میری بات مان جاؤ۔" ریسیور اٹھا کر حریم نے مصنوعی دھمکی دے کر موبی کو ڈرانا چاہا۔

"نہیں ڈرتا میں۔" وہ بے خوف تھا۔

"تجھے مار ڈالوں گی۔" وہ تخت پر لیٹ کر پھنکارنے لگیں۔

"موبی کو مار دو گی؟"

"موبی!" حریم کو ایک دم اس پر غصہ آگیا۔ بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے حریم اندر لے آئی تھی۔

"تم نے موبی کو مارا۔" موبی بلاوجہ شور مچانے لگا تھا۔

"موبی تمہیں مارے گا۔"

"آرام سے بیٹھ کر کارٹون دیکھو' امی کو ہم اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔" حریم ٹی وی آن کر کے باہر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ جب موبی فرش پر لیٹ کر رونے لگا۔

"موبی کو بھابھی نے مارا' موبی کو بھابھی نے مارا۔" وہ چیختا جا رہا تھا۔

"موبی کہتا ہے' بھابھی دفع ہو جائے' یہاں سے بھابھی دفع ہو جائے۔"

"موبی!" ماہیر کی دھاڑ پر وہ ایسے خاموش ہو گیا تھا گویا اس کے گلے کا سوئچ کسی نے ایک جھٹکے کے ساتھ آف کر دیا ہو۔

"خاموشی سے لیٹے رہو' آواز نہیں آنی چاہیے تمہاری۔" ماہیر کی ہدایات سن کر وہ دبک کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ماہیر! امی کی پہلے بھی ایسی کیفیت ہو جاتی ہے۔" حریم بے دم سی راحت بیگم کو دیکھ کر بولی۔

"ہوں۔" ماہیر والٹ میں سے پیسے چیک کرتا ہوا حریم کی طرف متوجہ ہوا۔

"بی پی ہائی ہو جائے تب بھی ان کا نروس سسٹم متاثر ہو جاتا ہے' تم فکر مت کرو' شاید کوئی ٹینشن انہوں نے زیادہ ہی سر پر سوار کر لی ہے۔" ایمبولینس گیٹ پر آچکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد راحت بیگم کو اسپتال لے کر ماہیر چلا گیا تھا' جبکہ حریم اعصاب شکن لمحات کے شکنجے میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی کے اور تمہارے درمیان کیا بات تھی۔" ایک دن اور ایک رات کے بعد آج ماہیر امی کو لے کر اسپتال سے آگیا تھا۔ حریم ا لیے پرہیزی کھانا بنائے ان کا انتظار کر رہی تھی آنے کے بعد امی نے حریم سے کلام کرنا گوارا تھا۔ حریم تو ان کے ہتک آمیز رویّے کو دیکھ کر آپ میں کٹ کر رہ گئی۔ ماہیر بھی امی کا ہاتھ جھ چکا تھا۔ تاہم اس وقت تو وہ کچھ نہیں بولا تھا چائے لے کر اپنے کمرے میں آئی تو ماہیر کو بالکو رکھی چارپائی پر لیٹے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"اتنی گرمی میں کیوں لیٹے ہیں۔" وہ اس کے بیٹھے ہوئے بولی۔ ماہیر نے آنکھوں پر رکھے باز اسے دیکھا۔

"امی! اور تمہارے درمیان کیا بات ہوئی تھی"

"آپ کو امی نے کچھ بتایا ہے؟" وہ جھجک کر لگی۔

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔"

"کچھ زیادہ نہیں' غلط فہمی کی بنا پہ انہوں۔ حریم نے من و عن تمام واقعہ کہہ سنایا تھا۔ ماہ دوران خاموشی سے آسمان پر نظریں جمائے نہ جا کچھ سوچتا رہا۔

"تم نے امی کے ساتھ بدزبانی کی' برا بھ بدتمیزی کی' مجھے کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ ا مزاج سے میں اچھی طرح واقف ہوں' مگر یہ ز کیا قصہ ہے' وہ بھی اسپتال میں نہ جانے کیا کچھ رہی ہے۔" ماہیر کچھ بے زاری سے کہہ رہا تھا۔

"اف۔ ایک ہی بات کی فضول تکرار۔" شدید کوفت نے گھیر لیا۔ تمام بات مختصر لفظوں بتا کر وہ اپنا جرم سننے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

"ویسے حریم! کوئی تو بات ہے مجھ میں' سارے ہی میرے نصیب پر رشک کرتے ہیں۔" ماہیر کا م بخود بدلتا چلا گیا تھا۔ حریم کی تعریف توصیف اسے بھاتی تھی۔

"مثلاً" کون کون لوگ؟" حریم نے دلچسپی

پوچھا۔

"یہ ہی نفیسہ پھوپھو' فیفا۔ حانی اور میں خود۔"

"ایک بات تو بتائیں۔" کچھ خیال آنے پر حریم نے رانجیدگی سے پوچھا۔

"پوچھو۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

"میں نے سنا ہے پہلے آپ کی اور فیفا کی بہت بہی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔"

"کچھ غلط تو نہیں سنا۔"

"اب اس بے چاری سے کیوں بہت فارمل انداز میں ملتے ہیں۔" حریم نے کچھ تاسف سے کہا۔ نرم الفاظ میں فارمل کہنا مناسب تھا۔ ورنہ ماہیر کا رویہ تو بہت روڈ قسم کا تھا۔

"کیوں اٹھلا کر' چلبلا کر معانقہ کروں' مصافحہ کروں۔" وہ شرارت سے پوچھنے لگا۔

"ماہیر!" وہ خفگی سے بولی۔

"معانقہ' مصافحہ' ماشاء اللہ' آپ کے ارادے نیک تو نہیں لگتے۔"

"چھوڑو ان قصوں کو' اپنی بات کرو۔" ماہیر نے اس کی کھلی کھلی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا سوچا ہے۔"

"کس بارے میں۔" وہ حیران ہوئی۔

"آنے والے بچوں کے بارے میں۔"

"ہری ہری سوجھی رہتی ہے' چائے پی لیں' جا رہی ہوں۔"

"کہاں جا رہی ہو' میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔" وہ بھی ایک دم اٹھ کر سلیپر اڑسنے لگا۔

"آپ کچھ دیر آرام کر لیتے۔" اس نے ہمدردی سے کہا۔

"تمہارے بغیر۔ تعاون کرو' تو ارادہ بدل لیتے ہیں۔" ماہیر نے باہر کی طرف نکلتی حریم کو شرارت سے چھیڑا۔

"کچن کا پھیلاوا سمیٹنا ہے۔" وہ خفگی سے آنکھیں دکھانے لگی۔

"جا کہاں رہے ہیں۔"

"فیفا سے ملنے۔" ماہیر شرارتاً بولا۔

"کیا مطلب؟" حریم ٹھٹک کر رک گئی۔

"پھر سے بولیے۔"

"یار! پھوپھو سے ملے بہت دن ہوئے ہیں' سوچا ان کی خیریت معلوم کر لوں۔" اس نے وضاحت کی۔

"جلدی آئیے گا۔" حریم نے تاکیداً کہا۔

"تم ذرا کھانے پر اہتمام کر لینا' زمیلہ آئے گی۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔

"یار! زمیلہ کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کرنے کی کوشش کرو' بے ترتیبی کہیں بھی نہیں بھاتی' نہ زندگی میں' نہ رشتوں میں۔" وہ آخری سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ راحت بیگم کی گرج دار آواز سنائی دی۔

"حریم! او حریم! نہ جانے کہاں چلی جاتی ہو' میاں سے باتیں مٹھارنے سے جی نہیں بھرتا' میرے بیٹے کے کان کھاتی رہنا ہمیشہ' دماغ چاٹ لیتا ہے کیا۔"

"دلوں پر گرد نہیں آنی چاہیے' رویوں کا کیا ہے' بدلتے رہتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

"رویّوں سے تعلق مضبوط ہوتے ہیں' زندگی کی خوب صورتی رویّوں کی محتاج ہوتی ہے' خوش نما اور بدنما رویّے' وقت کا کام گزرنا ہوتا' سو گزر ہی جاتا ہے۔ گزر ہی جائے گا' مگر اچھی اور بری یادیں سوغات کے طور پر پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ہمیشہ خوش کرنے کے لیے یا چبھن دینے کے لیے۔" وہ سوچتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

رات کو زمیلہ اپنی ساس کے ہمراہ آئی تھی۔ مروتاً حریم سے بھی سلام دعا کر لی۔ یا ساس کی موجودگی میں کچھ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس کا پھولا منہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ زمیلہ کو رات بھر رہنے کی اجازت شاید نبیل کے توسط سے ملی تھی۔ اس وقت وہ ماں سے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ اسے امی کی شدید خرابی طبیعت کا احساس صرف ہدایات دینے تک تھا۔

"سوپ دیں' فروٹس لائیں' فریش جوس صحت کے لیے مفید ہے' وغیرہ وغیرہ۔" حالانکہ ڈاکٹر نے انہیں

ٹینشن فری رہنے کی تاکید کی تھی، وہ جسمانی طور پر بہت صحت مند تھیں، البتہ ذہنی صحت بہت متاثر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا وہ بہت زیادہ ٹینشن لیتی ہیں۔ پہلے مولی کی وجہ سے اور اب زمیلہ نت نئی کہانیاں سنا سنا کر ان کے ذہن کو منتشر کر دیتی تھی۔ جبکہ زمیلہ کا کہنا تھا امی کی بیماری کی سب سے بڑی وجہ بذات خود حریم ہے، ایسے فتوے سن سن کر حریم کی سماعتیں اب تو عادی ہو چکی تھیں۔

ان دنوں حریم کی طبیعت بہت بوجھل بوجھل تھی۔ موسمی بخار نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دن بہ دن نقاہت کی وجہ سے چکر آنے لگے تھے۔ ماہیر کے بہت دفعہ کہنے کے باوجود وہ چیک اپ کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں سے اب تو خوف آنے لگا تھا۔ اسپتال میں داخلہ بعد میں ہوتا تھا، یہ لمبے چوڑے ٹیسٹ کے پرچے ہاتھ میں پہلے پکڑا دیے جاتے۔ امی کی دوائیاں اتنی مہنگی تھیں کہ ماہیر مزید اور ٹیسٹوں، دوائیوں پر کہاں سے خرچہ کرنے کے لیے پیسے لاتا۔ حریم کو امید تھی کہ وہ ہومیو پیتھک دوا سے ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ ڈاکٹر صاحب ان کے محلے کے رہائشی تھے۔ ماسی نے حریم کو دوا منگوا کر دی تھی۔ پہلی خوراک سے ہی حریم کو افاقہ محسوس ہوا تھا۔

"آج کل کی لڑکیاں کہاں سنتی ہیں کسی کی بات، کسی بڑے ڈاکٹر سے دوا کیوں نہیں لیتیں۔" امی آتے جاتے ماتھا پیٹتے ہوئے نصیحت کرنا نہیں بھولتی تھیں۔ ایسا اس وقت ہوا کرتا تھا جب امی کی عیادت کی غرض سے کوئی نہ کوئی خاتون موجود ہوا کرتیں۔

"بڑے ڈاکٹروں کی فیس بھی بڑی، دوائی بھی مہنگی، احساس کی ڈور سے بندھے رشتے معتبری کا درجہ اسی لیے پاتے ہیں۔" کبھی نفیسہ پھوپھو پاس بیٹھی ہوتی تو ضرور جتا دیا کرتی تھیں۔ ماہیر کی دن رات بھاگ دوڑ، اور مشقت کسی کو بھولتی تو نہ تھی۔ ماں کی بیماری کے سلسلے میں وہ پھر سے قرض دار ہو چکا تھا۔

امی کی بیماری کے دورانیے نے حریم کو گویا نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ امی کی دیکھ بھال، گھر کے کام کاج، اوپر سے ماہیر کبھی موڈ میں ہوتا تو اس کے خوش گوار مو[ڈ کو] سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

آج صبح بھی اس کا سر بری طرح سے چکرا رہا تھ[ا] امی کا صبح صبح ارہر کی دال اور سادہ چاول کھانے کا ج[ی] رہا تھا۔

"املی اور ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ بیسنی روٹی [بنا] دو۔" ان کے خیال میں روز، روز کے پرہیز کی وجہ ان کی زبان سارے ذائقے بھولتی جا رہی تھی۔ [پ]رہیز شدہ ذائقے سے آشنا زبان کو کچھ چٹ پٹا ناگزیر ہو گیا تھا۔

چھٹی کا دن تھا، سو ماہیر کو دفتر بھیجنے والی عجلت سوار نہیں تھی۔ کچن میں کھڑے ہو کر کام کرنا، کسی پہاڑ کو سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ جیسے دال چاول تو پک گئے تھے۔ البتہ مولی کا ناشتا اسے ہر شے گول گول گھومتی نظر آنے لگی۔ وہ چکراتے سر کو تھام کر موڑھے پر بیٹھ گئی۔ ماہیر [امی] کے پاس لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ گاہے بگاہے [اس کی] نظریں کچن کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں۔ "اٹھ جاتی تھیں"

"حریم! کیا ہوا؟ چاول نہیں پکے، دال کو بگھ[ار لگا] یا نہیں۔" امی بے صبری سے بولی تھیں۔ ما[ہیر اٹھ] کر حریم کے پاس چلا آیا۔ وہ فکر مندی سے پوچھ[نے لگا]

"سر چکرا رہا ہے۔" حریم نے بھرائی آواز میں [کہا]

"تمہیں تو پھر سے بخار ہو رہا ہے، اٹھو، یا[ں] لیٹو۔" وہ اسے بازو کے حصار میں لے کر باہر آیا۔

"کیا ہوا؟" امی کو پوچھنا پڑا۔

"پھر سے تاپ چڑھ گیا۔"

"اترا ہی کب تھا، ڈھیٹوں کی طرح [پڑا ہوا] ہے۔" ماہیر کو اس کی لاپروائی پر شدید تاؤ آ[یا] [امی] نے ناگواری سے منہ بنا لیا۔

"دال چاول کیا پکانے پڑ گئے، پھر سے [بخار ہو] گیا۔ کیا ضرورت تھی کچن میں گھسنے کی، [آرام کر] لیتی۔"

"نہیں امی! میں ٹھیک ہوں، بس چکر سا [آ گیا تھا۔]" حریم تھکن زدہ لہجے میں بولی۔

"ماہیر! امی کو چاول لا دیں، ابھی دوا بھی کھانی ہے امی نے وقت دیکھیں، دس تو بجنے والے ہیں۔"

"بی بی! ہماری خیر ہے، تم خود کو سنبھالو، تم نے بستر پکڑ یا تو ہمارا کیا ہو گا۔" امی نے آہ بھری۔

"ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟" ماہیر پوچھ رہا تھا۔

"پہلے کچھ کھانے کو لا دو اسے، کھاتی پیتی تو کچھ ہے نہیں، لوگ ہم پر تاک تاک کر حملے کرتے ہیں، بے زبان بہو کو کچھ کھانے کو نہیں دیا جاتا۔ لوگوں کی بھی مت ماری گئی ہے، ہم نے تو کب سے باورچی خانے سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اب کھانا پینا تو خود ہے، ہاتھ سے نوالے توڑ کر کھلانے سے تو رہے۔" امی کی گفتگو طول پکڑنے والی تھی، مگر ماہیر کو واپس آتا دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ ٹرے ان کے سامنے تھی۔ من پسند کھانا ٹرے میں سجا تھا۔ سو وہ سب کچھ بھلائے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"تم نے ناشتا بھی نہیں کیا ہو گا۔" ماہیر دودھ کا گلاس اور بریڈ، جیم لے آیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ انڈہ ابال سکتا تھا۔ کوکنگ میں اسے صرف انڈا بوائل کرنا آتا تھا۔ حریم کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ شاید بی پی لو ہو گیا تھا۔ ماہیر بریڈ کے چھوٹے چھوٹے پیس دودھ میں ڈپ کر کے اس کے منہ میں رکھنے لگا تھا۔ امی کو نہ جانے کیا کچھ یاد آگیا۔ اپنا خوش گوار ماضی۔

ماہیر کے ابو بھی مزاجاً بہت نرم اور احساس رکھنے والے فطرتاً بہت نیک طبیعت انسان تھے۔ اپنی ذات سے انہوں نے کسی کو کبھی تکلیف نہیں پہنچائی۔ ماں، بہنوں اور بیوی کے حقوق میں انہوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ ماہیر بھی تو ان ہی کا بیٹا تھا۔ خوش گوار یادوں کو سوچتے ہوئے معاً انہیں زمیلہ کی تلخ ترین زندگی کا احساس ہوا۔ اپنے تئیں وہ یہ ہی کچھ سمجھتی تھیں کہ زمیلہ بہت مشکل زندگی گزار رہی ہے۔ زمیلہ اپنے دکھوں کی منظر کشی ہی کچھ اس طرح کرتی تھی کہ ایک ماں ہونے کے ناتے وہ پہروں غم زدہ رہتیں۔ جب کسی اور پر بس نہ چلتا تو حریم موجود تھی۔ ان کی تمام تر تلخیوں کو سہنے کے لیے وہ اپنے دل کی تمام بھڑاس نکال کر شانت ہو جاتی تھیں اور جب غصہ اترتا تو دل ہی دل میں خوب شکر ادا کرتیں۔ اگر حریم نہ ہوتی یا حریم کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اس پل پل موسم بدلنے والی ساس کے ساتھ بنا کر رکھنا کس قدر مشکل ترین کام تھا۔

"بس..." حریم نے دودھ کا گلاس آدھے سے بھی کم پی کر رکھ دیا تھا۔

"تھوڑا سا اور پی لو۔" ماہیر نے نرمی سے اصرار کیا۔

"ابھی دل نہیں چاہ رہا۔"

"کچھ دیر بعد پی لینا، بلکہ یہ تھوڑے سے چاول کھا لو، اس موئی ڈبل روٹی سے پیٹ کہاں بھرتا ہے۔" امی کو شاید ترس آگیا تھا، اسی لیے لہجے میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگا۔

"الٹی آرہی ہے۔" وہ بے زاری سے صوفے پر لیٹ گئی۔

"آپ بھی کچھ کھا لیں۔" معاً حریم کو اس کے خالی معدے کا احساس ہوا۔ وہ صبح سے بھوکا تھا۔ اب حریم کی خرابی طبیعت کی وجہ سے اس کی بھوک مٹ کر رہ گئی تھی۔

"تم آرام کرو، میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" ماہیر کا ہاتھ اس کے سر پر ٹھہر گیا تھا۔ حریم کو لگا جون کی تپتی دوپہروں جیسے دل میں نہ جانے کہاں سے سفید، نیلے بادل اڈ کر آگئے ہیں۔ دو ننھے سے آنسو اس محبت کی شکر مندی پر پلکوں کی باڑ توڑ کر بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔ ماہیر کو سر دبانے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ مگر ہولے ہولے سے دباؤ کے یہ جھٹکے اسے بہت سکون بخش رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی پر حرارت انگلیوں کے محبت بھرے لمس نے بہت کچھ پا لینے کا احساس بخش کے اسے شاد کر دیا تھا۔ دیتے اور مسلسل دیے چلے جانے کے اس عمل کے دوران کسی کی محبت بھری رفاقت حریم کی زندگی کا حاصل تھی۔ ان کے درمیان محبت کا ہی نہیں احساس، اعتبار، اعتماد اور یقین کا بہت مضبوط بندھن قائم تھا۔ ادھر راحت بیگم سوچ

رہی تھیں۔

"چلو دوپہر کو دال چاول سے وقت نکل جائے گا۔ دوپہر کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں' البتہ رات کا مسئلہ ہنوز منہ کھولے کھڑا ہے۔ ماہیر کے ارادے تو نہیں لگتے' حریم کو کچن میں بھیجنے کے' پھر رات کو کیا ہوا کھائی ہے' خیر کوئی بات نہیں ماہیر سے کہوں گی بازار سے کھانا لے آئے۔ اب میری بوڑھی ہڈیوں میں دم کہاں ہے۔ طبیعت ویسے بھی ناساز رہتی ہے' یہ ہی بہتر ہے' کھانا بازار سے آجائے گا اور یہ حریم ڈبل روٹی یا پاپے وغیرہ کھالے گی۔ بخار میں نرم غذا ہی بہتر رہتی ہے۔" وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی تھیں اور حریم اٹھ کر پھر سے کاروبار سلطنت کے مختلف امور سرانجام دینے لگی۔

☼ ☼ ☼

زمیلہ کے دیور کی شادی تھی' کسی اونچے گھرانے کی لڑکی آرہی تھی۔ جہیز میں سیروں کے حساب سے سونا اور کوٹھی' گاڑی لے کر' ان دنوں زمیلہ کے غم زدہ اور دکھی دل کو چھیڑنے کی حماقت کرنا فضول تھا۔ وہ جب بھی آتی اپنی ہونے والی دیورانی فری کے قصے اس کی زبان پر ہوتے اور ایسی باتیں بتاتے ہوئے اس کے چہرے پر بڑے عجیب عجیب سے تاثرات ابھر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ بہت سی محرومیوں کا شکار ہے' حالانکہ راحت بیگم نے بیٹی کی کسی خواہش کو حسرت بننے نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے حال سے مطمئن ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ فری کی خریدی ہر چیز اسے اپنی چیزوں سے زیادہ امپورٹڈ دکھائی دینے لگتی تھی۔ مادیت پرستی امی میں اور زمیلہ میں گویا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس دن سے وہ بھی ایک چکر زمیلہ کے سسرال کا لگا کر آئی تھیں اسی دن سے صبح و شام ان کی زبان پر ایک ہی ورد تھا۔

"زمیلہ سچ ہی روتی ہے' ہم نے بھلا بیٹی کو دیا ہی کیا ہے۔" دکھ کے احساس سے ان کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ اور آنسو تو ان کا واحد ایسا ہتھیار تھے جن سے بیک وقت وہ کئی لوگوں کو شکست سے دوچار کرد تھیں۔

حریم کو پکا یقین تھا کہ مطلب کے لیے وہ منافقانہ تک میٹھی ہو جایا کرتی تھیں۔ زبان سے گویا شہد لگتا۔ اپنی ہر بات کبھی تو رو دھو کر اور کبھی خوشامد ذریعے وہ منوا کر ہی دم لیتی تھیں اور جب ان کی خوا پوری ہو جاتی تو ان کے چہرے پر فتح مندی کے تاثرا ابھر آتے۔ ایسی چیلنج بھری نظروں سے حریم کو د کرتی تھیں گویا نظروں کی زبان میں حریم کو جتا چاہتی تھیں کہ دیکھو میں نے کس طرح اپنی بات منو ہے' تمہارا پلڑا بھاری کہ میرا۔

اور حریم کا دل تو ویسے بھی آپ آپ کی گردان رہتا تھا۔ اب یہ بیماری کا بہانہ اچھال گیا تھا۔ ڈاکٹر انہیں ٹینشن سے دور رکھنے کی ہدایت دے کر نجا حریم سے کس جنم کا بدلہ لیا تھا اب امی کی کسی بات کو کرنے کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ ہر وقت یہی خد رہتا کہ امی صاحبہ ٹینشن لے کر پھر سے ہسپتال نہ جائیں۔

وہ جب بھی کسی بڑی بچت کے بارے میں سو کی کوشش کرتی۔ کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھ اسے تو بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے ہوٹل کے بل' زمیلہ کی شادی کے سلسلے میں کل کرتے ہوئے ماہیر کو کچھ قرض لینا پڑا تھا۔ اور ابھی تنخواہ میں سے اس قرض کی ادائیگی احسن طریقے ہو رہی تھی۔ ان حالات میں اگر امی یا موبی کو ڈاکٹر سے سیشن کروانے پڑتے تو پھر مہینے کے آخر میں نو دال روٹی تک آجاتی تھی۔ پھر امی کے بگڑے مزاج سنبھالنا مشکل ترین کام ہوتا تھا۔ انہیں اپنی خوراک بہت خیال رہتا تھا۔ ہفتے میں چار دن لگاتار گوشت پکتا۔ ایک دن دال اور تین دن سبزی۔ انہیں خ سبزی تو بھوسے کی مانند لگتی تھی۔ اور وہ ذائقے کے گوشت کی دو چار بوٹیوں کی فرمائش کر دیتی تھیں۔

مسئلہ تو یہ تھا کہ امی کی بروقت فرمائش پوری نہ ہو تب بھی وہ شدید ہیجان کا شکار ہو جاتی تھیں۔ کبھی بہ

ہی غصہ آنے لگتا اور کبھی بلا کی مہربان ہو جاتیں۔

نبیل بھی بھائی کی شادی کے سلسلے میں دو ماہ کی چھٹی لے کر پاکستان آیا ہوا تھا۔ ان دنوں زمیلہ گویا ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کی خوشی چہرے کی چمکدار شفاف جلد اور جگر جگر کرتی آنکھوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مگر نجانے اس کی فطرت کیوں اس قدر خود غرض تھی۔ میکے آتے وقت خود پر مظلومیت طاری کر لیتی۔ چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو جاتی۔ ساس کے ساتھ ساتھ حریم کو بھی دہلاتی رہتی تھی۔

"اس قدر شدید گرمی ہے۔ نبیل کے آنے سے پہلے تو اے سی تک لگانے نہیں دیتے۔ آپ کو بھلا مجھے اے سی دینے کا کیا فائدہ ہوا جب وہ لگانے نہیں دیتے۔ استعمال کرنے نہیں دیتے۔ دادی کو اختلاج ہونے لگتا ہے' بجلی ضائع کرنے پر لمبے لمبے لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ میرے شوہر کی کمائی سے گھر کا خرچہ چلاتی ہیں۔ اور مجھے اے سی لگانے تک کی اجازت نہیں۔" اس کے پاس امی کو اور حریم کو دکھی کرنے کا ایک سے بڑھ کر ایک قصہ ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ کئی مرتبہ حریم نے سوچا تھا۔ زمیلہ کو سمجھانے کی کوشش کرے گی۔ کہ اپنے مسئلے کم از کم ماں سے دور رکھا کرو' کیونکہ زمیلہ کے جانے کے بعد امی پر حساسیت کا بڑا بھرپور دورہ پڑتا تھا۔ خود پر رقت طاری کیے ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی تھیں۔

اے سی ایک آسائش ہے۔ ضرورت نہیں' پھر ان حالات میں جب بل اتنے لمبے چوڑے ادا کرنے پڑ رہے تھے۔ اور جو گھر چلاتے ہیں۔ ضروریات پوری کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہیں۔ اس بڑھتی مہنگائی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ صرف وہ ہی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ گھر چلانا کوئی آسان کام نہیں۔

داماد کی آمد کی ساتھ ہی امی پھر سے الرٹ ہو گئی تھیں۔ بازاروں کے چپکے چپکے چکر لگنے لگے۔ یہ عقدہ بھی جلد حل ہو گیا۔ بیٹی اور داماد کے لیے خفیہ شاپنگ کی گئی تھی۔

آج نبیل کی اور اس کے گھر والوں کی دعوت کا اہتمام کرنا تھا۔ رات سے حریم کو پھر حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی لیے ماہیر سختی سے اسے منع کر کے گیا تھا کہ کچھ بھی گھر میں پکانے کی ضرورت نہیں۔ مگر حریم جانتی تھی کہ مہینے کے شروع میں بڑی رقم کو محض اپنے آرام کی خاطر فضول میں خرچ کر دینا عقلمندی میں شمار نہیں ہوتا۔

ماہیر کے جاتے ہی وہ کچن میں جت گئی تھی۔ جن جن ڈشز کے نام امی نے گنوا دیئے تھے ان کی تیاری میں چار پانچ گھنٹے اضافی چاہیے تھے۔ ان ڈشز کی فرمائش زمیلہ کی طرف سے تھی۔ بقول زمیلہ کے وہ اچھے کھانوں کے ذائقوں کو سسرال جا کر بھول چکی تھی۔

سرِ شام ہی زمیلہ اپنی ساس دو دیور ایک نند کے ہمراہ آگئی تھی۔ نبیل کچھ دیر بعد آیا تھا۔ ماہیر بھی آفس سے جلدی گھر آگیا تھا۔ حریم میز پر برتن بھی لگا چکی تھی۔

"اماں بی حریم سے ملنے تو ضرور آتیں مگر ان کی ٹانگوں میں شدید درد تھا۔" فرحت آنٹی' امی کو بتا رہی تھیں۔

"اچھا ہے' نہیں آئیں' ہونہہ' مفت خورے لوگ۔" زمیلہ جلتے بھنتے نبیل کا جائزہ لینے آگئی۔

"واہ' نبیل بھائی کی فیورٹ ڈشز' آج تو بھابھی آپ نے کمال کر دیا ہے۔" نازش بھی زمیلہ کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے بھابھی!" نازش اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

"ذرا سا بخار محسوس ہو رہا ہے۔" حریم مصروف انداز میں بولی۔ زمیلہ باہر نکل گئی تھی شاید اسے نبیل نے آواز دی تھی۔

"بھابھی' آپ آرام کر لیجیے۔ آپ کی طبیعت بہتر نہیں لگ رہی۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" وہ نرمی سے بولی۔ تبھی افتاں خیزاں امی کچن میں داخل ہوئیں۔

"ارے۔ نازش! تم یہاں' چلو آؤ کھانا کھالو۔" انہوں نے یوں ظاہر کیا تھا گویا انہیں نازش کی کچن میں موجودگی کا پتا ہی نہیں تھا۔ پھر حریم کی طرف دیکھ کر عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولیں۔

"حریم! تم آرام کرلو۔ میں باقی کا کام خود دیکھ لوں گی۔"

"میں بھی حریم بھابھی کو آرام کا مشورہ دے رہی تھی۔" نازش نے معنی خیزی سے آنکھیں پٹ پٹا کر کہا۔

"نازش بیٹی! آؤ تم کھانا کھالو۔" امی نے نازش کے لہجے کی معنویت کو قطعا" اہمیت نہیں دی تھی۔

"جی آنٹی' آرہی ہوں۔"

"تم کچھ دیر آرام کرلو حریم۔! چائے دیر سے بنالینا۔" جاتے جاتے پلٹ کر وہ دبی آواز میں بولتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔ حریم نے اسی بات کو غنیمت جانا تھا اور پھر امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

تقریبا" آدھے گھنٹے بعد زمیلہ کی ساس نے کمرے میں جھانکا پھر اندر چلی آئیں۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹی۔"

"کچھ بہتر محسوس کررہی ہوں۔ کمر میں بہت درد تھا۔" حریم شرمندہ سی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"لیٹی رہو۔"

"نہیں' اب اٹھتی ہوں۔ آپ نے کھانا کھالیا ہے۔" اپنے بکھرے حواس مجتمع کرتے ہوئے حریم نے پوچھا۔

"ہاں بیٹی! بہت اچھا کھانا بنایا ہے۔"

"شکریہ۔" حریم تھکی تھکی سی پژمردہ آواز میں بولی۔

"کون سی ڈیٹ فائنل کی ہے۔" کچھ خیال آنے پر حریم نے پوچھا۔

"اسی مہینے کی بائیس تاریخ تم نے ضرور آنا ہے' کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" انہوں نے محبت بھری دھونس سے کہا۔ حریم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد حریم بچا ہوا کھانا محفوظ کررہی تھی۔ جب دبے قدموں سے راحت بیگم آئیں۔

"حریم! ایک بات سچ سچ بتاؤ۔"

"پہلے میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے۔؟" ح ناگواری دبا کر بولی۔

"پوچھیے۔"

"فرحت نے تم سے کیا کیا باتیں کی ہیں۔"

"میرا خیال ہے وہ دس منٹ بھی میرے پاس نہ بیٹھی ہوں گی۔ صرف حال احوال پوچھا تھا۔"

"نرا جھوٹ۔" امی کو قطعا" یقین نہیں آیا۔

"جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"سب جانتی ہوں۔ ساس' نند کی برائی کر تمہیں کون سا ایوارڈ ملنا ہے۔" امی نے رعونت میں بھرلی۔

"امی آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" حریم ر ہوگئی۔

"میری بیٹی کی زندگی میں تلخیاں گھول کر تمہ ملے گا۔" وہ اپنی بات پر اڑی رہیں۔

"امی پلیز۔" حریم بے بسی سے بے چین ا بولی۔

امی۔!" ماہیر نے کچن میں جھانکا۔

"کون سے مذاکرات چل رہے ہیں۔"

"آں۔ ہاں۔ کچھ نہیں۔" وہ بوکھلا کر گئیں۔

"تمہیں کس نے پتھر بنا دیا ہے۔" حریم دیکھ کر وہ اس کا بازو ہلا کر بولا۔

"کیا بات ہے حریم۔"

"کچھ نہیں۔" حریم گہری سانس کھینچ کر ر لگی۔

"امی نے کچھ کہا ہے۔" ماہیر کے اکثر درست ہوتے تھے۔ حریم نے لب بھینچ لیے۔

"نہیں۔"

"تھک گئی ہو؟" وہ ہمدردی سے اس تھکے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں۔" حریم نے رخ موڑ لیا تھا۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات ماہیر سے چھپا لینا چاہتی تھی۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ کیا ضرورت تھی اتنا محنت کرنے کی۔ چھوڑو' ان دھندوں کو۔" ماہیر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا۔

"چھوڑیے نا۔" حریم نے بے زاری سے کہا۔

"یہ پھیلاوا کون سمیٹے گا؟"

"صبح کرلینا۔"

"صبح بھی خود ہی کرنا ہے۔" بے زاریت گویا اس کے روم روم میں اتر آئی تھی۔

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ جسم تنور کی طرح تپ رہا ہے۔" وہ فکرمندی سے اس کی نبض ٹٹولتے بولا۔

"ہٹیے پیچھے!" وہ اپنی کلائی چھڑوا کر تلخی سے بولتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ماہیر اس کے شدید رد عمل پر حیران پریشان سا دیکھتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

زمیلہ کے دیور کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ حریم اور ماہیر نے صرف ولیمہ میں شرکت کی تھی۔ البتہ امی تینوں فنکشنز میں روزانہ شرکت کی غرض سے پہنچ جاتی تھیں۔ واپسی پر ان کی زبان پر فری کے میکے والوں کی دولت کے قصے ہوا کرتے تھے۔ یہی حال زمیلہ کا تھا۔ ذرا ذرا سی بات ماں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

"نازش کو سونے کا سیٹ دیا ہے۔ امی کے کڑے اور دادی کو بھی موٹی موٹی چار چوڑیاں۔ بڑے دل والے لوگ بیٹیوں کو دیتے ہیں۔ جو ذرا ذرا سی بات پر مہنگائی کا رونا روتا ہو اس نے کسی اور کو بھلا کیا دینا ہے۔" وہ جلتی کلستی بلند آواز میں کہتی۔

ان دنوں زمیلہ کے نخرے اٹھانا۔ حریم کو اپنے اختیار سے باہر محسوس ہوتا تھا۔ خیر سے امید لگی تھی امی کا بس نہیں چلتا تھا۔ بیٹی کو جلاد قسم کی ساس کے چنگل سے آزاد کرکے اپنے پاس ہی لے آتیں۔ نبیل جانے سے پہلے زمیلہ کے بے حد اصرار پر اسے ماں کے گھر چھوڑ گیا تھا۔ اور امی تو پورے نو مہینے اسے اپنے پاس رکھنے کی خواہش مند تھیں۔ مگر مجبورا" انہیں خاموشی اسی لیے اختیار کرنا پڑی تھی کہ زمیلہ کی ساس نے پہلے ہی جتا دیا تھا۔

"ہمارے ہاں رواج ہے۔ پہلا بچہ میکے میں ہوتا ہے۔" امی اپنا سامنہ لے کر چپکی بیٹھی رہی تھیں۔

"خرچہ بچانے کے لیے سارے رسم و رواج یاد ہیں۔" امی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔

"دنیا کا یہی دستور ہے۔" زمیلہ نے ناگواری سے کہا۔

"سب کو ایک ہی لائن میں کھڑا نہ کرو۔ تمہاری سسرال کے طور طریقے نئے ہیں۔ ہمارے میں تو بچہ اپنے باپ کے گھر ہوتا ہے۔ میکے والے توفیق کے مطابق جو مرضی بعد میں بیٹی کو دیں دلائیں۔"

"تو میں نہیں آؤں گی یہاں۔" زمیلہ کی آنکھیں آنا" فانا" جل تھل ہو گئیں۔

"میری ناک کٹوا دیجیے گا۔ پہلے کون سے مربعے میرے نام لکھوائے ہیں۔"

"اپنی طرف سے کوئی کمی کی نہیں تھی۔" امی کی آواز دھیمی پڑ گئی۔

"پھر بھی باتیں تو مجھے سننی پڑتی ہیں۔"

"ایسا بھی کیا لالچ۔" امی کو غصہ آگیا۔

"ہر کوئی آپ کی طرح نہیں۔ ایک کنگلے افسر کی بیٹی بیاہ لائیں۔ لوگ تو اونچے گھرانے دیکھتے ہیں چانس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ادھر خوش قسمتی ہاتھ باندھے آپ کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس وقت میری بات نہیں مانی آپ نے۔ ورنہ ہمارا بھی معیار بہت اعلا ہوجاتا۔ چار لوگوں میں چرچا ہوتا۔ عزت ہوتی۔ اٹھا کر لے آئیں گلی کے گند کو۔" زمیلہ نخوت سے سر جھٹکتے کہہ رہی تھی۔

"بکواس مت کرو۔" انہوں نے ناگواری سے زمیلہ کو ٹوکا۔

"آج تو سننا پڑیں گی میری باتیں۔ کچھ غلط نہیں

کہہ رہی۔" وہ خود سری کا مظاہرہ کرنے لگی۔

"حریم سن لے گی' بک بک نہ کر۔" ان کی آواز دبی دبی تھی۔

"سنتی ہے تو شوق سے سنے۔ مجھے پروا نہیں۔"

"تجھے پروا نہیں مگر مجھے تو ہے۔"

"آپ کرتی رہیں' خوشامدیں۔" زمیلہ زہر خند ہوئی۔

"خاموش ہو جا۔ ماہیر اپنے کمرے میں ہے' سن لے گا۔" امی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ بیٹے سے اچھا خاصا دبتی تھیں۔

"نہیں تو سنانا چاہتی ہوں۔ کسی کا دل توڑا ہے انہوں نے اسی کی سزا بھگتیں گے تمام عمر۔"

"زمیلہ!" انہوں نے غصے کے عالم میں اس کا بازو جھنجوڑا۔

"بکواس نہ کرو۔"

"بولنے دیں مجھے۔" وہ بازو چھڑوا کر تلخی سے بولی۔

"نازش سے دکھ سکھ کہنے کا مزا تو چکھ لیں۔"

"کون سے دکھ سکھ۔" امی نے ہونق پن سے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

"تمہارے خلاف سازشیں کرنے کل۔ ایسے ہی تو وہ ماں بیٹی گیت نہیں گاتیں' حریم بھابھی کے۔"

"حریم نے کچھ کہا ہے۔؟"

"کچھ نہیں بہت کچھ۔"

"پھر بھی کیا؟" انہوں نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"ناظم کی شادی میں گھر کی باتیں انہیں بتاتی رہی ہیں۔" زمیلہ نے انکشاف کیا۔

"کون سی باتیں۔" امی جھنجلائیں۔

"یہی کہ ہم نے اپنی طرف کا زیور بھابھی سے ہتھیا لیا تھا۔" زمیلہ کا لفظ لفظ زہر میں ڈوبا تھا۔

"تو پھر۔"

"انہوں نے میرا زیور نازش کے لیے لے کر رکھ لیا ہے۔" اصل صدمے کا راز معلوم ہو گیا تھا الزامات کی یہ بوچھاڑ حریم کے لیے نئی نہیں تھی۔ خدا گواہ تھا ان لوگوں تک یہ "راز" حریم کے توسط سے نہیں پہنچا تھا۔

پھر یہ بات بتانے والی بھی نہیں تھی۔ حریم نے کوا[illegible] کسی پر احسان کیا تھا۔ محض ماہیر کا بوجھ بٹانے کی خا[illegible] وہ تمام بری کا زیور زمیلہ کو دے چکی تھی۔

"حریم نے انہیں بتایا ہے۔" امی کو یقین نہیں [illegible]

"ہاں۔" وہ وثوق سے بولی۔

"کب؟"

"شاید ولیمے کی شام۔"

"مگر حریم تو صرف آدھے گھنٹے کے لیے گئی تھ[illegible] بخار میں پھنک رہی تھی۔ کھانا کھائے بغیر ماہیر اور[illegible] دونوں چلے آئے تھے۔" امی کچھ سوچتے ہوئے [illegible] لگیں۔

"آپ کو خاک پتا چلنا تھا۔ لوگ اشاروں سے بات کر سکتے ہیں۔"

"پھر وہی بات۔" امی کو غصہ آگیا۔

"حریم میرے ساتھ بیٹھی رہی تھی۔"

"اچھا۔" زمیلہ کچھ پل کے لیے خاموش ہو گئی[illegible]

"پھر ان تک یہ بات کیسے پہنچی۔"

"مجھے کیا پتا۔" وہ چڑتے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔

یہ انہی دنوں کی بات تھی۔ گرمی اپنے زوروں [illegible] تھی۔ جون کا آخری عشرہ تھا۔ بارہ بجتے ہی سورج [illegible] سوا نیزے پر پہنچ جاتا تھا۔ چھتیں اور دیواریں گویا [illegible] اگل رہی تھیں۔ امی سارا دن اے سی لگائے کمر[illegible] میں دبکی رہتیں۔ حریم' ناشتا۔ کھانا کمرے میں پہنچ[illegible] کرتی تھی۔ صرف امی کے کمرے میں اے سی لگا[illegible] یو پی ایس کا کنکشن بھی نچلے حصے میں تھا۔ گر[illegible] اور حبس زدہ روکھے پھیکے یہ دن بڑی سست رفتاری گزر رہے تھے۔

ایسی ہی جلتی' تپتی دوپہر میں بکھری بکھری سی ز[illegible] چلی آئی۔ حریم کا دل گویا دھک سے رہ گیا تھا۔

سوجی آنکھیں' الجھے بال' بکھرا بکھرا سراپا۔ را[illegible] بیگم کے دل پر گویا آرے چل گئے۔

"زمیلہ! تم۔" ان کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے۔

"میری بیٹی! کیا ہوا۔"

"نہیں ہوں میں آپ کی بیٹی۔" وہ غصے سے گویا پھٹ پڑی۔

"بیٹی ہوتی تو یوں کان سے پکڑ کر رخصت نہ کر دیتیں۔ مجھے سسرال میں ذلت نہ اٹھانی پڑتی۔ وہ فری کمینی مجھے طعنے دیتی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے۔ سب کو گویا مٹھی میں دبا لیا ہے۔ مجھے کچن میں گھسنے نہیں دیتی۔ کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی۔ بات بے بات طنز کرتی ہے کوئی اس کے سامنے بولنے کی جرات نہیں کرتا۔ اس امیر زادی کا دل دکھانے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔" وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔

"تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے۔ فرحت نے یا اماں بی نے۔" امی نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو پھر تم اس طرح کیوں آئی ہو۔"

"خود چلی آئی ہوں۔ نہیں رہا جاتا مجھ سے ایسے ماحول میں۔" وہ پھنکار کر بولی۔

"تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" راحت بیگم نے بیٹی کو سمجھانا چاہا تھا مگر وہ یکدم بھڑک کر چلائی۔

"اگر مجھے بھی کوئی مکان' فلیٹ جہیز میں دیا ہوتا تو یہاں نہ آتی۔ فری کی طرح کروفر سے اپنی چھت کے نیچے چلی جاتی۔ کیا دیا ہے آپ نے مجھے بہت بھاری تھی میں۔ ایسے بوجھ کی طرح اتار پھینکا ہے۔ لکڑی کے سامان سے گھر بھر دیا تھا۔ جس کی کسی نے قدر نہیں کی۔ اٹھا کر کاٹھ کباڑ کی طرح پھینک دیا۔" وہ رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ جبھی ایک ٹھہری' رواں بھاری آواز سن کر اس کا دل پوری جان سے کانپا۔ لرزا اور لحہ بھر کے لیے رک سا گیا۔

"یہ مکان قانونی طور پر تمہارے نام کر دیا ہے زمیلہ! ایک ہفتے تک میں یہاں سے شفٹ کر جاؤں گا چاہے تو اسے بیچ دینا' چاہے یہاں آکر قیام کر لینا۔ تمہارے باپ کا یہ مکان 60 لاکھ کی مالیت کا ہے۔" وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا' سیڑھیاں اتر آیا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ زمیلہ کے سر پر ٹھہر گیا۔

"کبھی آج کے بعد یہ بات نوک زباں پر مت لانا زمیلہ۔ تمہارے بھائی نے رزق حلال کا ایک ایک روپیہ بچا کر تیرے لیے چھوٹی سے چھوٹی چیز خریدی تھی۔ اس کاٹھ کباڑ میں ماں کی محبت' ممتا اور خوابوں کے رنگ چڑھے ہیں۔ یہ رنگ کبھی ہلکے نہیں پڑیں گے۔ چاہے وہ لکڑی کا بے کار مال کتنا ہی بوسیدہ کیوں نہ ہو جائے۔ ایک ایک چیز کو دوسروں کی نظروں سے نہیں' اپنے دل کی نگاہ سے دیکھنا' کچھ بھی فضول اور سستا نظر نہیں آئے گا۔ ہر شے میں تجھے محبت کے سوتے پھوٹتے دکھائی دیں گے۔"

"بھائی۔" زمیلہ کو لگا وہ آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب رہی ہے۔ ابھر رہی ہے' کوئی اس طرح بھی بے مول ہوتا ہے۔؟

☼ ☼ ☼

"ہے نی۔! کہاں جا رہی ہو؟" فلیٹ کی گلاس ونڈو کھولے مونیکا سیلر ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھی۔ اس کے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔ وہ مارکیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ مگر مونیکا کو دیکھ کر واپس آگئی۔ ویسے بھی ان دنوں وہ بے حد تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ اس اجنبیوں کے دیس میں وہ اکیلی ہی تو تھی۔ رشتوں کے معاملے میں وہ واقعی مفلس تھی۔ اور دوستوں کے معاملے میں بالکل قلاش اور اب یہاں پر مونیکا اور شیری کے علاوہ کسی تیسرے کے ساتھ اس نے جان پہچان کا تعلق نہیں بنایا تھا۔

"مارکیٹ تک جا رہی تھی۔ تم کچھ منگواؤ گی؟" وہ گلاس ونڈو کے قریب آرکی تھی۔

"نہیں' نئیں' تم اندر آجاؤ نا۔ میں اکیلی ہوں۔ کچھ بات کر لیتے ہیں۔" مونیکا کی آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ بھی ہنی کی طرح تنہائی کی ماری ہوئی تھی۔ بے چاری بے اولاد تھی۔' اب تو بیوہ بھی ہو چکی تھی۔ پینتالیس سال کے لگ بھگ عمر تھی اس کی۔ ہنی کو مونیکا کے علاوہ کسی اور سے بات چیت کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ عیسائی عورت تھی۔ اور بے تحاشا مذہبی تھی۔ بلکہ کٹر قسم کی مذہبی تھی۔ ہنی کو اس کی کمپنی پسند تھی۔

اکثر جب شیری سیاحت کا شوق پورا کرنے شہر سے باہر چلا جاتا تو وہ اپنا فارغ وقت مونیکا کے ساتھ گزارنا پسند کرتی تھی۔
ہنی نے مارکیٹ جانے کا پروگرام ملتوی کردیا اور وہ مونیکا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے اندر آگئی۔ مونیکا بے اختیار کھل اٹھی۔ اسے ہنی کی فرمانبرداری بہت بھاتی تھی۔ ہنی بحث و تکرار میں نہیں الجھتی تھی۔ بلاوجہ جرح نہیں کرتی تھی۔
"ہے نی! تمہارے لیے کیا لاؤں۔" مونیکا نے خوشدلی سے پوچھا۔ وہ ایک بہت اچھی میزبان بھی تھی۔ ہنی نے بے ساختہ نفی میں سرہلا دیا۔
"کچھ بھی نہیں۔"
"کیوں نہیں کیا شیک پیو گی؟"
"بس موڈ نہیں۔" وہ کبھی بھی بہت خوش خوراک نہیں رہی تھی۔ اور اس وقت عجیب سی کربناک سوچوں کے زیر اثر وہ اور بھی بے زار بے زار تھی۔
"ہنی! ایک بات پوچھوں۔" وہ پھر سے ہاتھ میں پکڑی کتاب کھول کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کھلی ہوئی کتاب کے درمیان اس نے قلم رکھ دیا تھا۔ اس کی نظریں ہنی کے بجھے بجھے چہرے پر تھیں۔
"پوچھو۔" وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے پار اجنبی اور سرد منظر کو دیکھ رہی تھی۔
"تم اس قدر اداس کیوں ہو؟ جب بھی تمہیں دیکھتی ہوں' پھولوں کی پتیوں پر اتری اوس کا خیال آتا ہے یوں لگتا ہے' پھولوں کی پتیاں آنسو بہا رہی ہیں۔ اور تم بھی ایسی ہی دکھتی' ہو نم نم سی۔"
"جب دل روتا ہے تو آنکھ خود بخود روتی ہے۔" ہنی گہری افسردہ سانس کو گرم ماحول کے سپرد کرتے ہوئے بولی۔
"کیا میں پوچھ سکتی ہوں ہنی! دل بھلا کیوں روتا ہے۔؟" مونیکا کی آواز میں محسوس کی جانے والی نرمی تھی۔ اسی لیے تو ہنی اکثر اپنے دل کے "راز" اس سے شیئر کرلیتی تھی۔
"دل اس وقت روتا ہے' جب محبت روگ لگاتی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔
"کیا تم نے کسی سے لو کیا؟" مونیکا کا انداز ج لیے ہوئے تھا۔
"ہاں۔"
"اور وہ کہاں ہے؟"
"میرے دل میں۔" وہ اداسی سے مسکرادی۔
"کیا تم نے کسی سے لو کیا۔" اب وہ مونیکا سے رہی تھی۔
"ہاں۔" مونیکا بھی مسکرادی۔
"اور وہ کہاں ہے؟"
"بہت دور۔" اس کی آنکھیں پرنم سی تھیں۔
"پھر بھی کہاں؟ کیا وہ مرچکا ہے؟" ہنی نے ا لگایا۔
"نہیں' وہ زندہ ہے۔" وہ شاید ماضی کے کسی سے پیچھا چھڑانے لگی۔
"تم دونوں کی شادی نہیں ہوسکی۔؟"
"نہیں۔"
"مگر کیوں؟"
"وہ کسی اور سے لو کرتا تھا۔ وہ اس کی کزن تھ ان دونوں نے شادی کرلی۔ ایوڈ بہت اچھی خوش زندگی گزار رہا ہے۔" مونیکا نے نچلے لب کا کونا دا تلے دبالیا۔
"اور تم کسی اور سے شادی کرکے خوش تھیں۔" کا لہجہ عجیب سی تلخی لیے ہوئے تھا۔
"تم نے اس کو پانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔"
"ہاں' میں نے بھی ایک اچھی زندگی گزا ہے۔" مونیکا سچ کہہ رہی تھی۔ مگر ہنی کے تاثرا عجیب ہوگئے تھے۔
"تم نے میرے نزدیک منافقانہ زندگی گزا ہے۔ محبت کسی اور سے اور شادی کسی اور سے۔ ا میں تمہارا بھی قصور نہیں۔ جس سوسائٹی کا تم لوگ حصہ ہو' وہاں یہ باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔"
"نہیں' میں سیلر کے ساتھ مخلص تھی۔ میں اس سے محبت بھی کی۔ ہم نے ایک ساتھ بہت ا وقت گزارا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی میری طرح سے مذہبی تھا۔" مونیکا نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی۔
"تو پھر تمہیں ایوڈ سے محبت نہیں ہوگی۔ بس وقتی پسندیدگی کو تم نے محبت کا نام دیا ہے۔"
اس کا لہجہ اب بھی تلخی لیے ہوئے تھا۔
"مجھے اس سے محبت تھی مگر شادی کے بعد میری وفائیں سیلر کے نام تھیں۔ میں ایوڈ کو دل میں رکھ کے گناہ گار نہیں ہونا چاہتی تھی۔" مونیکا اس کے لہجے کی تلخی پر قطعا" برا نہیں منا رہی تھی۔
"گناہ اور ثواب کی تمہارے نزدیک کیا اہمیت ہے؟" ہنی کچھ چونک گئی۔
"کیا چیز نیکی اور بدی کی طرف مائل کرتی ہے؟"
"انسان کو نیکی اور بدی کے راستے پر ڈالنے والی اہم خواہش اس کا نفس ہے۔ جس کا نفس قابو میں رہا وہ گناہ سے بھی بچتا رہا اور ظلم سے بھی۔"
"ظلم سے کیا مراد؟"
"گناہ وہ تھا۔ جو میں سیلر کے ساتھ رہتے ہوئے ایوڈ کو یاد کرتی۔ اور ظلم یہ تھا کہ میں ایوڈ کو پانے کے لیے گمراہ ہوجاتی۔" مونیکا کی آواز میں بلا کی مٹھاس تھی۔
"گمراہ؟ مگر کیسے؟" ہنی حیران تھی۔ مونیکا کی باتیں اسے اسی طرح سے حیران کردیتی تھیں ہمیشہ۔
"مجھے اللہ نے گمراہ ہونے سے بچالیا۔ جیسے ایشیا میں جادو ٹونے کا رواج بہت پرانا ہے۔ اسی طرح امریکہ میں بھی اس کی جڑیں اپنی جگہ بنا رہی ہیں۔ یہ گمراہی تھی کہ میں ایک غلط راہ کا انتخاب کرلیتی۔ حالانکہ مجھے میری فرینڈز اکساتی بھی رہی تھیں تاہم میں نے ہمیشہ گاڈ سے ہی رجوع کیا ہے۔" اس کا انداز سچ پر اثر تھا مگر ہنی کچھ الجھ سی گئی۔
"تو پھر گاڈ نے تمہیں وہ سب کچھ دے دیا۔ جس کی تمہیں چاہ تھی؟"
"جس کی میں نے چاہ کی تھی۔ اس کا ساتھ شاید میرے لیے بہتر نہیں تھا۔ اسی لیے وہ مجھے نہیں ملا۔"
وہ صبر کی نجانے کون سی کہانی سنا رہی تھی۔
"یہ کیسا صبر ہے۔" ہنی کی آواز تھکی تھکی سی تھی۔

"مجھے بھی ایسا ہی صبر چاہیے۔"
"کیا تم نے صبر اور شکر کی طلب کی ہے کبھی؟"
"نہیں۔" اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہل گیا۔
"تو پھر یہ چیزیں تمہیں کیسے مل سکتی ہیں۔" وہ دھیمے سے مسکرادی۔
"مجھے ان کی چاہ بھی نہیں۔" اس کا لہجہ اکھڑ گیا۔
"مجھے جس کی طلب ہے۔ اللہ مجھے نہیں دیتا۔"
"وہ ضرور نوازتا ہے۔ بس طلب سچی ہونی چاہیے۔"
"ہیلر تمہارے ساتھ خوش تھا۔" ہنی بات بدل گئی۔ اس کا دل ایک دم ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اور وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔
"ہاں بہت۔ وہ دنیا سے جب گیا تو مجھ سے بہت راضی تھا۔ اسے کوڑھ کی بیماری تھی اور میں نے اس کی بہت خدمت کی تھی۔"
"تم نے کبھی اس سے کراہیت محسوس نہیں کی؟" ہنی کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔
"نہیں۔ میں اسے خود نہلاتی تھی' صاف ستھرا کرتی۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی۔" ہیلر کی یاد نے اس کی آنکھوں کو بھگو دیا تھا۔
"کیا وہ خوبصورت تھا۔"
"دنیا کی نظر میں شاید وہ ایک بد صورت آدمی تھا تاہم میرے لیے وہ بہت پیارا بہت اچھا تھا۔" اس کی آواز میں پیار ہی پیار تھا۔ ہنی کو پھر سے حیرت ہوئی۔ وہ مونیکا کے پاس آکر ہمیشہ حیران ہی ہوتی تھی۔
"ہیلر کے بعد تم نے شادی نہیں کی۔؟" ہنی کچھ سوچ کر پوچھنے لگی۔
"نہیں۔"
"کیوں؟"
"بس دل نہیں مانا۔ حالانکہ ایوڈ۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ ہنی کو بے چینی لاحق ہو گئی۔
"کیا ایوڈ؟"
"کچھ نہیں۔" مونیکا شاید بتانا نہیں چاہتی تھی۔
"پلیز مونی! بتاؤ نا۔" ہنی نے اصرار کیا۔ ویسے بھی وہ بلا کی بے صبری اور ضدی تھی۔
"ایسا کچھ بھی تو نہیں۔" مونیکا کی آواز نجانے کیوں بوجھل ہو گئی۔
"تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔" وہ اداس ہو گئی تھی۔
"پگلی! ہیلر کے بعد ایوڈ نے مجھے اپنانا چاہا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔"
"انکار؟ مگر کیوں؟" ہنی بے چین ہو گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا گویا مونیکا نے ایک احمقانہ فیصلہ کیا تھا۔
"بس میرا دل راضی نہیں تھا۔"
"پھر بھی۔ تم نے اپنی محبت کو ریجیکٹ کر دیا۔ اس لیے کہ ماضی میں ایوڈ تمہیں ریجیکٹ کر چکا تھا؟" ہنی کا سوال کافی چبھتا ہوا تھا۔
"نہیں' ایسی بات نہیں۔" مونیکا نے بغیر برا مانے تردید کی تھی۔ ویسے بھی اسے غصہ بہت کم آتا تھا بلکہ سرے سے آتا ہی نہیں تھا۔ ہنی اسے بہت تلخ ترین بھی کہہ سن لیتی تھی۔ [illegible] جو اس کی پیشانی پر سلوٹ نمودار ہو جاتی۔
"مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں ہیلر کے ایثار اور [illegible] کو بھلا نہ پاؤں گی۔ اور میں ایوڈ کے ساتھ مخلص [illegible] نہ پاؤں گی سو اسی لیے۔" وہ کچھ بیمار تھی۔ زیادہ بولنے سے اس کا سانس پھول جاتا تھا مگر وہ پھر بھی بہت سے ہنی کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔
"مگر مجھے تمہارا فیصلہ احمقانہ لگ رہا ہے۔" ہنی [illegible] ایک عادت بہت پختہ ہو چکی تھی۔ وہ کھل کر اپنی [illegible] کا اظہار کر دیتی تھی۔ اگرچہ اس کی بات مقابلہ کو لگتی یا بھلی۔
"شاید۔ یہ تمہارا اپنا نقطہ نظر ہے۔" مونیکا ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔
"اگر تم ایوڈ سے شادی کر لیتیں تو آج تنہا نہ ہوتیں۔" ہنی نے تاسف سے کہا۔
"تنہائی میرے نصیب میں لکھی تھی اور مجھے تنہا ہی رہنا تھا۔" وہ اپنا انہیلر تلاش کر رہی تھی۔ [illegible] میز پر بے شمار سیرپ اور دوائیاں رکھی تھیں۔ [illegible] استھما کے مرض میں مبتلا تھی۔ اور یہ مرض

[illegible] دوائیوں اور تنہائیوں کا مرہون منت لگتا تھا۔
"تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"
"بس زندگی کے دن پورے ہو رہے ہیں۔" مونیکا ہلکے سے انداز میں مسکرادی تھی ہنی کچھ دیر مزید بیٹھی تھی۔ پھر اٹھ کر باہر نکل گئی۔ اسے مارکیٹ جانا تھا مگر اس کی طبیعت بہت بوجھل ہو گئی تھی سو وہ واپس پلٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

وہ جس روڈ پر روزانہ واک کرتی تھی۔ اس روڈ کے آخری سرے پر چرچ کی عمارت تھی۔ یہ عمارت بہت پرانی تھی۔ اس بلاک کے سبھی لوگ اس چرچ میں عبادت کے لیے جاتے تھے۔ مونیکا بھی تقریباً" اسی وقت یہاں سے گزرتی تھی۔ پہلی مرتبہ مونیکا سے اس کی ملاقات بھی اسی جگہ پر ہوئی تھی۔
وہ معمول کے مطابق عبادت کے لیے جارہی تھی جب بینچ پر بیٹھی اس اداس آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی نجانے کون سی کشش تھی جو مونیکا کو اس لڑکی کی طرف کھینچ لائی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی آئی۔ ہنی اس کی موجودگی کے باوجود بھی چونکی نہیں تھی۔ اس کی سوچ ہی اتنی گہری تھی کہ وہ اس سوچ کے اثر سے نکل ہی نہیں پائی۔
"پور گرل!" مونیکا کو عجب سے تاسف نے گھیر لیا۔ ہنی اب کے واقعی چونک بھی گئی تھی۔
"کون ہو تم؟" اسے اپنی سوچوں تک میں کسی کی مداخلت پسند نہیں تھی۔
"میں مونیکا ہوں۔ تمہارے پڑوس میں رہتی ہوں۔ یہاں سے گزر رہی تھی۔ تمہیں دیکھ کر رک گئی۔" مونیکا نے سادگی سے وضاحت کی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے مونیکا کی طرف دیکھ کر رکنے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔
"تمہارا چہرہ اچھا لگا تھا۔ اسی لیے رک گئی۔"
"کمال ہے۔" ہنی حیران ہوئی۔
"بھلا اس چہرے میں کیا خاص بات ہے۔"
"اس چہرے کی اداسی! ان آنکھوں کی ویرانی تمہارے ساتھ کیا ہوا پیاری لڑکی۔" اس کا بے تکلفانہ انداز ہنی کو کچھ بھایا نہیں تھا۔
"میرے ساتھ کیا ہونا ہے۔" وہ اتنی آسانی کے ساتھ کسی پر کھلتی کہاں تھی۔
"تم کون ہو؟ اور کہاں جارہی تھیں؟" وہ بے زاری سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔
"میں ایک بیمار عورت ہوں۔ ابھی تو عبادت کے لیے جارہی ہوں' واپسی پر اسٹور سے دوائیاں لاؤں گی۔" مونیکا نے ایک دفعہ پھر سے سادگی بھرے انداز میں کہا۔
"عبادت کے لیے۔" ہنی چونکی۔
"ہاں۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔
"تم مسلمان ہو؟"
"نہیں۔"
"او۔ تو کرسچن ہو' چرچ جارہی ہو۔" ہنی گویا سمجھ گئی تھی۔
"ہاں۔"
"کیا روزانہ جاتی ہو۔؟" ہنی غیر محسوس طریقے سے اس کے ساتھ باتوں میں الجھ گئی تھی۔ اور وہ بھی تو فرصت کے عالم میں اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔
"ہاں۔"
"اس وقت۔" ہنی نے سوچتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔"
"پھر تو مجھے بھی تم روزانہ یہاں دیکھتی ہو گی۔؟" سوچ سوال بن گئی تھی۔
"ہاں' تقریباً" روزانہ۔"
"عبادت کے بعد دعا میں کیا مانگتی ہو۔" اس نے ایک عجیب سا سوال کر دیا تھا۔ دراصل مونیکا اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اور یکایک اس سے گفتگو طویل کرنے کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ پہلی مرتبہ اس اجنبی ملک میں وہ کسی اجنبی عورت سے گفتگو کر رہی تھی۔ اس بات پر وہ خود بھی حیران تھی۔

"دعامیں سکون مانگتی ہوں۔"
"تو کیا سکون ملتا ہے؟" ایک اور عجیب سوال۔
"ہاں 'ملتا ہے۔"
"مجھے بھی سکون کی تلاش ہے۔ کیا میرے لیے بھی سکون مانگ دوگی۔" وہ تھکی تھکی آواز میں بولی۔
"تم خود اپنی لیے سکون مانگو۔ مجھے امید ہے ' تمہاری طلب کو پورا کیا جائے گا۔"
"نہ طلب پوری ہوتی ہے نہ چاہ۔" وہ ایک انگریز عورت سے بہت عجیب سوال کر رہی تھی۔ اور وہ انگریز عورت بھی بہت عجیب تھی۔ عجیب سوالوں کے عجیب جواب دیتی تھی۔
"کیا پتا' طلب اور چاہ پوری کی جانے والی ہی نہ ہو۔" وہ بغیر مسکرائے بولی۔
"تو پھر تمہاری کیوں پوری ہوتی ہے؟ اس لیے کہ تم عیسائی ہو۔" اس کا سوال اور بھی چبھتا ہوا تھا۔
"نہیں۔ اس لیے کہ میں دکھ پر صبر کرلیتی ہوں اور سکھ پر شکر۔ یہ اچھی دوا ہے مگر ذائقے میں بہت تلخ۔" اب کے وہ مسکرادی تھی۔
"ہاں' تم نے ٹھیک کہا۔" ہنی نے تائیدی انداز میں سرہلایا۔
"تم اب چرچ جاؤ گی۔"
"ہاں۔"
"کیا میں تمہارے ساتھ چلوں؟" نجانے کیا سوچ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تمہاری مرضی ہے۔ میں تمہیں فورس تو نہیں کرسکتی۔" اس نے قدم آگے کی طرف بڑھادیئے۔
"میں چلوں گی۔" وہ اس کے برابر چلنے لگی تھی۔
نجانے کیوں مونیکا کی رنگت چرچ کی عمارت دیکھ کر زرد ہونے لگی تھی۔ مگر پھر بھی وہ قطار میں شامل ہوگئی تھی۔ عورتیں مقدس گیت گارہی تھیں۔ مگر مونیکا کے ہونٹ بالکل ساکت تھے۔ یوں لگ رہا تھا گویا سوئی کے ساتھ ہونٹوں کو سی دیا گیا ہے۔
جب دعا کے لیے کہا گیا تو ایک نن ٹائپ کی عورت اس کے قریب آکے بیٹھ گئی۔
"تم بھی دعا مانگ لو۔"
"کیا مانگوں۔" ہنی کا ذہن صاف سلیٹ کی ما[illegible] ہوگیا تھا۔
"کچھ بھی مانگ لو۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔
"پھر بھی کیا؟" ہنی کو بھول گیا تھا کہ اسے کچھ ما[illegible] بھی تھا۔ حالانکہ آج سے پہلے وہ پوری پوری را[illegible] مانگنے کے لیے کھڑی ہوتی تو صبح کی سپیدی تک کھ[illegible] رہتی۔
"تمہیں آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔" اس نن ک[illegible] میری تھا۔ اور وہ مونیکا کی اچھی دوست تھی مگر ان د[illegible] وہ دونوں ایک دوسرے سے دور دور تھیں نجا[illegible] کیوں؟
"ہاں' میں پہلی مرتبہ آئی ہوں۔" وہ سپاٹ [illegible] میں بولی۔
"تم کس کتاب کی پیروکار ہو۔؟" میری نے دھیمے لہجے میں رازداری سے پوچھا تھا۔
"کیا مطلب؟" وہ سمجھی نہیں تھی۔ ایک دم ا[illegible] عجیب سی گھبراہٹ نے گھیر لیا تھا۔ وہ یہاں سے بھ[illegible] جانا چاہتی تھی۔
"جیسا کہ عیسائیت انجیل کے دم سے ہے۔ [illegible] یہودیت' تورات سے ہے۔
"جیسا کہ اسلام 'القرآن کے دم سے ہے۔ جی[illegible] مسلمان قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔" ہنی کی آواز [illegible] مضبوط تھی۔ جذبات کی حدت سے ہنی کے رخسار [illegible] گئے تھے وہ اس کے سوال کا مطلب سمجھ گئی تھی۔
"کیا تم مسلمان ہو۔" میری کا لہجہ اور انداز [illegible] گیا۔
"ہاں" وہ بغیر کسی خوف اور جھجک کے بولی۔
"اچھا۔" میری کھسیانی سے ہوگئی تھی۔
"ویسے ایک بات کہوں؟"
"ہاں۔ کہو۔" وہ مونیکا کے فارغ ہونے کا انت[illegible] کر رہی تھی۔
"سب سے زیادہ پیروکار رکھنے والا مذہب پتا [illegible] کون سا ہے؟" میری کی آواز بالکل سرگوشی نما ہو[illegible]

تھی۔
وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بلکہ اس کا میری کی باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں تھا۔
"پیروکاروں کی تعداد کے لحاظ سے عیسائیت دنیا کے مذاہب میں سرفہرست ہے۔ دنیا میں اس کے پیروکار بہت ہیں۔" میری نجانے اس پر کون سی بات کا رعب جمانا چاہتی تھی۔ وہ کون سا اس کی طرف متوجہ تھی۔ اس کا دل تو عجیب سی گھٹن کا شکار تھا۔ نجانے کب مونیکا چپکے سے ان کے قریب آگئی تھی۔
"عیسائیت کے پیروکار زیادہ ہیں۔" میری کے لہجے میں فخر تھا۔
"اسی لیے یہ معاشرہ تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہے۔ نہ یہ راہنما چاہتے ہیں۔ نہ انہیں کسی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی انہیں کوئی "راہنما" چاہیے۔ یہ لوگ آسان راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ جہاں مشقت دیکھ لیں' وہیں راہ بدل لیتے ہیں۔" مونیکا کی آواز میں عجیب سی کاٹ تھی۔
"سونی! چلیں۔" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔
"دعا نہیں مانگو گی؟" میری پھر سے اسے گھیرنا چاہتی تھی۔
"کم از کم اس جگہ بیٹھ کر نہیں۔"
"تم بائبل کو پڑھو تو سہی۔" میری اسے روکنا چاہتی تھی۔
"اس کے پاس قرآن ہے۔ اور قرآن جامع ہے کاملیت رکھتا ہے۔" مونیکا کی سرد سی آواز نے ہنی کو چونکا دیا۔
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" مونیکا' ہنی سے تصدیق چاہ رہی تھی۔
"ہاں' بالکل ٹھیک۔" ہنی کھل کر مسکرادی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ چرچ میں داخل ہونے کے بعد جو اسے گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ وہ ان راہوں پر بھٹکنا نہیں چاہتی تھی۔ سوا سے بچا لیا گیا تھا۔
"تم نے کبھی دعا مانگی۔" مونیکا واپس جاتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔
"ہاں بہت دفعہ۔ میری تو پوری زندگی ایک دعا کے گرد گھوم رہی ہے۔" وہ کھلی فضا میں گویا کھل کر سانس لے رہی تھی۔
"مگر میری "دعا" نے قبولیت کا درجہ نہیں پایا۔"
"تو کیا تم نے دعا مانگنا چھوڑ دیا۔"
"نہیں۔ اگر اس "دعا" کو ترک کردیا تو میرے لیے زندگی میں کچھ نہیں بچے گا۔" وہ دھیرے دھیرے ٹہلنے کے سے انداز میں چل رہی تھیں۔
"مجھے بھی دعا مانگنا اچھا لگتا ہے۔"
"اور تم دعائیں کسے مانگتی ہو؟" ہنی نے کچھ ٹھٹک کر مونیکا کی طرف دیکھا تھا وہ بغیر رکے چل رہی تھی۔
"کسی کو بھی نہیں۔" وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔
"تو پھر خالی ہاتھ اٹھاتی ہو۔" مونیکا کی کچھ باتیں اسے الجھا کر رکھ دیتی تھیں۔
"نہیں' خاتمہ بالخیر مانگتی ہوں۔ دعا کرتی ہوں کہ کسی کو میری ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ میں کسی

کے دل کو ٹھیس نہ پہنچاؤں۔" وہ نم آواز میں کہتی چلی گئی تھی۔

"اور کوئی تمہارے دل کو بے شک توڑ پھوڑ دے؟" ہنی نے اکھڑے انداز میں پوچھا۔

"وہ اس کا اپنا عمل ہو گا۔"

"تم بھی کمال کی چیز ہو۔ بہت عجیب بلکہ عجیب تر۔" ہنی نے سر جھٹک کر کہا۔

"تم جو بھی سمجھ لو۔" مونیکا نے بغیر برا مانے کہا۔

"اب میں چلتی ہوں۔ میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ ویسے مجھے چرچ جا کر اچھا نہیں لگا۔" وہ اپنے دل میں آئی بات بھی چھپا نہیں پائی تھی۔

"اور مجھے بھی۔" مونیکا دھیمی آواز میں بولی تھی یوں کہ ہنی بمشکل ہی سن پائی۔

"تمہیں کیا اچھا نہیں لگا۔" وہ ٹھٹک کر پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں۔" وہ ٹال گئی تھی۔

"پھر بھی۔ بتاؤ نا۔" ہنی بضد ہوئی۔

"بس ایسے ہی۔" مونیکا دائیں بائیں سر جھٹک رہی تھی۔

"تم بتانا نہیں چاہتیں۔" ہنی بددل سی بولی۔

"مجھے بھی تمہاری طرح چرچ میں جانا کبھی اچھا نہیں لگتا۔" مونیکا کہہ کر رکی نہیں تھی۔ بلکہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ جبکہ ہنی گویا سن سی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اسکیٹنگ کا کھیل ہنی کو کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ مگر وہ اس دلچسپ کھیل کو دیکھنے میں دلچسپی ضرور رکھتی تھی۔

نجانے لوگوں کو اس کھیل میں کیسا مزا آتا تھا۔ عجیب سی کھڑاؤں کو پہن کر برف پر پھسلنے کا خطرناک کھیل۔ اس کھیل کا آغاز سکنڈے نیویا سے ہوا تھا۔ اس کا پہلا کلب انگلستان میں قائم ہوا۔۔۔ اور شدید سرد ممالک میں ہی کھیلا جاتا تھا۔ آج کل برف باری کے باعث اسکیٹنگ عروج پر تھی۔

مگر ہنی کی دلچسپی آج بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ بہت دیر تک سرد ٹھٹھرتے موسم کی سختی برداشت کر رہی۔ مگر جب ٹھنڈ ہڈیوں کے گودے میں گھسنے لگی تو بے دلی سے اٹھ کر واپس چل دی۔ چرچ روڈ پر چلتے ہوئے اس کی نظر نے چرچ کی پرانی بلند و بالا عمارت دیکھا تھا مگر نجانے کون سی قوت تھی جس نے اسے اندر جانے سے روک لیا۔ وہ اندر جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک "دعا" کے حصول کے لیے بہت سی راہوں پر بھٹک رہی تھی مگر ان راہوں کی طرف چلنے کی ۔۔۔ خواہش ہرگز نہیں تھی۔

جب وہ واپس لوٹی تو میڈ فینی نے پوچھا۔

"آپ کہاں تھیں میم!" وہ کافی گھبرائی گھبرائی لگ رہی تھی۔

"آپ صبح سے غائب ہیں۔ سیل بھی آف تھا۔ ورنہ آپ کو اطلاع کر دیتی۔"

"کیا ہوا؟" وہ کچھ انہونی کے خیال سے گھبرا اٹھی۔

"میم! مونیکا کی ڈیتھ ہو گئی۔" فینی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔

"کک، کب۔ کل تک تو وہ ٹھیک تھی۔" ہنی کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

"آپ کے گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد۔" فینی بھی افسردہ تھی۔ اور یہ افسردگی عارضی قسم کی تھی۔

"کیا اسے دفن کر دیا گیا ہے۔" ہنی کے سینے سے ایک بوجھل بوجھل سانس آزاد ہوئی۔ وہ صوفے پر ڈھے گئی تھی۔

"یس، اس کی موت کے ایک گھنٹے بعد اسے دفن کر دیا گیا تھا۔" فینی نے کچھ بے زاری سے بتایا۔ ہنی کچھ چونک گئی تھی۔ فینی کا لہجہ خاصا روکھا پھیکا سا تھا۔

"مجھے مونیکا کی موت کا بہت دکھ ہوا۔" ہنی کی آواز بھرانے لگی۔

"وہ آپ کی فرینڈ تھی نا۔" فینی نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"پھر تو آپ اسے جانتی ہوں گی۔"

"ہاں۔" وہ کافی اعتماد سے بولی تھی۔

"آپ اس کے بارے میں کیا جانتی ہیں۔" فینی کا انداز کچھ عجیب تھا، پراسرار سا۔

"سب کچھ۔" وہ ابھی تک صدمے کے زیر اثر تھی۔ فینی کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

"آپ کچھ بھی تو نہیں جانتیں۔"

"کیوں؟" وہ تنک اٹھی۔ فینی کے لہجے کے استہزا کو وہ اچھی طرح سے سمجھ چکی تھی۔ تبھی اس کا انداز کافی روکھا ہو گیا تھا۔

"آپ کو پتا ہے۔ مونیکا نے ایوڈ کے پلٹ آنے کے باوجود اسے کیوں ٹھکرا دیا تھا۔؟"

"نہیں تو۔" اب کے وہ چونک اٹھی۔

"اس لیے بھی کہ وہ عیسائیت سے بے زار تھی۔ اس لیے بھی کہ وہ مذہب بدل چکی تھی۔ اس لیے بھی کہ اسے ایوڈ کی بیوی کی "بددعاؤں" سے ڈر لگتا تھا۔ وہ کسی کا دل اجاڑ کر اپنا گھر آباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس کی محبت کی کشش نے ایوڈ کو پھر سے اس کے قریب کر دیا تھا۔ مگر وہ اسے اپنا کر اپنی زندگی کا اصل سکون نہیں کھونا چاہتی تھی۔"

"مونیکا کیا مسلمان تھی؟" اسے پہلے بھی شک سا تو گزرا تھا تاہم اس سے پوچھنے کی نوبت نہیں آسکی۔

"ہاں، وہ اسلام قبول کر چکی تھی۔"

"مگر اس کا چرچ جانا۔ وہ کیا تھا؟" اس نے الجھن بھری نظروں سے فینی کی طرف دیکھا۔

"وہ ارد گرد کے لوگوں کو دھوکا دیتا تھا۔ وہ اتنی جلدی مذہب کی تبدیلی کا اعلان نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی کچھ مجبوریاں اور مسائل تھے۔ مگر پھر اسے مہلت ہی نہیں ملی۔" فینی نے اب بھی بے جان سے انداز میں بتایا۔

یقیناً" اسے مونیکا کا مسلمان ہونا پسند نہیں آیا تھا۔

"اس نے ایوڈ کو بھی اسی وجہ سے مایوس کر دیا تھا۔ وہ مسلمان تھی اور کسی عیسائی سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر جب ایوڈ نے کہا کہ وہ بھی اسلام قبول کر لیتا ہے۔ مگر وہ پھر بھی نہیں مانی۔ وہ کہتی تھی۔ پیار وہی ہوتا ہے جو امر ہو جائے۔ تمہیں پا لوں گی تو طلب ختم ہو جائے گی۔ تم نہ ملے تو محبت ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گی اسے ایوڈ کے بچوں کا بہت خیال تھا۔ اور اس کی بیوی جو کہ ایوڈ کی شادی کا سن کر بیمار پڑ گئی تھی۔ مونیکا کو ان بچوں کا اور ان کی ماں کا بہت خیال تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اگر ایوڈ اس کی طرف لوٹ آیا تو اس کا پورا گھرانہ تباہ ہو جائے گا۔ وہ انہیں تباہی سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ ایک اچھی عورت تھی۔ آج کے دور میں ایسا کوئی بھی نہیں سوچتا۔" فینی خاموش ہو گئی تھی اور اس خاموشی کے ساتھ وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جبکہ ہنی کو بھی خاموشیوں اور سوچوں کے حوالے کر گئی۔

اسے مونیکا کے مر جانے کا بہت دکھ تھا۔ دنیا کی بھیڑ میں بہت پیاروں کو کھو دینے کے بعد وہ مونیکا کو بھی کھو چکی تھی۔ ایک اور کہانی اختتام پذیر ہو گئی۔ ایک اور محبت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

وہ مونیکا کی زندگی سے بہت متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی کے ان پہلوؤں کے بارے میں غور و فکر کر رہی تھی وہ اسے سراہ بھی رہی تھی۔ مونیکا سراہے جانے کے لائق بھی تھی۔ اس میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اور اس مختصر سے عرصے میں ہنی پر اس کی خوبیاں منکشف نہیں ہو پائی تھیں۔

اس انگریز عورت کی زندگی ہنی کے لیے ایک مثال کی طرح تھی۔

مگر کیا ہنی نے اس باکمال، بے مثل عورت کی زندگی سے سبق حاصل کیا تھا؟

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

☼ ☼

میرے نصیب کی بارش

اقراء عباسی

"دانش اٹھ جائیں صبح ہو گئی ہے۔ آپ نے آفس نہیں جانا ہے۔؟ آپ کے کپڑے اور جوتے میں نے نکال دیئے ہیں۔ آپ جلدی تیار ہو جائیں۔"
وہ جلدی جلدی کمرے کو سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

یہ آواز اور الفاظ مجھے کبھی نہیں بھول سکتے تھے۔ وہ روز مجھے اسی طرح اٹھاتی تھی۔

"میں جا رہی ہوں ناشتا تیار ہے ٹیبل پر بچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر میرا جواب سنے بغیر چلی گئی یہ تھی میری بیوی فاریہ جو میرے دو بچوں عدیل، ثمر کی ماں ہے۔ جسے میں نے اپنا نام تو دیا پر دل میں جگہ نہ دے سکا۔ میری زندگی ایک مشین کی طرح چل رہی تھی۔ میں زندگی کو نہیں گزار رہا تھا بلکہ زندگی مجھے گزار رہی تھی۔ میں ایسا تو نہ تھا اس کی وجہ صرف وہ تھی۔ فاریہ کی بہن سونیا۔

فاریہ اور سونیا میرے چچا کی بیٹیاں تھیں۔ مجھے سونیا ہمیشہ سے بہت پسند تھی۔ چچا صدیق کراچی میں اور ہم لاہور میں رہتے تھے۔ میں ماسٹرز کرنے کے بعد کراچی گیا۔ وہاں سونیا سے میری ملاقات نو سال بعد ہوئی۔ وہ بہت شوخ مزاج تھی۔ ہنستی تو ایسا لگتا جیسے مندر کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے۔ وہ ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی۔ شاید وہ تھی ہی اتنی خوبصورت کہ عام سا حلیہ بھی اس کو خاص بنا دیتا تھا۔

میں اس کی خوبصورتی کا اسیر ہو گیا۔ وہ میرے دل میں کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ بات بات پر ہنستی تھی اور مجھے شوخ مزاج لڑکیاں ہی پسند تھیں۔ اس نے میٹرک بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ پڑھ پڑھ میں خود کو بوڑھا نہیں کرنا چاہتی جس طرح فاریہ ہیں۔ فاریہ بہت لیے دیئے انداز میں رہتی تھی۔ نے اس کو ہمیشہ کتابوں میں سر دیے دیکھا بہت سنجیدہ مزاج۔ وہ سونیا کی بہن لگتی ہی نہیں تھی۔ رنگ گہری آنکھیں، سادہ سی چوٹی عام سا ہی ہوتا۔

میں کراچی ایک ہفتہ رہا اور اس ایک ہفتے صرف سونیا سے باتیں، اس کے ساتھ شاپنگ کی کا اس کو بہت شوق تھا وہ زندگی سے بھرپور لڑکی مجھے اس کی یہی باتیں پسند تھیں۔

ایک ہفتے بعد واپسی ہوئی اور آتے ہی میں نے کو کہہ دیا کہ وہ جا کر رشتہ مانگیں۔ میری صرف دو تھیں جو اپنے اپنے گھروں کی تھیں۔ ابا کا جما کاروبار تھا۔ میں شکل و صورت کا بھی خاصا اچھا مجھے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا میں کسی بھی لا خواب ہو سکتا تھا۔ میں نے گھر میں اتنا شور مچایا کہ ابا اگلے ہی ہفتے کراچی چل پڑے ان کو بھی بہت ا تھا اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کرنے کا اور وہ بھی خوش تھے۔ میں گھر میں بے قراری سے انتظار کر میں دن میں دو بار فون کرتا اماں تنگ آ جاتیں۔ انہوں نے مجھے خود فون کر کے بات پکی ہونے کی ا دی۔ میں خوشی کے مارے پھولے نہ سمایا۔ اماں ا دن بعد واپس آ گئے۔ اماں ابا جیسے ہی گھر میں د

ئے میں ان سے لپٹ گیا ابا کا مجھ پر بہت رعب تھا اس لیے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خوشی کو کنٹرول کیا۔ اماں آتے ہی کاموں میں لگ گئیں اور میں ان کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ آخر میں نے اماں کو پکڑ لیا اور کہا "مجھے بتایئے کیا بات ہوئی۔" اماں نے مجھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اپنے ابا کا انتظار کرو وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔" مجھے کچھ تشویش ہوئی معاملہ کیا ہے۔ آخر ابا آگئے انہوں نے کہا۔

"برخوردار تم خوش نصیب ہو جو تمہیں فاریہ جیسی ہم سفر مل رہی ہے۔ فاریہ جیسی سلیقہ مند اور پڑھی لکھی لڑکی تو ڈھونڈنے سے نہ ملتی۔" میں فاریہ کا نام سن کر ہی گم ہو گیا مجھے لگا جیسے میرے پیروں تلے زمین سرک گئی ہے۔ پھر ذہن نے کہا۔

"ابا شاید نام غلط لے رہے ہیں۔"

"ابا فاریہ نہیں سونیا۔" میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ ابا نے مجھے گھور کر دیکھا۔

"تم میری ناک کٹوانا چاہتے ہو۔ دس لوگوں کے

سامنے بات پکی کر کے آیا ہوں۔ اکلوتا بیٹا ہونے کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔" اور ابا نہ جانے کیا کیا کہتے رہے مجھے تو لگ رہا تھا جیسے زندگی نے مذاق کیا ہے۔ ابا کمرے سے چلے گئے اور میں کبھی ابا کو دیکھتا اور کبھی اماں کو۔

"اماں یہ سب کیا ہے۔ میں نے آپ کو کہا تھا کہ میں سونیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" میں شدید غصے میں تھا۔

"کیوں فاریہ میں کیا برائی ہے اور سونیا میں کون سی اچھائی ہے۔ مجھے تو وہ بالکل پسند نہیں آئی۔ سارا دن اٹھکیلیاں کرتی رہتی ہے۔ میں نے خود اس کو ماں سے بدتمیزی کرتے دیکھا اس کی ماں نے اس کو برتن دھونے کا کہا تو آگے سے صاف جواب دے دیا۔ میرے ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔ جو ماں کو ایسا جواب دے سکتی ہے کل کو مجھے کیا کہے گی۔ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو میری جمع پونجی میں تمہیں گنوا نہیں سکتی۔ فاریہ سارا دن ماں کے ساتھ کاموں میں لگی رہتی ہے۔ اس نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ ماشاء اللہ سے پڑھائی میں بھی آگے ہے۔" اماں نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں مجھے ان کی باتیں بہت بری لگ رہی تھیں۔

"اماں وہ اتنی خوبصورت ہے آپ کو اس میں کوئی اچھائی نظر نہیں آئی۔ مجھے بس سونیا سے شادی کرنی ہے۔" میں نے حتمی انداز میں کہا۔

"یہ تم بھول جاؤ تمہاری شادی فاریہ سے ہی ہوگی۔ چار مہینے بعد تمہاری شادی طے ہے۔" یہ ایک اور بم مجھ پر گرا تھا۔

"اماں لیکن۔"

"بس میں کچھ نہیں سنوں گی تم اپنے ابا سے بات کرو۔ تمہاری بہنوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اماں یہ کہہ کر رکی نہیں اور کمرے سے چلی گئیں۔

میں نے بہت واویلا مچایا۔ بھوک ہڑتال بھی کی۔ لیکن ابا نے مجھے گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی اور میں ابھی اپنے پیروں پر نہیں کھڑا تھا۔ بالآخر قسمت کے آگے ہار گیا۔ اور خاموشی سے سر تسلیم خم کر دیا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں مجھے یہ بہت برا لگتا۔ مجھے لگتا جیسے سب میرا مذاق اڑا رہ ہوں۔

سونیا کی شادی میرے چھوٹے چچا کے بیٹے سل سے طے پا گئی۔ ستم یہ ہوا کہ فاریہ اور سونیا کی ر اکٹھے ہونا تھی۔ مجھے سلمان پر رشک آتا تھا۔ ف میری بیوی بن کر گھر میں آ گئی پر میں نے اپنے دل دروازے اس کے لیے نہ کھولے۔ وہ بہت س مزاج تھی۔ شروع کے دنوں میں اس نے مجھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی پر میں اس کے حقوق و فرائض ادا کیے اور صرف کام کی کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتا۔ وہ بہت سمجھ دار تھ اس نے بھی میرے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ پھر ہم دو اپنی اپنی دنیا میں سمٹ گئے۔ شادی کے پانچ سال میں دو بچوں کا باپ بن گیا۔ اماں ابا انتقال کر گئے۔ آج بھی میرے دل میں بیٹھی تھی۔ میرا کاروبار بہ کے چل رہا تھا۔ اس ہی سلسلے میں مجھے سیالکوٹ پڑا۔

سیالکوٹ میں ہی چھوٹے چچا کی فیملی رہتی تھ میں نے سوچا تھا کہ میں کبھی سونیا سے نہ ملوں لیکن سونیا کی کشش نے مجھے ان کے دروازے آگے کھڑا کر دیا۔ میں نے سلمان کو فون کر کے اپنے آ اطلاع دی تھی۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھلا ہ میں اندر داخل ہو گیا۔ گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دس سال پہلے سیالکوٹ آیا تھا۔ برآمدے میں دا ہوا تو کمرے سے شور کی آواز آ رہی تھی۔ میں دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ کم میں سلمان بیٹھا تھا جس کی گود میں ایک بچہ تھا اور ا اور بچہ اس کی ٹانگ سے چمٹا ہوا تھا۔ کمرے کی حا بدتر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کافی دنوں سے صفائی نہ ہوئی۔ کپڑوں کا ڈھیر صوفے پر پڑا تھا جس میں سے آ رہی تھی۔ میں سب کچھ نظر انداز کر کے آگے اور سلمان سے گرمجوشی سے ملا۔

"یار تمہیں گھر ڈھونڈنے میں دقت تو نہیں ہوئی۔" بچہ اس کی گود میں چیخ چیخ کر رو رہا تھا وہ اس کو چپ کراتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں مجھے گھر آرام سے مل گیا تھا۔ گھر پر کوئی نہیں ہے کیا؟"

مجھے بچوں کی چیخ و پکار سے کوفت ہو رہی تھی۔ کیونکہ فاریہ میرے آرام کا بہت خیال رکھتی تھی اور میں نے کبھی اپنے بچوں کو گود میں نہیں لیا تھا۔ سلمان کی آواز نے مجھے سوچوں کے بھنور سے نکالا۔

"معاف کرنا یار وہ سونیا ذرا اپنی سہیلی کی طرف گئی ہے۔ تم کھڑے کیوں ہو بیٹھو نا۔" اس نے صوفے پر سے کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر میرے لیے جگہ بنائی۔

"فاریہ اور بچے کیسے ہیں؟" وہ شرمندہ شرمندہ لگ رہا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔ تم کبھی لاہور کا چکر لگاؤ نا۔"

"بس یار آج کل کاروبار تھوڑا مندا چل رہا ہے۔"

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سونیا آ گئی۔ وہ بالکل نہ بدلی تھی۔ اسی طرح سجی سنوری، زرق برق سوٹ ہاتھوں میں چوڑیاں، گہرا میک اپ، شوخ رنگ کی لپ اسٹک اس کے ہاتھ میں شاپر تھے۔ جو اس نے دروازے پر ہی رکھ دیے۔

"ارے دانش بھائی آپ کب آئے، وہ بھی اچانک؟ فاریہ آپا کہاں ہیں؟" وہی شوخ و چنچل انداز۔

"ارے تم یہ باتیں چھوڑو اور کھانے پینے کا بندوبست کرو۔" سلمان غصے میں لگ رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا میں ابھی پارلر میں پانچ ہزار لگا کر آئی ہوں اور چولہے کے آگے کھڑی ہو جاؤں۔ آپ باہر سے کھانا لے آئیں۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"اچھا تم بچوں کو سنبھالو میں کچھ کرتا ہوں۔" بچہ لپک لپک کر سونیا کے پاس آنا چاہ رہا تھا۔

"آپ بچوں کو بھی لے جائیں۔ میں ابھی تھکی ہاری آئی ہوں۔" سلمان اپنے غصے کو دبا رہا تھا۔ مجھے بھی کچھ شرمندگی ہو رہی تھی۔

"نہیں سلمان تم تکلف مت کرو۔ میں کچھ دیر کے لیے ہی آیا ہوں۔ مجھے ہوٹل واپس جانا ہے۔" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا حالانکہ میرا ارادہ دو دن رکنے کا تھا۔

"یہ کیا بات کر رہے ہو اتنے عرصے بعد آئے ہو۔ تم تھوڑا آرام کرو میں کھانا آرڈر کر دیتا ہوں۔"

"دانش بھائی آپ آئیں گیسٹ روم میں فریش ہو جائیں۔" اور پھر میں سونیا کے ساتھ گیسٹ روم کی طرف چلا گیا۔

گیسٹ روم کا حال باقی گھر سے بہتر تھا۔ لیکن میں صفائی کا خیال رکھنے والا تھا یہ عادت بھی مجھے فاریہ نے ڈال دی تھی۔ وہ گھر کو ہر وقت چمکا کر رکھتی تھی۔

"میری ملازمہ آج کل چھٹی پر ہے۔ سارے کام الٹے ہو رہے ہیں۔ میرے پاس تو وقت نہیں ہے اب میں بچوں کو سنبھالوں یا گھر کو۔" سونیا بڑی ادا سے کہہ رہی تھی۔ میں واش روم چلا گیا اور وہ باہر چلی گئی۔

واش روم سے نکلا تو مجھے شور سنائی دیا۔

"جاہل عورت میں اس وقت کو پیٹتا ہوں جب میں نے تم سے شادی کی تم نے مجھے تباہ و برباد کر دیا۔ میرا بال بال قرضے میں جکڑا ہے اور تم پھر یہ زیور اٹھا لائیں۔" سلمان چیخ رہا تھا۔

"میں تم سے شادی کرنے کے لیے نہیں مر رہی تھی۔ تم خود میرے گھر کے چکر کاٹتے تھے۔ کیا ہو گیا اگر میں نے یہ ہلکا سا پانچ تولے کا سیٹ لے لیا۔" سونیا جاہل عورتوں کی طرح گلا پھاڑ کر بول رہی تھی۔

"آہستہ بولو گھر میں مہمان ہے۔ میں پاگل تھا اندھا ہو گیا تھا۔ دھوکہ کھا گیا تمہاری شکل دیکھ کر۔ اصل میں تم انتہائی بد صورت عورت ہو۔ جس کو نہ اپنے بچوں کی پروا ہے نہ شوہر کی' سارا سارا دن تم پارلر میں پیسہ برباد کرتی ہو یا بازاروں میں گھوم رہی ہوتی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جیسے تم شوہر ہو اور میں بیوی جو سارا دن بچوں اور گھر کو سنبھالتا ہوں۔"

"میں تمہاری بیوی ہوں ملازمہ نہیں۔ اگر اتنا ہی شوق تھا اپنی خدمت کروانے کا تو کسی گھریلو لڑکی سے شادی کرتے۔ مجھے تو پہلے ہی لوگ کہتے ہیں سلمان تمہارا شوہر لگتا ہی نہیں۔" وہ چیزیں توڑ کر چیخ رہی تھی۔

مجھے سب کچھ صاف سنائی دے رہا تھا۔ فاریہ نے کبھی میرے آگے زبان نہیں چلائی تھی۔ اسے میری اور بچوں کی فکر بہت تھی۔ اس نے سارا زیور میرے کاروبار میں لگا دیا تھا۔ اور مجھے یہ کہا تھا کہ میرے لیے میرے علم کا زیور ہی کافی ہے۔ میں جو کماتا اس کو دے دیتا۔ اور مجھ سے دوبارہ کبھی پیسے نہ مانگتی۔ میں نے دیکھا تھا سونیا کے اتنے خوبصورت چہرے کے پیچھے بد صورت دل ہے۔ مجھے اپنا آپ چھوٹا لگ رہا تھا۔ اندر کی گھٹن بڑھتی جا رہی تھی میں نے اپنا سامان اٹھایا اور سلمان سے ملے بغیر باہر نکل گیا۔ میں سب بھول گیا میں سیالکوٹ کیوں آیا تھا اور سیدھا بس اسٹاپ گیا اور پہلی بس سے ہی لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ سارے راستے میں سونیا اور فاریہ کا موازنہ کرتا رہا۔ "اگر میں سلمان کی جگہ ہوتا تو۔۔۔" اس سے آگے میری سوچ نہیں جا رہی تھی۔ مجھ پر آج یہ راز کھلا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اماں ابا کا فیصلہ درست تھا۔ اماں مجھ سے کہتی تھیں فاریہ ہیرا ہے۔ جس کی قدر مجھے آج معلوم ہوئی۔ وہ میری قسمت تھی جو مجھے ملی تھی۔ سونیا کو میں دیکھ آیا تھا جو بدترین حالات میں بھی اپنا سوچتی تھی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ سارے راستے میں بے چین رہا۔ رات کو گھر پہنچا تو فاریہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی۔ مجھے اپنا گھر جنت لگ رہا تھا۔ فاریہ سے نظر نہیں ملا سکتا تھا اس لیے کمرے میں جا کر سو گیا۔

فاریہ مجھے روز کی طرح ابھی اٹھا کر گئی ہے۔ میں نے یہ جان لیا ہے وہ میرے نصیب کی بارش تھی جو مجھ پر برسی تھی۔ اب مجھے پانچ سالوں کا ازالہ کرنا ہے۔ میں نے سونیا جیسی خود غرض اور حسن پرست عورت کے عشق میں تباہ کر دیے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی میرے بیوی بچے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں ایک نئے عزم کے ساتھ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

مکمل ناول

سعدیہ عزیز آفریدی

ریت کے اندر اک دریا

ابھی ابھی اس کے موبائل فون پر بیل ہوئی تھی اس نے کال ریسیو کی اور حیران رہ گیا۔

"اوئے تو یہاں کیسے؟؟"

"ایک مہینہ ہو گیا ہے یہاں آئے ہوئے تو سنا کیا کر رہا ہے؟؟"

"تیری آوارگی کو سکون مل گیا سچ بتا خود آیا ہے یا بابا جان نے بلایا ہے۔" دوسری طرف گہری سانس کو نجی اور اس نے کہا۔

"بابا جان نے بلوایا ہے کہنے لگے کب تک لور لور پھرو گے واپس آؤ میرے گھر کو آباد کرو۔"

"پھر کیا آباد گھر کو۔"

"ہاں اسی لیے لوٹ آیا ہوں سارے پرانے ملازمین پاگلوں کی طرح خوش آمدید کر رہے ہیں' اچھا سن میں بابا کا گھر آباد کرنے کے لیے چلڈرن ہوم سے دو بچے گود لینا چاہتا ہوں۔"

"آہاں.... یعنی ان کی خدمتِ خلق کی چین کو آگے بڑھانا چاہتا ہے۔"

"ہاں شام کو مل' پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" اور وہ اپنی ساری مصروفیات ترک کرکے اس کی کوٹھی جا پہنچا بہت سے معاملات طے ہو گئے تھے یہاں تک کہ اس نے ماں کے تذکرے پر حیرت سے اسے دیکھا۔

"تو بے بیز کی طرح ماں بھی ایڈاپٹ کرنا چاہتا ہے تیری اپنی ماں موجود تو ہے منصور۔"

"ہاں مگر میں جب اپنے گھر جاتا ہوں تو مجھے لگتا ہے میری ماں مجھ سے کوسوں دور کھڑی ہے وہ ان سب کی عادی ہیں میری نہیں' وہ مجھے مہمان کی طرح ٹریٹ کرتی ہیں پھر میری امارت میرے رتبے سے کانشس رہتی ہیں ان میں وہ فطری ممتا ابھر کر نہ آتی میں انہیں چھوتا ہوں یا ان کے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ مجھے خود سے دور کر دیتی ہیں۔

"پاگل ہے میرے کپڑوں میں ادرک لہسن کی (بو آ) رہی ہے اتنی گرمی ہے اتنا پسینہ آتا ہے مجھے تیری نا(زک طبیعت) یہ سب نہیں برداشت کر سکتی' وہ مجھے اپنے گھر کا (فرد) نہیں سمجھتیں۔"

"تو تجھے کیا لگتا ہے ایک آرڈنری ماں تجھے وہ (سب) دے سکے گی۔"

"نہیں مگر مجھے گھر کو چلانے کے لیے کسی بزرگ عورت کی ضرورت ہے میں بچے ایڈاپٹ کرنا چاہتا ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے ان کی تربیت کے پوائنٹ (آف) ویو سے صرف نظر کروں گا۔"

"مگر تیری ماں کی گود میں سر رکھنے کی حسرت۔"

"چل چھوڑ نا میری زندگی کی بہت سی حسر(تیں) صرف حسرتیں ہیں اور مجھے ان کے ساتھ جینا آگیا بس میں بابا کے گھر کو آباد کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوکے میں تیرے ساتھ ہوں۔" پھر (بچے) سلیکٹ کر لیے تھے مگر ان کی گارجین ماں ابھی نہیں مل رہی تھی آج بھی وہ اسی تلاش میں گھر سے باہر نکلا تھا کافی ادارے کھنگالے تھے مگر اسے ایک ماں درکار تھی جو دکھ کے باوجود زندگی جینے کا قرینہ (جانتی) ہو۔ پیڑول اس کی سوچوں کے ساتھ تیزی سے جل (رہا) تھا کہ ایک جگہ وہ ٹھہر گیا ایک بوڑھی عورت اس کی نظروں کا مرکز بن گئی تھی۔

٭ ٭ ٭

چلچلاتی دھوپ میں وہ چادر کی بکل منہ پر ڈالے چلی جارہی تھیں پتا نہیں کہاں سے کہاں تک کے فاصلے ان کے پیروں نے ذائقے کی طرح چکھے تھے مگر آج زندگی نے آخری تلخ گھونٹ ان کے ہونٹوں سے لگایا تو انہیں لگا ان کی زندگی کسی زندگی کا حصہ بھی تھی یا وہ بس بلاوجہ زندگی کو دھوکہ دے کر جیتی آرہی تھیں وہ جب گھر سے نکالی گئیں ان کے سر پر چادر' ایک پرچی پر لکھے پتے' ایک لان کا ڈھل ڈھل کراپنے رنگ روپ سے منہ موڑے ـــــ سوٹ اور کٹے پٹے پیروں میں پھنسی ہوئی ہوائی چپل کے سوا کچھ نہیں تھا اور خالی ہاتھوں میں دستک دینے اور نامراد ہو کر لوٹ آنے والے حسرت زدہ ہاتھوں پر بے بسی سے ٹپکے آنسو۔

انہوں نے رک کر کئی بار سوچا تھا کیا پہلے کبھی ان کی آنکھوں سے ایک ساتھ اتنے سارے آنسو بہے تھے جتنے اس ایک ہفتے میں انہوں نے بہا دیے تھے۔

اسی گز کا وہ گھر آج بہت شدت سے یاد آرہا تھا جہاں زندگی نے پہلی بار آنکھ کھولی تھی وہ تھک کر بیٹھ گئیں۔

"زیبی..... ہائے نی میری زیب النساء۔" ایک نام درد کی لہر کی طرح ان کے منہ سے ابھرا اور ایک نئی سسکی بن گیا' یہ سسکی کبھی نئی زندگی کو جنم دینے کی خوشی بن کر ان کے ہونٹوں سے ٹکرائی تھی مگر اب۔

"میں کیا کروں اماں میرا تو دل چاہتا ہے تجھے دل میں جگہ دوں' تیرے پیروں کو دھو دھو کر پیوں مگر تجھے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی بشیر نہیں مان رہے وہ کہتے ہیں میں کوئی ساہوکار نہیں جو اتنی مہنگائی میں اپنے تین بچوں کے ساتھ تجھے بھی پالوں تیری ماں کو بھی پالوں۔"

ان کی آنکھوں میں نم کے ساتھ ایک پرانی یاد کلبلائی۔

"تیرا دل بہت سخت ہے نیک بخت! اسے نرم کر ورنہ مجھے ڈر ہے تجھے کوئی بہت بڑی ٹھوکر' کوئی بہت بڑی چوٹ ضرور لگنے والی ہے۔"

"ہائیں بدفعالیں نہ نکالو بلو کے ابا' مجھے پتا ہے تیرا دل آج تک مجھ سے نہیں ملا مگر اس کا مطلب تھوڑی ہے بیوی کو بددعائیں دینے لگ پڑو۔"

"میں بددعائیں نہیں دے رہا نیک بخت سمجھا رہا ہوں دوسروں کے دکھ' درد نہ کرید اکرا نمک مرچ نہ رکھا کر ان کے آنسو دیکھ کر خوش نہ کر۔"

"میں کیا کروں اندر سے میرا دل ہی ایسا ہے' خوش دیکھ لوں تو جلن ہونے لگتی ہے میرا دل چاہتا وہ ہنستا چہرہ رونے لگے اس کا آرام بے آرامی میں جائے۔"

"غلط کرتی ہے' ایسا سوچتی ہے تو غلط کرتی ہے سوہنا کہتا ہے سب کا بھلا چاہو' کسی کا دل دکھے تو تسلی دو' کسی کا زخم دیکھو تو مرہم رکھو۔"

"مجھ سے نہیں ہوتی یہ دکھی دل کی چاکری میرے لیے ساری زندگی صرف میری خوشی سے ہو کر بس میری خوشی تک محدود ہے۔" لمحہ بھر کو بولیں۔

"تو کرتا ہے نا دکھی دلوں کی چاکری بس کافی ایک گھر میں دو' دو فرشتے اچھے نہیں لگتے۔"

"اماں ..... ہیلو اماں یہاں کیوں بیٹھی ہو کہاں ہے۔" کسی کی آواز کے بعد کسی کے لمس نے انہیں واپس حال میں لوٹنے پر مجبور کر دیا ان کے سامنے بوٹ میں ایک جوان عمر لڑکا کھڑا تھا یہی کوئی 28۔ برس عمر رہی ہوگی بڑی بڑی غلافی آنکھیں' ستواں متناسب ہونٹ' کھلتا ہوا گندمی رنگ وہ بس دیکھتی اگر آج ان کا بلو ان کے پاس ہوتا تو اس قد کاٹھ کا مگر ان کے ہاتھ تو خالی تھے کسی کے دل کی آہ لگ تھی بہت زبردست ٹھوکر لگی تھی انہیں۔

"ہائیں قمر جلال ..... ہائے میرا بلال احمد۔" ا دل چاہا وہ ایک ایک کا نام لے کر بین ڈالیں مگر۔

"نہیں میرے آقا نامدار کا حکم ہے۔ میتوں پر ڈال کر مت روؤ یہ اسلام کے' اللہ کے منافی ہے۔"

"میں نا روؤں کیوں نا روؤں میری بیٹی مری ہے یا

صنوبر' ہائے صنوبر۔" وہ اب پھر سے رونے لگی تھیں تبھی جمع ہو جانے والے مجمع میں اپنی پوزیشن آکورڈ دیکھ کر وہ تھوڑا گھبرایا تھا۔

"خالہ ہیں میری کبھی کبھی دماغی دورے پڑتے ہیں۔" اسے خود نہیں پتا تھا وہ جھوٹ کیوں بولتے جارہا تھا۔

"اٹھو نا' خالہ جان سب دیکھ رہے ہیں ہمیں۔" اس نے اس بار ہاتھ بھی بڑھا دیا تھا اور اماں کی ذہنی رو بھٹک گئی تھی وہ کپڑے جھاڑ کر فوراً کھڑی ہو گئیں سب نے اس کے بیان کو سچا جانا اور پھر کوئی اعتراض کرتا بھی کیوں یہاں ہر شخص اپنا بوجھ اپنے کندھے پر لے کر ایسے پھرتا ہے کہ کسی اور کے کندھوں کا بوجھ اضافی ہی لگتا ہے۔

وہ اماں کو سہارا دیتا ہوا اپنی کار تک لایا تھا فرنٹ ڈور کھولا تھا پھر گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو اماں کو لگا وہ یکدم مری میں آگئی ہوں ٹھنڈی یخ ہوا مگر ان کے ہونٹوں پر کانٹے جم گئے تھے کبھی بہت سا رونے کو دل چاہے اور آپ ضبط کر لو تو زبان اور جبڑے میں عجیب سی اینٹھن ہونے لگتی ہے رونے سے زیادہ تکلیف ہو جاتی ہے۔

"جوس پئیں گی۔" اس نے ایک ہاتھ سے گاڑی چلاتے ہوئے پچھلی سیٹ سے کچن کے سامان سے جوس کاٹن برآمد کیا تھا اماں نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"اسے کیسے پتا چلا مجھے پیاس لگی ہے۔" انہوں نے سوچا اور بہت غیر متوقع پوچھا۔

"میں تمہیں شکل سے فقیرنی جیسی لگتی ہوں نا۔" لمحہ بھر کو رکی پھر بولیں۔

"ہاں فقیرنی ہی لگتی ہوں گی خود مجھے بھی اپنا شیشہ کچھ ایسا ہی بتانے لگا تھا پھر میں نے خود کو دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔" اس نوجوان نے بوڑھی اماں کو دلچسپی سے دیکھا۔ پھر دل بڑھانے کو بولا۔

"نہیں تو اماں آپ تو مجھے اماں جیسی لگی ہو اس لیے آپ کی خدمت کر رہا ہوں۔"

"تیری ماں کیا میرے جیسی تھی۔" اماں کو لگا کہ وہ حد سے تجاوز کر رہی ہیں مگر عادت سے مجبور' وہ ہولے سے مسکرایا۔

"ساری اچھی مائیں آپ جیسی ہی لگتی ہوں گی اماں مجھے یقین ہے۔" اماں نے ٹن سے جوس پینا شروع کر دیا تھا مگر بغیر اسٹرا کے انہیں دقت ہو رہی تھی جوس بار بار چھلک چھلک کر ان کی میلی چادر میں جذب ہو رہا تھا۔

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام ....." انہوں نے اس نوجوان کو یوں دیکھا جیسے اس نے غیر نصابی سوال پوچھ لیا ہو۔

"جی آپ کا کوئی نام تو ہوگا۔" وہ پھر مدھم سا بولا اور ہمت مجتمع کرنے کے لیے ان کے لیے مسکرایا بھی۔

"جنت بی بی۔" دو لفظ ادا کر کے انہوں نے ہونٹوں کو یوں بھینچ لیا جیسے اب کیے جانے والے ہر سوال کا جواب اضافی ہوگا۔

"نام تو بہت پیارا ہے آپ کا' آپ رہتی کہاں ہیں۔" اماں نے اس نوجوان کو دیکھا اور پھر سے بہت

سارا پانی ان کی آنکھوں میں اکٹھا ہونے لگا۔
"کہیں نہیں رہتی پہلے تھا ایک گھر' اب کہیں نہیں رہتی جہاں جگہ ملتی ہے سو جاتی ہوں جہاں آنکھ کھلتی ہے چل پڑتی ہوں کوئی کھانا دیتا ہے کھا لیتی ہوں ورنہ بھوکی بیٹھی رہتی ہوں مگر مجھے لگتا ہے بڑھاپے میں بھوک ختم نہیں ہوتی اور بڑھ جاتی ہے۔" اس نے پھر انہیں دلچسپ نظروں سے دیکھا۔
"وہ کیسے اماں؟ آپ کو یوں کیوں لگا؟" اس نے سوال بھی داغ دیا تب جنت بی بی کی آواز گاڑی میں پھیلنے لگی۔
"پتا نہیں' جوانی میں بندے کو پتا ہوتا ہے. جو چاہے گا مل جائے گا نہیں ملے گا تو چھین لے گا مگر بڑھاپے میں ساری لگن توجہ' منت بے بسی میں سمٹ آتی ہے کسی نے دے دیا تو کھا لے لیا نہ دیا تو منہ لپیٹ کر سو چھین لینے کی ہمت جو نہیں رہتی بس پھر یہیں سے بندے میں ہوس آجاتی ہے جیسے عبادت افضل پر جوانی کی عبادت افضل ترین ویسے ہی جوانی کی ہوس شدید ترین بھی کم ترین لگتی ہے اور بڑھاپے کی ہوس اس کا کوئی انت نہیں ہوتا زندگی میں سے زندگی ختم ہونے لگتی ہے تو ہوس تو بڑھنی ہی ہے نا۔"
"واہ اماں تم تو فلاسفر ہو۔" وہ ہنسا' اماں نے رک کے اسے دیکھا۔
"تیرا نام کیا ہے پتر۔"
"مجھے سب منصور ابراہیم کہتے ہیں۔"
اماں کو دھکا سا لگا پتا نہیں کیوں منصور ابراہیم نے ان کے اتنے جلدی جلدی بدلنے والے تاثرات سے گھبرا کے پوچھ ہی لیا۔
"کیا ہوا اماں میری کوئی بات بری لگ گئی۔"
"نہیں پتر بس میرا دل تھا کہ تیرا نام بلال ہونا چاہیے تھا۔"
"اچھا اماں وہ کیوں میرا نام بلال کیوں ہونا چاہیے تھا؟" اس کو واقعی اچنبھا ہوا تھا۔
"اویں میرے پتر کا نام بلال تھا نا' تجھے دیکھا تو ایسے لگا وہ کہیں سے چپکے سے آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔"
"آہ سوری چلیں آپ مجھے بلال کہہ لیجیے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
"بلو بولوں۔"
منصور ابراہیم کی ان کی معصومیت دیکھ کر ہنسی چھوٹ گئی مگر بلو سے اسے بلو یار برباد آگئی تھی وہ اسی کیفیت میں چلا گیا تھا اور لازمی طور پر سنجیدہ ہو گیا اماں اس کی سنجیدگی کو جانے کیا سمجھیں اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر لجاجت سے بولیں۔
"چل نا منہ نہ بگاڑ نہیں بولتی تجھے بلو! منصور ہی کہوں گی اب تو خوش۔" اس کے ہونٹ پھر مسکرانے لگے۔ بہت دیر تک کسی گہری کیفیت کا شکار نہیں رہتا تھا اس لیے۔۔۔ منصور ابراہیم کے بھیس میں واپس آگیا۔
"نہیں اماں! آپ کا جو دل چاہے وہ ہی بولنا مجھے برا نہیں لگتا میرا یار غار کہتا ہے مجھ میں کوئی فالٹ ہے اس لیے مجھے بری لگنے والی باتیں بھی بری نہیں لگتیں۔"
"نہ نہ۔۔۔ باتوں کو جی سے لگانا بھی نہیں چاہیے ناسور بن جاتی ہیں دل میں جو باتیں رکھتے ہیں وہ جلدی دیمک کی طرح بھربھرا ہو جاتے ہیں' اللہ نصیب کرے میرے قمر جلال کو' وہ ہی گیان دھیان کی باتیں کرتے تھے پر مجھے ان کی باتیں کبھی سمجھ ہی نہ آئیں۔" وہ لمحہ بھر کو رکیں پھر مٹھی میں پکڑا ایڈریس اس کی ہتھیلی پر رکھ کر بولیں۔
"تیری بڑی مہربانی پتر مجھے اس پتے پر پہنچا دو۔ کہہ رہا تھا جس کا کوئی نہیں ہوتا ان لوگوں کو آسرا دیتے ہیں یہ لوگ۔" منصور ابراہیم نے دیکھا اور بمشکل ضبط کر پایا "آشیانہ" یہ ایک طرح سے اولڈ ہوم تھا۔
"آپ یہاں کیوں جانا چاہتی ہیں؟"
"ایک بوڑھی بے آسرا عورت ایسی جگہ کیوں جانا چاہتی ہے پتر۔" منصور ابراہیم نے دانتوں تلے زبان دبالی واقعی وہ کتنی احمقانہ بات کرنے جا رہا تھا۔
"آپ کا کوئی نہیں ہے۔"
"ہے نا میرے دو پتر ہیں دو بیٹیاں ہیں پر کوئی

رکھتا مجھے' قمر جلال چلے گئے سارا راج پاٹ سب چھن گیا پتر' عورت سر کے سائیں کے بغیر ٹھوکر پر رکھا ہوا پتھر ہے. جس کا جب دل چاہتا ہے ٹھوکر مارے ادھر سے ادھر کر دے کیچڑ میں پھینکے یا ٹھوکر پر ٹھوکر مارتا جائے وہ کچھ نہیں بول سکتی بیٹے بہو کی روٹی کھانا آسان نہیں۔"
"قمر جلال صاحب کیا کرتے تھے؟" اس نے یونہی سوال کیا اماں کی آنکھوں میں نرماہٹ آگئی۔
"پڑھاتے تھے پرائمری اسکول کو ٹیوشن بھی دیتے تھے کچھ لکھتے بھی تھے وہ کیا کہتے ہیں غزل وزل۔"
"آہا تو شاعر تھے قمر صاحب پھر تو بڑا اچھا وقت گزرتا ہو گا آپ پر غزلیں کہتے ہوں گے۔" وہ شرارت سے ہنسا۔ اور اماں بھی ہنسیں۔
"پتا نہیں کیا کیا مشکل لفظ بولتے تھے مجھے تو کبھی ایک دفعہ میں سمجھ نہیں آئے میں تو جب وہ کچھ سنانے لگتے ہاتھ جوڑ دیتی کہ مجھے نہ سناؤ میرے بس کا کام نہیں یہ دیو قامت لفظ سننا مجھ سے تو بس چولہا چوکی کی باتیں کرو نمک مرچ آلو پیاز کی باتیں۔" وہ ہنس پڑتے پھر کہتے۔
"چل بھلی لوکے جس میں تو خوش وہی باتیں کر لیتا ہوں۔"
"پھر آپ خوش ہوتی تھیں۔" اس نے گاڑی کو ہلکا سا ٹرن دیا۔
"نہیں مجھے اس وقت خوش ہونا ہی نہیں آتا تھا مجھے ہر چیز بری لگتی تھی ہر خوشی تھوڑی لگتی تھی مگر جب سے در در کی فقیر بنی ہوں مجھے کوئی ہنس کے پہچان کے' نام لے لے تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے جیسے پرائے دیس میں کسی ہم وطن کو دیکھ کر بندے کا دل خوش ہو جائے کبھی پوری ایک روٹی کھا لوں تو خوش ہو جاتی ہوں کسی روز دوپہر کے بعد رات کو بھی کچھ کھانے کو مل جائے تو شکر کرنے بیٹھ جاتی ہوں پہلے شکر کرنا آلکسی میں ڈال دیتا تھا کر لوں گی شکر بھی جب اللہ بہت سا دے گا۔۔۔ اور پتر اللہ تو بہت سا دیتا ہے مگر جب تک بندہ خالی ہاتھ نہ رہ جائے تب تک اس بہت

سے کی قدر نہیں آتی۔"

"یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا اماں۔" اس نے گاڑی ایک وسیع و عریض گھر کے سامنے لے جا کر روک دی تھی پہلے تالا کھولا تھا پھر گاڑی اندر لاتا چلا گیا تھا۔

"تم نے مجھے اغوا تو نہیں کیا۔ دیکھ بیٹا میرے پاس تجھے دینے کو کچھ نہیں۔" اماں کے لہجے میں بے چارگی در آئی اور منصور ابراہیم کا قہقہہ بہت بلند تھا وہ ہنستے ہوئے بہت خوب صورت لگتا تھا باغ کے ایک درخت نے دوسرے درخت سے سرگوشی کی اور وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اماں تک آ گیا۔

"کوئی بیٹا اپنی ماں کو اغوا ـــــ کرے گا..... ادھر دیکھیے کیا مجرم و جرم لوگ ایسے ہوتے ہیں اتنے پیارے ہینڈسم۔" اس نے اپنی ہی تعریف کے قلابے ملائے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک سمت چلنے لگا کنکریٹ کی روش طے کر کے اس نے سیڑھیاں چڑھی تھیں پھر لاکڈ دروازہ کھولا تھا۔

"اگر میں کہوں آپ میرے ساتھ رہنے لگو تو کیا آپ رہنے لگو گی اماں۔" اماں نے سر اٹھا کر اس لمبے قد کے نوجوان کو دیکھا۔

"وہ انسان تھا یا فرشتہ۔" انہوں نے ایک بار پھر چھو کر اسے پرکھا۔

"کیا ہوا اماں اللہ دی قسمیں میں غنڈہ نہیں ہوں بزنس کرتا ہوں بڑا شریف آدمی ہوں دس سال سے باہر تھا پچھلے ہفتے ہی پاکستان آیا ہوں بالکل اکیلا آدمی ہوں اس لیے گھر میں اتنی خاموشی ہے مگر میں نے ملازمین کے لیے اشتہار دے رکھے ہیں ایک دو دن میں وہ بھی فائنل ہو جائیں گے تو میرا مکان بھی گھر ہو جائے گا۔"

"تجھے نہیں لگتا میں ہی کوئی چوری چکاری کے کسی گروپ کی ساتھی ہوتی تو اپنے گھر میں یوں لے آیا کتنا غلط فیصلہ کرتا ہے تو۔" اس نے غور سے اماں کو دیکھا پھر کاندھوں پر ہاتھ دھر کے بولا۔

"تم کوئی چوری چکاری کے گروپ کی رکن ہوتی بھی تو کیا کر لو۔ گی گھر لوٹو۔ گی مجھے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے نا تو کیا اماں اکیلا آدمی اس کے مرنے جینے کا بھی کیا دکھ کیا آنسو۔"

"تیرے ماں باپ بہن بھائی کوئی نہیں؟" اماں کو ایک دم سے اپنے سے زیادہ اس پر ترس [illegible] اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ماں باپ مر گئے کوئی نہیں ہے بھائی بہن میں ہوں میری تنہائی ہے یا وہ الو کا پٹھا زین ضیاء۔"

"زین ضیاء۔" اماں سیڑھی پر بیٹھ گئی تھیں سیڑھی کے کنارے پر جھک کر بولا۔

"ہاں ہاں زی زی ایمان سے آپ اسے ملیں تو ہر غم بھول جائیں گی میری فلم کا منور ظریف وہ۔"

"قمر کے ساتھ بڑی دیکھی ہیں اس کی فلمیں نے۔" اماں کو ہر بات سے کوئی نہ کوئی بات یاد تھی سو منصور ابراہیم کو یقین تھا اس کا وقت بہت گزرنے والا تھا تنہائی میں اچانک سے اتنا مزے رشتہ جو ہاتھ آ گیا تھا۔

"ماں! شاید یہ نام یہ رشتہ وہ ہی تھا جس نے زندگی میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی مگر یہ بی بی۔" اس نے مسکراتی آنکھوں سے ایک دروازہ کھولا۔

"یہ آپ کا کمرہ ہے اسے جیسے چاہے سنواریں میرا کمرہ آپ کے سامنے ہے اگر کسی ضرورت ہو تو یہ بیل کا بٹن ہے اسے دبا دیں گی فوراً" آ جاؤں گا۔"

"اچھا۔" اماں نے سر ہلایا اور دو جوڑوں کی [illegible] صوفے پر رکھ کر بیٹھ گئیں۔ وہ اپنے روم کی طرف گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں بالکل خاموشی طاری تھی حالانکہ کمرے میں چار عورتیں اور دو مرد بیٹھے تھے مگر نے چپ سادھ رکھی تھی۔

"تم جانتی ہو آج تک ہمارے گھر میں بڑے ابا کے حکم کے سوا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔"

"مجھے معلوم ہے مگر بڑے ابا آج فیصلہ کر نہیں رہے ان سے فیصلہ کروایا جا رہا ہے۔"

"تم جانتی ہو تم کچھ رشتوں کا احترام بھولتی جا رہی ہو نور۔"

"جب کچھ رشتے اپنی قدر بھول رہے ہیں تو کیا ضروری ہے میں احترام کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے کر پھروں۔"

"جب سے ناہید کا انتقال ہوا ہے تمہیں چھوٹے بڑے کی تمیز ہی ختم ہو گئی ہے۔" کمرے کے سب سے عمر رسیدہ نفس کی یہ اس کے بارے میں تلخ ترین رائے تھی مگر اس نے سنا ہی نہیں۔

"میں نے اپنی دوست سے ایک نوکری کی بابت پوچھا تھا اچھی سیلری ہے کل وقتی ملازمت ہے اس لیے میں کراچی جا رہی ہوں۔"

"تم اکیلی کراچی جا رہی ہو تمہارا دماغ ٹھیک ہے کوئی ضرورت نہیں ہے۔" دوسرے مرد نے غصے سے کہا مگر وہ ضدی انداز میں بیٹھی رہی پھر آہستگی سے بولی۔

"دیکھیے ماموں جان یہ رشتوں ناتوں کی دہائی آپ نہ دیا کریں کیوں کہ اماں کے مرنے پر آپ نے یہی کہا تھا جہاں میری بہن مر گئی وہاں میرے لیے نور العین بھی مر گئی پھر اچانک آپ سب یہاں کیوں اکٹھے ہو گئے ہیں۔"

"ہمیں اگر افضل نہ بلاتا تو شاید ہم کبھی یہ دہلیز نہ چڑھتے۔"

"تم بالکل اپنے باپ پر گئی ہو اسی کی طرح بدتمیز اسی کی طرح بدمزاج۔"

"شاید لیکن مجھے خوشی ہے میرے ابا میں ایک خوبی تھی کہ وہ دوغلے نہیں تھے جو کہتے منہ پر کہتے جو سوچتے وہی بولتے لفظوں کو گھماتے پھراتے نہیں۔"

"تم سے تو بات کرنا مشکل ہے سبین نہ کہہ دو اپنے شوہر سے اس کی بہن کسی کی سننے کو تیار نہیں بڑی فنکار ہو گئی ہے۔" وہ استہزاء سے ہنس پڑنے کو بے تاب ہوئی مگر ضبط کر گئی تھی۔

"بھیا کو میرا گھر سے جانا اتنا برا نہیں لگے گا جتنا آپ لوگوں کو لگ رہا ہے کہ انہیں فیل ہو رہا ہے۔"

"تم اپنی آنکھوں کے علاوہ کسی اور کی کہی بات پر یقین کرو تب نا۔"

"میں نے اماں کی زندگی سے ایک بات سیکھی ہے ہر انسان کا انٹرسٹ الگ ہوتا ہے یہ دنیا نفع نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ہے سو یہاں رشتوں کا ہیڈک رکھنا محبت ڈھونڈنا فضول مشغلے کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی کو حقیقت کے ساتھ صرف ایک بار قبول کر لو تو تکلیف بار بار نہیں ہوتی۔"

"تم سے بحث کرنا فضول ہے تم عجیب لڑکی ہو سچ بتاؤ کراچی میں کس دوست کے پاس جا رہی ہو۔"

"بڑے ابا میں اگر سچ بولوں گی تو بھی آپ کو جھوٹ ہی لگے گا اس لیے بہتر ہے آپ سب اپنی اپنی مرضی کا نام شخصیت سوچ لیں مجھے اس الزام پر بھی زیادہ درد نہیں ہو گا کیوں کہ مجھے جتنا رونا تھا میں اپنی ماں کے مرنے پر رو چکی تھی۔"

وہ یکدم اٹھ گئی کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہ گئے مگر وہ رکی نہیں پھر وہ کمرے میں آئی تھی تو اس کے بیڈ پر اس کے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی آنے لگا مگر ابھی اس نے خود کہا تھا زندگی کو حقیقت کے ساتھ صرف ایک بار قبول کر لو تو تکلیف بار بار نہیں ہوتی مگر اس نے سب کے سامنے جھوٹ بولا تھا کیونکہ زندگی کو حقیقت کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد بھی ہر نئی ٹھیس سے دل کو پہلی بار کی طرح تکلیف اور دل کے قریب درد ہوتا رہتا ہے۔

"مجھے لگا تھا آپ بابا کے کہنے پر نہیں رک رہیں تو بڑے ابا کی کہاں سنیں گی سو الماری میں سے آپ کے کپڑے باہر نکال دیے۔" اس نے کچھ نہیں کہا خاموشی سے بڑے سے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے تہہ کر کر کے رکھنے لگی۔

"تو تمہارا فیصلہ نہیں بدلا تم نہیں رک رہیں۔" بڑے بھیا کمرے میں آ کر حق سے بولے اس کا دل چاہا

وہ جو سوٹ کیس بند کر رہی ہے یکدم بڑے بھیا اس کے ہاتھ سے چھین کر رکھ دیں اور بولیں۔

"کہہ دیا نا تم کہیں نہیں جا رہیں۔ سمجھیں اتنی بڑی کب سے ہو گئی ہو کہ اتنے بڑے بڑے فیصلے لینے لگی ہو۔" اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو بڑے بھائی دو تھپڑ بھی لگا دیں وہ ان کی گودوں میں کھیلی تھی بیٹی کی طرح انہوں نے اسے پالا مگر اب اچانک صرف تین سال میں جانے کیا اور کہاں جذباتی کیبل فالٹ آیا تھا کہ وہ بالکل اجنبی سے بن گئے تھے۔

"ٹھیک ہے تمہارا یہی فیصلہ ہے تو یاد رکھنا اس گھر سے ایک بار قدم نکالا تو پھر یہ قدم پھر کبھی واپس نہیں آنے چاہئیں میں سمجھوں گا میری ماں اور باپ کے ساتھ تم بھی مر گئی ہو۔" اسے پھندا سا لگا ہمیشہ ٹینشن اور جذباتی ابال پر ایسا ہی ہوتا تھا۔ بڑے بھیا یکدم گھبرا گئے تھے۔

"تمہارا ان ہیلر کہاں ہے۔"

"مت پریشان ہوں میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں بڑے بھیا۔" اس نے تکیے کے نیچے سے ان ہیلر نکال کر دو پمپ کی گہرے گہرے سانس لیے بڑے بھیا کی جان اس میں ہی اٹکی تھی تبھی بیوی کی ہزار آوازوں پر بھی وہ ہلے نہیں تھے۔

"اب ٹھیک ہے تمہاری طبیعت۔" وہ پرانے والے طریقے سے پوچھ رہے تھے مگر اس نے دل پتھر کر لیا۔

"میں آپ کے لیے مر چکی ہوں بڑے بھیا اور مردہ لوگوں کے لیے زندہ لوگ پریشان ہوں کچھ اچھا نہیں لگتا۔" اس نے ضروری سامان رکھ کر سوٹ کیس بند کر دیا اور خاموشی سے سٹنگ روم کے صوفے پر بیٹھ گئی کسی بے دیار بے گھر مسافر کی طرح۔

"ایک رات اور مت دفنائیں مجھے کل میں اپنے جنازے کے ساتھ خود اس گھر سے چلی جاؤں گی بڑے بھیا۔" بڑے بھیا دبے قدموں سے اس کے پیچھے آکر کھڑے ہوئے مگر وہ تو انہیں ان کی سانسوں سے پہچانتی تھی سو ان کی طرف دیکھے بنا آزردگی سے بولی ان کے دل کو کچھ ہوا ہی تھا کہ بس اسی وقت بھابھی انٹری دی۔

"اپنی بہن کے ناز نخرے اٹھانے سے فرصت جائے تو کمرے میں آجایئے گا فرحت بخار میں پھ[نک] رہی ہے اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا شاید آپ تمر لے کر بیٹھ گئے بڑوں کی وڈیرہ شاہی کانفرنس نتیجہ نکلا اس سارے معاملے کا.... کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے 'دوپہر کا کھانا' شام کی چائے بجٹ خراب ہو کر رہ گیا میں کہے دیتی ہوں یہ اللے آپ کی تنخواہ میں تو پورے نہیں ہو سکتے۔"

"چپ کر جاؤ صبو یہ کبھی تو چپ ہو جایا کرو وقت تمہاری باتیں دماغ کو دل کو کھاتی رہتی ہیں نہیں تم کیسی عورت ہو کیسی ماں ہو۔"

"بس بس دیکھ لیا آپ کا واویلا اگر آپ چاہتے ہیں رعب ڈال کر غصہ کر کے اس پھوہڑ لڑکی کو میں رہنے دوں اس گھر میں تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔"

"آپ کو لڑنے کی ضرورت نہیں میں یہاں نہیں رک رہی بھابھی کل صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔"

"کیا تھا تم اس عباس سے شادی کر لیتیں اچھا خاصا لڑکا تھا گھر بس جاتا تو مجھے تسلی تو رہتی۔" اس نے شکوے سے بڑے بھیا کو دیکھا۔

"کیا آپ عباس سے علینہ کی شادی کر دیتے بڑے بھیا۔" بڑے بھیا کا سر ایک دم سے جھک گیا وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی اچھی خاصی ڈبل ایم اے تھی کچھ عرصے سے ایک آفس میں شوقیہ جاب کر رہی تھی کہ اچانک بھابھی کو اس کی شادی کا بھوت سوار ہو گیا اور بھی عباس حسن کے نام کا' عباس حسن جو شوقیہ طور ہر طرح کی ڈرگ لینا قابل فخر سمجھتا تھا جس کی اپنی ذاتی کوئی پہچان نہیں تھی جس کی شخصیت کی ساری گلکاری اس کے باپ کی دولت اور امارت سے تھی اور وہ بھی اب اس کی شاہ خرچیوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ اس کے گھر سے برکت کی طرح اٹھتی جا رہی تھی۔ بھابھی کی کسی سہیلی کا بھائی تھا عمر میں بھی بڑا مگر عقل میں کھوٹا پڑھا لکھا گنوار تھا وہ۔

بھیا چلے گئے تھے اور وہ ساری رات صوفے سے ٹیک لگائے جاگتی رہی آج اس کی اس گھر میں آخری رات تھی اسے واقعی لگ رہا تھا وہ چپکے سے مر گئی تھی اور اپنے سرہانے اکیلی بیٹھی تھی۔ پھر پہلا آنسو ٹپکا تھا جب اسے لگا اس کے داہنی طرف اماں آکر بیٹھ گئی ہیں۔ اس نے سر موڑ کر دیکھا تھا۔

"اماں! میرا جانا آپ سے برداشت نہیں ہو رہا مگر بھیا کو دیکھیں کتنا بدل گئے ہیں نا وہ۔" اس نے شاید اپنی حیاتی کی پہلی شکایت لگائی تھی اماں کو اماں کچھ نہیں بولیں۔

"میں کل یہاں سے چلی جاؤں گی پھر حشر کے دن ملیں گے شاید۔" وہ سسکی تھی ابا اس کے بائیں طرف بیٹھے تھے۔

"میں بہت بد تمیز بہت بد مزاج سہی مگر زندگی تو مجھ سے بھی زیادہ بد مزاج اور بد اخلاق نکلی میں نے اپنی طرح سے زندگی برتی کبھی کسی کی قدر کی نہ کسی سے اچھا سلوک روا رکھا میں سوچتا تھا جو میں جی رہا ہوں وہ صرف میری زندگی ہے مگر دنیا مکافات عمل بن گئی 'میرے اعمال کے کانٹے تیرے پیروں میں بچھا دیے گئے ہیں سچ پوچھ تو یہ اس تکلیف سے بہت زیادہ ہے جو میں نے ایک مہینے وینٹی لیٹر پر مشینوں کے ذریعے سانس لیتے وقت محسوس کی۔" اس نے ابا کی آنکھ سے آنسو پونچھے پلو اپنی آنکھ تک آکر رک گیا تھا۔

"تو کیا وہ تھوڑا تھوڑا ابا اور تھوڑی تھوڑی اماں کو اپنے ساتھ لیے جا رہی تھی۔"

"تو بڑی انصاف پسند ہے حصہ میں اضافی کٹوتی نہیں کرتی۔" اماں نے کسی زمانے میں اس کی تعریف کی تھی تو آج بھی وہ انصاف پسندی سے اماں ابا کا پیار بھیا کے حصے چھوڑے جا رہی تھی ہاں بس کہیں ناانصافی کی تھی ڈنڈی ماری تھی حصے میں تو وہ اپنے وجود کی ماری تھی اب بھیا کی کوئی بہن نہیں تھی ہاں اس کے بھیا تھے جو اس نے چرا کر اپنے کپڑے والے سوٹ کیس میں ایک پرانی سی ڈول اور تین شاعری کی کتابوں میں باندھ کر رکھ لیے تھے.... اس نے آنکھوں کو تھوڑا سا بند کیا تھا پھر یکدم نیند کب آگئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

"کہاں ہو میرے یار دلدار .... نظراں اڈیک دیاں۔" ایک کھلکھلاتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے ریموٹ سے میوٹ کر دیا سامنے منصور ابراہیم کھڑا تھا۔

"کیا دیکھا جا رہا ہے۔" وہ اس کے پاس صوفے پر دھم سے آن گرا اسکڈ میزائل کی طرح....

"تمہیں ہر وقت بتیس دانتوں کی گنتی کروانے کا شوق کیوں رہتا ہے۔"

"تاکہ تیری گنتی پکی ہو جائے وگرنہ بچپن سے حساب کی بنیادیں مضبوط کرتے کرتے اس حال کو پہنچ گیا ہے ہر وقت گنتی ہی کرتا رہتا ہے۔"

"کیشیئر ہوں بینک میں کوئی عام بات نہیں۔"

"تجھے کیشیئر ہونا خاص بات لگتی ہے۔" اس نے اسے طرح دی اور اس کی پلیٹ میں کٹے ہوئے تربوز کی پھانک فورک سے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالی اور اس نے اسے گھور کے دیکھا۔

"پورا فریج بھرا پڑا ہے مگر تیری عادتیں عالمی بینک سے بہت ملتی جلتی ہیں۔" وہ زور سے ہنسا پھر مدھم بولا۔

"بزنس مین ہوں خسارے کا سودا نہیں کرتا ویسے دیکھ کیا رہا تھا۔" اس نے اب ریموٹ کو بھی چھین لیا تھا۔

"یہ اتیاچار برداشت نہیں ہو گا۔"

"چپ کر اسٹار پلس کے دیوانے۔" اس نے فوراً چینل بدل دیا۔

"کیا فضولیات ہے یار اتنا اچھا ڈرامہ چل رہا تھا۔"

"بس کر دے تو کوئی بتول باجی ہے جو یہ گھریلو سیاست سے بھرے ڈرامے دیکھتا ہے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ضروری ہوتے ہیں یہ ڈرامے یار' عورتوں میں مشہور ہونا ہو ان کی چالوں کو سمجھنا ہو تو یہ ڈرامے ضرور دیکھنے چاہئیں تبھی تو ان کی سیاست کا توڑ نکال سکوں گا اور خواتین میں بیٹھ کر ان کے مقبول عام ڈراموں کا تذکرہ کردو نا تو ایک دم سے ان کا ایٹی ٹیوٹ بدل جاتا ہے نرمی اور حلاوت سے بھر جاتی ہیں جوش و خروش سے اس ڈرامے پر تبصرہ شروع اور مجھے ان کا نمبر مل جاتا ہے۔"

"تو تبصرہ سن لیتا ہے لمبے چوڑے ڈائیلاگ کے ساتھ۔" وہ متواتر تربوز پر ہاتھ صاف کر رہا تھا وہ ہنس پڑا۔

"کہاں میری جان ایسے وقت کے لیے میں یہ روئی کے پھائے کانوں میں ٹھونس کے بیٹھتا ہوں یا خیالی طور پر سوچنے لگتا ہوں کہ میں جولیانہ کے ساتھ میامی بیچ پر گرمی کی چھٹیاں منا رہا ہوں۔"

"خبیث ہے تو میامی کی بیچ اور وہ بھی گرمی کی چھٹیاں۔" اس نے اس کے کان کھینچ لیے پھر لاڈ دارانہ بولا۔

"یہ لڑکیاں تجھ سے پٹ کیسے جاتی ہیں مجھ سے تو آج تک ایک لڑکی بھی نہیں گھمائی گئی۔"

"وائے افسوس یہ تیری دولت کا سب سے بڑا یوز ہے کہ تیری دولت پر میرے عیش ہو رہے ہیں۔"

"کیا کروں میرا دل بڑا نرم ہے۔" وہ شرارت سے اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹتے ہوئے کالر اکڑانے لگا۔

"تجھے کیسا لگے اگر میں تجھے کسی دن اغوا برائے تاوان میں اٹھوا کر تیری ساری جائیداد ہڑپ لوں تو؟"

منصور ابراہیم نے اس کے چہرے کو ہولے سے چھوا۔

"کرلے کر کے دیکھ لے یہ بھی کسی دن نتیجہ صفر نکلے گا۔"

"کیا مطلب؟ تو نے کہیں اپنی ساری جائیداد کسی ٹرسٹ کے نام تو نہیں کر رکھی کہ تجھے اغوا کروانے کا بھی پیسہ اپنی جیب سے بھرنا پڑے۔"

"ہاہاہا الو واپٹھا۔۔۔۔ آدھی جائیداد تیرے نام ہے پاگل باقی آدھی شادی کرلی تو بچوں کے لیے ورنہ وہ ایک اولڈ ہوم کے نام کردی ہے۔" وہ یک ٹک اسے دیکھ لگا کہیں سے بہت سارا پانی در آیا تھا۔

"چل جا مر جا اچھا خاصا موڈ تھا رلا کر چھوڑا ہے۔"

"کیوں رو کیوں رہا ہے میری کترینہ کیف۔" مزے سے اب سیب کھا رہا تھا۔

"گھر سے بھوکا بھاگا تھا کیا' مجھے تو لگتا ہے تو پیدا بھوکا ہوا تھا اور مرے گا بھی بھوکا۔"

"خدا کا خوف کر بھوکا مر گیا تو حشر تک کا انتظار کرے گا۔" شوخی اس کے موٹے تن سے پھوٹ رہی تھی۔

"آج بڑا خوش لگ رہا ہے۔" زین ضیاء نے اس آنکھوں میں جھانکا۔

"آج ایویں آوارہ گردی کرنے نکلا تھا اچانک راستے سے اماں اٹھالیں۔"

"ابے تیرے یہ اطوار کے اب اماؤں کو اغوا کرنے لگا ہے ذلیل۔" اس نے منصور ابراہیم کا کان مروڑا اور وہ تان اشاپ ہنسنے لگا۔

"تجھے پتا ہے تو ہنستے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔۔؟" اس نے برملا کہا منصور ابراہیم کی ہنسی تیز ہوگئی۔

"بس کردے اقربا پروری کی بھی ایک حد ہے۔"

"چل دفع ہو تجھے پتا ہے میں کبھی منہ دیکھے تعریف نہیں کرتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔۔۔۔" منصور ابراہیم جاکر اس کے کا فریج کھنگالنے لگا۔

"آہم! یہ چکن کڑاہی کس نے بھیجی تیری مر والی نے۔" وہ اب فرائی پین میں سالن ڈال چکا تھا۔

"نہیں میری جولیانہ نے بنائی ہے آج کل پاکستانی کھانوں پر ہاتھ صاف کر رہی ہے اور تختہ مشق بنا ہوا ہوں میں زین ضیاء۔"

"سچ بتا یہ جولیانہ والی کہانی سچی ہے کیا۔" اس نے اچنبھے سے ماربل کے کاؤنٹر پر بیٹھ گیا اور زین ضیاء

سگھڑ خاتون خانہ کی طرح روٹیاں بیل رہا تھا۔

"قسم سے اتنا پیارا لگ رہا ہے روٹیاں بیلتے ہوئے کاش تو زینی ہوتا تو ابھی تجھے بھگا کے لے جاتا۔"

"خبیث اتنا برا وقت بھی نہیں پڑا کہ میں تجھ جیسے شخص سے شادی کرتی۔" توے پر روٹی ڈال کر وہ مڑا تھا۔

"اوئے کیا برائی ہے مجھ میں سگھڑ ہوں ذمہ دار ہوں دولت مند ہو ایک مشرقی لڑکی کو اور کیا چاہیے۔"

"تو اوروں کی طرح بے ایمان نہیں اور مجھے بے ایمان لوگ بچپن سے اٹریکٹ کرتے ہیں پھر یہ تیرے خدمت خلق کے شوق' کتے بلیاں اٹھا اٹھا کر لاتا ہے ان کی مرہم پٹی کرتا ہے پھر چھوڑ دیتا ہے دیکھ لینا ترے جنازے پر کتوں بلیوں کی یہ لمبی فوج ہوگی۔"

"ہاہاہا کچھ تو ہوگا قابل ذکر' انسان تو ہر کسی کے جنازے میں ہوتے ہیں سچ بتا ہے نا بریکنگ نیوز۔"

"دفع ہو جا تیرے اندر کوئی فالٹ ہے ضرور ورنہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے ایک کرپٹ غبن کے الزام میں برطرف کیشیر کو لے کر اپنی کمپنی میں سی ای او بنا ڈالا ہے جو نے گا تری عقل پر ماتم کرے گا۔"

"کرنے دے ماتم مجھے کوئی غم نہیں۔" اب وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سالن اور روٹی سے انصاف کر رہا تھا۔

"دیکھ لے پہلے بتا رہا ہوں کسی دن بہت لمبا غبن کر کے بھاگوں گا تیری کمپنی سے عرش سے فرش پر پڑا ہوگا تب سمجھ آئے گی کہ اندھا اعتماد کرنا کیسا ہوتا ہے؟" اسے کھانے میں مگن دیکھا۔ تب وہ اس کے کان میں گھس کر بولا۔

"زہر ملایا تھا کھانے میں اب دس منٹ ہیں تیرے پاس مرنے کے لیے۔" اس نے ہنس کر اسے دیکھا پھر کہا۔

"پاگل یہ بول دس منٹ ہیں جینے کے لیے میرے پاس میں آدھے بھرے ہوئے گلاس کی امید کا پانی پیتا ہوں۔"

"تجھے کسی بات پر چونکنا بھی آتا ہے کوئی بات تجھے ہراس ۔۔۔ میں بھی مبتلا کرتی ہے۔"

"نہیں نا۔۔۔۔ وہ اللہ ہے نا' میرے آج' میرے کل اور آنے والے ہر کل کا پلانر میں کیوں کچھ سوچوں' کیوں پریشان ہوں۔" اب اس نے ہاتھ روک کر پلیٹ سنک میں رکھ دی۔

"تو شروع سے اتنا درویش ہے یا یہ اسکرو ابھی کچھ سالوں میں ڈھیلا ہوا ہے۔" اس نے گہری آنکھوں سے اسے دیکھا کچھ کہا نہیں کیونکہ وہ اس ٹاپک پر آکر چپ سادھ لیتا تھا زین ضیاء پھر کتنا ہی ہلاتا جھلاتا پھر ایک لفظ نہ بولتا۔

"پتا نہیں آگے سننے کے لیے مجھے تیرے کتنے اندر اترنا پڑے گا۔"

"کہیں نہ اتر تو کوئی میری بیوی ہے جو میرے معدے کے راستے ڈھونڈنے لگی ہے ویسے قسمیں اللہ دی تری جولیانہ کھانا بڑے مزے کا پکاتی ہے۔"

"دفع ہو میں نے خود بنایا ہے ڈبے کا مسالا ڈال کر۔"

"اوئے ہوئے یعنی تیرے جیسے پھوہڑ لوگ اس وجہ سے مسالا چینل پر ان ہیں۔"

"بات کو مت بدل یہ بتا تو شروع سے ایسا ہے۔" وہ یکدم کمر موڑ گیا ایک دم کوٹ کی جیب میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔

"تیرا موبائل میرے ٹی وی لاؤنج میں پڑا ہے۔"

"قسم سے تیری ٹیلی پیتھی کو سات سلام۔" وہ ایک دم سے کچن سے غائب ہو گیا پھر وہ ٹی وی لاؤنج تک پہنچا ہی تھا مگر وہ وہاں تھا ہی نہیں۔

"یہ کیا چھپاتا ہے مجھ سے اور کیوں۔" وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر بیل ہوئی تھی۔

"سوری میں بہت اچھا دوست نہیں تیرا مگر وفادار دوست ضرور ہوں۔ اچانک مجھے گھر میں مہمان کی گئی اماں کا خیال آگیا اس لیے گھر جا رہا ہوں میری کسی بات کو پلیز دل پر مت لینا تیری عزت اور تیری قدر اپنے آپ سے زیادہ کرتا ہوں اس لیے بدگمان نہ ہونا۔"

"سن تو۔۔۔۔" اس نے اس کے چپ ہونے پر تیزی سے کچھ بولنا چاہا اور وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

"تو زبانی از بر ہے مجھے تیرے سوال اکثر خود سے کرتا رہتا ہوں کبھی مجھے جواب ملے تو تجھے ضرور بتانے آؤں گا۔" اس نے منصور ابراہیم سے بھی گہری سانس لے کر موبائل بند ہونے کی آواز اپنے اندر بجتی ہوئی سنی اور پہلی بار سوچا خالی گھر میں بجنے والی فون کی گھنٹی ساحرانہ لگتی ہے پر اسرار محسوس ہوتی ہے یا چراغ آخری شب جیسی اکیلی اور تنہائی کے دکھ سے چور محسوس ہوتی ہے مگر جواب ندارد تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کہہ دیا ہے یہ لڑکی زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہے گی اگر تمہیں لگتا ہے یہ مجبور ہے تو یہ تمہاری بھول ہے اس جیسی سر پھری اپنی من مانی کرنے والی لڑکیوں سے میں خوب واقف ہوں' نام تمہارا استعمال کیا ہے مگر دیکھ لینا یہ بہت جلد کسی لڑکے کے ساتھ ہوا ہو جائے گی اور نام عزت تمہاری داؤ پر لگ جائے گی۔"

"اماں نور العین ایسی نہیں ہے وہ بہت مختلف لڑکی ہے میں آفس ورک کی وجہ سے کمپنی ورکشاپ میں کئی بار اس کے ساتھ لیکچر اٹینڈ کرنے گئی تھی وہ میری چھ سال تک حیرت انگیز طور پر روم میٹ رہی ہے دو تین بار جب ایسا نہیں ہو پایا تو ہم نے منت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا معرکہ لڑا وہ ایک بہت سلجھی ہوئی پاکباز اور قطعی اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی ہے۔"

"یہ اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکیاں ہی گل کھلاتی ہیں آخر کوئی تو وجہ ہوگی جو اس کے گھر والوں نے خود اسے اپنے گھر سے باہر تھوک دیا ہے بھابھی غیر سہی بھائی تو سگا ہے نا اس نے بھی نہیں روکا کیوں؟"

نور العین یہ سب باتیں برابر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے سن رہی تھی اپنی تحقیر پر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں نے جمع ہونے پر کمر باندھی تھی مگر اس نے ان آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑ کر صاف کر دیا تھا۔

"کوئی تو وجہ ہوگی جو اس کے گھر والوں نے خود اسے اپنے گھر سے باہر تھوک دیا ہے۔" یہ جملہ روح: کانٹے کی طرح چبھا تھا تبھی اس سے کھانا بھی نہ: کھایا گیا اور تیسرے دن وہ ایک نیوز پیپر میں اشتہا پڑھ کر ایڈریس ڈھونڈنے نکل گئی چلچلاتی دھوپ ا اس پہ بس کی خواری بہ دقت وہ پتے پر پہنچی تھی باہر و مین گو دیکھ کر اسے تسلی ہوئی تھی گھر بالکل ہی۔ رونق نہیں تھا اس نے پتا سامنے کیا۔

"لالہ انٹرویو کے لیے آئی ہوں۔" پٹھان واچ: نے چھوٹا گیٹ کھول دیا تھا باہر گارڈن میں چھ سا لڑکیاں پہلے سے موجود بھیں عارضی شیڈ سے دھوپ روک کی گئی تھی۔

"رحم دل ہے۔" وہ نفسیات میں تھوڑی بہ شد بد رکھتی تھی تبھی لوگوں کے رویے سے ا کے اندر اترنے کی کوشش کرتی تھی انٹرویو لینے والا خود غرض ہوتا تو عارضی شیڈ نہ دیتا مگر نوکری کے۔ آنے والی لڑکیاں پھر بھی اسی طرح کھڑی ہوتیں خو بھی تو۔۔۔ نوکریاں کم اور لوگ زیادہ تھے سو وہ ان ز لوگوں ہی میں سے اپنی جگہ بنانا چاہتی تھی سار کشتیاں جلا کر آئی تھی پانچ بجے تک اس کا نمبر آیا تھا

"نوکری کیوں کرنا چاہتی ہو۔"

"آپ میری جگہ ہوتے تو کیا جواب دیتے۔" ، نے تو کہا نہیں سخت جواب دے مگر وہ حلاوت سے بولی

"نوکری میری ضرورت ہے مجھے فوری طور چھت کی سخت ضرورت ہے سر۔" سامنے بیٹھے جوا العمر نوجوان نے اس کی سی وی پر سے نظر اٹھا کر یک اسے دیکھا تھا۔

"ایسی کیا افتاد پڑی آپ پر کہ آپ نے گھر چھ دیا۔"

"میں نے نہیں گھر نے مجھے چھوڑ دیا سر اور د نے کہا اتنی بڑی دنیا ہے ایک پیر رکھنے کی جگہ اور مٹ بھر آسمان تمہارے نام بھی کہیں نہ کہیں ڈپازٹ۔ جاؤ حالات سے لڑو اور اپنا حصہ حاصل کر لو۔"

"اس یقین کی کوئی خاص وجہ۔۔۔" وہ متاثر نظ آنے لگا تھا۔

"میری ماں سر اس کی عبادت اس کی دعائیں' مجھے یقین ہے دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں جب ایسا لگ رہا ہو تب بھی۔"

"آپ کو لگتا ہے دعائیں کسی بھی انسان کی زندگی بدل سکتی ہیں۔"

"جی سر! کیوں کہ کسی دانا نے کہا ہے اگر قسمت کا لکھا ہی سب کچھ ہوتا تو وہ اللہ اپنے بندے کو دعا مانگنا بھی نہ سکھاتا۔"

"آپ کا لیگج کہاں ہے؟" یہ اس کا دوسرا مربوط جواب تھا۔

"کیا مجھے آپ نے نوکری دی ہے یا خیرات۔" بے سبب لہجے میں نمی آگئی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے آپ کو نوکری کی ضرورت ہے یا خیرات کی۔" اس نے جواباً گہرے لہجے میں پوچھا اور اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میرا خانوادہ کسی رائل فیملی کو ٹچ نہیں کرتا مگر خودداری اور عزت نفس کا پاس رکھنا میری ماں نے خوب سکھایا ہے مجھے' بھوک سے مر تو سکتی ہے نور العین مگر خیرات نہیں لے سکتی۔"

"اور مجھے تمہاری اس بات پر آنکھ بند کر کے یقین ہے مس نور۔" وہ کھڑا ہو گیا تھا اور کچھ دیر بعد ملازم اسے انیکسی میں اس کا کمرہ دکھا رہا تھا۔

"کل صبح سے گھر کے اندرون خانہ آپ کا ٹرائل ہونا ہے۔" جاتے جاتے ملازم نے اسے مطلع کیا اور وہ ملازم کو بتا کر اپنا سوٹ کیس لینے اپنی دوست کے گھر پہنچی تھی دبے قدموں سے چلتی ہوئی تب اس نے اپنی حمایت میں بلند ہونے والی آواز سنی تھی۔

"آپ کے نازیبا سلوک سے اس لڑکی نے ان تین دنوں میں ایک بار بھی گھر میں پکا ہوا کھانا نہیں کھایا یہاں تک کہ گھونٹ گھونٹ بھر پانی پیا مگر وہ بھی اپنے پیسوں سے لا کر امی آپ بھی کبھی بہت سفاک ہو جاتی ہیں۔"

"میں سفاک نہیں ہوں بس ماں ہوں تیرا بھلا چاہتی ہوں اسے عادت ہے تبھی اتنے بڑے بڑے فیصلے کر لیتی ہے تو دو قسم کی لڑکی گھر سے نکلی تو پرزہ پرزہ ہو جائے گی مجھے تو اظفر نے کہا تھا اتنی سختی برتنے کو وگرنہ کیا میرا دل کسی کی بیٹی کو دیکھ کر کسی بے آسرا بے دیار بیٹی کو دیکھ کر اتنا سفاک ہو سکتا ہے۔"

"مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں آنٹی۔" اس نے ان کی خاموشی توڑی تھی پھر نرمی سے بولی تھی۔

"مجھے ایک گھر میں کل وقتی ملازمت مل گئی ہے ایک ہاؤس میڈ کی جاب کا انٹرویو دیا تھا' بوڑھی ماں ہے اور ایک بیٹا ہے ان کا بیٹا صبح کا نکلا رات کو گھستا ہے سو مجھے گھر اور اماں کو سنبھالنا ہے صرف۔"

"یہ کراچی ہے تجھے پتا ہے نا یہاں لوگ کب انسان سے بھیڑیے بن جائیں پتا نہیں چلتا۔"

"ہاں پتا ہے شہر سے کیا نبھی کرنا یہ تو ایک نفسیاتی بیماری ہے اکیلی لڑکی کو دیکھ کر کب مرد انسان سے بھیڑیا بن جائے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر یار گھر سے سب کشتیاں جلا کر نکلی ہوں مجھے کہیں نہ کہیں تو قدم بھر جگہ چاہیے نا پھر تمہاری اور خالہ کی دعائیں ہیں نا میرے ساتھ کچھ نہیں ہو گا مجھے۔"

"اللہ واقعی تجھے ہر درد و بلا سے محفوظ رکھے نور العین۔" اس کی دوست نے اسے دعا دی۔ وہ سوٹ کیس سمیت دوبارہ اسی گھر پہنچی تھی پھر اس نے اپنا کمرہ صاف کیا تھا اور دوسری صبح وہ اس کے سامنے تھی اور اسے حیرت ہوئی تھی یہ دو بچے کہاں سے آگئے۔

"ان سے ملیے یہ میرے بڑے بیٹے احمد اور یہ چھوٹے بیٹے حمزہ ہیں اور یہ اماں جان آپ کی ذمہ داری ان کی پوری طرح دیکھ بھال کرنی ہے ان کی ٹیوٹر کل شام سے آئے گی آپ کو دھیان رکھنا ہے یہ ٹھیک سے اپنی پڑھائی کو وقت دے رہے ہیں کہ نہیں کھانا پینا ٹھیک ہے یا نہیں اماں کو وقت پر کھانے کے ساتھ یہ ایک ٹیبلٹ صبح دینی ہے ناشتے کے بعد۔"

"اور آپ کی ذمہ داری۔۔۔" ہولے سے اس نے مزید تفصیل سے پوچھنا چاہا۔

"میری کوئی ذمہ داری آپ کے سر نہیں میں صبح کا نکلا ہوا رات کو آتا ہوں اور آپ کی ذمہ داری رات

کے آٹھ بجے یعنی کھانے کے ٹائم تک ہے پھر وقت آپ کا ہے جیسے چاہیں استعمال کریں آپ کے کمرے میں فون ایکسٹنشن موجود ہے آپ چاہیں تو فیملی سے بات کر سکتی ہیں سیلری معقول ملے گی اب آپ بتائیے سیلری آپ کے کسی اکاؤنٹ میں جمع کروانی ہے یا آپ کو پے کرنی ہے۔"

"جی میں خود کرلوں گی سیلری کا کچھ۔"

"اوکے اب ہم ناشتا کریں گے۔" وہ کھڑی رہی تو اس نے آنکھ کے اشارے سے اسے کرسی پر بیٹھ کر ناشتا کرنے کا نیا حکم صادر فرمایا پھر وہ بیٹھنے والی تھی کہ کسی اور کے مضبوط ہاتھ نے وہ کرسی کھسکالی۔

"واؤ جب سے تو نے نیا کک رکھا ہے میری تو عیدیں ہوگئی ہیں۔"

"ذی ذی ہم ناشتا خاموشی سے کریں۔"

"اوکے باس جیسے آپ کا حکم۔" وہ سعادت مندی دکھانے لگا نور العین کو گھر کا ماحول بہت زیادہ عجیب سا نہیں لگا تھا۔

"رہا جا سکتا ہے اس گھر میں۔" اس نے اطمینان سے گہرا سانس لیا تھا اور ناشتے کے بعد میڈ کے ذریعے برتن کچن میں رکھوانے لگی پھر صفائی ستھرائی کرواتے اسے ساڑھے بارہ کا وقت ہوگیا پھر یہ شام تھی جب غیر متوقع گاڑی پورچ میں رکی تھی اس کے ہاتھ میں ایک بلی کا بچہ تھا ڈاکٹر سے بینڈیج کروا کر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"قمر جلال......" زیر لب کہہ کر وہ اس کے پاس آگئی تھیں۔

"تجھے بھی یہ کتے بلیوں کا شوق ہے۔"

"پہلے نہیں تھا اب ہے وہ ایک ہوتے ہیں اشفاق بابا جی انہوں نے لکھا تھا ہم سے زیادہ مالک کی سمجھ بلی میں ہوتی ہے کھانے پینے کے لیے وہ مالک کے پیروں میں سر مارتی ہے خوب پیار کرتی ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے اسے جو ملنا ہے یہاں سے ہی ملنا ہے بس کبھی کبھی جب ایمان میں کمزوری محسوس کرتا ہوں بلی اور اس کے یقین سے پھر کچھ اینٹیں جوڑنے لگتا ہوں۔"

"تیرا ایمان کب کمزور ہوتا ہے۔" اماں نے سوال کیا۔

"جب دنیا پر انحصار کرنے لگتا ہوں جب سجدے میں سر جھکاتے جھکاتے ایک دم سے نماز نیت میں بھاگے داری کرنے لگتی ہے جب کل کا سوچ کر اپنے آج سے شکایتیں ہونے لگتی ہیں۔"

"تیری ماں بڑی جلتی عورت تھی بہت اونچا تجربہ ہے اس نے تجھے۔"

"میری ماں...... اور تربیت۔" وہ زیر لب بڑبڑایا پھر تیزی سے وہاں سے کمر موڑ کر چلنے لگا اپنے کمرے میں آکر اس نے چاروں طرف سے خود کو بند کرلیا جب خود سے ناراض ہوتا تو ایسا ہی کرتا تھا وہ اپنی چیئر پر جھولنے لگا یہ ہولے ہولے گھومنے سے اس کا دل جیسے اس کے اندر سے نکل کر کہیں باہر قدم دھرنے لگا تھا۔

"آج تم نے روٹیاں پھر جلائی نہیں ہیں آج نہیں ملے گا۔" پہلی تلخ یاد اس کے دل کا کونا تھامے سہمی کھڑی تھی اور وہ بے سبب اسی ماحول میں چلا گیا وہ دس برس کا بچہ اور اتنا سارا آٹا۔

"مجھے روٹیاں نہیں پکانی آتیں میم۔" وہ اپنے ہاتھوں کے جلنے سے پہلی بار رویا تھا آج تک اس ماں نے اس کے آگے روٹی رکھی تھی اور آج ایک ماہ ٹریننگ کے بعد اس نے اکیلے پچیس روٹیاں توے سے اتاری تھیں اونچے سے پیڑے پر کھڑے ہو کر بھی ان روٹیوں اور توا سنبھالنا دوبھر لگ رہا تھا۔

"تری ماں ایک ماہ کی ایڈوانس سیلری لے کر جا چکی ہے اس لیے نخرے مت کر اور سیدھے سیدھے کام کر روٹیاں پکانا سیکھ جائے گا تو پھر تجھے سالن پکانے کی ٹریننگ بھی دلوانی ہے فضل دین سے۔"

"سالن پکانا مجھے نہیں آتا مجھے بس پیاز اور لہسن کٹواؤں جی۔" وہ منمنایا تھا۔

"یہ لو یہ تیرے نخرے کہیں کا شہزادہ آیا ہے چل کہا ہے کر برتن دھو جلدی۔" اور اس نے پہلی بار جب انسان بھوکا ہو تو اس کا دماغ اس کے معدے سے آگے ایک انچ نہیں ہل سکتا۔ اس نے پہلی بار ساری بھوتی پلیٹوں میں سے کھانا اور روٹی کی برکیاں اٹھا اٹھا کر چھپا کر رکھی تھیں پھر کچن صاف کرکے وہ پلیٹ کا سامان تھیلی میں سے نکال کر بیٹھ گیا اور اسی وقت کہیں سے ایک بلی چلی آئی تھی۔

"ہش ہش میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"جب تمہارے پاس دینے کے لیے کچھ نہ ہو تب ہی تو تم اصل میں سخاوت کرتے ہو۔" کل نائمہ بی بی زور زور سے پڑھ رہی تھیں "اس کا کیا مطلب ہے" اس نے نائمہ بی بی سے پوچھا تھا اور وہ ہنس پڑی تھیں۔

"تجھے کیا ہے؟ ان باتوں سے لینا دینا روٹیاں پکا سالن میں نمک مرچ چکھ۔"

"نہیں نا نائمہ بی بی بتادو نا کیا مطلب ہے اس کا۔" وہ کرسی پر بیٹھی تھیں اور وہ ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر انہیں تک رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے جب تمہارے پاس دینے کے لیے بہت کچھ ہو تب تم اللہ کی راہ میں دو تو اس کا ثواب تو ملے گا مگر جب تمہارے پاس بہت تھوڑا ہو پھر بھی تم دل بڑا کر کے کچھ دو کسی کو تو یہ افضل ترین ہے سخاوت کا مطلب یہ نہیں کہ تم وہ چیز دو جس کی تمہیں ضرورت نہیں تو تم نے کسی اور کو دے دی سخاوت کا مطلب ہے اس چیز کی تمہیں بھی اتنی ضرورت ہے اور تم پھر بھی کسی کے سوال پر اسے اپنی ضرورت میں شامل کر کے کچھ حصہ اسے بانٹ دو۔"

"واہ واہ کیا بات ہے جبران کی باتیں کرتی ہے اور سوچ فیوڈل لارڈ جیسی ہے کیا بات ہے تیری نائمہ حماد......" اسرار حماد نے تالیاں بجا کر کچھ ایسا کہا تھا جو نائمہ بی بی چڑ گئی تھیں۔

"میں نے نہیں کہا اسے فرش پر بیٹھنے کو یہ خود بیٹھا ہے۔"

"اچھا اگر یہ گندہ مندہ سا منصور کا بچہ بالکل تیرے سامنے یا تیرے برابر آکر بیٹھ گیا تو کیا تجھے اچھا لگے گا۔" نائمہ حماد کی تیوریوں میں بل پڑ گئے تھے۔

"دنیا میں ہر شخص کا ایک کردار پہلے سے متعین ہے بھائی یہ کردار میں نے لکھا ہے نہ اس کی بے بسی میرے کسی عمل کا شاخسانہ۔"

"پر تم اس کردار کو دھو مانجھ کر ستھرا تو کر سکتی ہوں۔" اسرار حماد نے پھر سے ٹکڑا لگایا اور وہ اور چڑ گئیں۔

"میں کسی این جی او کی ممبر نہیں نہ ہی آپ کی طرح بڑے بڑے دعوے کرنے والی کسی کامریڈ تنظیم کی کارکن ہوں۔"

"ایک غلطی درست کرلو میں کامریڈ نہیں ایک پکا مسلمان ہوں اس لیے اسلام کے برابری کے دیے ہوئے اصولوں کو مانتا ہوں۔"

"چل ادھر آ......" وہ نائمہ بی بی سے بولتے بولتے یکدم اس کی طرف مڑے تھے۔

"تیرا پڑھنے کو دل کرتا ہے۔" اس کا دل ہاں کہہ رہا تھا مگر اس نے نا میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں جی پڑھنا لکھنا ہمارے کس کام کا جی یہ سب تو آپ بڑے لوگوں کو زیب دیتا ہے۔"

"واہ میرے شیر تیری اردو بتاتی ہے شد بد ہے تجھے تعلیم سے......" انہوں نے دلچسپی لی اور وہ پھیکے سے انداز میں بولا۔

"نہ جی! نائمہ بی بی، بتول باجی اور فرخ بھائی کے جملے سن سن کر جو سیکھا ہے، وہیں سے سیکھا ہے۔"

"ذہین بچہ ہے۔" انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں یہ ان کے پیار کا خاص انداز تھا وہ فرخ سے بھی ایسے ہی پیار کرتے تھے اور جب وہ فرخ کو پیار کرتے تھے تب وہ خود اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر دیکھتا تھا کہ کسی کے پیار سے واقعی اتنا مزا آتا ہے کہ بندہ بے وجہ مسکرانے لگے۔

"اسرار یہ سب حرکتیں انگلینڈ میں اچھی لگتی ہیں یہاں ان گندے مندے لوگوں کو زیادہ منہ لگاؤ گے تو ان کی ڈیمانڈ ہائی فائی ہونے لگتی ہے۔"

"ماما آپ کی سمجھ مجھے آج تک نہ آئی آپ ویسے چائلڈ لیبر پر سیمینارز اٹینڈ کرتی ہیں آرٹیکل لکھتی ہیں

اور خود گھر میں۔"

"چراغ تلے اندھیرا بھیا۔۔۔۔" فرخ نے ٹکڑا لگایا اور اماں نے غصے میں اس دن اسے رات کو آج کی رات کی طرح کھانا نہیں دیا تھا اس وقت اسے اتنی سمجھ نہیں تھی مگر آج اس نے سمجھداری دکھائی تھی اس نے کچن کے نل سے اپنی گندی مندی پلیٹ دھوئی تھی پھر پلیٹ لے کر بیٹھا تھا کہ بلی اس کے بالکل سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ بہت کمزور لگ رہی ہے۔" اس نے دل میں سوچا مگر "بھوک" ہر نوالے پر وہ میاؤں کرتی اور وہ اس سے نظر بچا کر نوالہ منہ میں رکھ لیتا اسی طرح اس نے سارا کھانا ختم کیا تھا اور بلی کا اس کی سخاوت پر یقین۔

"میں بہت بھوکا ہوں۔" اس نے بے بسی سے کہا اور سر جھکا کر کھانے لگا کچن میں داخل ہوتے اسرار حماد فرخ سے بولے تھے۔

"کوئی بھوکا ہو اور اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے معاف کر دو کیونکہ بھوکا صرف بھوکا ہوتا ہے اس کے اندر کا انسان باہر نکل کر بیٹھ جاتا ہے جب تک اس کا پیٹ خالی رہتا ہے اس کی رحم دلی اس کا ترس اس کی اچھائی سب بے معنی ہوتے ہیں۔"

"جی بھیا آج مما نے پھر ۔۔۔ منصور کا کھانا نہیں دیا۔" مگر کچن میں داخل ہوتے منظر کو دیکھ کر اسرار حماد کو حیرت ہوئی تھی۔

"تم کھانا کھا چکے ہو۔"

"کس نے دیا کھانا تمہیں۔" وہ اس کے اسٹول پر بیٹھ گئے تھے۔

"کسی نے بھی نہیں آپ سب کی پلیٹوں سے سالن صاف کر کر کے روٹی کی برکیوں سے کھایا ہے جی۔"

"یہ برکی کیا ہوتا ہے بھیا۔۔۔"

"روٹی کے ٹکڑے آئی مین نوالے کو کہتے ہیں۔" وہ اسے سمجھانے لگے اور اس پر انہیں ترس آنے لگا یہی وجہ تھی جب دو ماہ بعد اس کی ماں آئی تو اسرار حماد نے اس کی خوب کلاس لگائی۔

"تمہیں اپنے بچے سے محبت ہے یا پیسے سے۔"

"دو وقت کی روٹی سے۔۔۔۔ صاحب جی انسان ہو تو جی اسے پھر کچھ نہیں سوجھتا وہ اپنے بچے بھی ہے انہیں مار بھی دیتا میں بزدل ہوں نا جی مر سکی سکی مگر پیٹ تو روٹی مانگتا ہے اور روٹی کے لیے منہ بیگم صیب کے ہاں جمع کروا دیا۔"

"کتنے ملتے ہیں تمہیں مہینے کے اس بچے کے سے۔"

"پندرہ سو ملتے ہیں جی ہاتھ پلے کچھ نہ ہو تو پند بہت ہوتے ہیں جی۔"

"بس پندرہ سو اس مہنگائی میں۔۔۔۔"

"اسرار تمہیں کتنی بار کہا ہے میرے معاملات دخل مت دیا کرو مت کرو ان لوگوں کے دما خراب۔"

"ماما آج کل گلوبل ولیج ہے دنیا' آج چھوٹے چھوٹا خوانچہ فروش بھی پوری طرح سے آگاہ ہے حالات اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی سے۔"

"بس رہنے دو ان کے آگاہ ہونے سے کچھ ہوتا' ہوتا وہی ہے جو قانون ہم بنائیں جو ہم لوگو سمجھائیں۔"

"ماما آپ سیاست دان ہوتی جا رہی ہیں۔"! حماد نے کہا اور تب اس نے سوچا سیاست دان بہت کمال کی چیز ہے جس پر اسرار حماد بھی رشک رہے ہیں۔

"بڑے ہو کر مجھے سیاست دان بننا ہے۔" اس دس سال کے دل نے سوچا اور اس کی ماں پندرہ سو کر فلیٹ کی سیڑھیاں اترنے لگی وہ تیزی سے نیچے دوڑا تھا۔

"اماں مجھے بھی ساتھ لے جاؤ میرا یہاں دل ہے یہاں مجھے سردی گرمی میں باورچی خانے سلاتے ہیں یہ لوگ وہاں کاکروچ بھی ہوتے ہر چوہے بھی مجھے تمہارے ساتھ سونا ہے ماں۔" مگر نے ایک نہیں سنی پیسے بٹوے میں رکھ کر آگے بڑ چلی گئی وہ مرے ہوئے قدموں سے واپس آ گیا۔

"کیا مر گئے تھے جب سے آوازیں دے رہی ہوں بہت زیادہ ان سنی نہیں کرنے لگا ہے تو۔"

"میں وہ ذرا اماں جی سے ملنے گیا تھا۔" وہ منمنایا تھا۔

"بس کر دے یہ کرن ارجن کا ڈرامہ چل جا کر برتن دھو تیری ماں 500 اضافی لے کر گئی ہے کہہ رہی تھی تیرا باپ بیمار ہے کہہ رہی تھی زیادہ کام لے کر پورے کر لینا۔"

"زیادہ کام لے کر۔۔۔۔" وہ بڑبڑایا اور پھر یہ زیادہ کام شام تک پتا چل گیا آج ان کے فلیٹ میں بہت بڑی پارٹی تھی انہوں نے اسے کچن میں کام میں جوت رکھا تھا اور سب کے سامنے پڑوس والی جمیلہ نوکرانی ٹھسے سے کھانا اور ڈرنک سرو کر رہی تھی یہاں بہت اخباری نمائندے اور بیگم صاحب کی این جی او کے لوگ بھی تھے اس لیے جمیلہ نوکرانی کو اس ساری اداکاری کے ایک ہزار دیے جا رہے تھے۔

"تمہاری نوکرانی کہیں سے بھی نوکرانی نہیں لگ رہی ہے ڈارلنگ۔" ایک مرد نے ان کے شوہر سے نظر بچا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں تعریف کرتے ہوئے بے وجہ بات نکالی اور وہ ہنسنے لگی۔

"آپ کو تو پتا ہے میں ملازمین میں بھی حسب نسب کی قائل ہوں ہر ایک تو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتی۔"

"واہ پھر تو ہم خوش نصیب ہیں کہ تمہارے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔" اسی مرد نے آنکھوں میں حرص بھر کر اسے دیکھا اور ان کے شوہر نے ہولے سے ان کا شانہ دبایا۔

"بہت اچھے طریقے سے ملنا ہے مسٹر بدر الدین سے وہ صرف تمہاری این جی او کے ڈونر ہی نہیں میرے بزنس کے بہت بڑے سپورٹر بھی ہیں۔" یہ کل کی بات تھی جوان کا شانہ دبا کر مسٹر حماد نے پھر سے یاد دلایا تھا یہی وجہ تھی کہ پھر ان کا سارا وقت مسٹر بدر الدین کے ساتھ گزرا تھا اور رات کے دو بجے وہ سارے برتن اکیلے دھو دھو کر اس 500 روپے میں سے کچھ روپے کم کر رہا تھا جو اس نے آج کے کام کے بعد اس ادھار میں سے خود ہی گھٹائے تھے۔

رات کے تین بجے وہ ہمیشہ کی طرح ساری پلیٹوں سے نکالا ہوا صاف کیا ہوا کھانا سوکھے نان سے حلق سے اتار رہا تھا اور بلی پھر کہیں سے آ گئی تھی پھر اسے یہ نہیں یاد رہا تھا وہ بلی کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا یا بلی اس کے ساتھ بھوک تھکن ہر احساس' ہر برائی مٹا دیتی ہے انسان ہونے کا اضافی احساس بھی کہیں دور جا سکتا ہے اسے بلی پر ایک ماں جیسا پیار امنڈ رہا تھا۔

"میں تیری بھوک سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میں نے بھوک کو بہت قریب سے دیکھا ہے محسوس کیا ہے کھانا کھا میرے ساتھ کھا تجھے کوئی نہیں دیتا تو روز میرے پاس آیا کر۔۔۔۔ میں تجھے دوں گا۔" اس نے بلی سے انویں ایک بچکانہ وعدہ کر لیا اور تیسرا دن۔۔۔۔ اسے لگا اس فلیٹ میں یوم حشر کا دن تھا۔

"تم نے میری دی ہوئی پلیٹ میں بلی کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا تم اتنے گندے ہو ۔۔ ہم تمہارے ہاتھوں کا پکا کھانا کھاتے ہیں۔" بیگم صاحب نے ابکائی بھری اور اسرار حماد حیران رہ گیا یہ تصویر اس لیے تو مووی کیمرے میں نہیں فلمائی تھی انہوں نے۔

"تم نے میری سزا کے باوجود کھانا کھایا اب تمہیں ساری پلیٹیں صاف کر کے دینا فضل دین کا کام ہے فضل دین سن رہے ہو۔" انہوں نے ایک نیا حکم دیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیگم صاحب کو دیکھنے لگا تھا۔

"میں نے بلی سے وعدہ کیا ہے وہ آئے گی تو میں اسے اب کیا دوں گا۔" اس نے خود سے سوال کیا اور اسرار حماد یکدم اس کے اور بیگم صاحب کے بیچ آ گئے تھے۔

"اگر آپ نے اپنا یہ ظلم نہیں چھوڑا تو ۔۔۔ میں آپ کے این جی او کو اس کی ایک کاپی بھیج دوں گا اپنے حلفیہ بیان کے ساتھ۔"

"اسرار تم مجھ سے ٹکراؤ گے۔ مجھ سے اپنی ماں سے۔"

"شاید جی ہاں کیونکہ آپ سفاک ہو گئی ہیں اور

سفاک لوگ تب ہی سمجھتے ہیں جب ان کی سفاکی کا رزلٹ انہیں سزا کی صورت ملے۔"

"تم کیا چاہتے ہو....." بیگم صاحبہ بیٹے کے آگے نرم پڑ گئیں۔

"اس بچے کو اس کی ماں کے حوالے کر دیں اسے اپنی مرضی سے جینے دیں اپنی سفاکی سے اس کا بچپن [illegible]"

"غریب کا بچہ کچھ نہیں سوچتا صرف دو وقت کی روٹی کے سانس ان کے لیے بس اتنی ہی ضروری ہے جتنا یہ جی سکیں کیونکہ یہ جئیں گے تو یہ ہمارے کام کر سکیں گے اس کے آگے ان کی کوئی حیات نہیں مگر تم ابھی نہیں سمجھو گے یہ بات "ابھی کالج لائف میں ہو اور کتابی باتیں کرتے ہو کتاب سے باہر نکلو زندگی اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

"کیا ہو تم "اگر میری کاوشیں نہ ہوں اس گھر کے لیے۔" بیگم صاحبہ نے بہت تلخ ہو کر کہا اور پھر دوسرا دن اسرار احمد کے لیے موت کا دن تھا انہوں نے اپنا ہینڈی کیم مووی کیمرہ 5 ویں منزل سے نیچے پھینک دیا تھا اور پاپا کے سامنے کھڑے ہو کر بس ایک سوال کیا۔

"پاپا کیا واقعی میں "آپ زندہ ہیں۔" اور کام کرتے منصور کے ننھے ذہن نے سوچا اتنے ذہین سے اسرار حماد نے اتنا بچکانہ سوال کیوں پوچھا۔

"صاحب تو زندہ تھے پوری طرح....." مگر وہ چپ رہے تھے انہوں نے جواب نہیں دیا تھا اور اسرار حماد نے کہا تھا۔

"اتنے عرصے سے جو روٹی میں کھا رہا تھا میں سمجھتا تھا یہ رزق حلال ہے مگر مجھے کیا پتا تھا میں ایک حرام زندگی جی رہا تھا اور روٹی کے نام پر آپ کے نام کی کڑوی روٹی کھائے جا رہا تھا کھائے جا رہا تھا آپ سے آپ کی موت کی تعزیت کیے بغیر سوری پاپا مجھے افسوس ہے۔"

پاپا کو اس دن پہلی بار ظاہری طور پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

"زندگی گزارنے کے لیے یہ سب ضروری تھا اسرار۔" ڈاکٹر نے گھر میں ہی ٹریٹ منٹ کی تھی اور پاپا نے اپنی صفائی دینی چاہی تھی اور وہ ایک دم سے [illegible] کے پاس کچن میں آ کر بولے تھے۔

"چلو میں تمہیں آزاد کرنا چاہتا ہوں تم ایک غلا[م ہو] میری ماں کے اور سنا ہے غلام آزاد کرنے سے موت [کی] سختی آسان ہو جاتی ہے۔" وہ کل کے کھلونے کی ط[رح] اٹھا تھا اسے اس وقت بیگم صاحبہ کا خوف اپنی ما[ں کی] جھوٹی محبت کچھ نہیں یاد آیا تھا وہ اسرار حماد کے سا[تھ] سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

پھر ایک رش والے علاقے میں اسرار حماد [نے] اسے دیکھا تھا۔

"جاؤ میں نے تمہیں اپنی ماں اپنے باپ [کے] گناہوں کے کفارے میں آزاد کیا جہاں جانا چاہتے چلے جاؤ۔"

"آپ..... آپ کہاں جا رہے ہیں اسرار صاح[ب]"

"پتا نہیں میری کوئی منزل نہیں ہے میں نے سو[چنا] چھوڑ دیا ہے کہ میں زندہ بھی ہوں"۔

"آپ زندہ ہیں صاحب جی۔" اس نے معصومی[ت] سے کہا اور وہ دکھ سے بولے۔

"شاید ہر انسان کو یہی لگتا ہے کہ جو چل رہا ہے رہا ہے کھا رہا ہے آپ سے باتیں کر رہا ہے وہ زندہ۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں صرف سانس لینا ز[ندہ] ہونے کی علامت نہیں۔"

وہ یہ جملہ کہہ کر اس کا گال تھپتھپا کر آگے کہیں ہو گئے اور وہ حیرت زدہ کھڑا رہ گیا۔ پھر کتنے دھکے کھا۔ کتنے نہیں یہاں تک کہ ایک پولیس پارٹی نے می[ڈیا] کے ساتھ مل کر اسٹریٹ کرائم کی کھوج میں بہت [سے] بچوں کے ساتھ اسے بھی پکڑ لیا اب وہ بارہ برس کا [تھا] اور سگریٹ نوشی کرنے لگا تھا اس کی تصویر میڈیا پر [آ] میں چلی تھی جب چلڈرن ہوم کے ویٹنگ روم میں اس کی ماں منہ پر چادر کا بکل ڈالے اس کے پاس آ[ئی] تھی۔

"میں نے ٹی وی پر دیکھا یہ تھوڑا بڑا ہو گیا ہے مگر میرا منصور ہی ہے۔" اس نے بے حسی سے ماں [کو] دیکھا تھا۔

"تیرا کوئی اور بیٹا کام کاج کے قابل نہیں ہوا جو تجھے میرے لیے آنسو بہانے پڑے۔" یہ ان کی تنہا پہلی کونسلنگ تھی۔

"تو بہت بدل گیا ہے۔" ماں کو حیرت ہوئی تھی۔

"بدلا نہیں ہوں اپنے آپ کو ٹھیک سے پہچان گیا ہوں اور دنیا میں رہ کر سمجھ گیا ہوں یہاں کوئی بھی انسان کسی دوسرے انسان سے ضرورت کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔"

"منصور یہ تو نہیں ہے تو تو بڑا نمانا سا بڑا دبو ہوتا تھا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اس کے سگریٹ کی وجہ سے دانت..... اماں کو ایک اور دھکا لگا تھا اور وہ قریب ہو کر کئی سالوں کے فاصلے سے بولا تھا۔

"کوئی انسان کسی مضبوط سہارے کے بنا دنیا میں گھر سے باہر ایک رات بھی جی لے نا تو اس پر دنیا کے ساتوں در کھل جاتے ہیں میں کہاں کا ولی تھا۔ دنیا میں ہوتا اس کے رنگ میں رنگتا اور پھر بھی دو سال پہلے والا دبو پارسا منصور احمد رہتا..... ڈرگ لیتا ہوں یہ دیکھ۔" اس نے کلائی آگے کی انجکشن کے نشان اماں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس نے حقارت سے کہا۔

"میں نے بھی ایسے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں پھر کسی نے زور سے ہاتھ مارا تھا چل کبوتر کے بچے آنکھیں بند کرنے سے دنیا پریوں کی دنیا نہیں بن جاتی ماریں کھائی ہیں پولیس کی تیرے منصور نے' ایک ایک پیسے کے لیے عرش سے فرش پر گرا ہوں دو دو دن کے لیے جیل میں بند رہا ہوں بھتہ دینا اور زندگی گزارنا وہیں سے سیکھا ہے تجھے پتا ہے دنیا کا دوسرا نام بھتہ گیری ہے۔" اماں اسے دیکھتی رہیں اور وہ تیز آواز میں بولا۔

"یہاں لاوارث اور تجھ جیسے لالچی ماں باپ کی اولادیں ایسے ہی رلتی ہیں یہاں ایک ایک سانس کے لیے فنڈ ٹیکس دینا پڑتا ہے جنگل کا قانون بھوگنے کے لیے انسان کو سفاک' زہریلا اور مطلب پرست ہونا پڑتا ہے اور میں نے بھی ایسا ہی کیا جب گھوری پر سے کھانا اٹھا کر کھانا ہو تو کتے اور انسان میں بھوک بھر کا فاصلہ ہوتا ہے بھوک سب کو ایک لکیر میں کھڑا کر دیتی ہے میں نے اصل مساوات بھوک میں دیکھی ہے انسان ہو جانور ہو معدے سے سوچنے لگتا ہے معدے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا بھوک مٹانے کے لیے وہ کسی سے بھی لڑ سکتا ہے چھیننا آنا چاہیے بھوک تو مٹ ہی جاتی ہے اور دنیا میں 'میں نے جو ایک پتے کا سبق سیکھا وہ چھیننا ہے یہاں مروت' دل محبت سب فضول کے بکھیڑے ہیں جو پڑھے لکھے لوگوں نے اپنے جیسے دوسرے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے بنائے ہیں۔"

"بہت برا کیا..... اسرار صاحب نے تیرے ساتھ بہت برا کیا۔"

"نہیں تو اماں اسرار صاحب تو! میرے محسن ہیں انہوں نے تو مجھے زندگی کی سمجھ دی ورنہ میں آج بھی بیگم صیب کے کچن میں سو رہا ہوتا بلی سے کھانا چھینتا کبھی بلی میرے ساتھ کھاتی کبھی میں بلی کے ساتھ کھانا کھاتا اور مجھے پتا ہی نہیں چلتا ہم دونوں میں اصل میں کون دوسرے فریق کے لیے قابل احترام اور سخاوت کرنے والا ہے۔

تمہیں پتا ہے اماں تمہاری بیگم جب بھی کبھی میرے آگے سے کھانے کی پلیٹ اٹھا کر اپنی صفائی والی ماسی کو تھیلی میں ڈال کر دے دیتی تھی وہ اسے دعائیں دیتی تھی اور میں اکیلا بیٹھ کے سوچتا مجھے رونا چاہیے یا ہنسنا چاہیے اس مذاق پر "اس بے عزتی پر اور اس وقت گھر میں کوئی مجھ سے خاموش تعزیت اور افسوس کرتا تھا تو وہ وہی بلی ہوتی تھی جس کے ساتھ بیٹھ کر میں اور وہ ایک ذات ہو کر کھانا کھاتے تھے وہ انسانوں کی طرح بڑے بڑے بھاشن نہیں دے سکتی تھی مگر پھر بھی ساتھ دینا جانتی تھی۔" اب وہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔

"اسرار صاحب کا کیا بنا اماں۔" اماں نے خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

"اسرار صاحب تو پچھلے سال ہی گزر گئے پتا نہیں کیا ہوا تھا کسی نے فون کر کے بتایا تھا صاحب کو شاید

دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی تھی ان کی وہ ایک کمرہ کے کرائے کے میں رہتے تھے ایک کمپنی میں کلرک لگے تھے جب سے گئے تھے ایک بار بس چھوٹی بی بی کی سالگرہ پر آئے تھے تحفہ لے کر بہت خراب سی گڑیا تھی چھوٹی بی بی نے وہیں پھینک دی تھی اور بیگم صاحب نے کہا تھا تم لے جاؤ اپنی بیٹی کے لیے ۴ سرار صاحب نے یہ سب دیکھا اور پھر دوبارہ کبھی گھر نہیں آئے بس پھر ان کی میت آئی بیگم صیب 'صاحب' بہنیں چھوٹے صاحب اور دونوں خوب روئی تھیں پر اب وقت نہیں لوٹایا جا سکا تھا۔" منصور نے تیز تیز سگریٹ مرغولوں میں اڑادی تھی۔

"مجھے آزاد کروادیا مگر خود اپنی قید سے باہر نہیں نکل سکے خود کو معاف نہیں کر سکے بیگم صیب کو معاف نہیں کر سکے دماغ کی شریان تو پھٹنی ہی تھی کتنا برداشت کرتے حساس لوگوں کا یہی رونا ہے وہ برداشت نہیں کرپاتے اور برداشت کرنے کی اداکاری کرتے رہتے ہیں اور پھر کسی دن ایک دم سے دھماکے سے پرزہ پرزہ ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔"

"اتنی بڑی بڑی باتیں مت کر تو منصور ہے کوئی گیانی نہیں۔"

"میں منصور ہوں نہ گیانی میں زندگی کا رد عمل 'زندگی کا احتجاج ہوں سن ڈرامہ نہ کر محبت کا مجھے تیرے ساتھ نہیں جانا۔" وہ اب کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر سفاکی سے آنکھیں مظلوم بنا کر بولا تھا۔

"پتا نہیں کون عورت ہے صاحب مجھے کیا پتا یوں ایسے شک ہو رہا ہے میری ماں تو بچپن میں ہی مر گئی تھی۔" انسپکٹر نے اور میڈیا کی ٹیم نے سن کر ہولے سے سر ہلایا تھا اور یوں وہ چلڈرن ہوم میں لاک اپ کر دیا گیا تھا یہاں کی زندگی سڑکوں پر گزاری ہوئی زندگی سے الگ نہیں تھی پھر یہ چھ ماہ بعد کی بات تھی جب ایک خوبرو سا شخص اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"میں ابراہیم آفاق۔"

"میں منصور۔۔۔" اس نے بہت اعتماد سے جواب دیا۔

"تم بہت پسند آئے ہو مجھے کیا میرے بیٹے بنو گے۔" اس نے اچنبھے سے خود کو دیکھا وہ کس اینگل سے اچھا تھا انہیں اچھا نظر آیا تھا اس نے جب پہلی بار اس شخص کو دیکھا تب وہ اپنی پلیٹ ختم کر کے ایک کمزور لڑکے کی پلیٹ ہڑپ کرنے کی جنگ لڑ رہا تھا اور جب چلڈرن ہوم کے وارڈن نے لڑائی کی وجہ پوچھی تو اس نے بہت صفائی سے پورا سچ کہہ سنایا تھا جھوٹ نہیں بولا تھا۔

"میری بھوک صرف ایک چپاتی سے ختم نہیں ہوتی اس لیے اس سے روٹی جھپٹ رہا تھا کام جب پورا کرتا ہوں تو کھانا بھی پورا دو نا ایک روٹی تو 5 سال کا بچہ کھا جاتا ہے۔ اگر کھانا مزے دار پکا ہو۔" سامنے کھڑے ابراہیم آفاق کے ہونٹ ہنس پڑے تھے۔ اب یہ اچانک۔

"مجھ میں آپ کو کیا اچھا لگا ہے سر۔" وہ حیران ہوا

"تمہاری سچ بولنے کی عادت تمہیں پتا ہے مومن کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔" اس نے حیرت سے اس انسان کو دیکھا تھا ایک نئی تعریف بتا رہا تھا مومن کی۔

"مگر جو ہمارے اردگرد مسلمان ہیں وہ کیا ہیں وہ بھی تو جھوٹ بولتے ہیں۔"

"مسلمان اور مومن میں یہی فرق ہے وہ بابا اشفاق کہتے ہیں نا مسلمان وہ ہے جو اللہ کو مانتا ہے اور مومن وہ ہے جو اللہ کی مانتا ہے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے۔ مومن کچھ بھی ہو سکتا ہے جھوٹا نہیں اور جو مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہیں اپنے آقائے نامدار کے یقین اور اعتبار کو توڑتے ہیں ٹھیس پہنچاتے ہیں ان کے دل کو۔"

"آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" وہ دلچسپی سے انہیں دیکھ کر بولا۔

"نہیں بہت بولا ہے کبھی کبھی تو عادتاً بھی پھر ایک دن یہی حدیث نظروں سے گزری تو دل نے کہا نہ بدلنا پتھر اور بے جان چیزوں کی مجبوری ہے مگر زندہ چیزیں اپنے انت تک بدلتی ہیں یہی بدلنا ان کے زندہ ہونے کی پہچان ہے پھر دھیرے دھیرے بدلتا گیا۔" اب وہ اس کے قریب آن کھڑے ہوئے تھے۔

"غلطی صرف فرشتے نہیں کرتے انسان غلطی کرتا ہے غلطی سے سیکھتا ہے تجربہ جسے کہتے ہیں وہ پہلی بار کسی کی غلطی ہی تھا اور بعد میں دوسروں کی رہ نمائی بن گیا سو غلطی سے گھبراؤ نہیں تم فرشتے نہیں کہ گناہ نہ کرو مگر انسان ہو کر بری بات یہ ہے کہ اپنے گناہ پر اتراؤ اپنے گناہ کی تاویلیں دو اس گناہ سے توبہ کر لو تو انسان بالکل ستھرا ہو جاتا ہے۔

نیکی کرنا آنا چاہیے یہ گناہ کے لیے اینٹی ایجنٹ ہے منصور۔" منصور مسمرائز ہو کر انہیں سن رہا تھا اسے ان کی شخصیت میں تجسس پیدا ہو رہا تھا ان کی شخصیت کا سحر ـــــ متاثر کر رہا تھا تبھی اس نے ان کے ساتھ جانے پر اعتراض نہیں کیا پھر دوسرے دن جب وہ ملازمین کے ذریعے دھل دھلا کر ناشتے کی ٹیبل پر ان کے سامنے آکر بیٹھا تو پہلا سوال ہی دھماکے دار پوچھا تھا اس نے۔

"آپ کے ملازمین کی فوج دیکھ کر یہ تو نہیں لگتا آپ کو ملازم کی ضرورت تھی تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے مجھے اپنی اولاد کی کیٹگری میں لا رکھا ہے۔" مسٹر ابراہیم ہنس پڑے تھے۔

"ہاں یہ ہی سمجھ لو تمہاری ذہین آنکھیں اور تمہاری یہ دل موہ لینے والی صورت نے مجھے کہا کہ مجھے تمہاری کسٹڈی لے لینی چاہیے۔"

"یعنی اگر میں بلال کی طرح مریل' سڑیل سا ہوتا تو آپ میری طرف دیکھتے بھی نہیں آپ ظاہری پسند انسان ہیں سر۔" مسٹر ابراہیم ہنستے رہے کچھ نہیں بولے اور وہ بضد ہو گیا جواب کے لیے مسٹر ابراہیم نے اسے دیکھا اور آہستگی سے بولے۔

"شاید فی زمانہ یہی سب کچھ سچ ہے اپنی اولاد جیسی بھی ہو انسان سر آنکھوں پر رکھتا ہے لیکن کسی چلڈرن ہوم سے اولاد لینی ہو تو چوائس کا مارجن تو ہوتا ہے نا۔۔۔ لیکن میں نے بلال کے تعلیمی اخراجات بھی اپنے ذمے لے لیے ہیں وہ وہاں وہی زندگی گزارے گا جیسی یہاں۔"

"آپ کہنا چاہتے ہیں آپ بہت عظیم انسان ہیں۔" ابراہیم صاحب کی سنجیدہ آنکھیں اس پر آن جمیں۔

"عظیم انسان کیا ہوتا ہے کچھ نہیں 'دو گز زمین ایک کفن کے ساتھ ہر انسان ایک جیسی کیٹگری میں کھڑا ہو جاتا ہے عمل مائی چائلڈ' انسان کا عمل اسے دوسروں سے بہترین بہتر ترین انسان بناتا ہے اور نیک عمل یہ ہے کہ ہر اس شخص کو دو جس کو تمہارے مقابلے میں زیادہ سخاوت کی ضرورت ہے۔"

وہ بول رہے تھے اور اسے اچانک سے اسرار حماد یاد آگئے انہی کے جیسا سخاوت کا بھاشن 'وہ غور سے سن رہا تھا پھر یہ ایک ہفتے کی بات تھی جب وہ قانونی تقاضوں کے مطابق پوری طرح ان کا بیٹا بن گیا تو اس نے چائے پیتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ایک بات پوچھوں سر۔"

"پوچھو۔۔۔" انہوں نے چائے کا سپ لیا تھا اور اس نے غیر متوقع کہا تھا۔

"اچھا جب آپ مر جائیں گے تو یہ ساری دولت 'یہ گاڑیاں سب مجھے مل جائیں گی۔" مسٹر ابراہیم آفاق کو اچھو لگ گیا تھا وہ ہنسے جا رہے تھے پھر شرارت سے بولے تھے۔

"کیا دور کی کوڑی لائے ہو' ہاں منصور ابراہیم میرے مرنے کے بعد ساری جائیداد تمہارے نام ہے مگر یار بیٹا جی ابھی تھوڑا سا تم میرے ساتھ جی تو لو مرنے کی باتیں پھر کبھی مرنے پر کر لیں گے۔"

"مجھے لگتا ہے مجھے کسی کے مرنے 'جینے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا میں آپ کو ایک ہفتے بعد بھول جاؤں گا۔"

"اچھا! فی زمانہ یہی دستور ہے مگر میں چاہوں گا میری محبت اتنی مضبوط ہو کہ تم مجھے چاہو بھی تو ایک سال تک نہ بھول سکو۔"

"مجھے کسی کے مرنے پر رونا نہیں آسکتا پہلے بتا دوں آپ کو ورنہ لوگ کہیں گے سنگ دل بیٹا ہے۔"

"تمہارا دل محبت سے ناراض ہے اس لیے رونا

نہیں چاہتا ایک بار محبت کرنا سیکھ گئے تا مجھے یقین ہے تم آسمان زمین ایک کر کے رووَ۔ گے مجھے۔"

"میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔"

"میں تمہیں کب بدلنا چاہتا ہوں ہاں جو کچھ اچھا ہے وہ سب تمہارے لیے ہے۔" وہ اٹھ گئے تھے اس کی ڈرگ کی عادت چھڑوائی گئی تھی اعلا پائے کے ڈاکٹر سے کنسلٹ کر کے اس کے لیے ٹیوٹر رکھا گیا تھا اور پھر پہلی بار ایک سال کی محنت کے بعد وہ ڈائریکٹ 9th کلاس میں انٹر ہوا تھا اسکول کا ماحول' بچے' ان کی باتیں مسٹر ابراہیم کی چھوٹی چھوٹی مثالیں وہ نا چاہتے بھی بدل رہا تھا پھر ایک دن اچانک ایک کک کے ہاتھ پر چین سے تیل گر گیا مگر وہ بے حسی سے اسے دیکھتا رہا ہاتھ پر بڑا سا چھالہ ہو گیا اور شام کو اس نے مسٹر ابراہیم آفاق سے کہا۔

"بابا شفیق کا ہاتھ بالکل برگر لگ رہا ہے نا بس مایونیز لگاؤ اور کھا جاؤ۔" مسٹر ابراہیم چائے پیتے سے اٹھے تھے ملازم کوارٹر میں جا کر انہوں نے خاص طور پر اس کا ہاتھ دیکھا تھا ڈاکٹر کو فوراً" بلوایا تھا برن بینڈیج کروائی تھی پھر اکیلے ہوئے تو بولے۔

"آپ نے محسوس کیا انہیں اس وقت کتنی تکلیف تھی۔"

"مجھے کسی کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔" وہ چیونگم چباتا رہا سگریٹ کی عادت چھوٹ چکی تھی تب مسٹر ابراہیم آفاق نے اسے کچھ نہیں کہا اور تیسرے دن اس کے پاس ایک ماہ کا ایک بے بی ڈاگ موجود تھا۔

"اس کی ذمہ داری کسی پر نہیں اسے صرف آپ سنبھالیں گے۔"

"بابا مجھے کتے بلی بلکہ انسان کسی کے بچے سے محبت نہیں ہے۔"

"مجھے نہیں پتا میرے ایک دوست نے بھی یہ ہی کہا تھا' مگر میں نے کہا۔ نہیں' نہیں میرا بیٹا بہت ذمہ دار ہے' آپ یہ ہی ڈاگ مجھے ۔۔۔ دیں وہ بہت دھیان رکھے گا اس کا اب آپ چاہتے ہیں میں اپنے دوست کے سامنے غلط ثابت ہوں تو ٹھیک ہے رہنے دیجیے' میں کل اسے یہ ڈوگی واپس کر آوَں گا۔" منصور ابر نے مسٹر ابراہیم آفاق کی طرف دیکھا' خفگی کو نوٹ اور آہستگی سے بولا۔

"اچھا رہنے دیں میں کر لوں گا آپ اس کا نام اور مینو سمجھا دیجیے مجھے۔"

"تم یہ کام مجبوری کی وجہ سے تو نہیں کر رہے جی۔" انہوں نے جان کر منصور ابراہیم کو ٹھوک بجا دیکھنا چاہا اور وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

"نہیں بابا آپ جانتے ہیں جو کام مجھے نہیں کرنا وہ کام میں صاف منع کر دیتا ہوں۔"

"ہاں یہ تو میں جانتا ہوں' چلو آؤ میں تمہیں بتاؤ کیا کھائے گا۔" وہ اسے لے کر بیٹھے' پھر ایک گھنٹے اٹھے تو اس نے اس ڈوگی کو کسی جنت میں شیطان طرح داخل ہو جانے والی نادیبی نظروں سے گھورا' دو دن بعد وہ واقعی ڈوگی کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔

"وہ چپ کیوں بیٹھا ہے؟ آج اس نے اپنے دود باؤل پورا کیوں خالی نہیں کیا؟"

آج میں اس کے لیے بسکٹ لے کر گیا' مگر اس میری طرف دیکھا بھی نہیں' لیٹا رہا' بابا ڈاکٹر کو بلا کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔" مسٹر ابراہیم مسکرائے جاتے اس کی پریشانی پر ڈاکٹر کو بھی لیتے اور وہ سب ٹھیک ہے کا سن کر اسے ہاتھوں لے کر ایک' دو' تین چکر لگاتا اور کھلکھلانے لگتا۔

"بدمعاش کہیں کا" منصور ابراہیم کو بھاؤ دیتا ہے۔ پتا ہے نا مجھے کسی کی پرابلم سے بھی کوئی مطلب نہیں مگر تیری طرف میرا دل خود کھنچا ہے جیسے تو میری او ہو۔"

"ہاں' ہاں بری بات بچے ایسی باتیں نہیں کرتے ہیو یور لینگویج منصور۔" کہیں سے مسٹر ابراہیم آفاق سنتے تو اس کو سکھانے لگتے اور وہ ہنس پڑتا۔

"سوری بابا بھول ہوئی۔"

"اٹس اوکے آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔" اثبات میں سر ہلاتا اور بس ان دنوں اچانک ابراہیم آفاق کو گارڈننگ کا شوق چرایا۔

"مٹی میں نہ گھسیں' آپ کے کپڑے گندے ہو جائیں گے۔"

"لیکن ہم خود بھی تو مٹی سے تخلیق ہوئے' پھر کیسی مٹی سے جھجک' پھر کس برتے پر اپنے وجود کا زعم مٹی میں جا کر مٹی ہونا ہے' تمہیں بھی' مجھے بھی۔"

"بابا کیا مرنا ضروری ہے' ہم ہمیشہ کیوں نہیں زندہ رہتے۔" وہ ۔۔ بیٹھ کر کھرپی سے مٹی کھودنے لگا۔ مسٹر ابراہیم آفاق نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

"گرمیوں میں آم کھاتے ہو' مگر سردیوں میں یہ کہیں نہیں ملتے' پھر دوسری گرمیوں میں آم لگتے ہیں' آم کھانے کو ملتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔"

"بہت ایکسائیڈ ہوتا ہوں' میرا دل چاہتا ہے گرمیاں کبھی نہ جائیں۔"

"اور جب سردیاں ہوتی ہیں تو؟" مسٹر ابراہیم آفاق نے متانت سے اسے دیکھا اور وہ بولا۔

"پھر میرا دل چاہتا ہے سردیاں کبھی نہ جائیں۔"

"لیکن چاک پر کوزہ گر سے پوچھو گرمیاں اس کے لیے کتنی بڑی نعمت ہیں' کسان سے پوچھو کہ فصل بونے کے بعد وہ گرمی اور رم جھم کی کیسی کیسی آس اور امید روز اپنے سرہانے رکھ کر سوتا ہے اور روز صبح اسے اپنے سر کے گرد کپڑے کے ساتھ باندھتا جاتا ہے' باندھتا جاتا ہے ہر ایک نئی امید' ابھرنے کی امید ہے' یہ ہی مثال صبح کی رات سے گٹھ بندھن کی طرح جڑی ہے۔

یہ ایک چکر ہے تمہاری زمین اور دوسرے سیاروں کے درمیان بندھی کشش کی طرح۔ تم ہمیشہ جی لو' جی سکو' تو کیا تم میں نیکی کمانے' عمل کرنے کی لہر اٹھے گی زندگی میں تحریک ہے موت' موت نہ ہو تو انسان زندگی میں متحرک ہو ہی نہیں سکتا' تم بیج بوتے ہو تو کتنے دل سے اس بیج کے مٹی سے سر ابھارنے کی لگن لگاتے ہو' مگر تم غور کرو تو بیج زمین میں مٹی میں مل کر فنا ہوتا ہے' تب ہی وہ ایک نئی کونپل بن کر باہر اگتا ہے' ہم مرتے ہیں' مگر کیا واقعی ہم مر جاتے ہیں۔"

"بابا آپ بھی نا اتنی مشکل باتیں کرتے ہیں کہ۔۔۔"

"اچھا مگر تمہیں میری ہر بات سمجھ تو آجاتی ہے' اب بتاؤ ان باتوں سے کیا سمجھے ہو تم۔" وہ ہنس پڑے اور وہ بھی مسکرا کے بولا۔

"یہ ہی کہ موت انسان کے اعمال افعال کے لیے ایک روک ایک تحریک کی طرح ہے' اگر موت نہ ہو تو انسان زندگی میں زندگی کی خوشیوں کو انجوائے کر سکتا ہے نہ بڑے بڑے معرکے سر کرنے کی کوشش کر سکتا ہے' جو سردی کے بعد گرمی اور گرمی میں رم جھم کا ایک واقعہ' ایک تھرل ہے وہ ہے فنا ہونے' مٹ جانے کا ڈر' موت نہ ہو تو انسان فرعون بن جاتا ہے' خود کو ہر نیکی بدی سے مبرا سمجھتا ہے' بس من مانی اور خود سری میں جیتا ہے' دوسروں کی زندگی کو آزار بنا دیتا ہے اور یہ کہ اگر انسان فنا نہ ہو تو اپنی بقا کو کبھی نہیں پا سکتا۔

ویسے بابا یہ فنا سے بقا تک جانا یہ کیا ہے؟" اس نے نیا سوال داغ دیا اور وہ ہنسنے لگے۔

"یہ ایسے ہے جیسے پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک کا سفر' جب تک ہم نا سمجھ رہتے ہیں دنیا اور زندگی کو سب کچھ مانتے ہیں' مگر جب ہم میں شعور آتا ہے تو ہمیں پتا لگتا ہے ہم عارضی چیزوں پر خوش ہو' ہو کر اپنی انرجی ضائع کرتے آ رہے تھے۔ اصل میں تو یہ منزل تھی ہماری' جسے ہم صرف بڑھاپے کے اور بہت سے کاموں میں لسٹ لگا کر رکھتے ہیں' مگر اللہ تو ہماری پہلی سانس سے ہمارے ساتھ ہے اور آخری سانس اور آخری سانس کے بعد بھی ہمارے ساتھ رہتا ہے جیسے بیج فنا ہو کر کونپل بنتا ہے ویسے ہی انسان اللہ کی راہ میں فنا ہو کر ابدی زندگی کی راحتیں' مسرتیں پا لیتا ہے۔"

"فنا ہونا یعنی مر جانا۔" اس نے انہیں پھر سے دیکھا۔

"ظاہر ہے یہ ہی معنی ہیں' فنا ہو جانا' یعنی مر جانا' لیکن یہاں یہ مطلب نہیں' فنا ہونے کا مطلب ہے اپنی ذات کو منہا کر کے زیادہ بہتر شکل بہتر فارمیٹ میں آ جانا جیسے جب ہم محبت نہیں کرتے تو صرف اپنی طرف متوجہ رہتے ہیں' مگر جب ہم کسی سے محبت کرنے لگتے ہیں تو ہم چاہتے ہیں بالکل ویسے بن جائیں

جیسا ہمارا محبوب ہمیں دیکھنا چاہتا ہے' جیسے جس حالت میں ہمیں اسے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے' یعنی اپنی ذات کی اہمیت نہیں رہتی' اپنی اہمیت نہیں رہتی' اپنے محبوب کی پسند ناپسند بس یہ ہی مطمع نظر ہوتا ہے اور اسے کہتے ہیں خود کو فنا کرنا' منہا کر کے اس جیسا ہو جانا' سو سمجھ تو تم گئے ہو گے۔" وہ ہنسنے لگا تھا۔

"جی بابا' یعنی اس اللہ کے بتائے گئے راستے پر چلنا اور اللہ کے راستے پر چلنے والے کو نہ غم ستاتا ہے' نہ وسوسے' نہ کل کی فکر۔"

"گڈ۔۔۔" وہ دھیرے سے مسکرائے اور وہ شرارت سے بولا۔

"اور بابا ایک اور بات۔ بہت تیز اور چالاک ہیں آپ سمجھے۔" مسٹر ابراہیم آفاق کا قہقہہ بہت طویل تھا۔

"ہاہاہا کیوں۔۔۔ کیوں بھئی یہ کیوں؟"

"اتنی ساری زمین کی گوڈی کروالی مجھ سے کہاں میں مٹی کو ہاتھ لگانے کا روادار نہیں تھا۔"

"ہاں یہ تو ہے' مگر دیکھو جب ہم اس زمین میں یہ بیج لگائیں گے تو جتنے پودے نکلیں گے وہ تمہارا کتنا شکریہ ادا کریں گے۔"

"پودے اور میرا شکریہ ادا کریں گے چھوڑیں بابا نئی سے نئی نکالتے ہیں آپ تو۔"

" یہ شکریہ کرنے کا سبق میرے روحانی استاد بابا اشفاق احمد سے سیکھا ہے میں نے۔"

"اچھا پودے میرا شکریہ کیسے ادا کریں گے؟" اس نے دلچسپی لی۔ اور وہ بولے۔

"دیکھو یہ اس پیکٹ میں بند ہیں' ہم یونہ کریں تو یہ خراب ہو کر مر جائیں گے' یعنی ضائع ہو جائیں گے' لیکن جب آپ کے ہاتھ انہیں مٹی میں بوئیں گے' آپ انہیں پانی دیں گے' دھیان کریں گے تو جب یہ کونپل بن کر زمین سے سر ابھاریں گے تو اس انسان کا یعنی آپ کا شکریہ ادا کریں گے کہ آپ نے انہیں ضائع نہیں ہونے دیا۔" وہ رکے' پھر بولے۔

"آپ نے کبھی چلتے پھرتے لوگوں کا' پھول پودوں کا شکریہ ادا کیا۔"

"نہیں تو بابا میں نے کبھی کسی چیز کا شکریہ نہ کیا۔" وہ وہیں منڈیر پر بیٹھ گیا اور مسٹر ابراہیم پھر بولے۔

"میں تو صبح اٹھتا ہوں تو لمبی گہری سانس لے کر کہتا ہوں اللہ تیرا شکریہ کہ تو نے مجھے اس نیند سے جگایا؛ چاہتا تو ابدی ہو سکتی تھی' پھر کھڑکی کے پردے ہٹاتا ہوں تو اللہ کی روشن صبح کا شکریہ ادا کرتا ہوں' جس ابھرنے والی کرن مجھے روز کہتی ہے ہر روز آج سے آنے والا کل بہتر لائے گی' اندھیرے کے بعد روشن صبح ضرور آتی ہے۔ باہر نکلتا ہوں پیڑ' پودوں کا شکریہ کرتا ہوں جو مجھے صاف ہوا دیتے ہیں' میری ساری گندی سانسوں کو خود میں جذب کر لیتے ہیں' تم نے کبھی اتنا بڑا ایثار کرتے دیکھا ہے کسی کو' جس گاڑی میں بیٹھتا ہوں اس کے بنانے والے کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے اپنے دماغ کو لوگوں کی آسانی کے لیے استعمال کیا' آسانی دی۔ جو ملازم آپ کے لیے کوئی کام کرتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرو کہ وہ اپنی انرجی تمہارے لیے ضائع کرتا ہے۔"

"مگر بابا ملازم کو تو ہم تنخواہ دیتے ہیں' پھر شکریہ کیوں۔"

"ہاں تنخواہ دیتے ہو' مگر کیسے دیتے ہو۔ یہ سوچا؟" وہ رکے' پھر بولے۔

"اللہ تمہیں دیتا ہے تو تم اسے ان روپوں کے ذریعے اپنی سہولت میں شامل کرتے ہو' پہلے اللہ کا شکریہ ادا کرو' پھر اس بات کا کہ اس نے ملازم کے دل میں آپ کے لیے توجہ' آپ کے لیے آسانی پیدا کرنے کی مرضی ڈالی' اگر وہ چاہتا تو وہ ہی سب سے بڑا حریف بن جائے تمہارا' پیسے بھی لے اور پھر بھی تمہارے کام آدھے ادھورے کرے' ڈنڈی مارے اور موقع ملے تو کسی دن تمہیں بھی مار دے۔"

"ہائے بابا ایسا بھی ہوتا ہے ملازم مار بھی دیتے ہیں' میں نے تو اتنے دن ملازمت کی' مگر بس بیگم صیب کو مارنے کی پلاننگ ہی بناتا رہا۔"

"ایسا بھی ہوتا ہے' مگر ایسا تب ہوتا ہے جب دوسرے انسان کو لگے اس کو عزت بھی بھیک کی طرح دی جا رہی ہے' اگر کوئی ملازم تمہارے پیسوں کے عوض بھی تمہارا کوئی کام کرتا ہے تو وہ صرف اپنی محنت تمہارے ہاتھ بیچتا ہے' اپنی ذات نہیں بیچتا' آپ اس کی عزت کرو' وہ آپ کی عزت کرے گا' آپ اس کا خیال رکھو' وہ آپ کا خیال رکھے گا' کبھی کبھی اتنا کہ آپ کی زندگی کے لیے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرے گا۔ ہر چیز شکریہ چاہتی ہے' شکریہ ادا کرنا سیکھ جاؤ گے تو کوئی تمہارا حریف نہیں رہتا' حریف اس وقت بنتا ہے جب مقابلہ کرنا ہو' جب آپ کسی کو پیر کے نیچے دباؤ' کمتر سمجھو۔" بابا بیج ڈال رہے تھے اور وہ ان کے حکم کے مطابق مٹی برابر کرتا جا رہا تھا' آج وہ سر سے لے کر پیر تک مٹی میں بھرا ہوا تھا اور اس کے بروس نے اس کے باوجود اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ گر گیا تھا اور وہ اسے پیار کر رہا تھا۔

"واہ اتنے گندے ہو' پھر بھی یہ تمہیں پیار کر رہا ہے۔"

"محبت کرتا ہے بابا یہ مجھ سے' ——— اور آپ جس سے محبت کرتے ہو وہ کسی بھی حالت میں ہو گندا مندا ہو آپ کو پیارا لگتا ہے۔"

"آہاں۔۔۔" وہ کچھ نہیں بولے' محبت اس کے اندر سما رہی تھی' یہ ایک خوش کن احساس تھا' مسٹر ابراہیم آفاق کے جانے کے بعد اس نے ڈوگی کو دیکھا تھا۔

"یہ محبت۔۔۔ یہ سب میرا مزاج تو نہیں' پھر میں محبت کی بات کر رہا ہوں۔" وہ حیران ہوا' ڈوگی اس کے ہاتھ چاٹ رہا تھا' تب ہی ملازم نے آ کر اس کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا۔

"چلیے چھوٹے صاحب پانی گرم ہے' آپ کے کپڑے باتھ روم میں ٹانک دیے ہیں۔"

"شکریہ جمیل صاحب۔" اس نے پہلی بار شکریہ کہا اور جمیل صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی' ایک شکریہ نے ان کی آنکھوں میں چمک بڑھا دی تھی۔

"آپ نہانے کے بعد چائے پئیں گے بابا صاحب۔"

"اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو۔" اس نے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور جمیل مسکرانے لگا۔

"نہیں بابا صاحب آپ کے لیے کچھ کر کے مجھے خوشی ہو گی۔"

"پھر ٹھیک ہے بنا دیجیے گا۔" وہ نہانے چلا گیا اور پھر چائے پی کر اٹھا تو اسے ابراہیم آفاق کی یاد شدت سے آئی تھی' عجیب سی کشش تھی ان کے وجود میں وہ خود ان کے گرد کسی سہارے کی طرح چکر لگاتا تھا' وہ اسٹڈی روم میں تھے' باہر رات پھیل چکی تھی' وہ چپکے سے گیا اسٹڈی روم میں' ان کا سر سجدے میں جھکا ہوا تھا' وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا تھا' پھر جب انہوں نے سلام پھیرا اس نے روٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی نمازیں بڑی لمبی ہوتی ہیں بابا' اور جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو آپ کی توجہ میں کچھ نہیں ہوتا میں بھی غائب ہو جاتا ہوں۔" وہ ہنس پڑے تھے' پھر اس کے چہرے پر کچھ پڑھ کر پھونکتے ہوئے بولے۔

"نہیں تو میں بہت ساری نعمتیں لے کر بہت کم وقت اللہ کے لیے نکالتا ہوں' لیکن وہ پھر بھی قبول کرتا ہے یہ اس کی بڑائی اس کی رحمت ہے۔" پھر آہستگی سے بولے۔

"اور رہے تم تو' تم یہاں ہو اس دل میں اور جو دل میں ہو وہ کبھی کہیں بھی منہا نہیں ہوتے جب دعا کرتا ہوں تب بھی تم اس میں شامل ہوتے ہو۔"

"آپ میرے لیے کیا مانگتے ہیں اللہ سے۔" اسے پتا نہیں کیا دلچسپی ہوئی تھی کہ وہ پوچھے کہ وہ کن لفظوں میں اللہ کے سامنے اسے دہراتے ہیں۔

"میں دعا کرتا ہو میرے بیٹے کا دل اتنا نرم ہو جائے کہ وہ پیڑ پودے کی تکلیف تک محسوس کر سکے۔ اس کا دل اندر سے درویش ہو جائے وہ دنیا تو کمائے' مگر دنیا کا نہ ہو کر رہ جائے' اسے محبت کرنی آجائے اور وہ محبت بانٹے اسے معاف کرنا سیکھنا نہ پڑے' رحم اس کا تعارف بن جائے اور میرا بیٹا چاہے کبھی تو مجھے کبھی نہ

بھلا سکے۔" منصور ابراہیم کا ننھا سا دل بھرے ہوئے گلاس کی طرح چھلک اٹھا تھا' وہ بنا کہے ان کے سینے سے لگ گیا۔

"کیوں کرتے ہیں مجھ سے اتنی محبت' کیا ہوں میں آپ کا کچھ بھی تو نہیں۔" مسٹر ابراہیم نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسائی تھیں' اسے ایک دم سے اسرار حماد پھر سے یاد آ گئے تھے' ابراہیم آفاق نے اسے دیکھا تھا۔

"کوئی یاد آئے بہت دل سے تو اسے دعا بھیجو زندہ ہے تو شاد آباد رہنے کی' دنیا میں نہیں تو دعائے ابدی کرو کہ اللہ اس پر دوسرے جہاں میں آسانیاں اور مہربانیاں عطا کرے۔ روؤ مت رونے سے محبت نمکین ہو جاتی ہے اور جس چیز کو نمک لگ جائے وہ زمین ہو' دل ہو' بنجر ہو جاتا ہے' سمجھے نا' سنو مجھے یاد کرنا تو مسکرانا کہ کیا مزے کے بابا ملے تھے تمہیں۔"

"بابا پلیز ابھی نہ کریں ایسی باتیں ابھی تو ہم ملے ہیں۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ کون یاد آیا تھا تمہیں۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی چھو کر پوچھا اور وہ اسرار حماد کا بتانے لگا۔

"چلو گے اس نیک لڑکے کی قبر پر۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس نے بیگم صاحبہ کے برابر کے فلیٹ پر فون کر کے اسرار حماد کی قبر دریافت کی اس فلیٹ پر ہی اس کی ماں کا کبھی کبھی فون آیا کرتا تھا' تب ہی یہ نمبر اسے حفظ تھا۔ وہ قبر پر کھڑا تھا اور آنسو بھر بھر کے چلے آ رہے تھے۔ اس کو جتنی دعائیں یاد تھیں صورتیں یاد تھیں وہ پڑھتا رہا تھا' پھر چلنے سے پہلے وہ چونکا تھا۔

"اسرار صاحب میں آپ کا کفارہ ہوں' آپ کی جزا ہوں کوشش کروں گا مجھ سے کسی کا دل نہ دکھے۔"

"ایک بہترین وعدہ' ایک اچھا سودا کیا ہے' خاموش موت سے متحرک زندگی کا مجھے تم پر فخر ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔" ابراہیم آفاق نے اسے خود سے لگا لیا' پھر ابراہیم آفاق نے اسے ہاسٹل میں داخل کر دیا تھا' یہاں وہ بہت نپے تلے انداز میں جی رہا تھا کہ کینٹین سے ایک بلی اس کے پیچھے لگ گئی تھی وہ جان کر لنچ ڈنر بچا کر اسے دے دیتا وہ روز تشکر سے اسے دیکھتی' یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا' پھر اچانک اسے وہ بلی نظر نہیں آئی تو بے چین ہو گیا اسے لگا وہ جو ماضی میں کسی بلی سے ایک جھوٹا وعدہ کیا تھا وہ خفا خفا سا ہو کر اس کے ساتھ کر بچے کی طرح آن لگا تھا مجھے ڈھونڈو نا' کہاں ہوں میں نظروں نظروں میں اسے کھوجتا رہا' پھر ایک دن وہ ہاسٹل کی چھت میں پرانے فرنیچر کے بیچ اسے نظر آ گئی' بہت کمزور سی ہو گئی تھی اور پورے پانچ بچے اس کے اردگرد کلبلا رہے تھے' کسی شرارتی اسٹوڈنٹ نے اسے بہت زور سے مارا بھی تھا' اس کا ایک پیر زخمی تھا وہ اسے دیکھ کر غرائی تھی۔

"شش شش میں ہوں کول کول کچھ نہیں۔ صرف میں منصور غور سے دیکھو منصور ہوں بے بی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہمیشہ کی طرح اسے پیار کیا' پہلے وہ غرائی' پھر اس کے ہاتھوں کو سونگھ کر وہ اپنائیت کر کے مطمئن ہو کر لیٹ گئی' پھر وہ روز اپنا کھانا تھوڑا سا بچا کر چھپا کر اوپر لانے لگا' مگر وہ کھانے کو اس وقت تک منہ تک نہیں لگاتی تھی جب تک اس کے بچے کھا نہ لیتے' پھر وہ کھانا زیادہ بچا کر لانے لگا' بلی صحت مند ہوتی گئی' یہاں تک کہ وہ ہفتے کی شب گھر پہنچا تو اس نے سب سے پہلے اسے ہی ڈسکس کیا تھا' ابراہیم آفاق سن کر مسکرائے تھے۔

"آپ کو اس بات سے اس واقعے سے کیا سبق ملا۔"

"یہ ہی کہ وہ جانور ہو کر اپنی بھوک سے لڑتی رہی تھی' مگر اپنے بچے کے آگے سے کھانا نہیں اٹھاتی تھی اس میں کسی انسان جیسی ہی ممتا تھی' بلکہ کہیں کہیں کسی انسان سے بھی بڑھ کر ممتا تھی۔"

"تمہیں اس وقت کوئی یاد آیا ہوگا۔" انہوں نے اسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"آپ کو کیسے پتا چلا مجھے اس وقت کوئی یاد آتا تھا جب میں اپنا کھانا بچا بچا کر اسے کھلانے جاتا تھا۔" آنسو رونے لگی تھی' وہ سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہو کر اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

"تمہیں منصور یاد آ جاتا تھا ان بچوں کی بھوک میں اور تم ایک دم رحم سے بھر جاتے تھے' لیکن تم نے اس واقعے میں کردار کی طرح ہوتے ہوئے کبھی اپنی ماں کی بے بسی کو بھی ایسے ہی فیل کیا تھا۔" وہ اور زور زور سے رونے لگا تھا۔

"یاد آتی تھیں' مگر میں سوچتا تھا یہ بلی انسان نہیں ہے' مگر میری ماں سے زیادہ ممتا کو جانچتی ہے' سمجھتی ہے' وہ بھوکی ہو کر بھی غذا کا ایک ٹکڑا بھی منہ میں نہیں ڈالتی' جب تک اس کے سب بچے کھا کے الگ ہو کر نہ بیٹھ جاتے' بابا وہ بھوک سے بلبلا کر بار بار اٹھتی' اس کا بچہ غراتا' کھانے پر ہاتھ رکھ کر اور وہ اس سے طاقت ور ہو کر بھی کھانے کی طرف سے منہ موڑ لیتی تھی اور بابا بیٹھی رہتی تھی' مجھے تب خود پر ترس آتا تھا کہ میں رضیہ بی بی کی اولاد ہوں' جیسے بچوں اور گھر کے پرانے برتنوں میں فرق نہیں کرنا آتا ہے' جس نے اپنے گھر کا چولہا جلانے کے لیے میری زندگی آگ میں جھونک دی تھی۔" مسٹر ابراہیم آفاق نے اسے دیکھا تو کہا۔

"جب تم چھوٹے تھے تب' کیا تب بھی ماں اتنی ہی ظالم لگتی تھی تمہیں۔" اس نے ایک دم جھٹکے سے انہیں دیکھا اور پرانے دنوں کو ری کال کرنے لگا' اسے لگا اس کی ماں اس بلی سے بھی زیادہ رحم اور ترس کی حق دار تھی جو اپنے ظالم شوہر کی بھوک کو چرا چرا کر کسی برتن' کسی پیالے میں ڈھکا چھپا کر روز ایک جگ سا بڑل گیم کھیلتی اور جب وہ خراٹے لینے لگتا اسے مار پیٹ کر تو وہ دھیرے ـــــ سے اسے اٹھا کر باہر آنگن میں بٹھا کر نوالے بنا بنا کر کھانا کھلایا کرتی تھی اور ایک ہی بات کہتی تھی۔

"جلدی سے بڑا ہو جا نا وے منصورا میرے گٹے گوڈے پٹ پٹ کے خاک ہو گئے' میری مدد کر' میرا سہارا بن وے۔" اور وہ سوئی جاگی حالت میں پیٹ کا دوزخ بھرتا رہتا' پھر ایک دن دوزخ میں ڈال دیا گیا تو اس کی ماں جہنم سے بھی زیادہ بری لگنے لگی۔

"اس نے جو اچھا کیا اپنے لیے کیا' میں نے اسے اس سے زیادہ کما کر دے دیا' میں آٹھ سال سے کما رہا ہوں' پہلے ایک ورکشاپ میں تھا پر مجھ سے بڑے بڑے اوزار نہیں سنبھلتے تھے' تب ہی اماں نے کسی سے کہہ سن کر مجھے حماد صاحب کے ہاں نوکری دلوائی' انہوں نے خالص ممتا کے لیے تو کچھ بھی نہیں کیا بابا جان۔"

"یہ اس کی بدنصیبی' مگر کیا تم چاہتے ہو تم بھی بدنصیبی کا شمار کرو اور ایک لمحے میں جا کر اپنے زیاں پر آسمان زمین ایک کر کے روؤ۔" انہوں نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا تھا' پھر نرمی سے بولے۔

"کبھی سوچا کسی درخت نے اپنا پھول خود کھایا ہو' کسی ندی نے اپنا پانی خود پیا ہو بارش نے اپنی بوندوں کا لطف خود اٹھایا ہو' نہیں نا تو جب وہ مظاہر فطرت ہو کر ایسا ایثار کرنا جانتے ہیں ایسا ایثار کرتے ہیں تو پھر اگر ہزاروں لاکھوں کروڑوں لوگوں میں سے وہ اللہ کسی کو ایسا ہی ایثار ایسی ہی محبت بخشتا ہے تو ہی افضل بات ہے یا کمتر۔"

"افضل بات ہے بابا جان۔" اس نے مدھم سا ہو کر کہا' انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی' پھر کہا۔

"یہ ہی نقطہ سمجھو اللہ ہر دل کو محبت اور محبت بانٹنے کا ہنر نہیں بخشتا' کچھ خاص دل ہوتے ہیں جن کو وہ یہ وصف دیتا ہے' فیض بانٹنے والا بناتا ہے' تمہاری ماں ایک کمزور عورت تھی' اس سے بھی زیادہ ایک کمزور ماں اس نے جو کیا وہ کمزوری میں کیا' اسے معاف کرنا سیکھو جو دنیا میں لوگوں کو معاف کرنا سیکھ جاتا ہے آسمان پر اسے معاف کیے ہوئے بخشے ہوئے لوگوں کے ساتھ پکارا جاتا ہے تم دنیا کے بغض دنیا کی ناراضی کو عقبیٰ پر لٹانے والے کب سے ہو گئے۔"

"میں نے معاف کیا سب کو معاف کیا' اس محبت کی بخشش کے عوض جو مجھے آپ کے ذریعے زندگی نے دی۔"

"کل ہم تمہارے گھر جائیں گے۔"

"جی بابا۔" اس نے سرہلایا تھا، پھر اتوار کو جب وہ گھر پہنچا تھا تو وی وی آئی پی ہو کر رہ گیا تھا، سب، بہن، بھائی، نکھٹو، باپ سب اس کا دم بھر رہے تھے۔ بس ماں نے میلے کچیلے لباس میں اسے سینے سے لگایا تھا۔

"معاف کردے مجھے میں ظالم نہیں تھی، میں تو بس ماں تھی، میری ممتا نے مجھے ظالم بنا دیا ان سب کا منہ دیکھ کر تجھے آگ میں جھونک دیا۔"

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں اماں قسم سے۔" اس نے دل سے کہا۔ پھر ابراہیم آفاق نے انہیں گھر بنانے کے لیے رقم دی، شوہر نے جھپٹنا چاہی تھی، مگر منصور نے ماں کے ہاتھ میں رقم تھمائی تھی۔

"خود کو اکیلا مت سمجھنا، کوئی کچھ کہے تو اس نمبر پر فون کر دینا دیکھ لوں گا میں پھر۔" خاص مڑ کر باپ کو دھمکی دی تھی وہ اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر ہنسنے لگا، پھر تین کمروں کا گھر بن گیا تھا، ایک بہن کی شادی کر دی تھی اور چھوٹے کو کریانے کی دکان کھول دی تھی، گھر کے اندر اخراجات میں توازن آ گیا تھا۔

اب صرف اس کا فون پر ماں سے رابطہ تھا، زندگی بہت سہل تھی کہ اچانک ابراہیم آفاق ہر کام کے لیے تلقین والا رویہ اپنانے لگے تھے۔

"کیوں کرتے ہیں آپ ایسی باتیں۔"

"بس ویسے ہی سوچتا ہوں جو کچھ میرے پاس ہے سب کچھ تمہیں دے دوں۔" اس نے ان کے ہاتھ چوم لیے تھے، پھر ان کی گود میں سر رکھ کر بولا تھا۔

"آپ بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں، روپیہ پیسے کا تول مول نہیں ہے ہمارے بیچ، پھر آپ اور کیا دینا چاہتے ہیں اتنا کچھ تو دے دیا آپ نے بھٹکتا پھرتا تھا ایک سمت دی اتنا مضبوط سہارا دیا پھر اور کیا دیں گے میرے پیارے بابا آپ مجھے۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"کوئی بیج بوئے زمین کی دیکھ ریکھ کرے کونپل سرزمین سے باہر نکالے تو خوشی ہوتی ہے وہ کونپل پودا بنے تو دل جھوم اٹھتا ہے اور وہ پودا تجھ جیسا گھنا سایہ دار شجر بن جاتا ہے تو دل چاہتا ہے اس درخت کی چھاؤں میں کہیں چپکے سے کوئی میری قبر کھود دے اور میں پھر اس گھنے سائے کے نیچے لیٹا رہوں مدتوں اور جب اٹھ جاؤں تو عمل کے توشہ خانے میں سب سے قیمتی کمائی کی طرح تیرا نام لوں اور کہوں حضرت آپ نے جو محبت دی جیسی محبت دی جتنی محبت دی وہ سب میں نے اس پر لٹا دی، اس نے اپنے آنے والوں پر اور محبت کا سلسلہ رکنے نہیں دیا، آسانیاں، مہربانیاں بانٹتا رہا اور اب یہ اور اس کے بعد اس کی نسلیں، پھر مجھے اسی نیکی کے عوض اپنے رحم اپنی بخشش کی مدھ چھکا دیں۔"

"بابا جان نہیں پلیز ابھی نہیں میں ابھی درخت نہیں ہوں آپ کو لگتا ہوں، مگر ابھی عام ہوں کندا نہیں، ابھی جانے کی باتیں نہ کریں۔" جانے کیسے اس کے دل کی بات اس کا دل جان گیا، وہ منت کرنے لگا، خوشامد کرنے لگا، مگر مسٹر ابراہیم آفاق ایک دن ایسے سوئے کہ پھر شکریہ کہنے والا ان کا دل اپنی آواز سمیت حشر تک کے لیے سویا رہ گیا۔ وہ خالی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا تھا۔

"نہیں میرے بابا نہیں مر سکتے، نہیں تو یہ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ۔" ایک نہیں پورے دس ڈاکٹر بلوا لیے تھے اس نے، مگر سب کا ایک ہی جواب تھا۔

"ہی از نو مور۔" ابراہیم آفاق کی تدفین کروائی جانے لگی تھی، تب وہ ان کے چالیسویں کے بعد پہلی بار ان کے اسٹڈی روم میں گیا تھا۔ ان کی درازیں کھولی تھیں، ایک ڈائری ملی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔

"آج پہلی بار نجم السحر نے مجھے کہا میں بہت سنگ دل ہوں، مجھے کسی کی تکلیف پر دکھ نہیں ہوتا، میں نے کہا ہاں میں ایسا ہی ہوں مجھے یہ سڑک پر بھیس بدل بدل کر چلنے والے فقیروں پر واقعی ترس نہیں آتا نہیں — کتنی جھوٹی کہانیوں کے بعد ہم سے پیسے بٹورتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"توبہ کریں ایسا نہ ہو آپ کا دل موم کرنے کے لیے وہ اللہ ہمیں کوئی ایسا غم دے دے کہ پھر عمر بھر ہم سر نہ اٹھا سکیں۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے لگا میرا دل کانپا، مگر پھر اسی طرح سخت ہو گیا، میرے سامنے کوئی روتا تو مجھے اس کے رونے سے بھی زیادہ اس کی وجہ تکلیف سن کر ہنسی آتی تھی، میں سوچتا تھا کہ لوگ کتنی معمولی معمولی باتوں پر رونے بیٹھ جاتے ہیں، حالانکہ جو وقت وہ رو کر گزار رہے ہیں اسی وقت میں وہ اس تکلیف کو دور کرنے میں گزار کر اس تکلیف سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ نجم السحر نے پھر مجھے گھورا تھا۔

"توبہ کریں اور دعا کریں وہ تکلیف دے غم نہ دے تکلیف دور ہو سکتی ہے، مگر غم ساری زندگی دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔"

"ہر وقت یہ میری بیوی توبہ توبہ ایسے کرواتی ہے جیسے مجھ سے زیادہ کوئی گناہ گار نہیں، حالانکہ میں نماز پڑھتا ہوں، کبھی فجر کی، کبھی عصر کی، کبھی ایک ہفتے کسی وقت کی نہیں، مگر اللہ جانتا ہے میں برا انسان نہیں، میں ابراہیم آفاق اور میرا بیٹا بہزاد ابراہیم، ہم تین لوگ یہ ہی ہماری کل کائنات۔"

اس نے صفحہ الٹا تھا، لکھا تھا۔

"بہزاد اب چلنا شروع کر رہا ہے میں نجم سے کہتا ہوں اس کا خیال رکھے، مگر وہ کہتی ہے بچوں کو چوٹیں لگتی رہتی ہیں، لوہا گرم ہو گا تو ہی بڑھے گا نا۔" عجیب لاجک ہے اس کی پہلی بار زندگی میں میں نے دل کو دھڑکا لگتے دیکھا ہے، آج بہزاد بیڈ پر سے گرا تھا، اس کا ہونٹ پھٹ گیا، میں اس پر بہت چلایا تھا اور وہ عجیب بات لے کر آئی تھی۔

"یہ آپ کو درد محسوس کب سے محسوس ہونے لگا۔"

"تو بھلا آپ کی اولاد کو تکلیف ہو تو بھی درد نہ ہو گا۔" میں اس پر بھی خوب جھگڑا تھا۔

آج بہزاد پہلی بار اسکول گیا، میں نے آج پورے دن کی چھٹی کی اسکول میں اس کے لیے گارڈن میں بیٹھا رہا۔ پھر بہت سے صفحے خالی، پھر لکھا تھا۔

"آج نجم السحر مجھے چھوڑ گئی، وہ سچ کہتی تھی دعا کرو تکلیف ملے دکھ نہ ملے تکلیف دور ہو جاتی ہے، مگر دکھ نہیں دور ہو سکتا، دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے، اس کو بھی بہزاد کی گمشدگی دیمک کی طرح چاٹ گئی۔"

پھر لکھا تھا آج میں نے ایک بلی کے بچے کو سردی سے ٹھٹھرتے دیکھا، مجھے ایک دم سے بہزاد یاد آ گیا، وہ بچہ گاڑیوں کے شور گاڑی کے پہیوں کی چرچراہٹ سے بچ کر دبکا ہوا تھا اور میں نے بہت مشکل سے اسے اٹھایا، گھر لایا، میں جیسے جیسے اس کی خدمت کر رہا تھا مجھے لگتا تھا بہزاد کو بھی کوئی ایسا ہی شیلٹر مل گیا ہو گا، کوئی اس کو بھی اسی طرح پھولوں کی طرح سنبھال رہا ہو گا، میں روز دروازے کو دیکھتا ہوں، جیسے یہ بلی کا بچہ میری گاڑی کا ہارن سن کر کہیں بھی ہو دوڑا آتا ہے میرے دل کی سختی پتا نہیں کہاں گئی آج کل میرا دل پانی ہو کر ہر وقت میری آنکھ سے بہتا رہتا ہے، میں لٹا ہوا ہوں، پیسہ پانی کی طرح۔ کہ کسی کی دعا تو مجھے لگے گی، مگر بہزاد واقعی میری آزمائش بنا کر پیدا کیا گیا اور سبق بنا کر مجھ سے چھین لیا گیا، زندگی جنہیں خود سکھاتی ہے بہت سختی سے سکھاتی ہے اور اس نے مجھے سختی سے سکھا دیا تھا۔" ڈائری ختم ہو گئی تھی، وہ ایک پرانی تصویر کو دیکھ کر پھر سے رونے لگا اور ماضی کا جملہ اس میں گونج رہا تھا۔

"میں آپ کو ایک ہفتے میں بھول جاؤں گا۔"

"فی زمانہ یہ ہی دستور ہے، مگر میرا دل چاہتا ہے میری محبت اتنی مضبوط ہو کہ تم ساری زندگی چاہو، بھی تو نہ بھلا سکو۔" وہ اور زور سے رونے لگا تھا۔

"ہائے میرے بابا، میرے بابا۔" اس کی آواز بہت بلند ہو گئی تھی، تب ہی کسی کے کمزور ہاتھوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"ماں صدقے کیوں جی چھوٹا کرتا ہے میرے لعل صبر کر اللہ صبر کو پسند کرتا ہے۔" اس نے کندھے سے سر اٹھا کر دیکھا، وہ ایک غم کو آٹھ برس بعد اسی دل گیری سے منا رہا تھا، جنت بی بی کی آنکھوں میں ترحم تھا، ممتا تھی۔

"یہ میرے بابا ہیں۔" اس نے سوں سوں کرتی ناک صاف کرتے ہوئے جنت بی بی کو اپنے رشتے داری میں

شریک کیا تھا' پھر بہت محبت سے بولا تھا۔

"اتنی ممتا بھری گود کو کس نے ٹھوکر ماری۔" وہ یک دم کھڑے سے بیٹھ گئی تھیں۔

"بس میری اپنی خواری' اپنا بڑبولا پن لے ڈوبا بیٹا' اپنی اولاد پر اتراتی تھی۔ اپنے حالات پر اتراتی تھی کسی کے دکھ درد کو اپنا سمجھ کر تسلی اور ڈھارس کے پھاہے نہیں رکھتی' بس پھر ایک دن گھر کی چھت مجھ پر آن گری' نہ بلو بچا' نہ قمر جلال' نہ صنوبر بس دو شادی شدہ بیٹے اور ایک بیاہی بیٹی رہ گئی تھی یا بہت سارے دھکے جو آج تک دنیا مجھے دے رہی تھی۔ بڑی توبہ کی' بڑی منتیں کی مگر آزمائش دور ہو جاتی ہے سزا دور نہیں ہوتی۔"

"ہو جاتی ہے توبہ سے سزا بھی دور ہو جاتی ہے وہ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے ہم سے' وہ معاف کر دیتا ہے ہماری ہر غلطی' ہر خطا۔"

"ہاں شاید اس نے مجھے معاف ہی کیا ہے' جو تجھ جیسا بیٹا ملا ہے مجھے۔

پر اب کبھی نہیں اتراؤں گی اب کبھی زعم نہ دکھاؤں گی اولاد گھر بار حالت کوئی بھی کبھی بھی اوپر سے نیچے ہو سکتے ہیں۔ ساری چیزیں بس اس کی رحمت پر ٹکے ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا تھا پھر شرارت سے بولا۔

"میری ماں سمجھ دار ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ بتایئے وہ نئی ہاؤس میڈ کیسی ہے آپ کا خوب خیال رکھتی ہے نا۔"

"بہت خیال رکھتی ہے مگر وہ تیرا دوست ہے نا وہ اسے بہت ستاتا رہتا ہے۔"

"اچھا کیا کہتا ہے۔"

"ادھر ادھر کی کہانیاں سناتا ہے جھوٹے سچے قصے اسے کریدتا ہے۔ کبھی تو وہ ٹال جاتی ہے۔ اور کبھی آنسو بھر کر آنکھوں سے اسے خاموشی سے دیکھے جاتی ہے۔"

"اچھا میں خوب خبر لوں گا اس کی آپ فکر نہ کریں۔"

وہ اٹھ گیا تھا پھر موقع دیکھ کر اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"کیوں تنگ کرتا ہے۔ اس معصوم کو ویسے ہی حالات نے اسے بہت ستایا ہے۔"

"معلوم ہے مگر میں تو اسے پھر سے جینا سکھا رہا ہوں۔"

"اچھا جی کیا جانتے ہیں آپ اس کے بارے میں۔" وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔

"یہی کہ متوسط طبقے کی لڑکی ہے ایک بھائی ہے ماں باپ مر چکے ہیں بھابھی نے زندگی اجیرن کر دی اٹھتے بیٹھتے اپنی بیٹیوں کا حق مارنے کے طعنے دینے لگیں تو گھر سے باہر نکل آئی۔"

"یہ تو غلط کیا گھر سے باہر نکل آنا دانش مندی نہیں۔"

"اگر گھر جہنم جیسا لگے تو کیا پھر بھی انسان دریچہ نہ کھولے اور جل کر مر جائے۔"

غیر متوقع اس کی آواز سن کر بدک گیا مگر زین ضیا رفو چکر ہو گیا تھا اور وہ تنہا کھڑا رہ گیا تھا گلا کھنکارتا ہوا۔

"دیکھیے انسان دریچہ کھول کر اپنے گھر میں بھی رہ سکتا ہے میں غلط نیت سے نہیں کہہ رہا صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اکیلی لڑکی کو اچھے لوگ اچھے حالات مل جائیں ایسا ہمارے ڈراموں' پڑوسی ملک کی فلموں میں ہو جاتا ہے وگرنہ حقیقت میں لوگ اکیلی لڑکی کو دیکھ کر فوراً "ہڑپ" کرنا چاہتے ہیں۔ اور موقع ملے تو کر بھی گزرتے ہیں۔"

"تو آپ بھی ایسا ارادہ رکھ سکتے ہیں۔" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"آپ اگر سترہ اٹھارہ سال پرانے منصور سے ملتیں تو شاید میں آپ کے لیے ایسا ہی ثابت ہوتا میں زندگی کی تہ میں اترا ہوں گراوٹ سے ابھر کر آیا ہوں تبھی سچ بول رہا ہوں' تبھی تلخ حقیقتوں کی بات کر سکتا ہوں میری باتیں کتابی خود بیتی باتیں ہیں۔"

"ہا۔ آپ اور زندگی کی تلخ سچائی اتنے آرام و سکون سے کھڑے ہو کر کہہ رہے ہیں میں بھی پیالی میں طوفان اٹھانے کی بات کر سکتی ہوں مسٹر منصور۔"

وہ ایک لمحے کو چپ ہوا تھا پھر آہستگی سے بولا تھا۔

"کتنا زہر ہے زندگی کی طرف سے آپ کے دل میں بھی تو دیکھوں۔"

"میں اپنے دکھ ہر ایک کے سامنے نمائش کی طرح نہیں سجاتی۔" وہ روکھے لہجے میں بولی اور وہ مسکرا دیا۔

"چلو جب تمہیں لگے دکھ اندر نم بڑھاتے جا رہے ہیں کوئی جذبہ ہے' جو کبھی تمہاری سب سے بڑی طاقت تھا اور اب تمہارے لیے غیر ضروری لفظ بن گیا ہے تو مجھے بتانا مجھے دلوں کو جوڑنا آتا ہے یا نہیں مگر ٹوٹے ہوئے دلوں کو دیکھ کر میرا ایک سانس کم ہو جاتا ہے۔"

"ٹوٹے ہوئے دل۔" وہ طنز سے ہنسی۔ پھر بولی۔

"شاید یہ ٹوٹے ہوئے دل صرف کچھ خوبصورت لڑکیوں کے دلوں کے علاوہ کیا ہوں گے مسٹر منصور۔"

"ہاں یعنی آپ خوش گمانی رکھتی ہیں کہ۔ آپ خوبصورت ہیں۔" وہ محظوظ ہوا تھا اور وہ جز بز ہو کر بولی تھی۔

"نہیں میں جانتی ہوں میں خوبصورت نہیں اس لیے کہہ رہی تھی مجھ پر اپنا وقت مت برباد کریں آپ۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اچھا ہے انسان غلط فہمی کی بجائے کوئی خوش فہمی پال لے دن اچھے خوبصورت اور بھرپور ہو جاتے ہیں۔"

"مجھے بے رنگ پھیکے دنوں میں سانس لینے کی عادت ہے منصور صاحب۔"

"بے رنگ پھیکے دن سچ بتایئے جب اکیلی ہوتی ہیں تو کوئی یاد نہیں آتا آپ کو۔"

اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

"نہیں مجھے کوئی یاد نہیں آتا یاد ہائی سے الگ کر لیا ہے خود کو' میری کوئی احتیاج نہیں کیوں کہ ضرورت ہو خواہش ہو صرف زندہ افراد کرتے ہیں۔ ادھر دیکھیے کیا میں آپ کو زندہ لگتی ہوں۔"

اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر نرمی سے بولا۔

"ایک دفعہ میں بابا کے ساتھ الیکٹرک سٹی کا کام کر رہا تھا۔ سارے تار الگ پڑے تھے مجھے ایسا ہی لگا ان میں کوئی برقی لہر نہیں اٹھ سکتی میں نے نظر بچا کر صرف اداکاری کرنے کے لیے ایک تار کو پکڑا اور چیخیں مارنے لگا بابا سمجھے ــــــ میں مذاق کر رہا ہوں مگر مجھے واقعی بجلی نے پکڑ لیا تھا بابا نے دستانے پہن کر پلاس کی بجائے ہاتھ سے تار کھینچ کر مجھے بچایا تھا میں اور وہ بہت دور جا کر گرے تھے پھر بابا ہنستے رہے تھے دیر تک میری تو سانس ہی بحال نہیں ہوئی تھی پھر میرے سینے پر سر رکھ کر بولے تھے کیا تجربہ ملا اس حادثے سے' تو میں نے کہا جب ہمیں لگتا ہے بجلی کی کوئی لہر نہیں ہے تب بھی کبھی کبھی کسی باریک سے تار کا کوئی سرا برقی رو سے انگارہ جاتا ہے' جو کبھی بھی ایک اچانک اور حیرت بھرا جھٹکا دے کر ہمیں احساس دلاتا ہے تبدیلی کبھی بھی کہیں سے بھی کسی بھی طریقے سے کرنٹ مار سکتی ہے کیا سمجھیں آپ۔" نور العین نے اسے حیرت سے دیکھا تھا وہ کیا کہہ گیا تھا وہ سوچتی رہی تھی پھر ایک ماہ کے بعد کی بات تھی وہ ایک کونے میں کھڑی تھی۔ جب بہت اچانک زین ضیا اماں جی کو اپنے اور اس کے حوالے سے قصہ سنا رہا تھا۔

"بہت برا انسان تھا میں ہارڈ ڈرنک کیا کرتا تھا اس دن مجھے میری اسی عادت کی وجہ سے زیادہ ادھار لینے اور واپس نہ کرنے پر میرے دوستوں نے مل کر خوب مارا تھا ان کا خیال تھا میں ان کا کبھی ادھار واپس نہیں کر سکتا تھا۔ سو سب نے دل کی بھڑاس نکالی تھی پھر وہ سب چلے گئے اور میں کپڑے جھاڑ کر بے غیرتی سے اٹھا تھا مجھے اس طرح کی پٹائی کی عادت پڑ گئی تھی میں سڑک پر گاڑی کو زگ زیگ چلا رہا تھا کبھی سیدھے چلتے چلتے غلط ٹرن لے بیٹھا اور اسی وقت ایک بچہ میرے سامنے آ گیا وہ نوجوان اچانک آیا اور بچے کو بچا لے گیا مگر میری گاڑی کی تیزی نے اسے ہرٹ کر دیا وہ شدید زخمی لگ رہا تھا اور شکل سے کسی اچھے گھر کا میں نے بعد کی الجھنوں سے بچنے کے لیے اسے گاڑی

میں ڈالا اسپتال لے گیا اس کے کارڈ کے ذریعے اس کا ملازم آگیا پھر پولیس وغیرہ کا کھاتہ کھلا اور اسے طبی امداد دی جانے لگی۔"

"یہ حادثہ ہوا کیسے؟" وہ مجھ سے سوال پوچھ رہے تھے اور اب میں گھبرا گیا تھا کیوں کہ اسپتال کے باہر گاڑیوں کی لائن لگ گئی تھی ہر طبقہ فکر کا شخص اس کے حادثے کی خبر سن کر اسپتال دوڑا چلا آیا تھا اور میں تھا کیا؟

صرف ایک بینک کرپٹ کیشیئر۔ میری گاڑی لون پر نکلوائی ہوئی تھی جس کے لیے مجھے دوبار لیگل نوٹس مل چکے تھے میں معطل تھا میری انکوائری چل رہی تھی اور اب اتنے بڑے بندے کو اڑا ڈالا تھا۔ میں مسلسل چپ تھا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا آج مجھے یاد آرہا تھا کہ ماں اور اس کی دعائیں کتنی بڑی ڈھال ہوتی ہیں انسان کی، پورے آٹھ گھنٹے بعد اسے ہوش آیا تھا اور اس نے اتنا غیر متوقع بیان دیا تھا کہ میں واقعی سر نہیں اٹھا سکا تھا۔

"میں نے ہارڈ ڈرنک لی ہوئی تھی اور بہت اچانک گاڑی کے سامنے آگیا اسی وقت ایک بچہ بھی مخالف سمت سے آرہا تھا یہ شخص ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بچا سکتا ہے اور اس نے بہتر فیصلہ کیا اور بچے کو بچا لیا اور میں زخمی ہو گیا یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔" بیان قلم بند ہو چکا تھا واقعی یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا مگر اس کی کہانی من گھڑت تھی مگر سب نے چپ سادھ کر میری طرف دیکھا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو، الجھے ہوئے بال، گندے مندے حلیے میں، میں بہت زیادہ برا لگ رہا تھا۔ میں سوٹڈ بوٹڈ لوگوں کے درمیان اس حلیے میں اکیلا کھڑا تھا اس لیے بہت برا لگ رہا تھا۔

سب آہستہ آہستہ جانے لگے تھے تب میں کھڑا رہ گیا تھا اس نے مجھے نظروں میں تولا تھا اور پھر دوسری صبح پوچھا تھا۔

"تم کیوں پیتے ہو۔"

"غم بھلانے کے لیے۔" اس نے ہولے سے میرا ہاتھ تھاما اور بولا۔

"مگر نشے میں ڈوب کر تمہیں نہیں لگتا انسان سارے دکھ بھی یاد کر کے رونے لگتا ہے جن دکھوں کا غم منانا اس پر جائز بھی نہیں تھا اپنے آج کو اپنے گزر جانے والی کل پر قربان کرنا عقلمندی تو نہیں۔"

"تمہیں دکھ نہیں تبھی تمہیں ایسا لگتا ہے اگر میری زندگی جیو تو پتا چلے دکھ کیا ہوتے ہیں۔"

"انہیں جینا کیا ہوتا ہے؟"

وہ ہنس پڑا۔

"اچھا بتاؤ تمہارے کیا کیا دکھ ہیں؟"

"میں نے کہا میں معطل ہوں مجھے آدھی تنخواہ ملتی ہے میری انکوائری چل رہی ہے مجھ پر بہت سارا ادھار ہے میرے سارے دوست مجھ سے خفا ہیں میرا کوئی نہیں ہے نہ ماں نہ باپ نہ بہن نہ بھائی۔"

"بس یہی دکھ ہیں تمہارے۔" اس نے اس اطمینان سے کہا میں نے حیرت سے اسے دیکھا میرے دکھوں کو اتنا کم تر کیوں سمجھ رہا ہے۔ اور اس نے میرے ہر دکھ کے بخیے ادھیڑنا شروع کر دیئے۔

"تم نے غبن کیا اس میں کس کی غلطی تھی۔ تمہیں آدھی تنخواہ مل رہی ہے کبھی پوری بھی ملتی تھی تب شکر کیا تھا اگر یہ آدھی بھی نہیں ملتی تو اس شکر کیا۔؟

تم جب بہت اچھا کماتے تھے کیا کبھی اللہ کی راہ میں کچھ دیا تھا تم نے؟ تمہیں دینا اس پر واجب نہیں پھر بھی اس نے تمہیں نہ دینے سے تمہارے اچھے وقت میں ناشکری پر ہاتھ روکا اپنا نہ اب ہاتھ روکا؟ دوست تھے کیا تم بھی ان کے واقعی دوست نہیں تھے آج غم کر رہے ہو کہ وہ تمہارے اچھے دوست نہیں تم سے ناراض ہیں۔

جب تمہارے ماں باپ تھے تو کیا تب بھی تم نے انہیں ایسے ہی دل سے یاد کیا' تڑپ کر ان کی کمی محسوس کی جیسے اب کر رہے ہو؟

کیا واقعی اب تک جو تم سروائیو کر رہے ہو واقعی تمہارا کوئی نہیں ہے۔

کیا واقعی کوئی ایسا جس نے تمہیں تھام رکھا ہے۔

جو تمہیں گرنے نہیں دیتا جو راستہ نکال ہی لیتا ہے کہیں نہ کہیں سے تمہیں بچانے کا۔" اس کے سارے سوال ایسے تھے کہ میں اک سوال کا جواب بھی نہیں دے سکا تھا پھر اماں وہ ٹھیک ہو گیا۔ مگر میرا اس سے رابطہ یوں ہی رہا میں جب چاہتا اس سے ملنے اس کے آفس چلا جاتا اس کے گھر چلا جاتا اور آفس میں وہ دھیرے دھیرے کسی نا کسی معاملے میں مجھے پھنسا کر خود صاف بچ جاتا پھر چھ ماہ بعد مجھے پتا چلا وہ اس طرح میری اکاؤنٹس میں شد بد چیک کر رہا تھا اس نے میری انکوائری ختم کروادی تھی اپنے اثر رسوخ سے اور اپنی کمپنی میں "سی ای او" بنا دیا تھا۔

میں ہارڈ ڈرنک اب بھی کرتا تھا وہ اب کبھی کبھی میرے گھر بھی آنے لگا تھا اس دن بھی وہ آیا تھا اور میں نے اس کی گاڑی کا ہارن سن کر ہی بوتل بیڈ کے نیچے چھپا دی اور باتھ روم میں بہترین سے ماؤتھ واش سے کلیاں کرنے لگا وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور میرا دل دھک دھک کر رہا تھا میں اس کو کیسے فیس کروں گا مگر وہ آرام سے آکر میرے بیڈ پر بیٹھ گیا وہ اپنے کی رنگ کو بار بار ہوا میں اچھالتا اور رنگ پکڑ لیتا پھر اچانک اس کے ہاتھ سے رنگ کارپٹ پر گر گئی ۔۔۔ اس سے پہلے میں جھکتا وہ جھک گیا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"سوری میں غلط وقت پر آیا تم شاید پی رہے تھے۔"

میں نے ہونٹ کھولنے چاہے تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"پلیز یہ مت کہنا میں آج سے پینا چھوڑ دوں گا یا میں نے پینا چھوڑ دیا ہے۔ پہلی حالت میں تمہارے اعصاب پر بوجھ رہے گا اور تمہیں میں دوست کی بجائے عذاب لگوں گا جو تمہاری مرضی کے خلاف اپنی مرضی پر چلانا چاہتا ہے۔ اور چھوڑ دی ہے کہو گے تو تم کبھی سچ نہیں بول سکو گے اور جو لوگ جھوٹ بولنا سیکھ جائیں وہ اپنی زندگی کو کبھی بدل نہیں سکتے اور میں چاہوں گا تم خود کو اپنی مرضی سے بدلو جب چاہو جیسے چاہو۔"

"جھوٹ بولنے والے اپنی زندگی کو کبھی بھی کیوں

بدل نہیں سکتے منصور۔" میں اس کے سامنے بیٹھے گیا تھا تب اس نے حلاوت سے کہا تھا۔

"میرے بابا کہتے ہیں ہم ہمیشہ اس وقت بدلتے ہیں جب ہم خود سے سچ بولتے' خود سے سچ کہنے والے لوگ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا جانتے ہیں اور بدلاؤ تبھی آتا ہے جب ہم غلطی کا اعتراف کرتے ہیں ورنہ نہیں آتا ساری دنیا بھی ہمیں مل کر نہیں بدل سکتی۔" پھر یوں میں بدلتا گیا اور اب میں آپ کے سامنے ہوں اماں نے اسے گلے سے لگالیا اور نور العین وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔

"سچ بتائیے کیا کبھی آپ کو اکیلے میں کوئی یاد نہیں آتا۔"

اس کا سوال اس میں گونجنے لگا اور وہ گارڈن سے ہوتی ہوئی اس کے آوٹ ہاؤس کی سمت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں وہ کبھی کبھی دفتر کا اضافی کام بیٹھ کر کرتا تھا یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جہاں ایک سائیڈ کاؤنٹر پر الیکٹرک کیٹل رکھی تھی کافی کا سامان تھا ایک چھوٹا سا بیڈ روم فریج تھا اور ریک میں ترتیب سے رکھی ہوئی فائلیں ایک آفس ٹیبل انرجی سیور جو عین ٹیبل کے اوپر روشنی نچھاور کر رہا تھا اور اس وقت وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہوا اپنے آئی پوٹ پر نیو نور کے پرانے سونگ سن رہا تھا۔

ٹیبل پر رکھی ہوئی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی وہ کھڑی ہو کر اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے سوچا وہ شاید اس کی تنہائی میں مخل ہو رہی ہے تبھی اس کے پیروں نے ہلکی سی مڑنے کی جنبش کی اور اس کی بھاری آواز کمرے کی پہنائی میں گونج کر رہ گئی۔

"کیوں آپ بتائیں گی نہیں کہ جب آپ اکیلی ہوتی ہیں تو آپ کو کون یاد آتا ہے؟"

"بڑے بھیا مجھے بڑے بھیا بہت یاد آتے ہیں۔" وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور آنسو تواتر سے اس کی آنکھ سے گرنے لگے تھے۔

"تمہیں کیڈبری بہت پسند ہے نا۔"

اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گلابی رنگ واقعی تم پر بہت کھلتا ہو گا۔"

"آپ کو کیسے پتا مجھے کیڈبری پسند ہے یا گلا رنگ۔"

"جب تم میں کوئی جذباتی لہر اٹھتی ہے تو تمہا ناک کی نوک پر ہلکی ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اگر تمہیں گرما کافی نہ ملے تو ایک دم سے تمہارا سانس چڑھنے لگا بجلی کی تیزی سے اٹھا تھا اور اس نے بنی ہوئی کافی کو گرم دودھ سے پھر سے تازہ کیا تھا۔

"یہ پی لیں ابھی بہتر محسوس کریں گی۔" اس مسحور انداز میں کافی کو ہونٹوں سے لگالیا تھ

"آپ کا ان ہیلر ختم ہو گیا تھا یہ میں نے منگو تھا۔" اس نے دوا کو اچھال کیا تھا اور حیرت سے ا دیکھے جا رہی تھی۔

اور اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو بس ہیں صرف ہم ہی محبت کرنا جانتے ہیں صرف ہم محبت کر رہے ہیں ہم دوسرے فریق کو ایک دم محبت کی اس ریس سے نکال کر باہر کھڑا کر دیتے اور یہ ہم اس پر ہی نہیں خود پر بھی ظلم کرتے ہیں اندر ہی اندر ایک سیل بنا لیتے ہیں پھر اس میں کوئی اور دریچہ بھی نہیں رہنے دیتے اور پھر الزام دیتے کہ کوئی ہمیں منانے ہی نہیں آیا۔"

"میری بھابھی ایک خود غرض عورت ہیں۔" نے کہانی کی پہلی لائن سنائی اور پھر بولتی چلی گئی۔ وا رہا ایک لفظ نہیں بولا اور پھر جب وہ چپ ہوئی تو نے ٹیبل کے نچلے خانے کو کھول کر بہت سا چاکلیٹس ٹیبل پر لا رکھیں۔ آٹھ نو سوٹ پڑے اور وہ سارے کے سارے پنک کلر میں تھے۔

اس کی آنکھیں اس پر آن جمی تھیں۔

"یہ۔ یہ کس نے دیے ہیں میرا مطلب ہے کے پاس کہاں سے آئی ہیں۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا تھا۔

"خود چھو کر اندازہ کریں یہ کون بھیج سکتا ہے

محبت کس کا دل لٹا سکتا ہے آپ پر۔"

"بڑے بھیا۔" اس نے چاکلیٹ کو چھوا پھر رونے لگی۔

"یہ صرف میرے بڑے بھیا ہیں اور کوئی نہیں کر سکتا اتنی محبت۔"

"پھر یہ محبت سنبھال کر رکھیے اسے ضائع کیوں کرتی ہیں اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں انسان کو برے ترین لوگوں میں بھی اچھے طریقے سے رہنا آنا چاہیے مس نور۔ اسے ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ گھر سے نکلی ہوئی عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ دونوں حالتوں میں دنیا کے لیے چٹخارے سے زیادہ نہیں یہ این جی اوز یہ بے سہارا لڑکیوں کو سہارا دینے کے جتنے دعوے کرنے والے ادارے ہیں میں انہیں کنڈم نہیں کرتا مگر ان کی حمایت بھی نہیں کرتا کیوں کہ گھر سے بڑھ کر آپ کی پناہ گاہ کہیں نہیں ہے کوئی نہیں ہے۔"

وہ ساری چیزیں سمیٹ کر چلی گئی تھی تب بہت اچانک زین ضیا کمرے میں در آیا تھا۔

"تو کسی جنم میں بد روح رہا ہو گا کتنی جلدی تو نے اس کے این آئی سی سے گھر کا پتا لے کر اس کے بھائی سے دوستی گانٹھ لی ان کا دل اس کی طرف سے صاف کرتا رہا وہی بیس سال پرانی محبت کو جگاتا رہا اور آج اچانک گرم لوہے پر چوٹ کی۔"

"ہاں کیونکہ مجھے پتا تھا وہ لڑکی ہے اور محبت کا ایک واسطہ دوں گا تو فوراً" پگھل جائے گی یہ لڑکیاں بڑی معصوم' بڑی کمزور ہوتی ہیں نہیں ہوں تو اور بھی آسانی سے محبت سے ٹریپ ہو سکتی ہیں۔"

"تو نے اسے محبت سے ٹریپ کیا ہے یا۔۔۔" وہ اس کے قریب ہوا اور وہ مسکرایا۔

"میں نے اسے محبت کا ایک الیکٹرک شاک دیا ہے کیبل فالٹ ضرور تھا اندر مگر برقی رو ختم نہیں ہوئی تبھی اتنی آسانی سے مان گئی۔"

"سچ بتا یہ چاکلیٹ اور سوٹ اس کے بھائی نے بھیجے تھے۔"

اس نے شرارت سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ہاتھ بہت تنگ ہے بے چارے کا کہاں سے بھیجتا محبت بہت کرتا ہے مگر جتا نہیں سکتا اس کی بیوی بڑی کھڑوس ہے یار۔"

"کتنا خرچہ ہو گیا۔"

وہ ہنس پڑا پھر بولا۔

"بس کر دے کبھی تو اپنے حساب کتاب سے باہر نکل آیا کر بس سمجھ لے محبت نے محبت کو جیتا ہے ورنہ قیمتی سے قیمتی تحفہ بے کار ہے اگر دل سرد مہری پر اتر آئے۔"

"اچھا جی بڑی دل کی زبان آتی ہے پھر ٹانکا کیوں نہ بھڑا یا بجی کے ساتھ۔"

اس نے گھور کے اسے دیکھا۔

"تجھ پتا تو ہے میں ذرا او کھرے طریقے کا مرد ہوں محبت شادی میرے لیے ذرا الگ طریقے کی بات ہے

درد آشنا

لبنیٰ طاہر

تیری طرح نہیں کسی لڑکی نے مسکرا کر بھی دیکھ لیا تو تجھے اس پر مدتوں محبت کا گماں رہے۔"

"ہاں دیکھتا ہوں کس لڑکی کو پسند کرتا ہے تو۔"

"پسند کرلی میری جان۔"

"کون؟ یہی نور العین نا۔"

"نہیں نور العین جیسی نیک روح کو تو کسی نیک انسان کو ہی حباء کرنا چاہیے تھا سو میں نے اس کے بڑے بھیا کو کاشان افتخار سے ملوادیا ہے۔

"کاشان افتخار وہی بیرسٹر کاشان۔ ارے یہی اپنا کاشان۔" اسے حیرت ہوئی تھی اور وہ مزید بولا تھا۔

"ہاں وہی کاشان' افضل صاحب کو یہ رشتہ پسند آیا ہے۔ سو بہت جلد رسمی کارروائی پھر مٹھائی پھر سگائی اور پھر بینڈ باجے بارات۔"

"اور یہ تیری کون دلہن ہے یہ بتا۔"

"سونیا عبدالرحمان۔" اس نے دھماکہ کیا اور وہ واقعی اچھل پڑا۔

"کیا سونیا عبدالرحمان وہ تیری اماں کی چوائس تیری خالہ کی بیٹی وہ ان پڑھ پاگل ہوگیا ہے اپنے آپ کو دیکھا ہے کتنا ڈیسینٹ سا ہے وہ تجھ سے میچ نہیں کرتی۔"

وہ رکا پھر بولا۔

"تجھے تو کسی نور العین جیسی لڑکی سے شادی کرنا چاہیے۔"

"اچھا اگر سب مکمل باکمال لڑکیوں سے شادی کرنے لگیں تو سونیا جیسی لڑکیاں کہاں جائیں گی۔ ویسے میں یہ بتادوں میں اس سے ہمدردی میں شادی نہیں کررہا بس اس کے اندر دو عادتیں ایسی ہیں جو مجھے بہت پسند ہیں اس لیے اس سے شادی کررہا ہوں۔"

"اس میں کوئی اچھی عادت بھی ہے۔" طنز سے اس نے اسے دیکھا تھا۔

"کیا برائی ہے اس میں۔" اس نے اس کا دفاع کیا تھا۔

"کیا اچھائی ہے اس میں ایک نمبر کی ال منڑ چھچھوری سی ہے۔"

شوخ و چنچل سی ہے بس پاگل تجھے اس لیے ایسا فیل ہوتا ہے۔" وہ اپنی بات پر اڑا رہا تھا۔

"اچھا وہ عادتیں بتا جس کی وجہ سے تجھے وہ پسند ہے۔"

اس نے اس کی طرف دیکھا پھر دھیما سا ہو کر بولا۔

"سارے گھر کے لوگ محبت اور ناجانے کون کون سے جذبے اس سے نتھی کررہے تھے جو وہ میرے لیے فیل کرتی تھی مگر جب میں نے کہا سچ بول کیا واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے تو وہ بولی "اللہ دی قسمیں نہیں مجھے بس اچھے گھر میں رہنا بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومنے کا شوق ہے سچی سے ایمان سے" اور جو سچا ہو نا اسے آرام سے اپنے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں کافر کو مسلمان کرنے میں دقت ہوتی ہے مگر کسی مسلمان کو مومن بنانے میں کم محنت درکار ہوتی ہے۔"

"دوسری خوبصورت ترین عادت؟" اس نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

"اسے بچے بہت پسند ہیں یہی وجہ ہے اس نے میرے چلڈرن ہوم سے بچے اڈاپٹ کرنے کو ایشو نہیں بنایا اور ان بچوں سے ابھی سے دوستی گانٹھ لی۔ مجھے تو وہ ایک دم گڈ لگتی ہے۔"

اور سونیا عبدالرحمن جو باہر کھڑی تھی اور آج بچوں کے ساتھ منصور ابراہیم کے۔ پروگرام کے تحت رات کو ڈنر پر جانے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی ایک دم سے مسمریز ہو کر رہ گئی بہت سارا نمکین پانی اس کی آنکھوں میں بھر آیا تھا مگر یہ خوشی کے آنسو تھے وہ خوشی جس نے ابھی اس کے دروازے پر دستک دی تھی اور جس نے ابھی اسے سرتاپیر بدلنا تھا اور اسے بدل جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

زندگی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور آگے بڑھ گئی دیئے کے اندر دیا جل اٹھا تھا پھر روشنی کو کون تھا جو روک سکتا تھا۔

☆ ☆

وہ شام کو آفس سے لوٹی تو ہمیشہ کی طرح اس کی چار سالہ بیٹی سارا اسے گیٹ کے باہر اپنی منتظر ملی وہ تمام دن آفس میں اپنی بیٹی کے بغیر بہت بے کلی میں وقت گزارتی تھی اور شام کو اسے دروازے پر اپنا منتظر دیکھ کر اس کی سارا دن کی کلفت دور ہو جاتی تھی وہ تیز تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاپرز دوسرے ہاتھ میں منتقل کر کے اس نے سارا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اس کے گلابی گالوں کو چومتے ہوئے وہ اندر چلی آئی سامنے ہی امی تخت پر بیٹھی تھیں انہیں سلام کر کے وہ سارا کو لیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"کیسا گزرا میری گڑیا کا آج کا دن۔؟" اس نے سارا کو گود سے اتار کر بیڈ پر بٹھا دیا اور اپنا پرس اور شاپرز ایک طرف رکھ کر سارا کی جانب دیکھا "بالکل بور۔۔۔ آپ کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا مزا ہی نہیں آتا مما۔" سارا نے منہ بسور کر جواب دیا۔

"مجھے بھی مزا نہیں آتا جانو۔۔۔ مگر مما کا آفس جانا ضروری ہے نا۔" وہ اس کے سلکی بالوں کو سہلا کر بولی۔

"کیوں مما؟ سعدی اور مشعال کی مما تو آفس نہیں جاتیں پھر آپ کیوں جاتی ہیں آپ بھی مت جایا کریں مجھے آپ کی بہت یاد آتی ہے۔" وہ اس طرح کے معصوم سوال اکثر ہی کرتی تھی ان معصومانہ سوالوں کے وہ کیا جواب دیتی بس اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیتی تھی اور اپنی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتی۔

اسے کب شوق تھا کہ وہ سارا دن گدھوں کی طرح محنت مشقت کرتی اور اپنی بچی کی جدائی برداشت کرتی جتنی دیر وہ آفس میں رہتی اس کا سارا دھیان اپنی بیٹی میں اٹکا رہتا بار بار گھڑی دیکھتی کہ کب پانچ بجیں اور وہ اُڑ کر سارا کے پاس پہنچے اس کی زندگی کی واحد خوشی اس کی بیٹی ہی تو تھی اس کے دم سے ہی تو اس کی کائنات میں کچھ رنگ تھے ورنہ تو جانے والا زندگی کی ساری رنگینیاں اپنے ساتھ ہی لے کر چلا گیا تھا۔

تین سال پہلے وقت کا بے رحم وار اس کی مانگ سونی کر گیا تھا ایک حادثے نے اس سے اس کا محبوب شوہر چھین لیا تھا صرف ڈھائی سال ہی تو ہوئے تھے اس کی شادی کو اور سال بھر پہلے وہ ماں بنی تھی کتنی خوبصورت اور مکمل کائنات تھی اس کی 'جان نچھاور کرنے والا ساتھی اور گڑیا جیسی بیٹی مسرتیں اور خوشیاں ہر دم اس کی ہمرکاب تھیں اب سوچتی تھی تو لگتا تھا کہ زندگی وہی تھی جو اس نے عمر کی ہمراہی میں گزاری تھی صرف ڈھائی سالہ ازواجی زندگی میں اس نے اپنی پوری زیست جی لی تھی ساری حیات کی محبت پالی تھی عمر نے اسے کچھ ایسے والہانہ پن سے چاہا تھا کہ وہ سوچتی تھی کہ شاید ہی کسی نے کسی کو اس شدت سے چاہا ہو گا اسی لیے تو ان کے جانے کے بعد اس کے اندر کا خالی پن تین سال گزر جانے کے باوجود رتی برابر بھی کم نہ ہو سکا تھا وہ تو شاید مر ہی گئی ہوتی اگر سارہ کا ننھا وجود اس کی ڈھارس بندھانے کو نہ ہوتا اسے زندہ رہنا تھا اپنی بچی کے لیے باپ کی شفقت سے تو ننھی جان محروم ہو ہی گئی تھی سوائے اس معصوم کے لیے باپ کا کردار بھی ادا کرنا تھا اور وہ کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیوہ ہونے کے بعد عدت گزار کر وہ اپنے والدین کے گھر چلی آئی تھی ساس سسر تو اس کے تھے نہیں عمر کے بہن بھائی تھے جو سب شادی شدہ تھے وہ عمر کے ساتھ جس گھر میں رہتی تھی اس کے اوپر والے پورشن میں عمر کے بڑے بھائی اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے انہوں نے تو کہا بھی کہ زیبی چاہے تو ساری زندگی اپنی بچی کے ساتھ اس گھر میں رہ سکتی ہے وہ بہت خیال کرنے والے نیک فطرت انسان تھے ان کی بیوی بھی محبت کرنے والی عورت تھیں مگر زیبی یہاں رہتی تو شاید یادیں اسے مار ڈالتیں عمر کے بغیر یہ گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا اسے لگتا جیسے یہ دیواریں اسے پیس ڈالیں گی عدت کا عرصہ اس نے بدروحوں کی طرح اس گھر میں گھومتے پھرتے گزارا تھا اسے ہر طرف عمر نظر آتے تھے وہ ان کے عکس پر دیوانہ وار لپکتی تھی اور انہیں نہ پا کر بے دم ہو کر ہانپنے لگتی اس کی امی جو اس کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت کڑھتی تھیں اس لیے عدت ختم ہونے کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں اس گھر میں آ کر اس کی دیوانگی والی کیفیت میں کافی حد تک کمی آ گئی تھی پھر گھر کے افراد اس کا ہر وقت دل بہلانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اس کے بڑے بھائی جو شادی شدہ تھے ان کے دو بچے بھی تھے جن کی وجہ سے گھر میں رونق رہتی تھی بھابھی بھی ہر وقت اس کی دلجوئی میں لگی رہتیں پھر ایک بھائی اس سے چھوٹا تھا جو اپنی دلچسپ باتوں اور شرارتوں سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتا رہتا تھا اور ماں باپ تو تھے ہی اس کے سب سے بڑھ کر خیر خواہ امی تو اپنی اکلوتی اور خوبصورت بیٹی کو اس کم سنی میں بیوگی کی حالت میں دیکھتیں تو ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ابو کو بھی اندر ہی اندر اس کا دکھ کھائے جاتا کتنے نازوں سے پالی بیٹی تھی اور اس چھوٹی سی عمر میں کتنے بڑے دکھ میں گھر گئی تھی۔

ان کا بس چلتا تو کہیں سے بھی اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں لا کر اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے گھر والوں کی محبت اور توجہ نے اسے بہت سنبھالا دیا تھا اور پھر سارہ کا ننھا وجود تھا جسے دیکھ کر اس کے اندر جینے کی تحریک پیدا ہوتی تھی عمر کی یادوں اور سارا کو سینے سے لگائے وہ زندگی کے دن پورے کر رہی تھی سارا تھوڑی سی اور بڑی ہوئی تو اس نے ضد کر کے جاب شروع کر دی تھی حالانکہ امی اور بڑے بھیا نے اسے بہت منع کیا تھا مگر ابو نے اس موقع پر اس کا ساتھ دیا تھا اور اسے نوکری کرنے کی اجازت دی تھی۔

وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح نا صرف وہ مصروف ہو جائے گی بلکہ اپنی اور ۔۔۔ بیٹی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو احسن طریقے سے پورا بھی کر سکے گی ایسا نہیں تھا کہ اسے اس گھر میں کسی قسم کی کوئی کمی تھی اس کے گھر والے اس کی ضروریات کا پورا خیال رکھتے تھے اس کے باوجود وہ چاہتی تھی کہ وہ خود نوکری کر کے گھر والوں کا کچھ بوجھ کم کر سکے یوں بھی مہنگائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے وہ کسی کے دست نگر رہے یوں وہ نوکری کرنے لگی صبح سے شام تک کی سارا سے جدائی اسے کٹھن تو لگتی تھی مگر اپنی بچی کے بہتر مستقبل کے لیے وہ یہ کڑوا گھونٹ پی رہی تھی۔

امی کو اس کا اس طرح صبح سے شام تک محنت کرنا سخت کھلتا تھا ان کی تو خواہش تھی کہ وہ پھر سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لے بلکہ یہ خواہش گھر کے ہر فرد کی تھی لیکن وہ اس بات کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔

دوسری شادی کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی عمر کی محبت تو آج بھی اس کے دل کے طاق پر چراغ کی طرح جلتی تھی کسی بھی لمحے اس کی لو مدھم نہ ہوئی تھی وہ کیسے کسی اور کو اپنے دل میں جگہ دے سکتی تھی اس نے امی کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس بارے میں سوچیں بھی نہیں مگر وہ ماں تھیں بیٹی کو اجڑا ہوا دیکھ کر کڑھتی رہتیں ہر طرح سے منا کر دیکھ چکی تھیں مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوتی تب وہ اپنے شوہر کے سر ہو جاتیں۔

"آپ ہی سمجھائیں اسے احمد صاحب شاید آپ کی بات مان لے آخر کب تک اس طرح اکیلے زندگی گزارے گی میں اور آپ ہمیشہ تو اس کے سر پر نہ رہیں گے میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں کہ ہمارے بعد کیا بنے گا اس کا بے شک بھائی اسے چاہتے ہیں مگر پھر بھی آنے والے وقت میں کیسا وقت ہو؟ کیسے حالات ہوں؟ میرا دل بہت ڈرتا ہے احمد صاحب ہم دونوں کے جیتے جی اس کی نیا کسی کنارے لگ جائے تو موت بھی سکون سے آ جائے گی خدا کے لیے اسے سمجھائیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بیگم 'میری اپنی بھی یہی خواہش ہے اور میں نے اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے مگر وہ ڈرتی ہے آپ جانتی ہیں سارا اس کی کمزوری ہے اسے یہی خوف ہے کہ اگر اس نے اپنی نئی دنیا بسا لی تو سارا اس سے دور ہو جائے گی بس اسی

لیے وہ شادی کے لیے راضی نہیں ہوتی۔"

"اس کا یہ خوف تو اس طرح بھی دور کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس کے لیے کوئی ایسا رشتہ دیکھتے ہیں جو اسے اس کی بچی سمیت قبول کرلے پھر تو وہ راضی ہو جائے گی نا۔" وہ بڑی آس سے پوچھ رہی تھیں احمد صاحب دکھ سے مسکرائے۔

"وہ راضی ہو جائے گی یہ تو بعد کی بات ہے بیگم۔ کوئی اسے اس کی بچی کے ساتھ قبول کرلے گا اصل بات تو یہ ہے آپ اچھی طرح جانتی ہیں معاشرے کے چلن کو یہاں کنواریوں کو اچھے بر میسر نہیں ہیں بیوہ اور مطلقہ سے تو لوگ اس طرح بھاگتے ہیں گویا انہیں چھوت کی بیماری لگی ہو اور پھر ایسی خواتین کے ساتھ اگر بچے بھی ہوں تو پھر سونے پہ سہاگہ ہی ہوتا ہے کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ کسی بچے والی کو اپنے آنگن کی رونق بنائے یہاں تو ساٹھ سال کے بوڑھے کو بھی کنواری اور کم سن بیوی کی تمنا ہوتی ہے آپ پتا نہیں کس دور میں جی رہی ہیں۔" احمد صاحب کی ایسی حوصلہ شکن باتیں سن کر ان کا جی مکدر ہو جاتا کہ وہ کہتے تو بالکل ٹھیک ہی تھے لوگوں کے اس رویے کی وجہ سے معاشرہ تیزی سے تنزلی کی طرف گامزن تھا مادہ پرستی کا رجحان اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اچھے اور شریف گھرانوں کے مسائل میں ـــــ اضافہ ہوتا جا رہا تھا جسے دیکھو وہ خوب سے خوب ترکی کی تلاش میں تھا نہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاسداری تھی اور نہ ہی اسلامی تعلیمات کی طرف دھیان دیا جاتا مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی خوش امیدی قائم تھی کہ دنیا میں کچھ اچھے اور نیک لوگ ابھی باقی تھے تبھی دنیا قائم تھی احمد صاحب اور ان کی بیگم بھی اس امید کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے مگر اصل مسئلہ تو زیبی کا تھا جو دوسری شادی کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس دن بھی وہ آفس سے آکر امی کو سلام کر کے اپنے کمرے میں آگئی سارا حسب معمول اس کی گود میں چڑھی ہوئی تھی کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے وہ سارا کو لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور اس کے لیے لائے ہوئے کھلونے اور مختلف چیزیں اسے دکھانے لگی سارا کی خوبصورت آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور وہ خوب چہک رہی تھی سارا کی آنکھوں کی چمک اور اس کی یہی چہکار دیکھنے کے لیے ہی تو وہ سارا دن اپنی جان مارتی تھی اس کی معصوم باتیں اور خوشی سے بھرپور آواز سن کر اسے زندگی کا احساس ہوتا تھا اور وہ کچھ دیر کے لیے ہر غم سے آزاد ہو جاتی تھی وہ سارا سے اس کی پورے دن کی روداد سن رہی تھی اس کے اسکول کے قصے ٹیچرز کی باتیں اسکول میں بنے اس کے نئے دوستوں کی باتیں اس نے ابھی چند ماہ پہلے سارا کا اسکول میں ایڈمیشن کروایا تھا۔ وہ صبح آفس جاتے ہوئے اسے اسکول چھوڑ دیتی تھی واپسی میں احمد صاحب جا کر اسے اسکول سے لے آتے تھے۔ سارا اپنی اس نئی ایکٹیویٹی سے بہت خوش تھی زیبی کو بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ اب اس کا اچھا خاصا وقت اسکول میں گزر جاتا تھا اور اسے پورا دن ماں کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے سارا کی باتیں سن رہی تھی جب امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ارے... امی آپ... آیئے نا بیٹھیے۔" وہ اندر آکر بیڈ کے قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہو رہا بھئی۔ ماں بیٹی کیا راز و نیاز کر رہی ہیں؟"

"نانو... دیکھیں مما میرے لیے کتنے اچھے اچھے ڈائز لے کر آئی ہیں۔" سارا انہیں اپنی چیزیں دکھانے لگی۔

"واہ بھئی۔ یہ تو بہت پیارے ہیں آپ نے سعدی اور مشعال کو اپنے کھلونے نہیں دکھائے جا کر انہیں بھی دکھاؤ اور مل کر کھیلو۔"

"جی نانو۔ ابھی دکھاتی ہوں مما میں جاؤں۔" اس نے اپنے کھلونے سمیٹ کر ماں سے پوچھا۔

"ہاں میری جان۔ جاؤ کھیلو اور ہاں سعدی اور مشعال کو یہ چاکلیٹس دے دینا۔" سارا اچھلتی کودتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"ابو مسجد سے آگئے امی؟" سارا کے جانے کے بعد وہ امی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بس آنے والے ہوں گے وہ آجائیں تو سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

"ہاں مجھے آج بھوک بھی بہت لگ رہی ہے آج دوپہر کو میں آفس میں لنچ نہیں کرسکی تھی شاید اسی لیے زیادہ بھوک لگ رہی ہے۔"

"تم اپنی طرف سے بہت لاپروا ہو گئی ہو زیبی بالکل اپنا خیال نہیں رکھتی ہو دیکھو تو چہرہ کتنا زرد ہو رہا ہے اور آنکھوں کے نیچے حلقے بھی پڑ گئے ہیں کیوں اتنی لاپرواہی برتنے لگی ہو۔"

"ارے چھوڑیں نا امی! ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کچھ نہیں ہوا ہے مجھے آپ ماں ہیں نا اس لیے بے وجہ ہی فکر کرتی رہتی ہیں ورنہ میں بالکل فٹ فاٹ ہوں۔" وہ اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر بولی۔

"میری پریشانی تو اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک میں تمہیں دوبارہ ہنستا بستا نہ دیکھ لوں اور صرف میں ہی نہیں تمہارے ابو بھی یہی چاہتے ہیں کیا تم ماں باپ کی یہ خوشی پوری نہیں کرسکتیں؟" امی نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ نے پھر وہی بات شروع کردی امی... میں آپ سے پہلے بھی کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ میرا دوسری شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے آپ کیوں نہیں سمجھتی ہیں؟ میں خود کو اس بات کے لیے رضامند نہیں کرپائی عمر کے بغیر رہنا تو میں نے بڑی مشکل سے سیکھ لیا ہے مگر سارا کے بغیر میں نہیں رہ سکتی دوسری شادی کا مطلب سارا سے علیحدگی ہے اور اتنا حوصلہ میرے اندر نہیں ہے کہ میں جیتے جی اپنی معصوم بچی کو چھوڑ کر نئے جہاں آباد کرتی پھروں... پلیز امی۔ مجھے مجبور مت کریں۔" دکھ کے سائے اس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔

"لیکن بیٹا... جیسا تم سوچتی ہو ضروری تو نہیں کہ ایسا ہی ہو دنیا میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تو ایسا ہوگا نا جو تمہارے ساتھ ساتھ سارا کو بھی بخوشی اپنا لے اور اسے باپ کا پیار دے اگر ایسا ہو جائے پھر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا؟"

"چھوڑیں امی۔ ایسا کہاں ہوتا ہے؟ لوگوں کے دل اتنے وسیع نہیں رہے کہ کسی کی اولاد اس میں سما سکے سوتیلی ماؤں اور سوتیلے باپوں کے اتنے قصے تو آپ سنتی ہیں پھر بھی امید لگائے بیٹھی ہیں۔" اس کے لبوں پر ایک پر درد مسکراہٹ تھی۔

"اس لیے میری بیٹی کہ امید پر دنیا چلتی ہے اچھے لوگ بھی ہیں دنیا میں چاہے ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی ہو تم ایک دفعہ اقرار تو کرو ان شاءاللہ تمہارے نصیب کا اچھا شخص تمہیں ضرور ملے گا۔"

"ٹھیک ہے امی اگر آپ کو ایسا کوئی شخص مل جائے جو میری بچی کو بھی میرے ساتھ کھلے دل سے اپنائے تو میں اس کے بارے میں ضرور سوچوں گی۔ اب چلیں چل کر کھانا کھاتے ہیں مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" امی نے تو مارے خوشی کے اسے اٹھ کر گلے لگالیا تھا۔ شکر ہے خدا کا کہ وہ کسی طرح راضی تو ہوئی تھی ان کے لیے یہی کافی تھا پہلے بھی وہ اندر ہی اندر اس سلسلے میں کوششیں کر رہی تھیں اب تو اس کی طرف سے اجازت کا پروانہ ہاتھ آگیا تھا اب وہ اپنی کوششوں کو تیز تر کرسکتی تھیں۔

ان کے چہرے کی خوشی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تمام افراد کو صاف نظر آرہی تھی۔

اپنے ملنے جلنے والوں کے توسط سے امی نے اس کے لیے ایک دو جگہ بات چلائی تھی مگر فی الحال کامیابی نہ ملی تھی۔ مسئلہ وہی تھا کہ بیوہ اور ایک بچہ کی ماں کو اپنانے کے لیے جس حوصلے کی ضرورت تھی وہ حوصلہ کسی میں نہ تھا اگر کہیں بات بنتی نظر بھی آتی تو صرف اس وجہ سے ختم ہو جاتی کہ زیبی اپنی بچی کو چھوڑنے پر تیار نہ تھی یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ زیبی کو اس سارے معاملے سے کوئی سروکار نہ تھا اس کی

وہی روٹین لائف تھی انہی دنوں جب امی تھک کر مایوس ہونے لگی تھیں ان کی ایک ملنے والی کے ذریعے زیبی کے لیے ایک رشتہ آگیا رشتہ ویسے تو ہر اعتبار سے مناسب تھا بس ایک چیز امی کو بہت کھلی تھی کہ جس شخص نے پیغام بھیجا تھا وہ دو بچوں کا باپ تھا اس کی پہلی بیوی کا ایک سال پہلے انتقال ہوچکا تھا دونوں بچے بہت چھوٹے تھے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے وہ دوسری شادی کا خواہاں تھا اس کی کوئی شرط بھی نہ تھی گھربار' کاروبار شکل وصورت اور عمر سب کچھ ٹھیک تھا لیکن دو بچوں کا سن کر امی بہت کبیدہ خاطر ہوئی تھیں امی کی وہ ملنے والی امی کو سمجھا رہی تھیں کہ

"زیبی کے لیے اس سے بہتر رشتہ اور کوئی نہیں ہوسکتا آخر زیبی بھی تو ایک بچی کی ماں ہے اور وہ زیبی کی بیٹی کو بھی اپنانے کو بخوشی تیار ہے کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے اس کے پاس اتنا شاندار گھر' خوب چلتا ہوا کاروبار مناسب شکل وصورت اور کیا چاہیے اللہ کا نام لے کر ہاں کردو ان شاء اللہ زیبی بہت خوش رہے گی۔" امی ہچکچاہٹ کا شکار تھیں انہوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا تاکہ وہ گھر کے باقی افراد اور خاص طور پر زیبی کا عندیہ لے سکیں اور جب انہوں نے اس رشتے کا تذکرہ گھر میں کیا تو ان کے ساتھ ساتھ سب ہی ہچکچانے لگے کہ دو بچوں کے باپ سے زیبی کو کیسے بیاہ دیں۔

"امی آپ انہیں منع کردیں زیبی کوئی بوجھ تو نہیں ہے جسے ہم اس طرح اتار پھینکیں۔" بڑے بھیا نے تو فوراً فیصلہ سنادیا۔

"اور کیا امی کیا کمی ہے آخر زیبی آپا میں صرف یہ کہ وہ ایک بچی کی ماں ہیں اسی لیے ہم انہیں دو بچوں کے باپ سے بیاہ دیں؟ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ نہیں امی بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ ان لوگوں کو منع کردیں۔" فرحان بھی بڑے بھائی کا ہمنوا بن گیا۔

"آپ کیا کہتے ہیں احمد صاحب پھر کیا ــــ انکار کہلوا بھیجوں ان لوگوں کو؟" انہوں نے شوہر سے پوچھا جو بالکل چپ بیٹھے تھے۔

"دیکھ لیجیے بیگم... ویسے تو ہر لحاظ سے یہ رشتہ اچ[illegible] ہے مگر... ایک بار زیبی سے بھی پوچھ لیتے تو اچھا ہو دیکھیں وہ کیا کہتی ہے آخر معاملہ تو اس کی ذات ہے۔"

"یہ بھی آپ نے خوب کہی احمد صاحب وہ تو فور[illegible] سے پیشتر انکار کردے گی وہ تو پہلے ہی اتنی مشکل سے اس امر کے لیے تیار ہوئی تھی میں جانتی ہوں اب بھ[illegible] وہ یہی چاہتی ہے کہ اچھا ہے کہیں بات ہی نہ بنے دیکھ[illegible] نہیں کتنی بے دلی سے وہ ان معاملات میں شامل ہو[illegible] ہے اس سے پوچھنا تو بے کار ہی ہوگا میرا خیال ہے [illegible] میں خود ہی منع کروادیتی ہوں میرا تو پہلے بھی دل نہیں مان رہا تھا۔" وہ بات ختم کرکے کھڑی ہوگئیں تاک[illegible] انیسہ بیگم جو یہ رشتہ لے کر آئی تھیں انہیں فو[illegible] کرکے منع کردیں۔

"ٹھہریں امی۔" زیبی ایک دم اندر چلی آئی تھی ا[illegible] کے بڑھتے قدم وہیں تھم گئے۔

"ابو ٹھیک کہہ رہے تھے آپ ایک بار مجھ سے بھ[illegible] پوچھ لیتیں کہ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے بھی نہیں۔" وہ سر جھکائے بول رہی تھی اور کمرے میں موجود تمام لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہہ رہی ہو زیبی؟ کیا تم اس رشتے پر راضی ہو۔" عروسہ بھابھی حیران ہو کر پوچھ رہی تھیں سب سوالیہ نظریں اس کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔

"جی بھابھی... مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے انیسہ آنٹی ٹھیک کہہ رہی تھیں آخر میں بھی تو ایک بچی کی ماں ہوں جب کوئی اس بات کو جواز کر میرے لیے انکار کرتا ہے تو آپ لوگوں کو کتنا برا لگ[illegible] ہے کتنے دکھی ہوجاتے ہیں آپ سب پھر وہی کام کیوں کرنے جارہے ہیں آپ لوگ' یہ دہرا معیار آخ[illegible] کیوں؟... بس میں ایک بار ان صاحب سے ضرور ملنا چاہوں گی اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔" وہ جس طرح اندر آئی تھی اسی تیزی سے باہر نکل [illegible] کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی وہ سب کو حیران اور شرمندہ کر گئی تھی ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی اس نے اگر یہ فیصلہ کیا تھا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا زندگی تو اسے ہی گزارنی تھی اور جب اسے کوئی اعتراض نہ تھا تو پھر مسئلہ ہی کوئی نہیں تھا۔ امی نے انیسہ بیگم کو فون کرکے رضامندی دے دی اور ساتھ میں زیبی کا پیغام بھی پہنچادیا گیا۔

آج اس نے آفس سے چھٹی کی تھی کیونکہ انیسہ آنٹی سلمان صاحب کو لے کر ان کے گھر آنے والی تھیں امی اور بھابھی نے مل کر بہت سارا اہتمام کرڈالا تھا آج بہت عرصے بعد امی کے بار بار کہنے پر وہ بھی اہتمام سے تیار ہوئی تھی وہ بظاہر تو نارمل نظر آتی تھی مگر اندر سے اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا عمر کی بعد کوئی اور اس کی زندگی میں شامل ہونے جارہا تھا اس کے محسوسات اس وقت کے مقابلے میں بالکل مختلف تھے اس وقت تو کچی عمر کے کومل کومل احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا آنکھوں کی چمک اور چہرے کی دمک ہی کچھ اور طرح کی تھی اور دھڑکنوں کی لے آج کے مقابلے میں بالکل ہی بدلی ہوئی تھی آج تو وہ مختلف اندیشوں اور خدشات میں گھری ہوئی تھی اپنے بارے میں تو اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا ہر سوچ سارا سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوئی تھی پتا نہیں یہ شخص جو آنے والے دنوں میں اس کا ہم سفر ہوگا وہ اس کی بچی کے لیے کیسا ثابت ہو' اپنے دل کو اس کے ننھے وجود کے لیے کتنا وسیع کرپائے گا اور پتا نہیں سارا کسی نئے گھر اور مختلف ماحول میں ایڈجسٹ کرسکے گی کہ نہیں' یہ اور ایسے ہی کتنے اندیشے اسے لاحق تھے وہ لوگ آگئے تھے بھابھی نے آکر اسے اطلاع دی تھی اس نے خود کو پرسکون کرنے کی سعی کی اور ڈرائنگ روم کی جانب چل پڑی اس کی انگلی تھامے سارا بھی اس کے ہمراہ تھی اس نے کمرے میں موجود تمام لوگوں کو سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئی سرسری نظر سے وہ سلمان کو دیکھ چکی تھی۔ سلمان بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"امی میں سلمان صاحب سے علیحدگی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" وہ دھیمے لہجے میں امی سے بولی تھی۔

"ہاں... ہاں زیبی بیٹا سلمان بھی تم سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے اچھا ہی تم دونوں آپس میں کچھ معاملات طے کرلو تاکہ ہمیں آسانی ہوجائے۔" انیسہ آنٹی جلدی سے بولیں اس نے ابو کی طرف دیکھا انہوں نے سر کے ہلکے سے اشارے سے اسے اجازت دے دی وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"آیئے سلمان صاحب۔ باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" سلمان اس کے سامنے لان چیئر پر بیٹھے اس کی جھکی پلکوں کو دیکھ رہے تھے اور اس کے بولنے کے منتظر تھے ماحول کے بوجھل پن کو ختم کرنے کے لیے وہ ہلکے سے کھنکھارے اور زیبی کی گود میں چڑھی سارا سے مخاطب ہوئے۔

"اس پیاری سی گڑیا کا کیا نام ہے بھئی اور آپ کون سی کلاس میں پڑھتی ہیں۔؟" سارا نے جواب دینے کے بجائے شرما کر سر جھکالیا۔

"زیب آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں؟ میرا خیال ہے پہلے میں کہہ دوں اگر آپ کی اجازت ہو تو؟" انہوں نے بہت نرمی سے پوچھا۔

"جی کہیے۔"

"دیکھیے زیب... میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مجھے اپنے بچوں کے لیے صرف ماں کی ضرورت ہے کیونکہ میں بھی اپنی زندگی میں کسی ساتھی کی کمی کو بہت محسوس کرتا ہوں مگر میری پہلی ترجیح بہرحال یہی ہوگی آپ تو اچھی طرح سمجھتی ہوں گی کہ بچوں کی زندگی میں ماں اور باپ دونوں کی موجودگی کتنی ضروری ہے کسی ایک کے نہ ہونے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اسے پر کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے بچے اگر چھوٹے ہوں تب تو یہ مشکل اور بڑھ جاتی ہے ہم دونوں مل کر ان بچوں کی زندگی سے اس کمی کو دور کرسکتے ہیں کیا خیال ہے آپ کا۔"

"جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں کوشش کروں گی کہ ان بچوں کو ماں کی محبت دے سکوں اور آپ سے

بھی یہی امید کرتی ہوں۔" وہ اب بہت ریلیکس ہو کر بات کر رہی تھی سلمان کے انداز گفتگو نے اسے کافی حد تک پرسکون کر دیا تھا۔

"چلیے تو پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں امید کا ایک ایک جگنو پکڑاتے ہیں اور اس کی روشنی میں اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل طے کرتے ہیں ٹھیک ہے نا۔" وہ شگفتگی سے بولے تو زیبی کے ہونٹوں پر بھی مدھم سی مسکراہٹ آگئی سلمان نے اس مسکراہٹ سے آس پاس کا ماحول روشن ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔

وہ بہت سادگی سے سلمان کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی امی ابو کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ ان کی بیٹی ایک بار پھر گھر بار والی ہو گئی تھی

سلمان کی ایک ہی بڑی بہن تھیں جو لاہور میں رہتی تھیں وہ شادی میں شرکت کی غرض سے آئی تھیں اور اب واپس جا رہی تھیں یہ اطمینان لے کر کہ ان کے بھائی اور بچوں کی فکر اور دیکھ بھال کرنے والی آگئی تھی ورنہ انہیں بار بار لاہور سے کراچی آنا پڑتا تھا بچوں کی خبر گیری کرنے کے لیے' زیبی کی نیچر کو وہ تھوڑے سے دنوں میں سمجھ گئی تھیں انہیں یقین تھا کہ زیبی بہت جلد اس گھر اور گھر کے مکینوں میں رچ بس جائے گی۔

ان چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو جو اس کم سنی میں ماں کی ممتا سے محروم ہو گئے تھے دیکھ کر زیبی کا دل ممتا اور پیار سے بھر گیا تھا اس کی اپنی بچی باپ کی شفقت سے محروم تھی اس لیے وہ اس درد کو بہت گہرائی سے محسوس کر سکتی تھی اس نے ان دونوں کو اپنی ممتا بھری بانہوں میں سمیٹ لیا تھا پانچ سالہ آزان اور دو سال کی ماہا کے لیے اس نے اپنے دل میں محبت کے سوتے پھوٹتے محسوس کیے تھے بچے بھی کچھ اس طرح اس سے اور سارہ سے گھل مل گئے جیسے وہ ان کی حقیقی ماں ہو اور ہمیشہ سے ان کے ساتھ ہو وہ اپنی اس نئی حیثیت اور زندگی سے مطمئن تھی سارا بھی خوش تھی اس کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کی مما اب آفس نہیں جاتی تھیں اور اس کے ساتھ ہر وقت رہتی تھیں آزان اور ماہا سے بھی اس کی خوب دوستی ہو گئی تھی ماہا جب اپنی توتلی زبان میں اسے آپی کہہ کر بلاتی تو سارا کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سارہ ابھی اپنے پہلے والے اسکول میں ہی جا رہی تھی وہ اسکول یہاں سے بہت دور پڑتا تھا گو کہ ڈرائیور اسے اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا تھا مگر پھر بھی اسے گھر آتے آتے بہت دیر ہو جاتی تھی اور سفر کی تھکان سے وہ نڈھال بھی ہو جاتی تھی ایک دن زیبی نے سلمان سے اس سلسلے میں بات کی وہ چاہتی تھی کہ سارہ کا داخلہ آزان کے اسکول میں کروا دے وہ اسکول یہاں سے قریب بھی تھا اور اس کا شمار شہر کے بہترین اسکولوں میں ہوتا تھا سلمان اس کی بات سن کر چپ سے ہو گئے تھے زیبی منتظر نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئے۔

"میرا خیال ہے زیب۔ سارا جہاں پڑھ رہی ہے پڑھنے دو ڈرائیور اسے چھوڑنے اور لینے تو جاتا ہی ہے پھر کیا مسئلہ ہے۔"

"مسئلہ تو خیر کوئی نہیں ہے بس سارا تھک بہت جاتی ہے اور کافی دیر بھی ہو جاتی ہے اسے آنے میں صبح بھی جلدی نکلنا پڑتا ہے اس لیے میں چاہ رہی تھی کہ ..."

"مرضی ہے تمہاری مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے وہی اسکول مناسب ہے۔" سلمان نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی تھی زیبی اس کے بعد کچھ نہیں بولی تھی شاید اس اسکول کی فیس بہت زیادہ تھی اس لیے سلمان ہچکچا رہے تھے مگر سلمان کے لیے یہ فیس افورڈ کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا پھر پتا نہیں وہ کیوں نہیں چاہتے تھے کہ سارا آزان کے اسکول میں پڑھے اس کے ذہن میں اس طرح کے سوال آتو رہے تھے مگر وہ کچھ بھی نگیٹو سوچنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ بظاہر سلمان کا سارا کے ساتھ رویہ ٹھیک تھا وہ آزان اور ماہا کے ساتھ ساتھ سارا کی ضروریات کا بھی خیال کرتے

تھے پھر کون سی چیز تھی جو زیبی کے ذہن میں مسلسل چبھ رہی تھی۔

"بہت بری بات ہے سلمان اچھے انسان ہیں مجھے اس طرح بدگمان نہیں ہونا چاہیے ہو سکتا ہے ان کے ذہن میں کوئی اور بات ہو جو میں سمجھ نہیں پا رہی۔" اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی آزان اسے پکار رہا تھا وہ سر جھٹک کر اس کی بات سننے چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈائننگ ہال میں کھانا لگوا رہی تھی سلمان اور بچے ٹی وی لاؤنج میں تھے ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ٹیبل سیٹ کر کے پلٹی تو دیکھا کہ سارا اس کے پیچھے کھڑی ہے۔

"ارے۔ سارے کیا ہوا چندا؟ کیا بھوک لگ رہی ہے؟" وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اس سے پوچھ رہی تھی سارا کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"نہیں مما مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔" وہ آہستہ آواز میں بولی۔

"کیا ہوا بے بی آپ اتنی چپ چپ کیوں ہیں؟" وہ سارا کے گال چوم کر پوچھ رہی تھی۔

"ممتا۔ آپ بھائی کی اور ماہا کی مما ہیں اور میری بھی ہے نا۔"

"جی جان۔ میں آپ تینوں کی مما ہوں آپ ایسے کیوں بول رہی ہیں۔" اس نے سارا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"لیکن مما بابا صرف بھائی کے اور ماہا کے بابا ہیں میرے نہیں ہیں۔" وہ اس کے سینے سے لگ کر ملکے ملکے کہہ رہی تھی زیبی کے اندر جیسے چھن سے کچھ ٹوٹا اس نے سارہ کو زور سے بھینچ لیا۔

"نہیں گڑیا! ایسے نہیں کہتے وہ آپ کے بھی بابا ہیں۔ بابا نے کچھ کہا ہے آپ سے؟"

"نہیں مما۔ بابا نے کچھ نہیں کہا لیکن وہ مجھ سے پیار نہیں کرتے وہ بھائی سے اور ماہا سے پیار کرتے ہیں میں نے ان سے کہا بابا مجھے خرگوش والی کہانی سنائیں

مگرانہوں نے نہیں سنائی وہ بھائی کی فیورٹ کہانی سنانے لگے وہ کبھی بھی میری بات نہیں سنتے وہ مجھے گود میں بھی نہیں اٹھاتے مما۔ مجھے پیار بھی نہیں کرتے ۔۔۔ وہ میرے بابا نہیں ہیں۔۔۔ ہے نا مما۔؟" اب سارا ہولے ہولے سسک رہی تھی زیبی کا دل درد سے بھر گیا۔

"یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟ میری معصوم بچی اتنی حساس ہے کہ جو کچھ میں محسوس نہیں کرسکی وہ اس نے محسوس کرلیا کیا سلمان واقعی ان بچوں میں فرق کرتے ہیں اگر ایسا ہے میرے مولا تو مجھے حوصلہ دینا مجھے ہمت دینا کہ میں یہ سب فیس کرسکوں۔" وہ سارا کو سینے سے لگائے اللہ سے اپنے لیے ہمت اور حوصلے کی طلب گار تھی۔

کھانے کے دوران وہ نوٹ کررہی تھی کہ سلمان کی ساری توجہ آزان اور ماہا کی طرف تھی ان کی آنکھوں میں دونوں کے لیے وہی چاہت تھی جو ایک باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے بیچ بیچ میں وہ انہیں ٹوک بھی رہے تھے۔

"آزان۔۔۔ بیٹا آپ نے روٹی پوری ختم کرنی ہے۔" پھر وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

"زیبی ماہا کو جوس پلاؤ مجھے لگتا ہے اسے مرچیں لگ رہی ہیں۔"

"جی اچھا۔" اس نے جوس کا گلاس ماہا کے ہونٹوں سے لگادیا اور دزدیدہ نظروں سے سامنے بیٹھی سارا کو دیکھا اس کی پلیٹ جوں کی توں تھی ایک لقمہ بھی نہیں کھایا تھا اس نے جوس کا گلاس بھی ویسے ہی پڑا تھا سلمان کی توجہ اس طرف تھی ہی نہیں کہ سارا کھانا کھارہی ہے یا نہیں مگر وہ تو ماں تھی نا اس کی نظر بھلا کیسے چوکتی اس کا دل رو پڑا اس کی بچی کے ساتھ اس گھر میں امتیازی سلوک ہو رہا تھا اور وہ ننھی سی بچی اس بات کو شدت سے محسوس کررہی تھی اس نے ماہا کو گود سے اتار کر کرسی پر بٹھادیا اور خود اٹھ کر سارا کے قریب چلی آئی جھک کر اس کے گال چومے اور اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی سلمان نے اس کی اس حرکت کو خاصی ناگواری سے دیکھا تھا۔ مگر زیبی کی توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ وہ سارا کے منہ میں نوالے بنا کر ڈال رہی تھی آخر سلمان بول پڑے۔

"یہ کیا کررہی ہو زیبی؟ سارا اب بڑی ہوگئی ہے اس طرح اس کی عادتیں خراب کررہی ہو اسے خود سے کھانے دو۔"

"خود ہی تو کھاتی ہے سلمان آپ نے شاید دیکھا نہیں سارا اتنی دیر سے یونہی بیٹھی ہوئی تھی ایک لقمہ بھی نہیں کھایا تھا اس نے اور ابھی اتنی بڑی بھی نہیں ہوئی کہ میرے ہاتھ سے کھانا کھانے سے بگڑ جائے گی آپ کو پتا ہے دوپہر میں تو آزان نے ضد کرکے میرے ہاتھ سے کھانا کھایا ہے یہ ابھی بچے ہیں سلمان انہیں ابھی ہر پل میری اور آپ کی توجہ درکار ہے۔" وہ بڑے رسان سے بول رہی تھی سلمان کو لگا جیسے وہ کچھ جتارہی ہے مگر وہ جواباً" کچھ بولے نہیں تھے۔

بظاہر سلمان ایسی کوئی حرکت نہیں کرتے تھے جو قابل گرفت ہو وہ آفس سے واپسی میں اگر ماہا اور آزان کے لیے کچھ لاتے تھے تو سارا کے لیے بھی لاتے کبھی بچے رات کو آئس کریم کھانے کی ضد کرتے تو سارا ہمیشہ ساتھ ہوتی تھی مگر ان سب کے باوجود زیبی نے دیکھا تھا کہ وہ جس طرح آزان اور ماہا کے ساتھ لاڈ کرتے تھے جس طرح ان کے ناز اٹھاتے تھے اور ان کی شرارتوں میں ان کا ساتھ دیتے تھے سارا کے لیے ان کے رویے میں نہ یہ بے ساختہ پن تھا نہ بے تکلفی بلکہ وہ تو اس کی طرف نظر بھر کے دیکھتے بھی نہیں تھے۔

اس کے برعکس سارا آزان اور ماہا کی طرح ان کی طرف لپکتی تھی وہ جب گھر آتے تھے تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا تھا وہ ابھی اتنی چھوٹی اور ناسمجھ تھی کہ نہیں جانتی تھی یہ شخص اس کا حقیقی باپ نہیں تھا وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ بابا کہیں چلے گئے تھے اور اب واپس آگئے تھے عمر کا جب انتقال ہوا تھا تو وہ بالکل ہی چھوٹی تھی اور زیبی نے اسے کسی بھی محرومی سے بچانے کے لیے عمر کی تصویریں تک چھپادی تھیں اور جب سلمان سے شادی کا فیصلہ کیا تھا تو سارا کو یہی بتایا تھا کہ اس کے بابا واپس آرہے ہیں اور ننھی سارا یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑی تھی سلمان کو پاکر تو وہ دیوانی ہوگئی تھی اب جبکہ سلمان سے اسے وہ محبت اور توجہ نہیں مل رہی تھی جو اسے درکار تھی تو وہ گویا اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی تھی زیبی کا دل کانپ اٹھتا تھا یہ سب دیکھ کر وہ چاہتی تو جواباً" سلمان کے بچوں کے ساتھ وہی کچھ کرسکتی تھی جو اس کی اولاد کے ساتھ ہو رہا تھا مگر اس کا دل اتنا تنگ نہیں تھا۔

ان معصوم بچوں کا بھلا اس میں کیا قصور تھا وہ تو اسے ہی اپنی ماں سمجھتے تھے ماہا تو ان چند مہینوں میں اس کی اتنی عادی ہوگئی تھی کہ ایک لمحے کے لیے اسے نہیں چھوڑتی تھی وہ اپنی ممتا ان بچوں پر بلا تفریق لٹا رہی تھی مگر سلمان ۔۔۔ وہ اسی لیے دوسری شادی سے کتراتی تھی یہی خوف دامن گیر تھا جو اس نے اتنا عرصہ اکیلے گزار دیا تھا اور ماں باپ کی بات کو ٹالتی رہی تھی مگر سلمان سے مل کر اسے لگا تھا کہ اس شخص کی شخصیت میں ایسی کوئی کجی نہ ہوگی ان سے بات کرکے اسے مزید اطمینان ہوگیا تھا مگر اس نے جو دیکھا تھا وہ شاید ایک دھوکہ تھا سلمان ایسے نہیں تھے جیسے نظر آتے تھے اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے سلمان سے اپنی بیٹی کے لیے محبت کی بھیک مانگنا اسے گوارہ نہیں تھا اور سارا کی حالت بھی دیکھی نہ جاتی تھی وہ بالکل ہی گم سم ہوکر رہ گئی تھی سلمان کے رویے نے اس کے چھوٹے سے دل کو اتنی ٹھیس پہنچائی تھی کہ اس کے اندر پہلے جیسی کوئی بات ہی نہ رہی تھی شوخی و شرارت تو جیسے عنقا ہوکر رہ گئی تھی وہ ننھی سی بچی اپنے خول میں بند ہوگئی تھی اور اس کا اثر اس کی صحت پر پڑ رہا تھا پتا نہیں کیسا بخار تھا جو کسی طرح ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا علاج فیملی ڈاکٹر سے ہو رہا تھا آج چوتھا دن تھا ہر طرح کی دوا آزمائی گئی تھی مگر بخار کم نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر بھی پریشان تھا اس نے مشورہ دیا تھا کہ سارا کو کسی اچھے چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھایا جائے شام کو سلمان گھر آئے تو اس نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔

"ہاں تو ٹھیک ہے۔۔۔ دکھا دو کسی چائلڈ اسپیشلسٹ کو دیکھو کیا کہتا ہے وہ۔" انہوں نے عام سے لہجے میں جواب دیا زیبی ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی اسے یاد تھا ڈیڑھ ماہ پہلے ماہا بیمار ہوئی تھی سلمان کتنے پریشان تھے انہوں نے آفس جانا بھی چھوڑ رکھا تھا تشویش ان کے چہرے پر جیسے ثبت ہوکر رہ گئی تھی جتنے دن وہ بیمار رہی سلمان آفس نہیں گئے حالانکہ اس سے ان کے کاروبار پر اثر پڑ رہا تھا مگر انہیں کوئی فکر نہ تھی اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے اس کا علاج ہو رہا تھا خیر سارا کے علاج میں بھی انہوں نے کسی کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا مگر زیبی اچھی طرح جانتی تھی کہ سارا کس طرح ٹھیک ہوسکتی ہے اسے کوئی بیماری نہیں تھی وہ تو صرف باپ کی محبت اور توجہ کو ترسی ہوئی تھی سلمان کی شفقت ہی سارا کا علاج تھی زیبی ان سے کہنا چاہتی تھی مگر اس کی خودداری اسے روکتی تھی وہ اپنی بیٹی کے لیے ایک بار پھر ماں اور باپ دونوں بن گئی تھی اس کی بھرپور توجہ اور پیار سے سارا ٹھیک تو ہوگئی تھی مگر اب وہ بہت ضدی اور چڑچڑی ہوگئی تھی ہر وقت زیبی کا پلو تھامے رہتی اس کی ذرا سی توجہ ادھر ادھر ہوتی تو آسمان سر پر اٹھالیتی تھی زیبی تو پریشان ہوا تھی سارا برداشت ہی نہیں کرتی تھی کہ زیبی آزان یا ماہا کی طرف متوجہ ہو اس قدر روتی اور چیختی چلاتی کہ زیبی پریشان ہوکر کبھی کبھار تو رو پڑتی۔

اس کی بچی نفسیاتی طور پر اتنے دباؤ کا شکار ہوگئی تھی کہ وہ اب ایسی حرکتیں کرنے لگی تھی یہ بات زیبی جانتی تھی مگر سلمان نہیں سمجھتے تھے ان کے سامنے جب سارا ضد کرتی روتی چلاتی اور خاص طور پر آزان اور ماہا سے لڑتی تو سلمان چڑنے لگتے تھے اس دن بھی کھانے کی میز پر سارا نے اودھم مچادیا وہ ماہا کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا رہی تھی ماہا چھوٹی تھی وہ خود سے نہیں کھاپاتی تھی اس لیے زیبی ہی اسے کھلاتی تھی اور یہ روز کا ہی معمول تھا سارا اچھی خاصی بیٹھی تھی اور آرام سے کھانا کھارہی تھی بس اچانک ہی اس پر ضد سوار ہوگئی۔

"مما مجھے بھی آپ کے ہاتھ سے کھانا ہے۔" اس

نے اپنی پلیٹ آگے کھسکا دی تھی۔

"بیٹا آپ تو بڑی ہیں آپ خود کھالیں مما چھوٹی بہن کو کھلا رہی ہیں نا۔" زیبی مصروف سے انداز میں بولی۔

"نہیں مما میں خود سے نہیں کھاؤں گی مجھے آپ سے کھانا ہے ماہا گندی ہے آپ اسے چھوڑ دیں مجھے کھلائیں۔" وہ انتہائی ہٹ دھرمی سے بولی زیبی کی نظر سلمان کی طرف اٹھی ان کے چہرے پر ناگواری کے واضح تاثرات تھے۔

"اچھا سارا ایک منٹ ہٹ جاؤ۔ میں بس ابھی اپنی بٹی کو کھلاتی ہوں او کے۔" اس نے سارا کو رام کرنا چاہا مگر سارا بالکل ہی آؤٹ ہو گئی اس نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ پر زور سے ہاتھ مارا پلیٹ میں رکھا ہوا تمام کھانا آس پاس بکھر گیا قریب رکھا پانی کا گلاس بھی اس سے ٹکرا کر نیچے گرا اور چکنا چور ہو گیا زیبی نے ڈر کر سلمان کی طرف دیکھا وہ اب شدید غصے کے عالم میں کھانے سے ہاتھ روک کر سارا کو گھور رہے تھے جواب چیخ چیخ کر رونے لگی تھی وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب گئی تاکہ اسے وہاں سے اٹھا کر لے جائے "آ۔۔۔ آپ کھانا کھائیں سلمان ۔۔۔ مم ۔۔۔ میں اسے چپ کرواتی ہوں پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے جب سے بیماری سے اٹھی ہے، بہت ہی ضدی ہو گئی ہے۔" وہ سارا کو بھی چپ کروا رہی تھی اور ساتھ ساتھ سلمان کے غصے کو بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نا صرف ضدی بلکہ انتہائی بدتمیز بھی ہو گئی ہے زیبی ۔۔۔ میں اس قسم کی بدتمیزیاں برداشت نہیں کر سکتا اسے اچھی طرح سمجھا دو تم نے اسے کچھ زیادہ ہی سر چڑھا لیا ہے اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر کھلاؤ گی تو یہ تو ہو گا ہی بہرحال آئندہ یہ سب نہیں ہونا چاہیے۔" وہ کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ پلیز کھانا تو کھائیں میں اسے سمجھا دوں گی نا۔ آئندہ نہیں کرے گی بچے بیماری میں تو چڑچڑے ہو ہی جاتے ہیں ٹھیک ہو جائے گی جب بیماری کے اثرات ختم ہوں گے' آپ جانتے ہیں یہ ایسے ضدی تو نہیں تھی آپ پلیز کھانا چھوڑ کر مت جائیں۔" وہ ا[illegible] صورت حال سے روہانسی ہو گئی تھی۔

"سوری مجھے بھوک نہیں ہے تم اپنی بیٹی کو چپ کرواؤ" وہ تو کہہ کر چلے گئے مگر زیبی کے دماغ میں [illegible] ایک جملہ گردش کرتا رہ گیا "اپنی بیٹی" اس نے ا[illegible] آنسو روکے اور سارا کو لے کر بیڈ روم میں آ گئی س[illegible] اب بھی اس کے کندھے سے لگی ہولے ہولے سسک رہی تھی۔۔۔۔

"اپنی بیٹی۔ آپ نے ٹھیک کہا سلمان سارا صرف میری بیٹی تو ہے آپ نے اگر اسے اپنی اولاد سمجھا ہوتا [illegible] میری بیٹی اس طرح ذہنی ابتری کا شکار نہ ہوتی آپ اتنے تنگ دل اور تنگ ذہن کے ہوں گے کاش میں پہلے جان جاتی سارا کے ساتھ اگر آپ کا یہی رویہ رہا تو تو یہ پاگل ہو جائے گی یا مر جائے گی۔" وہ سارا کو سینے سے لگائے مسلسل سوچ رہی تھی سارا اس کے سینے میں منہ چھپائے سکون سے سو رہی تھی اس کی پلکیں ابھی بھی بھیگی ہوئی تھیں اور گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں زیبی کے دل کو ٹھیس سی لگی اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی وہ بہت دیر سے اس کے کمرے میں تھی باہر کیا ہو رہا ہے اسے کچھ پتا نہیں تھ[ا] آزان اور ماہا شاید سو گئے تھے اس لیے اتنی خاموشی تھ[ی] وہ اٹھ کر باہر آئی ملازمہ نے ڈائننگ ٹیبل سمیٹ دی تھی وہ اپنے بیڈ روم میں آئی سلمان 'آزان اور ماہا کو اپنے دائیں بائیں لیے لیٹے ہوئے تھے دونوں بچے س[و] گئے تھے مگر سلمان جاگ رہے تھے۔

"سو گئے یہ دونوں؟"

"ہاں سو گئے ہیں تمہیں اگر فرصت مل گئی ہو تو انہیں ان کے بیڈ پر لے جاؤ تاکہ میں بھی سکون سے س[و] سکوں صبح مجھے آفس کے لیے جلدی نکلنا ہے۔" سلمان کے انداز میں ابھی بھی ناراضی تھی وہ کچھ نہیں بولی بچوں کو ان کے بستروں پر لٹا کر وہ واپس آئی تو سلمان کروٹ لے کر سو چکے تھے زیبی نے ایک تاسف بھری نگاہ ان پر ڈالی اور خود بھی دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

سلمان کے رویے نے اسے بری طرح گھائل کیا تھا ان کی تنگ دلی اب کھل کر ظاہر ہو چکی تھی اس گھر میں رہ کر اس کی بچی ذہنی مریض بنتی جا رہی تھی اس کی ضد اور ہٹ دھرمی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس نے سلمان کی طرف تو لپکنا چھوڑ دیا تھا مگر زیبی کے معاملے میں وہ انتہائی حساس ہو چکی تھی آزان کے ساتھ تو اس کی ایک منٹ کے لیے نہیں بنتی تھی ہر وقت اس بات پر لڑائی ہوتی کہ یہ میری مما ہیں تمہاری نہیں کبھی کبھی اس بات پر سارا اتنی جنونی ہو جاتی کہ آزان کو نوچنے کھسوٹنے پر آمادہ ہو جاتی زیبی اس صورت حال سے خاصی تنگ آئی ہوئی تھی سلمان کی بے زاری اور غصہ اور اس کا خون خشک کیے رکھتا اب تو سلمان صاف کہتے تھے کہ "تمہاری اولاد کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو رہا ہے اس کی دیکھا دیکھی ماہا اور آزان بھی بگڑتے جا رہے ہیں۔" وہ اپنے جذبات کو کنٹرول کرتے کرتے ہلکان ہو جاتی تھی اسے ایسے لگتا جیسے وہ جیتی جاگتی انسان نہ ہو کوئی روبوٹ ہو۔

جتنی دیر سلمان گھر سے باہر ہوتے وہ سارا کو بھرپور توجہ دیتی جس کے نتیجے میں سارا پر سکون رہتی تھی مگر سلمان کی موجودگی میں اگر وہ سارا کا زیادہ خیال رکھتی تو انہیں برا لگتا تھا اب تو وہ کہنے لگے تھے کہ وہ تم میرے بچوں کو اگنور کرنے لگی ہو تمہاری ساری توجہ سارا کی طرف رہتی ہے تم کیا چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی کی طرح میرے بچے بھی پاگل پن کا شکار ہو جائیں ویسے بھی اس کی وجہ سے میرے بچوں پر برا اثر پڑ رہا ہے۔" اس دن زیبی آخر بول ہی پڑی تھی۔

"یہ کیا آپ نے تمہاری بیٹی اور میرے بچوں کی رٹ لگا رکھی ہے آپ کیسے آدمی ہیں سلمان ۔۔۔ اس طرح کی باتیں تو اگر عورتیں بھی کرتی ہیں تو اچھا نہیں لگتا کیا ہوتا ہے یہ میرا تمہارا میں نے تو آج تک ایسا نہیں سوچا میرے لیے تو یہ تینوں میرے بچے ہیں میں نے تو ایک دن بھی ان میں فرق نہیں کیا اپنی ممتا کے خزانے کا منہ کھول دیا ان کے لیے مگر آپ ۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے سلمان؟ کہ میں نے ایک ایسے شخص پر اعتبار کیا جو ذرا بھی قابل اعتبار نہ تھا سخت افسوس ہے مجھے۔" سلمان جواب میں ایک لفظ نہیں بولے تھے اس کے تمتمائے ہوئے چہرے پر ایک قہر بھری نظر ڈال کر وہاں سے چلے گئے زیبی کا دل دکھ کے گہرے سمندر میں ڈوبنے لگا تھا درد کی ایک لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

سلمان دو دن کے لیے بزنس کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے اس دوران زیبی ایک فیصلہ کر چکی تھی وہ اب مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی سارا کا اس گھر سے چلے جانا ہی بہتر تھا اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا دل تو اس کا یہ چاہتا تھا کہ وہ خود بھی ہر چیز پر لعنت بھیج کر یہاں سے چلی جائے مگر آزان اور ماہا کی معصوم صورتیں اسے ایسا کرنے سے روکتیں ۔۔۔ وہ دونوں تو اسے ہی اپنی ماں سمجھتے تھے پھر بھلا ان کا قصور ہی کیا تھا اگر ان کا باپ تنگ نظر تھا تو اس کی سزا انہیں کیوں ملتی البتہ سارا اگر اس گھر میں رہتی تو ضرور پاگل پن کا شکار ہو جاتی اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے امی ابو کے پاس چھوڑ دے ان کی محبت اور توجہ شاید اسے نارمل کر دیتی وہ سارا کو امی کے پاس لے آئی اس نے سب کچھ انہیں بتا دیا تھا یہ سب کچھ جان کر گھر کے سب افراد بے حد رنجیدہ ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے زیبی کہ مجھے اور تمہاری امی کو سلمان سے بات کرنا چاہیے یہ تو وہ بہت غلط کر رہے ہیں ہم نے یہ شادی اسی شرط پر کی تھی کہ وہ سارا کو بخوشی قبول کریں گے پھر وہ اب اپنے وعدے سے کیوں پھر رہے ہیں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تم کیا کہتی ہو بیٹا؟ ابو کو اس کے آنسو بہت تکلیف دے رہے تھے انہوں نے اسے اپنے کندھے سے لگا کر پوچھا تھا۔

"نہیں ابو کوئی فائدہ نہیں ہے سلمان بہت تنگ دل انسان ہیں وہ میری اولاد کے لیے اپنے دل میں گنجائش نہیں پیدا کر پائیں گے اور ویسے بھی یہ میرا اپنا

فیصلہ ہے کہ سارا یہاں رہے انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے وہ تو یہی کہیں گے کہ میں کب کہہ رہا ہوں کہ سارا یہاں سے چلی جائے پھر کیا ضرورت ہے بات کرنے کی... لیکن امی....." اس نے ماں کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں شکوے تھے۔

"میں اسی لیے دوسری شادی سے ڈرتی تھی میں آپ سے کہتی تھی نا کہ لوگوں کے دل اتنے وسیع نہیں ہیں کہ دوسرے کی اولاد اس میں سما سکے دیکھا آپ نے میری بچی باپ کے ساتھ ساتھ ماں سے بھی محروم ہو گئی بس آپ اسے سنبھال لیجئے گا اور اسے بتا دیجئے گا کہ اس کی ماں کتنی مجبور تھی... اسے بتاتی رہیے گا امی... تاکہ یہ مجھ سے نفرت نہ کر سکے... پلیز امی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

☼ ☼ ☼

سلمان اسلام آباد سے واپس آگئے تھے پہلے تو انہوں نے سارا کی غیر موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا مگر وہ انہیں اگلے دن بھی نظر نہ آئی تو انہوں نے زیبی سے پوچھ لیا۔

"وہ امی کے گھر ہے اور اب وہ وہیں رہے گی۔" وہ دل کے درد کو چھپا کر نارمل سے لہجے میں بولی وہ اس شخص پر اپنے دکھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کیوں؟... وہاں کیوں چھوڑ آئی ہو اسے؟ یہاں اسے کیا تکلیف تھی جو تم اسے وہاں چھوڑ آئیں۔" ان کی ڈھٹائی پر زیبی کا خون کھول اٹھا تھا کتنے آرام سے وہ یہ سوال کر رہے تھے اس کے دل کا خون کر کے اس کی ممتا کو قتل کر کے انجان بن رہے تھے اس نے ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ بڑی لاپروائی سے کندھے اچکا کر رہ گئے ان کا یہ انداز زیبی کو مزید تپا گیا تھا مگر وہ صبر کے گھونٹ پینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

سارا کے اس گھر سے جانے کا اثر ظاہر ہے صرف اسی پر پڑنا تھا وہ اس کی ماں تھی اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے دور کر کے وہ ہمہ وقت تکلیف میں تھی مگر اپنی اس تکلیف کو اس نے خود تک ہی محدود رکھا تھا بظاہر وہ نارمل نظر آتی تھی اور اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہی تھی کبھی کبھی آزان سارا کے بارے میں پوچھ لیتا تو وہ بڑی دقت سے اپنے غم کو چھپا پاتی تھی اپنی بچی سے ملنے اور اسے دیکھنے کو اس کا دل تڑپتا رہتا مگر وہ خود پر کنٹرول رکھتی ضبط کے بڑے کڑے مراحل سے گزر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سارا امی کے گھر ایڈجسٹ ہو جائے اس کے بغیر رہنا سیکھ لے جیسے وہ سیکھ رہی تھی بار بار کا ملنا ان دونوں کو ہی بے سکون رکھتا اس لیے چاہنے کے باوجود وہ وہاں نہیں جاتی تھی بس فون پر امی سے سارا کی خیریت پوچھتی رہتی تھی۔

سارا اسے بہت یاد کرتی تھی مگر نانا' نانی کی بھرپور توجہ اور بے اندازہ محبت گھر کے باقی افراد کے لاڈ پیار نے اسے نارمل کر دیا تھا بچے تو پیار محبت اور توجہ کے بھوکے ہوتے ہیں اور جہاں سے انہیں یہ سب کچھ ملتا ہے وہ وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ وہ بھی وہاں خوش تھی اس کا مطلب تھا کہ اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی اس کی بچی خوش رہے نارمل رہے کسی محرومی کا شکار نہ ہو وہ یہی تو چاہتی تھی بدلے میں چاہے اسے اپنی ممتا کو داؤ پر ہی کیوں نہ لگانا پڑے اپنی تڑپ اپنی بے چینی کو دور کرنے کے لیے وہ ماہا اور آزان کے لیے چھپر چھاؤں بن گئی تھی ان بچوں کے لیے تو وہ پہلے بھی اپنی ممتا نچھاور کرتی رہی تھی مگر اب وہ سارا کے حصے کا پیار بھی انہیں دے رہی تھی البتہ سلمان کے لیے اس کے دل میں بہت سے گلے تھے جنہیں وہ دل میں ہی رکھتی تھی اس نے ایک بار بھی نہیں جتایا تھا کہ وہ کتنے جبر کے ساتھ وقت گزار رہی ہے کتنی بے چین و بے قرار ہے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے اسی لیے اس نے اپنے دل پر پتھر کی سل رکھ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا روزوں اور عبادات کے ساتھ ساتھ عید کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں شادی کے بعد زیبی کی اس گھر میں پہلی عید تھی مگر اس کا دل بچی خوشی سے محروم تھا اس کے وجود کا ایک حصہ کاٹ کر اس سے علیحدہ کر دیا گیا تھا وہ خوشی مناتی بھی تو کیسے؟ آزان اور ماہا کے لیے اس نے البتہ بہت تیاری کی تھی جب وہ ان کی خریداری کے لیے بازار جاتی تو اس کا دل بہت تڑپتا کہ وہ سارا کے لیے بھی کچھ خریدے اس سے پچھلی عیدوں پر وہ اس کے لیے کیسی بھرپور تیاری کرتی تھی اس کی پسند کے کپڑے' جوتے' کانچ کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت چوڑیاں اور نہ جانے کیا کیا وہ اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ سارا پر ہی تو خرچ کرتی تھی۔

چاند رات پر وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے ننھے ننھے ہاتھوں پر مہندی سے خوبصورت بیل بوٹے بناتی تھی سارا کی خوشی دیکھنے والی ہوتی تھی اس کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر اتنی چمک رہتی کہ زیبی کی نظریں اس کی بلائیں لیتی رہتیں ایک اس کے نہ ہونے سے زیبی کو لگتا کہیں کچھ نہیں ہے سارا منظر جیسے خالی خالی لگتا تھا جیسے جیسے عید قریب آ رہی تھی زیبی کی اداسی اور بے چینی بڑھ رہی تھی بات بے بات آنکھوں میں آنسو آ جاتے وہ بڑی کوشش سے ان آنسوؤں کو اپنے اندر اتار لیا کرتی وہ اپنی اذیت کو لاکھ چھپاتی مگر چہرے پر چھائی ویرانی اور آنکھوں کے ہر وقت گیلے رہنے والے کنارے سلمان سے چھپے ہوئے نہیں تھے وہ بہت دنوں سے اس کی یہ کیفیت نوٹ کر رہے تھے اور وجہ بھی جانتے تھے ان کا خیال تھا کہ زیبی کسی بھی وقت پھٹ پڑے گی اور سارا کو واپس لانے کے لیے ان کے سامنے ڈٹ جائے گی مگر ایسا اب تک نہ ہوا تھا غضب کا حوصلہ تھا اس کے اندر یا پھر وہ بہت انا پرست تھی اور وہ تو ایک مرد تھے جب وہ عورت ہو کر اپنی انا کے پرچم کو سرنگوں نہیں کر سکتی تھی تو وہ کیوں جھکتے ایک عورت کے ہاتھوں انہیں اپنی شکست منظور نہیں تھی اگر وہ ایک بار بھی کہتی تو وہ اسے کبھی نہ روکتے کیونکہ ان کے خیال میں سارا کو یہاں سے بھیجنے کا فیصلہ اس کا ذاتی فیصلہ تھا ان کا اس میں کوئی ہاتھ نہ تھا اس نے اپنی اولاد کے لیے جو بہتر سمجھا وہی کیا تھا وہ بھول گئے تھے کہ انہوں نے اپنے بدصورت رویے سے اسے یہ کٹھن فیصلہ کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا انہوں نے بڑی آسانی سے خود کو بری الذمہ قرار دے کر اپنا دامن بچانا چاہا تھا مگر ان کے دامن پر لگے داغ اتنی آسانی سے دھلنے والے نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼

آج چاند رات تھی روزہ کھولنے کے بعد زیبی' آزان اور ماہا کو لے کر قریبی مارکیٹ گئی تھی ماہا کے لیے چوڑیاں اور مہندی لینے کے لیے سلمان بھی ساتھ ہی تھے جب وہ چوڑیوں کے اسٹال پر کھڑی ماہا کے لیے چوڑیاں پسند کر رہی تھی تو سلمان بھی اس کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔

"تم بھی اپنے لیے چوڑیاں خرید لو یہ دیکھو یہ کتنی خوبصورت چوڑیاں ہیں۔" انہوں نے سامنے ریک میں رکھی ست رنگی چوڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں مجھے کانچ کی چوڑیاں اچھی نہیں لگتیں۔" وہ ہولے سے بولی۔

"مگر مجھے تو اچھی لگ رہی ہیں پلیز... لے لو نا۔"

"پلیز سلمان... میں نے کہا نا مجھے نہیں چاہئیں۔"

وہ یہ کہہ کر واپس پلٹ آئی اور گاڑی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی سلمان' ماہا اور آزان کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے وہ بھی چپ چاپ بیٹھی تھی سلمان نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگے وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پلکیں جھپک جھپک کر پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی گود میں دھرے اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرز رہے تھے سلمان نے ایک متاسف نظر اس پر ڈالی تھی وہ ان سے کتنی بدگمان تھی انہیں اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا گھر آ کر وہ ماہا کو لے کر مہندی لگانے بیٹھ گئی تھی اپنی حالت پر وہ قابو پا چکی تھی اور اب نارمل نظر آ رہی تھی سلمان کچھ دیر تک سامنے صوفے پر بیٹھے اس کی مصروفیت دیکھتے رہے پھر میز پر پڑی گاڑی کی چابی اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

"میں ذرا کام سے جا رہا ہوں کچھ دیر میں آ جاؤں

گا۔" زیبی نے ایک پل کے لیے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر دوبارہ مصروف ہو گئی ماہا کے دونوں ہاتھوں میں مہندی لگا کر اس نے گھڑی دیکھی رات کافی بیت چکی تھی۔ سلمان ابھی تک واپس نہیں آئے تھے چاند رات تھی شاید دوستوں کی طرف نکل گئے تھے اس نے ماہا کو گود میں اٹھایا وہ مہندی لگواتے ہوئے سو گئی تھی ماہا کو اس کے بیڈ پر لٹا کر وہ خود بھی لیٹ گئی تھکن بھی ہو رہی تھی اور نیند بھی بہت آ رہی تھی صبح عید تھی اور سویرے سویرے اٹھنا تھا وہ آنکھیں موند کر لیٹ گئی تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔

صبح نماز کے لیے اٹھی تو دیکھا سلمان اس کے برابر میں سوئے ہوئے تھے پتا نہیں رات کتنے بجے آئے تھے اس وقت وہ بہت گہری نیند میں تھے وہ آہستہ سے اٹھی اور وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہو گئی نماز پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے آج عید کا دن تھا خوشی اور مسرت کا دن مگر۔ خوشی کہاں تھی؟ اس کی خوشی تو سارا تھی جو اس سے دور تھی۔

"یا رب مجھے ہمت دے میری برداشت میں بے حساب اضافہ کر دے میرے حوصلوں کو اتنا بلند کر دے میرے مولا کہ میں ٹوٹنے سے بچ جاؤں اپنی رحمت کی چادر سے میرے خالی وجود کو ڈھانپ لے میرے معبود نہ جانے کتنی دیر تک وہ ہاتھ اٹھائے رب کے حضور گریہ وزاری کرتی رہی اس کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو لڑیوں کی صورت میں بہہ رہے تھے دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ اپنے اللہ کو پکار رہی تھی۔ "مما" یہ کیسی پکار تھی جس نے اسے چونکا دیا تھا اس نے آنکھیں کھولیں تو آنسوؤں کی دھند کے اس پار اسے سارا کی صورت نظر آئی اپنا وہم سمجھ کر اس نے زور زور سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں سارا کا چہرہ واضح ہو گیا وہ اس کے سامنے کھڑی تھی زیبی تڑپ کر اٹھی یہ خواب یا وہم نہیں تھا سارا سچ مچ وہاں موجود تھی اس نے بے تابانہ آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اپنی پیاسی ممتا کو سیراب کرنے لگی وہ اسے بے تابی سے چوم رہی تھی اسے ہاتھ لگا کر اس کے ہونے کا یقین کر رہی وہ اب بھی بے تحاشا رو رہی تھی مگر اب رونے کی نوعیت بدل گئی تھی۔

"آج سارے آنسو بہا ڈالو۔۔۔ کیونکہ آج کے بعد میں تمہیں رونے نہیں دوں گا۔" سلمان کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا وہ سینے پر ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔

"سلمان۔۔۔ آ۔۔۔ آپ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ سارا۔۔۔ یہ کیسے کب آئی۔۔۔؟" اس کے ہونٹوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

"اسے میں لایا ہوں رات کو تم سو رہی تھیں میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا میں نے سوچا صبح تمہیں تمہارا تحفہ دوں گا ہاں۔۔۔ زیبی یہ تمہارا عید کا تحفہ ہے تمہاری اس گھر میں پہلی عید ہے نا۔ تمہارے لیے میری طرف سے عید کا سب سے خوبصورت تحفہ سارا اب ہمیشہ یہیں رہے گی اپنے بابا اور مما کے ساتھ کیوں سارا ٹھیک ہے نا۔" انہوں نے زیبی کی گود میں گھسی سارا سے پوچھا۔

"جی بابا۔"

"تو پھر بابا کی جان۔۔۔ ادھر آؤ بابا کے پاس۔" انہوں نے اپنی بانہیں وا کیں اور سارا ان کھلی بانہوں میں سما گئی زیبی کے لیے یہ دنیا کا سب سے خوبصورت منظر تھا اس کا دل آج سچی خوشی سے آشنا ہو رہا تھا۔

"میں اسے بیڈ پر لٹا کر آتا ہوں تاکہ یہ تھوڑی دیر اور سو لے پھر تم اس کے ہاتھوں پر مہندی لگا دینا۔" سارا کو گود میں اٹھائے کمرے سے باہر نکل گئے زیبی ابھی تک جائے نماز پر بیٹھی تھی سجدہ شکر اس پر واجب ہو چکا تھا۔

سلمان واپس آئے تو وہ جائے نماز تہ کر رہی تھی انہیں دیکھ کر اس کی چلتے ہاتھ رک گئے وہ بھی اس کے قریب آ کر رک گئے تھے۔

"سلمان۔۔۔ میں آپ کا شکریہ۔۔۔"

"پلیز زیبی مجھے اور شرمندہ نہ کرو شکریہ ادا کر کے میں پہلے ہی اپنی نظروں میں بہت گرا ہوا ہوں یہ تو میں نے اپنی نظروں میں ذرا سا بلند ہونے کی کوشش کی ہے میں اپنے مقام سے اتنا گر گیا تھا کہ مجھے خود سے نظر ملانا عذاب لگنے لگا تھا۔"

"مگر سلمان۔ آپ۔"

"آج صرف میری سن لو زیبی۔۔۔ پھر تم جو کہو گی میں سنوں گا تمہیں پتا ہے زیبی جب تم سارا کو چھوڑ آئیں تو میں کتنی کمینگی سے تمہیں جانچ رہا تھا میں منتظر تھا کہ کب تم میرے بچوں سے اپنا بدلہ چکاتی ہو انہیں سوتیلے پن کی آگ میں جھونکتی ہو میں انتظار کرتا رہا کرتا رہا مگر ایسا نہ ہوا میری کم ظرفی تو دیکھو کہ مجھے تم پر شدید غصہ آتا کہ تم آخر میرے سامنے گڑگڑاتی کیوں نہیں ہو میری منتیں کیوں نہیں کرتی ہو تمہاری انا پرستی اور تمہارا غرور مجھے اندر ہی اندر کھولاتا رہتا میں تمہارے غرور کو چکنا چور کر دینا چاہتا تھا پھر مجھے آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ جسے میں انا اور غرور سمجھ رہا ہوں وہ تو خود داری ہے تمہارے صبر تمہاری برداشت اور حوصلے نے مجھے پسپا کر دیا۔

پھر مجھے اپنی اوقات کا پتا چلا اور مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تمہاری اعلا ظرفی نے مجھے بتایا کہ میں کتنا کم ظرف ہوں تم نے تو اپنی ممتا کو سمندر کی طرح وسیع کر لیا لیکن میں اپنے دعوے میں جھوٹا پڑ گیا اور اس حوالے سے اپنی ذات میں ایک جوہڑ بن کر رہ گیا جس کے تعفن سے مجھے خود بھی سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔۔۔ تمہیں یاد ہے نا میں نے تمہارے ہاتھ میں امید کا ایک جگنو دیا تھا بدلے میں تم نے بھی دیا تھا تم نے تو اس ننھے سے دیئے سے میرے گھر کو روشن کر دیا مگر میں نے وہ ایک ہی پھونک میں بجھا دیا کیا تم مجھے پھر سے وہ جگنو دو گی زیبی۔ تاکہ میں بھی روشنی کے سفر میں تمہارا ساتھ دے سکوں۔۔۔ دو گی نا زیبی؟" وہ اسے کاندھوں سے تھامے پوچھ رہے تھے۔

"آپ نے مجھے اتنا کچھ دے دیا ہے سلمان کہ آپ میری جان بھی مانگ لیں تو مجھے انکار نہ ہو گا۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں میری جان۔ بس اپنی مسکراہٹ کا ایک جگنو دے دو میرا کام تو اس سے ہی چل جائے گا۔" انہوں نے تھوڑا سا جھک کر اس کا چہرہ دیکھا جہاں دھیرے دھیرے گلال سا پھیل رہا تھا اور ہونٹ مسکرانے لگے تھے۔

"تھینک یو زیبی اور بہت بہت عید مبارک ارے ہاں۔" وہ ذرا سا رکے "ایک چھوٹا سا تحفہ اور بھی ہے، ابھی دیتا ہوں۔" وہ الماری کی طرف بڑھے زیبی کا دل بڑی خوبصورت تال پر دھڑک رہا تھا اور نظریں سلمان کی طرف تھیں وہ مڑے تو ان کے ہاتھ میں خوبصورتی سے پیک کیا ہوا ایک پیکٹ تھا جو انہوں نے زیبی کو پکڑا دیا۔

"کیا ہے اس میں؟"

"کھول کر دیکھو نا کہ کیا ہے۔" اس نے پیکٹ کھولا تو اس میں وہی ست رنگی کانچ کی چوڑیاں تھیں جو اس نے رات کو چوڑیوں کے اسٹال پر دیکھی تھیں۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ نے کب خریدیں؟"

"جب گھر سے گیا تھا تو پہلے یہ چوڑیاں خریدیں پھر سارا کو لینے چلا گیا تھا واپس آیا تو تم اتنی گہری نیند سوئی ہوئی تھیں کہ میں نے سوچا کہ دونوں تحفے تمہیں صبح دوں گا تمہیں کانچ کی چوڑیاں چاہے اچھی نہ لگتی ہوں مگر یہ تم ضرور پہننا کیونکہ مجھے یہ اچھی لگتی ہیں اور میں نے بہت پیار سے لی ہیں پہنو گی نا۔"

"جی ضرور پہنوں گی مگر اب آپ نماز کی تیاری کریں عید کی نماز میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے اور ہاں آپ کو بھی بہت بہت عید مبارک۔" اس کی کھنکتی آواز سلمان کو سر سے پیر تک سرشار کر گئی تھی طمانیت کی ایک لہر ان کے پورے وجود میں سرائیت کر گئی۔

☼ ☼

نبیلہ عزیز

درِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابو امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۴
چودھویں قسط

کومل کے چہرے پہ اک واضح ناگواری تھی جو کسی اور کو تو نہ سہی لیکن آذر کو بڑی شدت سے محسوس ہوئی جس کی وجہ سے وہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود ڈائریکٹ کومل کے چہرے کی سمت دیکھنے پہ مجبور ہو تھا اور دوسری طرف کومل بھی اپنے چہرے پہ اس کی نظروں کی تپش اور اک الجھی ہوئی کھوج محسوس کر چکی تبھی ذرا سا پہلو بدل کر چہرے کا رخ موڑ لیا۔ لیکن آذر نے اپنی نظروں کا پہلو پھر بھی نہیں بدلا۔

"آذر......" دانیال نے اسے ٹھوکا دیا۔

"ہوں......؟" وہ بڑے الجھے ہوئے انداز میں متوجہ ہوا کیونکہ وہ ہنوز کومل کی سمت ہی دیکھ رہا تھا۔

"انوشہ تم سے کچھ کہہ رہی تھی شاید......؟" دانیال نے اسے یاد دلایا۔

"ہوں! سن رہا ہوں اور سب دیکھ بھی رہا ہوں مگر سمجھ نہیں پا رہا۔" آذر کا لہجہ پر سوچ اور مبہم سا تھا اس۔ دوبارہ اک اچٹتی سی نظر کومل پہ ڈالی' وہ اپنے قریب بیٹھی حرمت اور رانیہ کی سمت متوجہ ہو چکی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا...... کیا سمجھ نہیں پا رہے۔" انوشہ کو آذر کی بات سمجھ نہیں آئی تھی مگر دانیال سمجھ چکا تھا۔

"یہی کہ آپ لوگوں کا پروگرام کینسل ہونا چاہیے یا پھر اوکے؟" آذر بہت ٹھہر کے بات کر رہا تھا۔

"آذر بھائی پلیز! ہمارا پروگرام اوکے ہونا چاہیے کینسل نہیں' اسی لیے تو آپ کے سامنے یہ عدالت لگائی ہے' پلیز کچھ رحم کریں' فیصلہ ہمارے حق میں ہونا چاہیے۔" انوشہ انتہائی لجاجت سے بولی۔

"تو پھر میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو یہ کام علیزے سے کہنا چاہیے' ڈیڈ مجھے تو انکار کر سکتے ہیں لیکن علیزے کو نہیں۔" آذر نے کومل کے چہرے کے تاثرات دوبارہ جانچنے کے لیے جان بوجھ کر علیزے کا نام لیا لیکن اس بار شاید وہ اپنے تاثرات کنٹرول کر چکی تھی اس کا چہرہ نارمل تھا۔

"علیزے سے؟ لیکن وہ تو سو چکی ہو گی؟" انوشہ نے وال کلاک دیکھا پونے بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا! علیزے تو عشاء کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد ہی سونے کے لیے چلی جاتی تھی۔

"تو کوئی بات نہیں صبح کا انتظار کر لو' صبح بات کر لینا۔" آذر نے کندھے اچکائے۔

"علیزے جاگ رہی ہے۔" زین نے اندر داخل ہوتے ہوئے گڈ نیوز سنائی۔

"سچ......؟" انوشہ چہکی تھی۔

"سچ......" زین نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔

"مگر تمہیں کیسے پتا کہ علیزے جاگ رہی ہے......؟" انوشہ کو ایک اور سوال سوجھا تھا۔

"علیزے کی لاڈلی رجو ابھی ابھی اس کے بیڈ روم سے نکلتی ہوئی دکھائی دی ہے جس کا مطلب ہے کہ شہزادی علیزے اپنی خواب گاہ میں ابھی جاگ رہی ہیں' آپ نے اپنی کوئی عرضی پیش کرنی ہو تو کر سکتی ہیں۔" زین۔ صوفے پہ بیٹھ کے آلتی پالتی مارتے ہوئے شاہانہ انداز میں جواب سے نوازا تھا۔

"ارے واہ! یہ تو کمال ہو گیا' آج تو علیزے بھی جاگ رہی ہے......؟" احمد مسکرا کر بولا۔

"میں ابھی علیزے کو بلا کے لاتی ہوں......" انوشہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور وہ سب انوشہ کی پھرتی پہ ہنس پڑے تھے اب تو عائشہ آفندی کی طرح آذر اور دانیال بھی سارا تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انوشہ' علیزے کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"عائشہ پھوپھو کیسی ہیں آپ؟" علیزے سب کو سلام کرنے کے بعد سیدھی عائشہ آفندی کے پاس آئی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا' میں بالکل ٹھیک ہوں' تم سناؤ کیسی ہو؟" انہوں نے نرمی اور شفقت سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں' بس سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ انوشہ آپی نے بلا لیا۔" علیزے ان سب لوگوں کو اک نظر دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"تمہاری انوشہ آپی نے تمہیں کسی کام کے لیے بلایا ہے۔" عائشہ آفندی مسکرا کے بولیں۔

"کسی کام کے لیے......؟" علیزے نے سوالیہ نظروں سے انوشہ کی سمت دیکھا۔

"جی ہاں! کام کے لیے بلایا ہے کیونکہ یہ کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔" انوشہ نے تمہید باندھی۔

"کیسا کام......؟" علیزے کو حیرانی ہوئی۔

"ارے ڈیئر! کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے' بس یوں سمجھ لو کہ آب و ہوا تبدیل کرنے کا کام ہے۔" احمد نے بھی مداخلت کی۔

"کیا مطلب......؟ میں سمجھی نہیں۔" علیزے ان کی پہیلیاں نہیں بوجھ سکتی تھی۔

"مطلب کہ ان سب لوگوں کا گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے۔" آذر نے اس کی مشکل آسان کی تھی۔

"اوہ اچھا...... تو اس میں مشکل کیا ہے؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"مشکل یہ ہے کہ ان کا پروگرام مری اور اسلام آباد گھومنے کا ہے' لاہور کی سڑکوں سے نکل کر اسلام آباد کی سڑکوں پہ پھرنا چاہتے ہیں۔" آذر نے مزید اطلاع پہنچائی تھی جس پہ علیزے کو بھی اچنبھا ہوا تھا۔

"رئیلی......؟"

"آف کورس یار! اگر تم ساتھ دے دو تو؟" انوشہ کو خود میدان میں اترنا پڑا تھا۔

"میں ساتھ دے دوں......؟ وہ کیسے......؟" اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"ڈیڈ سے اجازت لے کر۔" انوشہ نے مدعا بیان کیا۔

"اوہ! تو یہ کام ہے؟" علیزے نے سر ہلایا۔

"ہاں یار! یہی کام ہے اور یہی سب سے مشکل کام ہے' جو صرف تم کر سکتی ہو۔"

"ہوں! وہ تو ٹھیک ہے لیکن......" علیزے چپ ہو گئی۔

"لیکن کیا......؟" انوشہ بے صبری سے بولی۔

"لیکن اگر پاپا نہ مانے تو؟" اس نے انکار کا خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم کوئی کام کہو اور وہ انکار کریں۔" انوشہ کو کامل یقین تھا کہ وہ مان جائیں گے۔

"تو پھر آذر بھائی سے کہیں کہ وہ پاپا سے اجازت لینے میں میرا ساتھ دیں' وہ میرے ساتھ چلیں۔" علیزے نے معصومیت اور سادگی سے کہا تھا لیکن ذرا فاصلے پہ بیٹھی کومل نے سانپ کی طرح پھنکار کے سر اٹھایا تھا اس کی نظروں میں کسی تلوار کی سی کاٹ تھی۔

"ارے ہاں! یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے آپ لوگوں کو ڈیڈ سے ایک ساتھ اجازت مانگنی چاہیے وہ آپ دونوں کو انکار نہیں کریں گے' آذر بھائی پلیز اٹھ جائیں' ورنہ ڈیڈ سو جائیں گے۔" انوشہ ہر طرف بس جلدی ہی مچا رہی تھی۔

"تو اچھا ہے نا صبح بات کریں گے۔ ڈیڈ کا موڈ بھی فریش ہو گا۔" آذر نے اسے روکنا چاہا۔

"نہیں صبح نہیں' ابھی بات کریں۔" وہ ضد پر اڑی ہوئی تھی اور اس کی ضد سے مجبور ہو کے آذر کو بالآخر اٹھنا ہی پڑا تھا انوشہ بھی آج اس کی نرمی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی اور آذر بھی اسے اس لیے انکار نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس کی اکلوتی پھوپھو کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس نے آج تک ان سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا' آج بھی نجانے کس موڈ میں تھی کہ یہ انوکھی فرمائش کر بیٹھی تھی...... اور آذر سے انکار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"چلو علیزے تم بھی ساتھ جاؤ اور سنو' اجازت لے کر ہی آنا۔" اس نے علیزے کو آذر کے ساتھ بھیجا اور

ساتھ ساتھ تاکید کرنا بھی ضروری سمجھا تھا' وہ دونوں ایک ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلے تھے لیکن باقی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی کومل نے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے آذر اور علیزے کو کافی تیز اور سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا' اس کے دل میں رقابت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالے....

"کومل! کیا دیکھ رہی ہو؟" حرمت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے متوجہ کیا تھا وہ یکدم چونک اٹھی تھی۔

"کچھ نہیں....." وہ مختصر سا جواب دیتی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" حرمت نے دوبارہ استفسار کیا۔

"میرا سر درد کر رہا ہے' اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔" وہ اپنی کنپٹی سہلاتے ہوئے بڑے ضبط سے کہتی وہاں سے چلی گئی اور حرمت پیچھے دیکھتی رہ گئی' کیونکہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے اصرار کر کے روک بھی نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے سمجھا سکتی تھی' اس کا موڈ پہلے ہی خراب تھا' غصے میں کچھ بول دیتی تو خواہ مخواہ تماشا بن جاتا' جبھی مجبوراً حرمت کو چپ ہو کے بیٹھنا پڑا تاکہ وہاں موجود اور لوگوں کو بھی کومل کے رویے کی خبر نہ ہو..... لیکن حرمت یہ نہیں جانتی تھی کہ دانیال بھی سب کچھ جانتا ہے اور اس وقت کومل کی تمام حرکتیں نوٹ کر رہا ہے' بالکل اسی طرح جس طرح حرمت کرتی تھی....

☼ ☼ ☼

"پاپا پلیز.... ! مان جائیں نا۔" علیزے نے التجائیہ انداز میں دہائی دی تھی۔

"دیکھو بیٹا! میں نے ان لوگوں کو اجازت دے دی ہے' کیا یہ کافی نہیں ہے.....!" وقار آفندی کافی سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

"تو پھر مجھے اجازت کیوں نہیں دے رہے آپ؟"

"بس تمہارے لیے کوئی اجازت نہیں ہے' تم گھر میں ہی ٹھیک ہو۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولے۔

"کیوں؟ میرے لیے اجازت کیوں نہیں ہے؟ میں بھی گھر سے نکلنا چاہتی ہوں' گھومنا پھرنا چاہتی ہوں' سب لڑکیوں کی طرح انجوائے کرنا چاہتی ہوں' پلیز۔" پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے کسی چیز پہ ضد کر رہی تھی اور وقار آفندی مان نہیں رہے تھے حالانکہ علیزے کے ایک بار کہنے پہ انہوں نے سب کو جانے کی اجازت دے دی تھی سوائے علیزے کو۔

"دیکھو بیٹا! تم اتنا طویل سفر کرو گی تو تھک جاؤ گی' دوسرے وہاں کا موسم بھی تمہیں سوٹ نہیں کرے گا' اور سب سے اہم بات کہ میں تمہیں اپنی آنکھوں سے دور بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا' جب تک تم گھر سے باہر رہو گی مجھے بے چینی ہوتی رہے گی' مری کے پہاڑ' کھائی اور دشوار ترین راستے اف توبہ' میں تمہیں وہاں بھیجنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا..... ہرگز نہیں۔" وہ سختی سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلا رہے تھے علیزے نے روہانسے انداز میں آذر کی سمت دیکھا وہ خاموشی اور دلچسپی سے دونوں باپ بیٹی کی بحث و تکرار سن رہا تھا لیکن علیزے کی گولڈن براؤن کانچ سی آنکھوں میں تیرتے شفاف پانیوں کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

"دیکھیے ڈیڈ! اگر علیزے نہیں جائے گی تو ہم بھی نہیں جائیں گے۔" آذر نے ایک دم سے فیصلہ سنایا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم.....؟" وقار آفندی آذر کو علیزے کے حق میں بولتے دیکھ کر خفگی سے گویا ہوئے۔

"تو اور کیا کہوں.....؟ ہم سب چلے گئے تو وہ اکیلی پیچھے کیا کرے گی۔" آذر کی بات پہ علیزے کو ڈھارس بندھ گئی تھی کہ چلو کوئی تو ہے میرا ساتھ دینے کے لیے....

"تو یہ وہاں جا کر بھلا کیا کرے گی۔" وہ ہنوز خفگی سے پوچھ رہے تھے۔

"نئے لوگ' نئے شہر' نئی جگہیں دیکھے گی' گھومے پھرے گی' باقی سب کی طرح انجوائے کرے گی' اور بھلا کیا کرنا ہے اس نے؟" آذر نے اس کی بھرپور حمایت کی تھی۔

"لیکن آذر تم جانتے ہو کہ....."

"ڈونٹ وری ڈیڈ! کچھ نہیں ہو گا' ہم سب ہیں نا ساتھ' اس کی ذمہ داری آپ مجھے سونپ دیں' جیسے لے کر جاؤں گا' ویسے لے کر بھی آؤں گا' یہ صرف آپ کی ہی علیزے نہیں ہے' ہماری بھی ہے' جتنی فکر آپ کو ہوتی ہے' اتنی ہمیں بھی ہوتی ہے' اسی لیے آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ میں علیزے کو آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔" آذر نے وقار آفندی کو کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی وہ چپ سے ہو گئے تھے۔

اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی آسیہ آفندی اپنے ہاتھوں سے سونے کی چوڑیاں اتارتے ہوئے ان لوگوں کی سمت دیکھ کر مسکرا رہی تھیں کیونکہ وقار آفندی ابھی بھی اجازت دینے سے پہلے تذبذب کا شکار تھے جبکہ آذر انہیں اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ڈیڈ! کیا خیال ہے آپ کا.....؟" اس نے انہیں سوچوں سے نکالا' آسیہ آفندی اور علیزے مسکراہٹ دبا گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے! یہ بھی جا سکتی ہے لیکن....." انہوں نے دل پہ پتھر رکھتے ہوئے بالآخر اسے بھی اجازت دے ہی دی تھی۔

"لیکن کیا.....؟" آذر نے ان کی ادھوری بات پہ استفسار کیا۔

"کچھ نہیں بعد میں بتاؤں گا' ابھی تم لوگ جا کر آرام کرو۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے بولے تھے۔

"ٹھیک ہے ڈیڈ! تھینک یو سو مچ۔" آذر فوراً صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی علیزے بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

"گڈ نائٹ پاپا' گڈ نائٹ مما۔" وہ ان دونوں سے مل کر آذر کے ساتھ ہی باہر نکل آئی تھی اور جیسے ہی وہ دونوں واپس ڈرائنگ روم میں پہنچے وہاں یکدم ہی اک ہلچل سی مچ گئی تھی سب کا جوش عروج پہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑے بڑے سرخ رنگلے پایوں والی مضبوط نواڑی چارپائی پہ اوندھے منہ لیٹا کافی گہری نیند سو رہا تھا جب باہر کوارٹر کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی اور نیند گہری ہونے کی وجہ سے پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں ہے.... اور یہ دستک کی آواز کہاں سے آ رہی ہے.....؟ لیکن چند سیکنڈ نیند سے بیدار ہوتے ذہن پہ زور ڈال کے سوچا تو ادراک ہوا کہ وہ بڑی حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں محو خواب ہے اور جیسے ہی اس کا ذہن اور اعصاب ٹھکانے پہ آئے تو اسے فوراً ہی اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ڈیوٹی سے لیٹ ہو چکا ہے' جبھی تو وہ یکدم تڑپ کے اٹھ بیٹھا تھا ادھ کھلی کھڑکی اور دروازے کے نیچے سے روشنی اپنا رستہ بنائے اندر چلی آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ باہر سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور ٹائم بھی کافی زیادہ ہو چکا تھا جس پہ منصور حسین کو پورا یقین تھا کہ مبارک خان اس کی کلاس لینے کے لیے آیا ہے اور اس طرح دھڑادھڑ دروازہ بجا رہا ہے لہٰذا منصور حسین نے اک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر باہر نکلنے کے لیے کوارٹر کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن مبارک خان کی بجائے شہزادی علیزے کی خادمہ کو دیکھ کر اس کے واپس مڑتے قدم تھم گئے تھے۔

"السلام علیکم۔" رجو نے بڑی تمیز سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔۔! فرمائیے کیا پیغام لائی ہیں آپ؟" منصور حسین نے کافی ٹھہرے ہوئے اور پرسکون انداز میں دریافت کیا تھا۔

"اندر آجاؤں؟" رجو اس کے کوارٹر کے دروازے سے باہر کھڑی اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔

"نہیں۔" منصور حسین نے جواباً" انکار کر دیا تھا' دوٹوک اور کھرا انکار۔

"کیوں منصور حسین؟ میں اندر کیوں نہیں آسکتی؟" رجو نے خفگی سے پوچھا تھا۔

"کیونکہ میں تمہیں اندر بلا کر مشکوک نہیں ہونا چاہتا' اس لیے جس کام سے آئی ہو' وہ کام بتاؤ۔" منصور حسین کے انداز میں کوئی لچک اور کوئی نرمی نہیں تھی رجو کو تو وہ اس اکھڑے انداز میں بھی دل کو لگ رہا تھا۔

"تمہارے ماتھے پہ بل سجتے ہیں' شاید اسی لیے ماتھے پہ بل ڈال کے بات کرتے ہو؟" وہ پھر بھی اسے سر سے باز نہیں آئی تھی۔

"مطلب کی بات کرو بی بی' کیوں آئی ہو؟" منصور حسین ایسی باتوں میں آنے والا نہیں تھا لیکن رجو تو اس پہ مٹی تھی۔

"مطلب کی بات ہی تو کر رہی ہوں منصور حسین' پر تم آنکھ ہی نہیں ملا رہے؟" رجو جیسے ناراضی سے بولی تھی۔

"دیکھو بی بی! میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں' کسی سے آنکھیں ملانے نہیں' میں بندہ بڑا کھرا ہوں' یا تو کام کرتا ہوں' یا کام کی بات سنتا ہوں' فضول میں وقت ضائع نہیں کرتا' اس لیے' بہتر یہی ہے کہ کام کی بات کرو' کیوں آئی ہو یہاں؟ کس نے بھیجا ہے؟" اس نے ایک بار پھر استفسار کیا تھا لیکن رجو صدمے کی سی کیفیت میں کھڑی اس کو دیکھ رہی تھی کتنا روکھا' کتنا کٹھور اور کتنا بے مروت ثابت ہوا تھا وہ۔۔۔۔ اور ایک وہ تھی جو اتنے دنوں سے اسے دیکھ کر ہی خوش اور فدا ہو رہی تھی۔

"اللہ حافظ۔۔۔۔" منصور حسین نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے اور دروازہ بند کر ڈالا تھا باہر جوں کی توں کھڑی رہ گئی تھی لیکن بند دروازے کو دیکھ کر اسے دوبارہ کچھ یاد آیا تو دروازے پہ ایک بار پھر دستک دے ڈالی لیکن منصور حسین نے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"تمہیں بڑے صاحب نے بلایا ہے منصور حسین' ان کی بات سنو جا کر۔" رجو نے مجبوراً" باہر سے ہی آواز دے کر پیغام دیا تھا۔

"کیوں بلایا ہے۔۔۔۔؟" اب کی بار اس نے فوراً" دروازہ کھول دیا تھا وہ کندھے پہ تولیہ رکھے ہوئے تھا یقیناً نہانے کے لیے باتھ روم کی سمت جا رہا تھا۔

"ان ہی سے جا کر پوچھ لو۔۔۔۔" رجو کہہ کر پلٹ گئی تھی۔

"ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے پرسوچ سے انداز میں کہتے ہوئے سر ہلایا۔ دس منٹ بعد وہ تیار ہو کر سیدھا وقار آفندی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

"سلام صاحب!"

"وعلیکم السلام! منصور حسین کیسے ہو۔۔۔۔؟" وہ علیزے کا ملازم تھا اس لیے وقار آفندی اسے ایک الگ پروٹوکول دیتے تھے۔

"اللہ کا کرم ہے صاحب۔" وہ شکر گزاری سے بولا۔

"کوئی پریشانی کوئی تنگی تو نہیں ہے نا یہاں؟"

"نہیں صاحب! سب ٹھیک چل رہا ہے۔"

"کسی چیز پہ کوئی اعتراض یا پریشانی ہو تو بتا دینا۔"

"جی ضرور۔"

"گاڑی سروس کروائی تم نے؟"

"نہیں صاحب! ابھی تک تو نہیں کروائی' ایک دوبار مبارک خان اور عارف وغیرہ کے ساتھ مل کر خود ہی گاڑی کو چیک کالیا تھا۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"جو کام جس کا ہو اسے ہی اچھا لگتا ہے' نئی گاڑی ہے اسے پراپر طریقے سے سروس کروانا چاہیے تھا تمہیں۔"

"آپ کہتے ہیں تو آج ہی کروا لیتا ہوں۔۔۔۔؟" وہ مؤدب سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"ہوں! اس لیے تو تمہیں بلایا ہے کہ تم آج کا دن تمام ضروری کام نبٹالو' کل تو تم لوگوں نے نکلنا ہوگا۔" وقار آفندی کافی آرام اور سکون سے بات کر رہے تھے لیکن منصور حسین ان کی بات پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"آج کے دن کام نبٹالوں؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔۔؟" اس نے ناسمجھی سے استفسار کیا تھا۔

"ارے بھئی! میرا مطلب ہے کہ کل جانا ہے آپ لوگوں نے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"مری اور اسلام آباد۔"

"کیوں صاحب؟ خیریت۔" اس نے ٹھٹک کے پوچھا تھا۔

"منور حسین! تم بھی شاید پاگل ہی ہو' مری اور اسلام آباد لوگ کیوں جاتے ہیں بھلا۔۔۔۔؟"

"ہنی مون منانے۔" منصور حسین کا برجستہ جواب آیا تھا جس پہ وقار آفندی بھی سٹپٹا گئے تھے تب منصور حسین کو بھی احساس ہو گیا۔ کہ وہ بے ساختگی میں کافی غلط بات کہہ گیا ہے۔

"میرا مطلب ہے کہ لوگ تو ہنی مون منانے بھی جاتے ہیں' پکنک منانے بھی جاتے ہیں اور وہ انگلش کا کیا لفظ ہے۔۔۔۔؟ ہاں وہ کیا کہتے ہیں کہ ہالیڈیز بھی منانے جاتے ہیں۔" منصور حسین نے فوراً" بات سنبھالی تھی تبھی وقار آفندی بھی تھوڑا ریلیکس ہو گئے تھے۔

"ہاں یہ سب بھی ہالیڈیز منانے جا رہے ہیں' میں نے تو علیزے کو منع کیا تھا لیکن وہ ضد کر رہی تھی اس لیے مجبوراً" اسے بھی بھیج رہا ہوں' لیکن تمہاری ذمہ داری پہ۔" انہوں نے منصور حسین کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"میری ذمہ داری پہ۔۔۔۔؟"

"ہاں! تمہاری ذمہ داری پہ' تمہیں اس کی حفاظت کرنا ہوگی' اس کے آس پاس کڑی نظر رکھو گے اور اس کے آس پاس ہی رہو گے' جو بھی نوٹس کرو گے فوراً" بتا دینا' ایسی ویسی کوئی پرابلم بن جائے تو تم اسلحہ بھی استعمال کر سکتے ہو' ریوالور تو پہلے ہی تمہارے پاس ہے یہ گولیاں بھی رکھ لو' اس میں کچھ اور سامان بھی ہے احتیاط سے رکھنا۔" وقار آفندی ایک چھوٹا سا بیگ اس کی سمت بڑھا رہے تھے۔

"لیکن صاحب! گاڑی میں یہ سب کیسے جا سکتا ہے۔۔۔۔؟"

"کچھ نہیں ہوگا' تم بے فکر رہو' علیزے کی گاڑی کو کسی بھی چیک پوسٹ پہ نہیں روکا جائے گا' میں نے سارا انتظام کر دیا ہے اور ویسے بھی تمہارے پاس لائسنس بھی تو ہے نا؟ تم کون سا کوئی غیر قانونی چیز لے کر جا رہے ہو۔۔۔۔؟ یہ سب تو علیزے کی حفاظت کے لیے ہے' تمہارا ریوالور چوبیس گھنٹے لوڈڈ ہونا چاہیے' اس معاملے میں ذرا سی کوتاہی بھی معاف نہیں ہوگی۔" وقار آفندی اس کی برین واشنگ کر رہے تھے اور منصور حسین ہر بات پہ سر ہلا رہا تھا۔

"ابھی تم گاڑی سروس کروا کے آؤ' باقی باتیں تمہیں بعد میں سمجھاتا ہوں۔" انہوں نے منصور حسین کو جانے

کا اشارہ کیا جس پہ وہ فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔

"جی بہتر۔"

"گڈ! اب تم جا سکتے ہو۔"

"مہربانی صاحب۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

"اور سنو۔"

"جی۔۔۔؟"

"کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ تم اسلحے سے لوڈڈ ہو' خود علیزے کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔" انہوں نے اسے تاکید کی تھی۔

"جیسے آپ کا حکم۔" اس نے سر جھکا دیا۔

"اوکے! جا سکتے ہو تم۔۔۔" انہوں نے کہہ کر اخبار اٹھا لیا تھا اور منصور حسین اس مردان خانے سے نکل آیا تھا لیکن وہ ان لوگوں کے اس اچانک پروگرام پہ سخت کوفت اور بےزاریت کا شکار ہوا تھا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اتنے طویل سفر' مسلسل خاموشی اور اتنے گھنٹے لگاتار ڈرائیونگ سے کیا حال ہو گا۔۔۔ اور اسی حال کو سوچتے ہوئے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو منصور حسین۔۔۔؟" مبارک خان اسے گاڑی کی سمت بڑھتے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔

"گاڑی سروس کروانے۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ اچھا۔۔۔! علیزے بی بی نے مری جانا ہے نا اس لیے۔" مبارک خان کو شاید پہلے سے پتا تھا اس لیے منصور حسین کے بتانے سے پہلے ہی بول پڑا تھا۔

"جی ہاں! مری جانا ہے اس لیے۔" اس کا موڈ آف تھا اسی لیے کوفت زدہ سے انداز میں بولا تھا۔

"کیا بات ہے یار؟ تمہارا موڈ کیوں خراب ہو رہا ہے۔۔۔؟" مبارک خان نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"یار تم خود سوچو' اتنا طویل سفر' اتنی تھکاوٹ اور حاصل وصول کچھ بھی نہیں' ایسے میں موڈ تو خراب ہو گا ہی۔" منصور حسین کے چہرے پہ ہلکے غصے کا اثر تھا مبارک خان گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اسے۔

"حاصل وصول کیوں نہیں ہے؟ اس کام کے' اس نوکری کے پیسے نہیں لیتے تم۔۔۔؟ ماہانہ تنخواہ لیتے ہو' آخر کس لیے۔۔۔؟ اس کام کے لیے نا۔۔۔؟ تو پھر یہ بےزاری اور غصہ کیوں ہے۔۔۔ کون سا مفت میں کام کر رہے ہو۔۔۔ اگر یہ ڈرائیونگ اتنا ہی مشکل کام ہے تو نوکری چھوڑ دو' کہیں اور نوکری کر لو' کسی بینک یا کسی آفس میں۔" مبارک خان کی ڈیوٹی تھی کہ وہ گھر کے ضروری کاموں کے علاوہ تمام ملازموں پہ نظر رکھے اور انہیں ہدایت سے نوازتا رہے' جبھی آج منصور حسین کا موڈ دیکھ کر بھی وہ چپ نہیں رہ سکا تھا بےشک منصور حسین کے ساتھ اس کی کافی انڈراسٹینڈنگ اور دوستی ہو چکی تھی لیکن اصول پھر بھی اصول تھے' وہ ذات کا پٹھان تھا' حق بات کہنے سے باز نہیں آ سکتا تھا۔۔۔ جبکہ منصور حسین اس کی شکل دیکھ رہا تھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ مبارک خان نے اسے سخت لہجے میں اسے کھری کھری سنائی ہیں۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا مبارک خان' ورنہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ میری ڈیوٹی ہے' علیزے بی بی جہاں بھی جائیں مجھے ان کے ساتھ جانا ہو گا۔" منصور حسین افسوس سے کہہ رہا تھا اسے مبارک خان کی بات پہ دکھ ہوا تھا کتنی جلدی ڈانٹ دیا تھا اس نے۔۔۔

"لیکن میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔" مبارک خان کا انداز اب بھی نپا تلا سا تھا

"ہوں! بہت اچھا کیا ہے تم نے۔" اس نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے تم جاؤ اب' کام کرواؤ اپنا۔" مبارک خان کہہ کے اندر چلا گیا تھا اور منصور حسین بےدلی سے گاڑی میں بیٹھ گیا تھا گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسے خود بخود ہی رجو کا خیال آ گیا تھا۔

صبح اٹھتے ہی خود اس نے بھی تو رجو کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپنایا تھا اس بےچاری کو بھی تو اتنا ہی افسوس اور دکھ ہوا ہو گا۔۔۔؟ اللہ نے چند منٹوں میں ہی اس کا بدلہ لے لیا تھا اور منصور حسین کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ جیسا سلوک ہم کسی کے ساتھ کرتے ہیں' ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ لہٰذا اس نے آئندہ کے لیے اللہ سے معافی مانگ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بھائی۔۔۔! بھائی۔۔۔! پلیز جلدی اٹھیں ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" عدیل دن بھر کا تھکا ہارا چھت پہ چارپائی ڈالے کافی گہری نیند سو رہا تھا جب اچانک ایمن نے آ کر اسے جھنجھوڑ کے جگا دیا تھا۔

"ابا جی کی طبیعت؟ کیا ہوا ہے انہیں؟" عدیل بھی اس اچانک افتاد پہ گھبرا گیا تھا۔

"ان کے سینے میں بہت شدید درد ہے' بہت تکلیف میں ہیں وہ۔" ایمن کی آواز بھرا گئی تھی اور عدیل یکدم چادر پرے پھینک کے اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنے چپل پہن کر تیز تیز قدم اٹھاتا وہ پانچ سیکنڈ میں سیڑھیاں اتر آیا تھا۔

"امی! کیا ہوا ہے ابا جی کو۔۔۔؟" عدیل کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک سو رہے تھے' میری بھی آنکھ لگ گئی تھی' لیکن جیسے ہی کروٹ بدلی تو ان کی طرف نظر اٹھ گئی' تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تکلیف میں ہیں اور کراہ رہے ہیں' اٹھ کر پتا کیا ہے تو اپنے سینے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ سینے میں درد ہے' اب تو ان سے کراہنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔" امی بھی ابا جی کو تکلیف میں دیکھ کر رو رہی تھیں مریم اور ایمان ابا جی کے قریب جھکی ان کا سینہ سہلا رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پہ تکلیف کے آثار کم نہیں ہو رہے تھے بلکہ اور بڑھ رہے تھے۔

"آپ حوصلہ رکھیں میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں' انہیں ہسپتال لے چلتے ہیں۔" عدیل عجلت سے کہتا الٹے پاؤں باہر نکل گیا تھا۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا گلیوں میں ہونے والی چہل پہل اور شور ہنگامہ ماند پڑ چکا تھا لوگ اب اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند سو رہے تھے عدیل اپنی گلی سے تقریباً بھاگتا ہوا مین روڈ تک آیا تھا۔۔۔ مین روڈ روشنیوں سے بھرا پڑا تھا بےفکرے لوگ موج مستی میں مگن تھے ایسے میں وہ اکیلا فکرمند سا ٹیکسی کی تلاش میں مسلسل ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"ٹیکسی۔" اس نے اک ٹیکسی کو قریب آتے دیکھا تو فوراً سامنے آ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بمشکل بریک لگائے تھے۔

"دیکھیے بھائی صاحب! میرے والد صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے انہیں ہسپتال لے کر جانا ہے پلیز۔۔۔" عدیل دیکھ چکا تھا کہ ٹیکسی میں پہلے سے دو سواریاں موجود ہیں پھر بھی التجا کر ڈالی تھی۔

"معذرت چاہتا ہوں صاحب' میں نے یہ سواریاں ایئرپورٹ چھوڑنی ہیں ان کی فلائیٹ مس ہو جائے گی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے انکار کر دیا تھا۔

"دیکھیے کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے پلیز کچھ خیال کریں۔" عدیل روہانسا ہو گیا تھا۔

"دیکھو صاحب! خوامخواہ گلے مت پڑو' جاؤ کسی اور ٹیکسی والے سے کہو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی اک جھٹکے سے

آگے بڑھالی عدیل اچھل کے پیچھے ہوا تھا ورنہ یقیناً ”فٹ پاتھ پہ جا گرتا۔

”ٹیکسی.....“ اچانک اک اور ٹیکسی اس کے سامنے سے گزری تھی لیکن اس نے بھی عدیل کی آواز نہیں سنی تھی۔

”آٹو.....“ اب کی بار اسے سڑک کی دوسری جانب ایک رکشا دکھائی دیا اور عدیل اندھا دھند اس رکشے کی سمت دوڑ پڑا۔

”ہیلو بھائی صاحب! ہسپتال چلنا ہے۔“ اس نے رکشے میں آڑے ترچھے سوئے ڈرائیور کو بازو ہلا کر متوجہ کیا وہ نیند سے کسمسا کر بمشکل سیدھا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے باؤ جی.....؟“ رکشا ڈرائیور نے اپنی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہسپتال جانا ہے‘ ایک مریض کو لے کر‘ بہت ایمرجنسی ہے پلیز.....“

اس مصیبت کے عالم میں تو یوں لگ رہا تھا جیسے شہر کا شہر ویران اور سنسان ہو گیا ہو‘ جہاں وقت پڑنے پہ کوئی سواری ہی نہ مل رہی تھی۔

”معاف کرنا باؤ جی! میرا رکشا تو صبح سے خراب ہے‘ یہ کم بخت ٹھیک ہوتا تو میں اتنے آرام سے یوں نہ سو ہوتا‘ تمہیں ضرور ساتھ لے چلتا۔“ اس رکشا ڈرائیور نے بھی معذرت کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی تھی اور عدیل کے ماتھے پہ پریشانی سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا کہ نجانے گھر میں تکلیف کے مارے ابا جی کی کیا حالت ہو رہی گی اور اسے یہاں کوئی ٹیکسی یا رکشا وغیرہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے اور روہانسے سے انداز میں اوپر آسمان کی سمت دیکھا تھا آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے اور دل کی گہرائیوں سے فریاد نکلی تھی۔

”یا اللہ.....! رحم فرما.....“ اس نے اس مشکل اور کڑے وقت میں اپنے رب کو پکارا۔ جو کبھی بھی کسی کو مایوس نہیں کرتا۔ اس کے الفاظ بھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کے پیچھے اچانک کسی گاڑی کے ٹائر چرچرا تھے اور زوردار ہارن بجا۔ کیونکہ وہ اپنی بے دھیانی میں سڑک کے بیچوں بیچ چل رہا تھا۔

عدیل نے گاڑی کے ہارن پہ یکدم تڑپ کے اپنے پیچھے دیکھا تھا اور آنکھیں چندھیا گئی تھیں گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے گاڑی ڈرائیو کرنے والے کو دیکھ نہیں پایا اور لپک کے گاڑی کے قریب آ گیا تھا لیکن ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان لڑکی کو دیکھ کر اس کی رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی تھی عدیل کو اس لڑکی سے ہونے والی پچھلی دونوں ملاقاتیں بخوبی یاد تھیں اس لیے اس سے توقع رکھنا فضول تھا جبھی وہ کچھ کہنے سے پہلے ہی چپ ہو گیا تھا۔

”لگتا ہے کسی گاڑی کے نیچے آ کر مرنے کا بہت شوق ہے تمہیں.....“ وہ غصے سے چبا کر بولی تھی لیکن عدیل نے جواباً کچھ بھی کہے بغیر قدم پیچھے ہٹا لیے تھے۔

”او مسٹر ہیرو.....! میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں؟“ وہ گاڑی سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

”مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔“ عدیل بڑے کرب سے بولا تھا اپنے اندر کے بے بسی کے غبار کو وہ بمشکل ضبط کر رہا تھا۔

”بہرے ہو گئے ہو.....؟“

”ہاں! اندھا بھی ہو گیا ہوں۔“ اس کے لہجے میں اذیت تھی جو فی الحال مدحیہ حیات محسوس کرنے سے قاصر تھی۔

”تو پھر اندھے اور بہرے ہو کر سڑکیں کیوں چھان رہے ہو..... کوئی گاڑی روند کے گزر جائے گی۔“ وہ طنزیہ بولی

رہی تھی۔

”اس وقت ہر گاڑی مجھے روند کر ہی گزر رہی ہے میڈم.....“ عدیل کی آواز دکھ سے لرز رہی تھی اور شکست خوردہ سا لہجہ بھی چھپ نہیں رہا تھا پہلی بار مدحیہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

”وجہ پوچھ سکتی ہوں؟“

”وجہ پوچھ کر کیا کریں گی؟“

”یہ تو بعد کا مسئلہ ہے نا‘ پہلے وجہ تو بتاؤ۔“

”میرے بابا کی طبیعت خراب ہے‘ وہ بہت تکلیف میں ہیں اور مجھے کوئی رکشا یا ٹیکسی نہیں مل رہی‘ پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اسی سڑک پہ چکرا رہا ہوں۔“ اس نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا اور مدحیہ اس کی بات پہ ٹھٹک گئی تھی اس نے عدیل کو سرتاپا گہری نظروں سے دیکھا تھا اس کا حلیہ بتا رہا تھا جیسے ابھی ابھی سوتے سے اٹھ کر آیا ہو۔

”تم کوئی ڈرامہ تو نہیں کر رہے.....؟“ وہ مشکوک سے لہجے میں بولی تھی اور عدیل کا ضبط جواب دے گیا تھا وہ پھٹ پڑا تھا۔

”میں ایک مجبور اور بے بس انسان ہوں‘ اس وقت اپنے باپ کی موت کے خوف سے سڑکوں پہ مارا مارا پھر رہا ہوں اور آپ جیسے امیر اور عیاش لوگ اپنی گاڑیوں میں گزرتے ہوئے یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی آوارہ‘ کوئی موالی شاید ڈرامے کرتا پھر رہا ہوں‘ آپ لوگ کبھی ایسے حالات سے دوچار ہوئے ہوں تو آپ کو کسی دوسرے کا احساس ہونا.....؟ ہر چیز کی سہولت نے آپ لوگوں کے اندر بے حسی پیدا کر دی ہے‘ زیرو میٹر گاڑی میں بیٹھ کر پیدل چلنے والوں کو آپ لوگ کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں‘ جنہیں روند کر گزرنے پہ بھی کوئی پروا نہیں ہوتی آپ کو‘ میں نے اسی لیے کہا تھا آپ سے کہ وجہ مت پوچھیں‘ اگر پوچھ بھی لیں گی تو کیا کریں گی آپ.....؟ ڈرامہ باز کہہ کر گزر جائیں گی‘ بس اور کیا کریں گی.....؟ جائیں گزر جائیں‘ جہاں پورے شہر کی گاڑیاں گزر رہی ہیں وہاں آپ کی بھی گاڑی گزر گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا‘ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے‘ اگر میرے ابا جی کی زندگی باقی ہے تو کوئی بھی چیز انہیں موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی۔“ عدیل کا سارا غصہ اور سارا غبار مدحیہ پہ نکل گیا تھا اور وہ حیران پریشان اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی مگر وہ تلخی سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تھا۔

”ٹیکسی۔“ ایک بار پھر وہ کسی ٹیکسی کے پیچھے بھاگا تھا لیکن یہاں بھلا کون سننے والا تھا..... تیز رفتار ٹیکسی زناٹے سے گزر گئی تھی اور عدیل شکستہ سا واپس گھر کی سمت چل پڑا تھا ابھی کچھ دور آیا تھا کہ پیچھے ایک بار پھر ہارن بجا عدیل بغیر رکے چلتا رہا لیکن اب کی بار مدحیہ نے ہارن پہ ہاتھ رکھ کے ہٹایا نہیں تھا عدیل نے تلخی سے پلٹ کر دیکھا۔

”کیا مسئلہ ہے میڈم.....؟“ وہ زہر سے بھرا ہوا تھا۔

”بیٹھو گاڑی میں۔“ اس نے کہتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور عدیل گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر ڈانواں ڈول سا ہو گیا تھا کوئی اور وقت ہوتا تو شاید منہ موڑ کے آگے بڑھ جاتا لیکن اس وقت وہ غصے کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا خاموشی سے کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھ گیا تھا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔

”اپنے گھر کا راستہ بتاؤ۔“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی اور عدیل سنجیدگی سے اسے راستہ سمجھانے لگا۔ وہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھا چکی تھی اور چند منٹ بعد ہی وہ اس کی مطلوبہ گلی کے نکڑ پہ گاڑی کھڑی کر کے سیدھی ہوئی تھی۔

”اب.....؟“ اس نے عدیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”آپ یہیں ٹھہریں‘ میں انہیں لے کر آتا ہوں۔“ عدیل کہہ کے عجلت سے نیچے اتر آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پہ آ رکا تھا۔

"امی! دروازہ کھولیں۔" اس نے دستک دی پانچ سیکنڈ میں ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

"بھائی.....! اتنی دیر لگادی آپ نے۔" مریم کے چہرے پہ بدحواسی ناچ رہی تھی۔

"ٹیکسی نہیں مل رہی تھی، ابھی بھی کسی کی گاڑی ملی ہے، ٹیکسی نہیں ملی۔" وہ بتاتے ہوئے ابا جی کی طرف بڑھا وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھے عدیل نے انہیں بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔

"میں ساتھ چلوں.....؟" عابدہ خاتون آگے بڑھیں۔

"نہیں امی! گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے، رات کے اس پہر یہ سب اکیلی کیسے رہیں گی، حالات تو ویسے ہی بہت خراب ہیں۔" عدیل نے منع کردیا۔

"تو پھر میں ساتھ چلتی ہوں، آپ اکیلے کہاں کہاں بھاگ دوڑ کریں گے۔" مریم، عابدہ خاتون کو رکتے دیکھ کر تیار ہوگئی تھی۔

"لیکن مریم۔" عدیل نے روکنا چاہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے مریم، وہ ساتھ چلی جاتی ہے جاؤ مریم چادر لے آؤ۔" عابدہ خاتون نے اشارہ کیا تھا اور عدیل کے پیچھے پیچھے مریم بھی نکل آئی۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ سے پشت ٹکائے بیٹھی اس شخص کی واپسی کا انتظار کررہی تھی جس کے نام سے بھی واقف نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کا انتظار کررہی تھی، نجانے اسے کیا ہوا تھا کہ وہ بنا سوچے سمجھے اس کے ساتھ چلی آئی تھی ورنہ اتنی نرم اور حساس تو وہ کبھی بھی نہیں تھی جتنی آج ثابت ہوئی تھی اور وہ اپنے اس اقدام پہ خود بھی بہت حیران تھی لیکن جو بھی تھا وہ کسی کو یوں مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی، اس شخص کی پریشانی سن کر وہ اپنا دا بھر کا غم و غصہ بھی بھول گئی تھی اور ساتھ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اس شخص کے ساتھ ہونے والی پہلی دو ملاقاتیں کیسی گزری تھیں۔

جن کے بعد وہ اس شخص کا خون پی جانے کے درپے ہوجاتی تھی، اسے پورا پورا دن گالیوں سے نوازتی رہتی بلکہ اس کا بس چلتا تو وہ اسے یقیناً" قتل بھی کرڈالتی، لیکن آج وہ اسی شخص کو اپنی گاڑی میں اپنے ساتھ اپنے برابر بٹھا کے لائی تھی، وہ بھی محض اس کی مدد کرنے کی خاطر.....

وہ انہی سوچوں میں گم چپ بیٹھی سامنے ونڈ اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی جب وہ شخص گلی سے نکل کر گاڑی کی سمت آتا دکھائی دیا تھا مدحیہ اسے دیکھ کر گاڑی سے اتر آئی اور گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا۔

"تھینک یو۔" عدیل نے اسے تھینکس کہہ کر بمشکل نیچے جھکتے ہوئے ابا جی کو پچھلی سیٹ پہ لٹایا اس کے پیچھے مریم بھی آرکی لیکن وہ گاڑی کے قریب کھڑی مدحیہ کو دیکھ کر ٹھٹک کے رک گئی۔

"مریم! تم پیچھے بیٹھ جاؤ۔" عدیل ابا جی کو لٹا کے سیدھا ہوا تو مریم کو بیٹھنے کا کہا جو حیران نظروں سے مدحیہ کو دیکھ رہی تھی البتہ مدحیہ نے اسے بڑے نارمل بلکہ سرسری سے انداز میں دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی۔

"چلیں.....؟" عدیل نے مدحیہ کی سمت دیکھا۔

"اوکے....." وہ کندھے اچکا کر دوسری سائیڈ سے گھوم کے ڈرائیونگ سیٹ پہ آبیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کردی مریم اور عدیل بھی بیٹھ چکے تھے وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے مین روڈ تک لے آئی تھی۔

"کون سے ہاسپٹل جانا ہے۔" مدحیہ نے سنجیدگی سے پوچھا لیکن مریم چونک گئی تھی اس لڑکی کے لب و لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ لندن پلٹ ہے مریم پچھلی سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی اسی لیے مدحیہ اسے صرف ایک سائیڈ سے ہی دکھائی دے رہی تھی مریم کی نظر اس کی گداز دودھیا کلائی اور مخروطی ہاتھوں پہ ٹھہر گئی تھی۔

اس کی کلائی میں خوب صورت اور نفیس سے دو بریسلٹ سجے ہوئے تھے اور نفاست سے ترشے ہوئے ناخنوں

پہ شاکنگ پنک کلر کی نیل پالش اس کے دودھیا ہاتھوں کو دو آتشہ بنا رہی تھی۔ اس کا ایسا جائزہ تو عدیل نے بھی نہیں لیا تھا جیسا مریم لے رہی تھی۔ جبکہ مدحیہ کو خبر بھی نہیں تھی کہ پیچھے بیٹھی لڑکی اتنے غور سے اسے دیکھ رہی ہے۔

"بتائیے نا کہاں جانا ہے آپ نے؟ کون سے ہسپتال کی طرف ٹرن لوں.....؟" مدحیہ نے ایک بار پھر عدیل کو مخاطب کیا تھا۔

"میو ہسپتال، یہ یہاں کا سب سے بڑا سرکاری ہسپتال ہے۔" عدیل نے بتایا اور ساتھ ہی راستہ بھی بتانے لگا۔ جس پہ مدحیہ نے چونک کر دیکھا تھا گویا وہ لوگ کسی پرائیویٹ ہسپتال کا خرچہ بھی افورڈ نہیں کرسکتے تھے؟ مدحیہ اس شخص کے حالات پہ حیران ہورہی تھی اور مریم اس لڑکی پہ.....! وہ اتنی پریشانی کے باوجود اس لڑکی کے متعلق سوچ رہی تھی بلکہ گاڑی میں موجود وہ تینوں نفوس ہی کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے اور ان کی سوچوں کا تسلسل مدحیہ کے موبائل کی رنگ نے توڑا تھا ڈیش بورڈ پہ رکھے موبائل کی نیلی لائٹس بار بار روشن ہورہی تھیں مدحیہ نے موبائل اٹھا کر کال ڈس کنکٹ کردی لیکن پانچ سیکنڈ کے وقفے سے دوبارہ رنگ بجنے لگی کال کرنے والا نبیل تھا جو اسے دوپہر سے تقریباً" سو مرتبہ کال کرچکا تھا اور مدحیہ اسے ایک ہی جواب دے کر فون بند کردیتی اس وقت بھی اس نے موبائل آن کرکے بولنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ ان کے بولنے کا انتظار کیا تھا۔

"مدحیہ پلیز! رات بہت ہوگئی ہے، گھر واپس آجاؤ، جو بھی بات کہنی ہے، گھر آکر کہو، پلیز میری بات مان لو۔" نبیل اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"ایم سوری بھائی! میں نے آپ کو پہلی کال میں ہی بتادیا تھا کہ جب تک وہ اس گھر میں ہیں، میں نہیں آؤں گی، بس بات ختم، آپ انہیں نکال دیں، میں ابھی آجاتی ہوں۔" مدحیہ نے سرد سے لہجے میں لاپروائی سے کہا تھا جس پہ عدیل نے ٹھٹک کر اس کی سمت دیکھا کتنی سخت تھی وہ لڑکی، اس کی کاٹ تو اس کے تیکھے نقوش سے ہی ظاہر ہوجاتی تھی، معاف کرنے والوں میں سے تو ہرگز نہیں تھی۔ پھر بھی عدیل کے ساتھ آگئی تھی..... عدیل کو حیرت نے چھوا تھا۔

"دیکھو مدحیہ! وہ بابا ہیں ہمارے، میں کیسے ان کو گھر سے نکال سکتا ہوں.....؟"

"اوکے! میں تو گھر سے نکل چکی ہوں نا.....؟ آپ کیوں بار بار کال کرکے مجھے ڈسٹرب کررہے ہیں.....؟ دوبارہ کال نہ کیجیے گا، اللہ حافظ۔" اس نے کہہ کے کال بند کی اور موبائل ڈیش بورڈ پہ پٹخ دیا تھا وہ دونوں بہن بھائی چپ چاپ اس کی گفتگو سنتے رہ گئے اور اس نے میو ہسپتال کی پارکنگ میں گاڑی اک جھٹکے سے لاکے پارک کی تھی اور گاڑی کے آٹومیٹک لاک کھول دیے تھے عدیل تیزی سے نیچے اتر گیا اور پھر آناً" فاناً" وہ لوگ اپنے ابا جی کو اسٹریچر پہ ڈال کے اندر لے گئے اور مدحیہ وہیں پارکنگ میں کھڑی رہ گئی اور اپنی بھاگ دوڑ میں عدیل کو اس کا خیال ہی نہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنا پن ہی اک بیگانے پن میں ہے
پورا عالم اک دیوانے پن میں ہے
یہ جو میں تم سے انجان بنا پھرتا ہوں
ساری بات ہی اسی انجانے پن میں ہے

عبداللہ کی ڈائری میں تحریر یہ شعر پڑھتے پڑھتے زری کی آنکھیں خوشی اور بے یقینی سے چمک اٹھی تھیں وہ

عبداللہ کے چھوٹے سے اسٹڈی روم سے نکل کر ننگے پاؤں نیچے کی طرف بھاگی تھی۔

"بھابھی…! بھابھی… ! کہاں ہیں آپ!" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے زور زور سے پکارتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔

"یا اللہ خیر… ! کیا آفت آگئی ہے؟" نگارش گھبرا کر دل پہ ہاتھ رکھتی ہوئی کچن سے باہر نکلی آئی اس کے ہاتھ میں چمچہ تھا وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی اور باقاعدہ ایپرن بھی باندھ رکھا تھا۔

"یہ شعر… یہ شعر پڑھا آپ نے؟" اس نے عبداللہ کی ڈائری نگارش کے سامنے لہرائی اور نگارش نے اس بات پہ تلملا کر اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

"اُف اللہ! تمہارے یہ شعر… کیا کروں میں ان شعروں کا… دن رات انہی میں چکراتی رہتی ہو' بلکہ مجھے بھی چکرا کے رکھ دیا ہے۔" نگارش نے خفگی سے کہتے ہوئے اسے گھور کے دیکھا تھا۔

"دل کو بہلاتی ہوں بھابھی۔ خوب صورت لفظوں کے اظہار سے دل کو سکون رہتا ہے۔"

"لیکن یار کیسا سکون… کون سا وہ خود تمہیں شعر سناتا ہے' جنہیں سن کر تمہارے دل کو سکون رہتا ہے؟ نگارش کبھی کبھی اس کی اس قدر دیوانگی پہ جھنجلا جاتی تھی۔

"بھابھی… ! یوں سمجھ لیں کہ وہ خود ہی مجھے شعر سناتا ہے' اگر یقین نہیں آتا تو یہ شعر پڑھ کے دیکھ لیں۔" اس نے پھر ڈائری سامنے کی تھی اور مجبوراً نگارش کو وہ شعر پڑھنا پڑا اور شعر کے نیچے دل آور شاہ کا نام لکھا ہوا تھا اور ساتھ میں ٹائم اور ڈیٹ بھی تحریر تھی۔

"اوہ! تو اس شعر کی بات کر رہی ہو؟" نگارش نے یہ ڈائری پہلے سے پڑھ رکھی تھی یہ ڈائری عبداللہ کی تھی لیکن اس میں شعر تینوں دوستوں نے اپنی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں تحریر کر رکھے تھے۔

"بھابھی… ! یہی شعر تو دنیا کا خوب صورت ترین شعر ہے۔" زری اس شعر کے لفظوں اور دل آور کے نام پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی سرشاری اور بڑی چاہ سے بولی تھی۔

"اس سے اگلا شعر بھی تو پڑھو۔" نگارش کہتے ہوئے واپس کچن کی طرف پلٹ گئی۔

"اگلا شعر… ؟ وہ کس کا ہے؟"

"پڑھو تو سہی' پتا چل جائے گا۔" نگارش نے کچن سے ہی جواب دیا تھا اور زری نے تجسس کے ہاتھوں اگلا صفحہ پلٹ دیا تھا۔

تیرے خیال سے دامن بچا کے دیکھا ہے
دل و نظر کو بہت آزما کے دیکھا ہے…
نشاطِ جاں کی قسم تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں سے تجھے ہم نے بھلا کے دیکھا ہے

زری نے زیر لب یہ شعر پڑھا تھا الفاظ واقعی دل کو چھو گئے تھے لیکن شعر کے نیچے لکھا "نبیل حیات" کا نام اس کے دل کو چھونے والا نہیں تھا' وہ دل آور شاہ کی داسی تھی اس کی پجارن' اس کی جوگن تھی' پیر کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک اس کے عشق میں ڈوبی ہوئی' تن بھی گھائل' من بھی گھائل' کسی اور طرف دیکھتی بھی تو کیسے… ؟

وہ تو سوتی بھی اسی خیال سے تھی کہ خواب میں وہ ملے گا' اس سے ملاقات کی آس پلکوں پہ نیند بٹھا جاتی تھی اس کا سونا جاگنا دل آور شاہ کے لیے تھا' اس کا پہننا اوڑھنا دل آور شاہ کے لیے تھا' اس کا جینا مرنا دل آور شاہ کے لیے تھا اور جب اس کا سب کچھ دل آور شاہ کے لیے تھا تو اسے دل آور شاہ کے پہلو میں کھڑا نبیل حیات کیسے دکھائی دے سکتا تھا… ؟ اس کا نام زری کی نظروں میں بھلا کیسے جچ سکتا تھا… ؟ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی نظر ایک انچ بھی دل آور شاہ سے ہٹ کے ادھر سے ادھر دیکھ لے اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا اس نے دوبارہ صفحہ پلٹ کے نظریں دل آور شاہ کے لکھے ہوئے شعر پہ جما دی تھیں۔

"شعر پڑھا تم نے… ؟" نگارش ایپرن کھولتے ہوئے دوبارہ کچن سے نکل آئی۔

"ہوں! پڑھا ہے' لیکن دل کو نہیں لگا۔" زری نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا' نگارش نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم' جس دل کو "دل آور شاہ" لگ جائے اس کو کوئی اور شے لگ سکتی ہے بھلا؟"

"ڈیفی نیٹلی آف کورس بھابھی… ! ایسا ہی ہے' وہ اتنا دل کو لگ گیا ہے کہ اب تو میرا دل بھی دل آور شاہ بن گیا ہے' بے رخ اور بے نیاز… مجھ سے آنکھ ہی نہیں ملاتا' بالکل اسی کی طرح' وہی چال چلن ہیں میرے دل کے جیسے اس کے تھے۔" زری بولتے ہوئے جیسے چہک رہی تھی۔

"اپنے دل کو اتنا نہ سر پہ چڑھاؤ' پچھتاؤ گی' دل بگڑ جائے تو قابو کرنا مشکل ہو جاتا ہے' لگام ڈالو اسے۔" نگارش اسے شرارت سے سمجھا رہی تھی۔

"بھابھی… ! بہت دیر ہو چکی ہے اب تو اس بے لگام کو وہی لگام ڈال سکتا ہے' جس کے لیے یہ بے لگام ہوا ہے۔"

"وہ خود بے لگام ہے' تمہارے دل کو بھلا کیا لگام ڈالے گا؟" نگارش نے مذاق اڑایا تھا اور زری بھی بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"بے لگام تو بھائی بھی بہت تھے' لیکن دیکھ لیں آج کتنے قابو میں ہیں۔" زری نے نگارش کو چھیڑا۔

"محترمہ! تمہارے بھائی کو قابو کرنے کے لیے بڑی محنت کی ہے میں نے' اپنا دل' اپنی جان' اپنی زندگی اور زندگی بھر کی تمام خدمتیں ان کے نام لکھی ہیں میں نے' تب جا کے آج وہ میرے قابو میں ہوئے ہیں۔"

"اوہ! تو اسی لیے انہوں نے یہ شعر لکھا ہوا ہے… ؟" زری نے تیسرا صفحہ پلٹ کے عبداللہ کا لکھا ہوا شعر سامنے کیا تھا۔

اب اداس کیوں پھرتے ہو' سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے' اس طرح کے کاموں میں
دوستی کا دعوا کیا' عاشقی سے کیا مطلب
میں تیرے فقیروں میں' میں تیرے غلاموں میں

اس نے بلند آواز سے شعر سناتے ہوئے نگارش کو معنی خیز اور شوخ نظروں سے دیکھا تھا۔

"ارے یار! ان تینوں دوستوں کے کیوں کچے چٹھے کھول رہی ہو… عبداللہ کو یہ ڈائری بہت عزیز ہے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ اپنے بریف کیس میں رکھتے ہیں' آج نجانے کیسے ٹیبل پہ بھول گئے ہیں' لاؤ میں واپس رکھ آؤں۔" نگارش نے زری کو ڈائری الٹنے پلٹنے سے باز رکھا۔

"ارے… رے… اب کہاں؟ یہ انمول خزانہ اب میرے پاس رہے گا۔" زری نے ڈائری پیچھے کرلی۔

"ارے پاگل ہو گئی ہو؟ عبداللہ واپس آتے ہی اس ڈائری کو تلاش کریں گے' ایک بار میں نے بھی یہ ڈائری ٹیبل سے اٹھا کر دراز میں رکھ دی تھی اور انہوں نے پورا گھر الٹ پلٹ دیا تھا۔"

نگارش نے اسے ڈائری چھپانے والی حرکت سے روکنا چاہا لیکن وہ بھی زری تھی دیوانگی کی حد تک دیوانی۔ دل آور شاہ کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے الفاظ کو وہ اتنی آسانی سے کسی اور کو نہیں سونپ سکتی تھی چاہے وہ اس کا سگا

بھائی عبداللہ ہی کیوں نہ ہوتا.... کیونکہ اس ڈائری میں لکھے ہوئے الفاظ ایسے تھے جن سے اس شخص کے اظہ جھلک رہے تھے اور وہ تیسرے صفحے پہ لکھے اس کے اظہار کو دل کی گہرائیوں سے پڑھنا چاہتی تھی اور محسوس ک چاہتی تھی۔

"ایم سوری بھابھی! آج سے میں چور بھی بن گئی۔" اس نے نگارش کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

"زری...." اس نے گھور کے دیکھا۔

"پلیز...." وہ جواباً" التجائیہ سا بولی تھی۔

"عبداللہ کو پتا چل جائے گا یار' انہیں پتا ہے کہ آج کل تم ہی اپنے ایگزامز کی تیاری کے لیے اسٹڈی میں جا ہو۔"

"تو کوئی بات نہیں آپ کہہ دیجیے گا کہ میں اب اسٹڈی میں نہیں جاتی۔" زری نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"اف خدایا....!" نگارش نے سر تھام لیا تھا۔

"تھینک یو۔" زری مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی تھی۔

"میں شکایت کروں گی۔ عبداللہ سے کہ یہ اپنے پیپرز کی تیاری نہیں کر رہی بلکہ آج کل کے دنوں میں بھ پوئٹری پڑھنے میں مصروف ہے۔"

"اوکے کر دیجیے گا شکایت۔" وہ ریلیکس تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ نگارش کچھ بھی نہیں کرے گی۔

"میں واقعی کر دوں گی۔"

"آپ واقعی کر دیجیے گا۔" زری ہنستے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی تھی....

☼ ☼ ☼

وہ شکستہ سے انداز میں راکنگ چیئر پہ جھولتے ہوئے مسلسل چھت کو گھور رہا تھا اس کی آنکھیں رات بھر جاگے کی وجہ سے بوجھل اور سرخ ہو رہی تھیں' سر تھا کہ سوچوں کے عذاب سے پھٹا جا رہا تھا اور دل و دماغ پہ اک عجیب سا بوجھ مسلط ہو چکا تھا۔ الجھن اور پریشانی ایسی تھی کہ سلجھائے نہ سلجھ رہی تھی کوئی حل نہیں مل رہا تھا وہ اس آگ اور عذاب میں اکیلا ہی بھٹک رہا تھا کہ اچانک اس کا سیل بجنے لگا۔ اتفاقاً" سیل اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھ جبھی اس نے تھکے تھکے سے انداز میں سیل اسکرین اپنے سامنے کی تھی۔ اسکرین پہ "دل کالنگ" کے لفظ جگمگ رہے تھے دل آور شاہ کی کال تھی۔ لیکن نبیل حیات میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے بات کرتا کیونکہ اگر و اس سے بات کرتا تو ساری بات بتانی پڑتی.... نبیل کی نظر اندازی سے اس کی ایک کال مسڈ ہو چکی تھی.... اور د سیکنڈ کے وقفے سے ہی دوبارہ سیل بجنے لگا نبیل کو یہ بھی پتا تھا کہ اگر اب بھی کال پک نہ کی تو وہ پریشان ہو جائے گ بلکہ ہو سکتا تھا کہ گھر کے نمبر پہ فون کھڑکا دیتا اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی کال ریسیو کر لیتا۔

"ہیلو....!" اس نے بمشکل ہیلو کہا تھا۔

"السلام علیکم...." اس نے جواباً" سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام...." نبیل بولنے کی فارمیلٹی نبھا رہا تھا۔

"کہاں ہو؟" دل آور شاہ کی تفتیش شروع ہو چکی تھی۔

"گھر پہ۔"

"تو پھر کال کیوں ریسیو نہیں کر رہے تھے؟"

"ہمت نہیں تھی۔"

"ہمت.... کیا مطلب ہے تمہارا.... تم ٹھیک تو ہو؟" دل آور کو اس کی آواز سن کے ہی پریشانی ہو چکی تھی۔

"ہمارے گھر میں کبھی کچھ ٹھیک بھی ہوا ہے؟" نبیل کا لہجہ تلخی لیے ہوئے تھا۔

"کیا بات ہے نبیل.... ؟کیا ہوا ہے.... ؟کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے....؟" دل آور کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہوا تھا۔

"ہونہہ! کسی کی عزت اور غیرت سے بڑا مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی اسی سولی پہ چڑھا ہوا ہوں' بے غیرتی کے گھونٹ پی رہا ہوں' ذلت کی زندگی جی رہا ہوں' ایسی زندگی جینے سے تو بہتر ہے کہ میں خود کو گولی مار دوں۔" نبیل جس اذیت سے دوچار تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم.... ؟کیا مدحیہ نے کچھ کہا ہے؟" دل آور کا پہلا خیال مدحیہ کی طرف ہی گیا تھا اور نبیل کے لب سختی سے بھنچ گئے تھے کنپٹی کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔

"مدحیہ کہے گی تو تب جب گھر پہ ہو گی۔" انا اور غیرت کا سر کچل کے بالآخر اس نے کہہ ہی دیا تھا کیونکہ کہے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا گھر کی کوئی بھی بات' کوئی بھی مسئلہ دل آور سے چھپا ہوا نہیں تھا وہ سب جانتا تھا۔

"مدحیہ گھر پہ نہیں.... ؟کیا مطلب؟ کہاں ہے وہ؟" نبیل کی شکست اس کے لہجے سے عیاں ہو رہی تھی وہ بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"نبیل....! مجھے صاف صاف بتاؤ کیا ہوا ہے؟ مدحیہ کہاں ہے؟" دل آور کے انداز میں سختی اتر آئی تھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں دل آور ے' مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہے.... ؟وہ صبح سے گھر سے نکلی ہوئی ہے اور ابھی تک گھر نہیں آئی۔"

"مگر کیوں.... ؟کیوں نہیں آئی وہ؟" دل آور کی آواز میں غصہ تھا اس کی کنپٹیوں کا لہو بھی دہک اٹھا تھا۔

"وہ چاہتی ہے کہ میں بابا کو گھر سے نکال دوں۔"

"واٹ؟ کس لیے؟" دل آور کو حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"اس لیے کہ اسے بابا سے نفرت ہے' وہ انہیں ناپسند کرتی ہے' وہ اس گھر میں رہیں گے تو وہ نہیں رہے گی اور اسی ضد پہ اڑی ہوئی ہے اور وہ اکیلی لڑکی گاڑی لے کر صبح سے گھر سے نکلی ہوئی ہے۔" نبیل شکست خوردہ سا رو دینے کو تھا۔

"تو تم مجھے اب بتا رہے ہو؟" اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا بتاتا تمہیں.... ؟یہ کہ میری بہن کی سرکشی دیکھو یا میرے باپ کی عیاشی دیکھو.... ؟اتنے اتنے مہینے باہر عیاشی کرتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو تھکن اتارنے گھر آ جاتے ہیں اور سالوں ان کا انتظار کرنے والی میری ماں' شکایت کا لفظ زبان پہ لائے بغیر ان کی خدمت میں لگ جاتی ہے' صرف اسی بات پہ خوش ہو جاتی ہے کہ وہ گھر تو آئے ہیں نا؟ اور میں انہیں پکڑ کے گھر سے ہی نکال دوں.... ؟کیا ایسا کرنا مجھے زیب دیتا ہے۔ کیا میری ماں یہ سب سہہ پائے گی؟ تو پھر تم بتاؤ یار میں کیا کروں؟ بہن کو گھر لے کر آؤں؟ یا باپ کو گھر سے نکالوں؟" نبیل دکھ سے کہتا چلا گیا اور اس کی بات سن کے دل آور بھی خاموش ہو گیا تھا بے بسی کی انتہا پہ کھڑا نبیل حیات ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا' وہ کیا کر سکتا تھا آخر.... دل آور نے جواباً" کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا تھا اسے اس وقت مدحیہ پہ غصہ تھا اور غصہ بھی غضب کا تھا....

☼ ☼ ☼

"حرمت....! میں نے کہہ دیا نا میں کہیں نہیں جاؤں گی' پلیز مجھے فورس مت کرو' تم لوگوں نے جانا ہے تو جاؤ'

مگر مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔" کومل کی تیز اور تلخ آواز پہ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے دہلیز پہ ہی ٹھہر گیا لیکن کومل اور حرمت اسے دیکھ چکی تھیں۔

"بھائی آپ.... ؟ آپ ٹارک کیوں گئے ہیں؟" حرمت نے سر پہ دوپٹہ درست کیا تھا جبکہ کومل ہنوز ضدی سے انداز میں گردن اکڑائے بیٹھی رہی۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کون کہاں نہیں جا رہا؟" آذر کی گہری کھوجتی ہوئی نظریں کومل پہ جمی ہوئی تھیں۔

"وہ بھائی دراصل کومل کو طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے وہ کہہ رہی تھی کہ میں نہیں جاؤں گی، تم لوگ چلے جاؤ۔" حرمت نے کومل کا بھرم رکھتے ہوئے بہانہ کیا تھا۔

"تو کوئی بات نہیں جب ان کی طبیعت ٹھیک ہوگی تب چلے جائیں گے ابھی پروگرام کینسل کر دیتے ہیں۔" آذر نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے.... ؟" کومل نے چونک کے دیکھا تھا کہ کیا وہ اس کی خاطر اس کا احساس کر رہا تھا یا پھر اسے کچھ جتا رہا تھا.... ؟

"کیوں نہیں ہو سکتا.... ؟ میں ابھی سب کو منع کر دیتا ہوں، ہمارے لیے آپ اہم ہیں، یہ پروگرام نہیں۔" آذر نے واپس قدم موڑے۔

"لیکن؟" کومل نے تیزی سے اسے روکا۔

"لیکن.... ؟" آذر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"لیکن سب کو اچھا نہیں لگے گا، سب کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔"

"آپ کو تو اچھا لگے گا نا؟ آپ کی طبیعت جو خراب ہے۔"

"نن.... نہیں میری وجہ سے سب کا پروگرام کینسل نہیں ہونا چاہیے۔"

"تو پھر کیا ہونا چاہیے؟"

"جانا چاہیے سب کو۔" کومل نے کہتے ہوئے چہرہ جھکا لیا۔

"سب میں آپ بھی تو شامل ہوتی ہیں.... ؟"

"مگر میری طبیعت...." وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی تھی۔

"ڈاکٹر کو بلا لیتے ہیں اور ویسے بھی ابھی تو پوری رات اور پورا دن ہم لوگ گھر پہ ہی ہیں، کل صبح نکلنا ہے، ہم نے تب تک یقیناً" آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔" آذر بڑے سکون سے اسے تسلی دے رہا تھا اور کومل جز بز سی ہو گئی۔

"کیا خیال ہے آپ کا؟ کل تک طبیعت ٹھیک ہو جائے گی نا آپ کی.... ؟" آذر کہتے ہوئے اسے اب بھی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور کومل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا حرمت کھانستے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپا کر رخ موڑ گئی۔

"گڈ.... ! آپ بھی اپنی تیاری کر لیجیے، اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے وہاں سے چلا گیا اور پیچھے حرمت کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم کیوں دانت نکال رہی ہو؟" کومل اندر سے خجل تو ہو چکی تھی لیکن جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

"واہ محترمہ واہ! میرے سامنے کیسے غصے سے اکڑ اکڑ کر بات کر رہی تھیں اور ان کے سامنے ایک دم بھیگی بلی بن گئیں؟ انہیں بھی انکار کرتیں نا کہ میں نہیں جاؤں گی۔" حرمت نے گھور کے کہا۔

"کیسے انکار کرتی؟ پہلی بار تو انہوں نے کچھ کہا ہے۔ اب جانا تو پڑے گا نا؟" کومل نے معصوم بن کے کہا۔

"ارے بھئی! کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں؟" جودت ان کی بات سنتے ہوئے اندر آ گیا۔

"ہم نادرن ایریاز جا رہے ہیں۔" حرمت نے فوراً" چہک کے بتایا تھا۔

"نادرن ایریاز؟ کون کون جا رہا ہے؟"

"تمام ینگ پارٹی۔"

"مطلب کہ میں بھی.... ؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"آپ گھر پہ ہوں گے تو جائیں گے نا؟" وہ خفگی سے بولی۔

"ارے یار! آہستہ بولو کیوں مروانا چاہتی ہو؟" جودت نے حرمت کو چپت لگاتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"تو اچھا ہے نا، آپ کی کلاس ہونی چاہیے، آخر رات رات بھر کہاں رہتے ہیں آپ؟ رات کو بھی آپ گھر پہ نہیں تھے اسی لیے آپ کو ہمارے اس پروگرام کی خبر نہیں ہے۔" حرمت پھر بھی چپ نہیں ہوئی تھی۔

"کومل آپا۔" جودت نے کومل کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

"کومل آپا کی تو خود کلاس لگنے والی ہے، آپ بس اپنی خیر منائیں۔" حرمت نے جس انداز سے کہا تھا کومل یکدم کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، حسن کے چمن میں آج تو بڑے شگوفے پھوٹ رہے ہیں.... ؟ کیا ماجرا ہو گیا آج؟" جودت نے ذو معنی لہجے میں کہا تھا۔

"اف! تم سب بہن بھائی ایک سے بڑھ کے ایک ہو۔" کومل نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ جس پہ وہ دونوں ہی ہنس پڑے تھے اور کچھ دیر بعد وہ بھی اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے تھے اب تو کومل بھی اپنی تیاری پورے جوش و خروش سے کر رہی تھی اور باقی سب لڑکیاں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

زری یونیورسٹی سے پیپر دے کے گھر آئی تو فریش ہونے کے لیے باتھ روم چلی گئی اور نگارش اس کے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔ دس منٹ بعد ہی زری چینج کر کے نیچے چلی آئی تھی۔

"پیپر کیسا رہا؟" نگارش کھانا ٹیبل پہ لگاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"شکر ہے اللہ کا بہت اچھا رہا۔" زری کھانا کھانے کے لیے بیٹھ چکی تھی۔

"عبداللہ کو بتایا؟"

"جی ہاں! سب سے پہلے انہوں نے ہی پوچھا ہے۔" وہ پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی جب باہر ڈور بیل سنائی دی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" زری اٹھنے لگی لیکن نگارش نے روک دیا۔

"تم کھانا کھاؤ میں دیکھ لیتی ہوں، ساتھ والی فیملی سے کوئی ہوگا۔" نگارش کرسی کی بیک سے دوپٹہ اٹھا کر پھیلاتی ہوئی دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا تھا لیکن اک ہلکی سی چیخ سے ذرا سا اچھل کے پیچھے ہوئی تھی اور اس کی آواز پہ کھانا کھاتی ہوئی زری لپک کے کچن سے باہر نکلی تھی۔

"بھابھی! کیا ہوا ہے.... ؟ کون ہے.... ؟" وہ ہراساں سی نگارش کے پاس آئی لیکن دروازے کے پاس آ کر اس کے قدم بھی جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اس کی ٹانگوں میں لرزش آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

محبت ابر ہے

سیدہ ضوباریہ ساجد

بھکاری ذہن ' تم ہی کچھ بتاؤ
دل دریوزہ گر کو بھیک کیا دوں
نہ میرے بس میں لمحے ہیں نہ رستے
میں شہر زندگی تک کیسے جاؤں
فصیل زندگی اور خندق جاں
نہ گرتی ہے نہ بھرتی ہے کروں کیا
سسکتی آرزو ' زخمی تمنا
نہ جیتی ہے ' نہ مرتی ہے کروں کیا

کیا ہے یہ زندگی..... محض ایک مشت خاک..... پل پل خواب دیکھتی دکھتی رستی آنکھیں..... اور یہ خواب کیا ہیں؟ گرد کے سوا کچھ بھی نہیں۔

وہی گرد جو سچے آئینہ لوگوں کے وجودوں پر پھیل جاتی ہے انہیں بے اماں ' بے وقعت کرنے کے لیے۔ جیون کو کیا کہیں؟ کوئی غبار..... بگولہ یا طوفان۔ کتنی آرزوئیں مٹ گئیں۔ کتنے خواب دفن ہو گئے وقت کے قبرستان میں..... یقین اور مان کسی آوارہ روح کی طرح وجود کے ایوان سے سر ٹکراتے پھرتے ہیں اور میں آئینہ پیکر۔ کانچ کے ذروں کی طرح بکھر کر رہ گئی ہوں۔ کیا ساتھ رہنے والوں کے حوالے یونہی پرچھائیاں بن کر تمام عمر ہمارے سائے سے لپٹے رہتے ہیں ' امربیل کی طرح ہمارا لہو نچوڑتے ہیں۔ قطرہ ' قطرہ بالآخر رگ رگ سوکھ کر جھاڑی ہو جاتی ہے اور جسم کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو جاتا ہے۔

اداسی ' خزاں اور الجھا ہوا مقدر..... کیا ہے میرے دامن میں ' گلاب آرزو خواب کچھ بھی تو نہیں ہے میرے پاس۔"

وہ آزردہ سی کھڑکی کے کھلے پٹ سے لگی باہر صحن میں رم جھم برستی بارش کو دیکھے گئی۔ کمرے کی مہیب خاموشی کسی عفریت کی طرح اسے اپنے پنجوں میں دبوچنے کو تیار بیٹھی تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنی تنہائی کو بے بسی کی چادر اوڑھا کر اپنے خوابوں کو تھپک رہی تھی۔

اسے بہت اچھی طرح یاد تھا جب پہلی بار اسے یاد دلایا گیا کہ اس کی ماں اس کے لیے کسی بھی طرح ایک معتبر حوالہ نہیں ہے۔ اس محروم عورت کے وجود سے لپٹی کرب انگیز حقیقتیں ' اس کا ماضی ' اس کا حال اور اس کا مستقبل کھا گئی تھیں اسے تو صرف اس کے ہونے کی سزا بھگتنی تھی اور کون جانے یہ کالے پانی کی سزا اس کی سانسوں پر کب تک مسلط رہنی تھی۔ کیا قصور تھا اس کا..... یہی نا کہ اس نے شیریں بیگم کے وجود سے زندگی انگیخت کی تھی۔ اس کے وجود کا ایک حصہ تھی اور بس اور یہ قصور جو ناکردہ تھا۔ اس کی سزا جانے کب تک اس کو ملنی تھی۔

جب تک بابا زندہ تھے وہ اور اس کی ماں حوادث زمانہ سے کوسوں دور تھے۔ لیکن ان کے اس دنیا سے رخ موڑتے ہی انہیں احساس ہو گیا کہ اماں اور سائباں درحقیقت کیا ہوتے ہیں۔ بابا کے سایہ التفات میں دنیا کی تلخیاں ' تلخیاں نہیں لگتی تھیں ' دکھ ' دکھ نہیں لگتے تھے اور خوشیاں ' خوشیاں تو جیسے ان کے دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھیں اور اب جب کہ وہ ان کے ساتھ نہیں تھے۔ تو ارد گرد سے پتھریلے رویوں کا کرب ' لہجوں کی سنگ باری اور تلخیوں کی تمازت نے اس کی روح تک کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

"مجاب بیٹا! تم ابھی تک سوئی نہیں۔" امی نے کمرے میں جھانکا تو اسے کھڑکی سے لگ کر کھڑے دیکھا تو پوچھا۔

"نہیں امی! نیند نہیں آرہی۔"

"ارے بیٹا! نیند نہیں آرہی تب بھی بستر میں لیٹو اتنی ٹھنڈ ہے بیٹا بیمار ہو جاؤ گی۔" امی کے لہجے میں اس کے لیے فکر و اندیشہ گھلا ہوا تھا۔

"نہیں امی! کچھ نہیں ہوتا مجھے آپ کی بیٹی بہت

ناولٹ

سخت جان ہے۔" مجاب کے لہجے کا ملال شیریں بیگم کو فوراً" محسوس ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ کانچ کانچ لہجہ درد سے بوجھل کیوں ہو گیا ہے۔ اس کے وجود کے زخم ان کی ممتا کی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں لیکن ان کے اپنے ہاتھ زخمی تھے وہ یہ کرچیاں چننے سے عاجز تھیں۔ ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ پھر انہوں نے مزید اسے کچھ نہ کہا اور بے آواز قدموں سے واپس پلٹ گئیں۔

"میری پیاری ماں! یہ تو ازل سے لکھا ہوا ہے کہ ہر ایک نے اپنے حصے کا درد خود بھوگنا ہے۔ یہ اور بات کہ کسی کے حصے میں درد ہی درد آتے ہیں اور کوئی چند لمحے دکھ سہہ کر سکھوں کے ہنڈولے میں جھولنے لگتا ہے تم اپنے حصے کا درد بھوگ رہی ہو۔ مجھے میرے حصے کا درد بھوگنے دو کہ نہ میں تمہارے مقدر سے لڑ سکتی ہوں اور نہ تم میرا نصیب بدل سکتی ہو۔"

مجاب مضمحل انداز میں سوچ گئی۔ رم جھم برستی بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن جو بارش اس کے دل کے اندر ہو رہی تھی وہ تو ہر موسم میں موسلا دھار ہی رہتی تھی۔ ایسی بارش کہ سیلاب آجائے اور سارے خار و خس اور راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہی لے جائے۔

☆ ☆ ☆

"ماما! عون نے میری نوٹ بک پھاڑ دی۔" وہ بسورتی ہوئی شیریں بیگم کے قریب آکھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک نظر اس کی آنسو بھری کٹورا آنکھوں کو دیکھا اور پھر عون کی طرف جو اب بہت شریف اور مہذب سا دروازے میں کھڑا انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیوں! عون یہ کیا حرکت ہے بیٹا۔"

"چاچی! اس نے میری پزل گیم توڑ دی میں نے اس کی نوٹ بک پھاڑ دی حساب برابر۔" وہ خالصتاً کاروباری لہجے میں بولا۔ انداز میں شرمندگی کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔

"لیکن بیٹا! پزل گیم ٹوٹنے پر آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن نوٹ بک پھاڑنے پر مجاب کی ٹیچر اسے ماریں گی۔ آپ کو گیم ٹوٹنے پر غصہ تھا تو آپ مجھے آکر بتاتے میں مجاب کی گیم آپ کو دے دیتی۔"

"نہیں ماما! میں نے جان بوجھ کر اس کی گیم نہیں توڑی۔ میرے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ لیکن اس نے میری کاپی جان بوجھ کر پھاڑی ہے تاکہ مجھے ٹیچر سے ڈانٹ پڑے۔" وہ ہنوز اسی لہجے میں منہ بسور کر بولی۔

"پھر بیٹا! اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو نئی نوٹ بک دلا دوں اور عون بیٹا آپ بھی خیال رکھیے گا آئندہ مجاب کی اسکول کی بکس یا کاپیز کو پھاڑنے کی بجائے مجھے آکر بتائیے گا میں خود اس سے پوچھ لوں گی۔" شیریں بیگم اٹھ کر کمرے سے باہر کی طرف چل دیں۔

اس وسیع و عریض گھر میں صرف دو خاندان بستے تھے۔ آفتاب خان یعنی مجاب کے تایا ابو ان کی بیگم خالدہ اور ان کے بچے ارمان، سعدان اور عون۔ دوسرا خاندان مہتاب خان، شیریں بیگم اور مجاب پر مشتمل تھا۔ دادا جان اور بڑی اماں کب کے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ لیکن دونوں بھائیوں کا آپس میں پیار اتنا مثالی تھا کہ والدین کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی انہوں نے الگ الگ اپنی دنیائیں بسانے کی بجائے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

تائی امی مزاج کی سخت تھیں۔ وہ شیریں بیگم کو کچھ خاص پسند بھی نہیں کرتی تھیں۔ لیکن شیریں بیگم بہت حوصلے اور ہمت سے ان کا تلخ رویہ برداشت کرتی رہی تھیں۔ شاید اس لیے کہ اس گھر کے علاوہ ان کی کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتیں۔ گھر بھر کا کام نبٹا کر فارغ وقت وہ مجاب کے ساتھ گزارتیں۔ کیونکہ خالدہ بیگم ان کے ساتھ سوائے ضروری بات کے زیادہ گفتگو نہیں کرتی تھیں۔ لیکن شیریں بیگم کو اس پر بھی کوئی گلہ نہیں تھا۔ وہ تو اسی بات پر شکر گزار تھیں کہ مہتاب خان نے انہیں ایک عقوبت خانے سے نجات دلا کر چار دیواری کی عزت و محافظت دی ہے۔ ایک چھتنار درخت کی طرح ان کے جلتے سلگتے وجود پر سایہ کر دیا تھا۔ کیا ہوا جو اس گھر میں انہیں روایتی عزت داروں جیسی وقعت نہیں ملی کم سے کم یہاں چبھتی ہوئی نظریں تو نہیں تھیں ـــــ اغراض میں لپٹے ہوئے مصنوعی محبت بھرے لہجے تو نہیں تھے۔ ہوس میں لتھڑی ہوئی مہربانیاں تو نہیں تھیں۔

یہ چار دیواروں والا اینٹ اور سیمنٹ سے بنا گھر انہیں اس جہان کا سب سے زیادہ مضبوط اور محفوظ

قلعہ لگتا تھا مہتاب خان کی محبت بھری آنکھیں انہیں دنیا بھر کی آنکھوں سے زیادہ قیمتی، خوب صورت اور بے لوث لگتی تھیں بعض اوقات تو خالدہ بیگم کے منہ سے نکلے ہوئے تلخ الفاظ بھی انہیں شہد کی طرح میٹھے لگتے تھے انہوں نے مہتاب خان سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی تھی اور شاید انہیں مہتاب خان سے کبھی کوئی شکایت تھی بھی نہیں۔ خدا نے محبت کرنے والے شریک حیات کے بعد مجاب کی صورت میں ان کی آغوش میں ایک خوب صورت پھول کھلا دیا تو جیسے ہر گلہ ہر شکوہ ڈھل کر رہ گیا۔ اگر کوئی بات پہلے انہیں تکلیف دیتی بھی تھی تو اب مجاب کی ذات میں گم ہو کر انہوں نے اس طرف دھیان دینا ہی چھوڑ دیا۔

وقت گزرتا گیا کسی کا انتظار کیے بنا کہ اس نے تو گزرنا ہی ہے مجاب گیارہ سال کی تھی جب ایک دن مہتاب خان ہنستے مسکراتے گھر سے نکلے اور خون میں لت پت زندگی سے عاری وجود کے ساتھ گھر لوٹے۔ شیریں بیگم کی تو مانو آنکھوں کی بصیرت کھو گئی دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ ان کے خالی دامن میں تو بس مہتاب خان اور مجاب کے وجود کی آسودگیاں اور سکھ تھے اور مہتاب خان نے جاتے سمے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ ان کے بعد شیریں بیگم اپنے زخم زخم وجود کے ساتھ حوادث زمانہ کا کس طرح سامنا کر پائیں گی۔ جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن ان کے چلے جانے سے بعض اوقات مقدر میں ایسے الجھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں کہ سلجھانے سے نہیں سلجھتے اور مجاب کو تو ان کے چلے جانے سے یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے اس کی روشن زندگی میں ملگجی شام اتر آئی ہو۔ جیسے روشنیاں دور، بہت دور کہیں کھو گئی ہوں۔ جیسے اندھیرے اور ٹھوکریں اس کے پیروں سے گردش زمانہ کی طرح چمٹ گئے ہوں اور شیریں بیگم تو یوں لگتا تھا جیسے مسکرانا ہی بھول گئی ہوں۔ ہر پل ان کی آنکھیں متورم رہتیں۔ دن سے رات تک گھر کے کاموں میں وقت بتانے کے بعد رات کو جب وہ مجاب کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر بستر پر لیٹتیں تو جیسے دن بھر کی تھکن اور مہتاب خان کی جدائی نمکین پانی بن جاتی جو آنکھوں کے گوشوں سے جھر جھر بہتا رہتا۔ راتیں بے خواب ہو گئیں اور دن بے کیف۔۔۔۔ زندگی میں بس ایک رنگ، ایک امید باقی تھی۔ مجاب کے روپ میں اور وہ بس اسی کی خاطر جیے جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پر آگیا۔ آفتاب خان نے دوبارہ کاروبار سنبھال لیا شیریں بیگم دل کا درد دل میں چھپائے گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے کرتا دھرتاؤں نے بہت کوشش کی کہ شیریں بیگم واپس رنگینیوں کی دنیا میں لوٹ جائیں۔ لیکن وہ مہتاب خان کا گھر چھوڑ کر ان کے ساتھ جانے پر تیار نہ ہوئیں۔ مہتاب خان ان کی گود میں اتنی بڑی امانت ڈال گئے تھے کہ شیریں بیگم اپنا آپ بھول گئی تھیں۔ کیونکہ وہ مجاب کی زندگی مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا چاہتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی خاندانی ہونے کے باوجود مسخ شدہ ماحول میں رہے۔ یہاں اس کا حق تھا۔ سو وہ یہیں رہیں۔

مجاب نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ عون اور وہ ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ جبکہ ارمان، ارسلان دونوں بڑے ہونے کے ناتے اس سے خاصے فاصلے پر رہے کچھ ان پر اپنی ماں کی مغرور طبیعت کا اثر بھی تھا۔ عون اس کا ہم عمر ہونے کے باعث ہر پل اس کے ہمراہ تھا۔ یہ اور بات کہ اس کی دوستی کا دعوا مجاب کو ہمیشہ جھوٹا ہی لگتا تھا۔ وہ اسے نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا کلاس روم میں بھی اور گھر میں بھی وہ بقول مجاب گندے ہاتھ لے کر اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ خدا جانے وہ کس قسم کی دوستی کا دعویدار تھا۔

اور اب جبکہ وقت کی دھول میں اس کا ماضی دھندلے آئینے کی طرح بے عکس ہو گیا تھا وہ کالج سے یونیورسٹی پہنچ چکی تھی۔ عون اب بھی ویسا ہی تھا۔ وہ جب تک گھر میں موجود رہتا مجاب کی حتی الامکان یہی کوشش رہتی کہ اس سے اس کا سامنا نہ ہو اور اگر بالفرض سامنا ہو بھی جاتا تو وہ کنی کترا کر ادھر ادھر ہونے کی

کوشش کرتی یہ اور بات کہ عون اس کی یہ کوشش اکثر و بیشتر ناکام بنا دیتا۔

☼ ☼ ☼

آج تایا ابو جلدی آفس چلے گئے جب وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر اپنے پورشن سے نکلی تو پورچ میں عون کی پھٹیچر بائیک کے سوا کچھ نہ تھا۔ یعنی ارمان اور سعدان بھی جا چکے تھے' اس کا مطلب یہ تھا کہ آج مسٹر عون کی یہ پھٹیچر اس کی طبع پر گراں گزرنے والی تھی۔ اگر سر یعقوب کا ضروری لیکچر نہ ہوتا تو وہ کسی صورت عون کے ہمراہ جانا پسند نہ کرتی۔ لیکن مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق وہ تائی امی کے پورشن کی طرف آ گئی۔ وہ شاید ابھی ابھی کچن سے برآمد ہوئی تھیں۔ دوپٹے سے چہرے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"تائی امی! عون ہے یا چلا گیا؟" تائی امی کی گھورتی نگاہیں اسے ہمیشہ اپنے وجود میں برمے کی طرح لگتی تھیں۔ سو وہ بوکھلا گئی حالانکہ پورچ میں اس کی بائیک کھڑی دیکھ کر ہی وہ ادھر آئی تھی۔

"کیوں؟" انہوں نے عجیب انداز میں پوچھا۔

"وہ...... وہ تایا ابو آج جلدی چلے گئے۔ گھر میں اور بھی کوئی نہیں۔ میرا آج ضروری لیکچر ہے اس لیے اگر عون مجھے اپنے ساتھ یونیورسٹی لے جاتا۔" اس کا لہجہ کمزور اور آواز دھیمی تھی۔ اللہ جانے تائی امی کے سامنے آ کر اس کا سارا اعتماد کہاں ہوا ہو جاتا تھا۔

"بیٹھو! پوچھتی ہوں اس سے۔" پتا نہیں ان کا سب کے ساتھ یہی انداز تھا یا پھر اس سے بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں تلخی آ جاتی تھی۔ وہ بہت کم ان کے ہاں آتی تھی۔ ان کی نظروں میں اس نے بہت بار اپنے لیے تحقیر محسوس کی تھی اور ہر بار وہ کچھ خائف سی ہو جاتی تھی۔ اب بھی وہ ایسے کھڑی تھی جیسے موقع ملتے ہی بھاگ کھڑی ہو گی۔ تین چار منٹ کے انتظار کے بعد تائی امی کے ساتھ عون کو آتے دیکھ کر اس نے یوں سکون کا سانس لیا جیسے کسی قید خانے سے رہائی کا مژدہ مل گیا ہو۔

"عون! آج تمہارا آف ہے مجاب کو یونیورسٹی ڈراپ کر کے جتنی جلدی ہو آ جانا تمہاری عابدہ خالہ بیمار ہیں مجھے ان کے پاس لے کر جانا ہے تمہیں' ادھر ادھر زیادہ وقت ضائع نہ کرنا۔" انہوں نے مجاب پر احسان عظیم کرتے ہوئے عون کو اجازت تو دے دی مگر ساتھ ہی تنبیہ بھی کر دی۔ عون نے قدم آگے بڑھائے۔

"اب چلو بھی...... میں تمہارا شوفر تو ہوں نہیں جو انتظار میں کھڑا رہوں' مجھے اور بھی کئی کام ہیں۔" اسے اپنی جگہ بت کی طرح کھڑے دیکھ کر عون نے تلخی سے کہا تو ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ لعنت ڈالے لیکچر پر ایسوں کا احسان لینے سے تو بہتر یہی تھا کہ بندہ اپنا نقصان کر لے۔ لیکن اب احسان لے تو لیا تھا۔ سو خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ بائیک پر بیٹھتے ہوئے بھی اس نے حتی الامکان فاصلہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"ذرا احتیاط سے بیٹھنا...... میری بائیک سواری پہچانتی ہے۔" وہ تفاخر سے بولا۔

"ہونہہ...... بائیک نہ ہو گئی گھوڑی ہو گئی سواری پہچانتی ہے۔" اس نے جل کر دانت کچکچاتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

"کیا بڑبڑ کر رہی ہو......؟" بائیک کی رفتار بڑھاتے ہوئے اس نے پلٹ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں...... اور خدا کے واسطے سامنے دیکھ کر بائیک چلاؤ۔ میں نے یونیورسٹی جانا ہے عالم بالا نہیں۔" وہ اونچی آواز میں بولی بائیک کی رفتار خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اس نے دل ہی دل میں ہزار قابل تحریر و ناقابل بیان گالیاں عون کو پارسل کرتے ہوئے اس کے کندھے پر مجبوراً" ہاتھ رکھ دیا۔ یونیورسٹی کے گیٹ پر اترتے ہی جیسے اس نے اپنے زندہ ہونے کا یقین کرتے ہوئے عون کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو جانتا ہوں میں بہت ہینڈسم ہوں۔" اس نے معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر گویا اس کی حالت کا مزا لیا اور بائیک کو ایڑ لگا کر یہ جا وہ جا مجاب کتنی ہی دیر اس کی بات پر دانت پیستی رہی۔

"آئندہ کچھ بھی ہو جائے میں اس لنگور کی بائیک پر نہیں بیٹھوں گی۔" وہ مصمم ارادہ کرتی ہوئی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئی اور جب اسے یہ پتا چلا کہ سر یعقوب نے لیکچر ملتوی کر دیا ہے تو مارے کوفت کے اس کا حال برا ہو گیا۔

"جانے صبح صبح کس منحوس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔"

☼ ☼ ☼

"شیریں ارمان کے سسرال والوں نے آنا ہے ذرا کچن میں میری ہیلپ کروا دو۔" تائی امی ان کے کمرے کے دروازے میں کھڑی حکم صادر کر رہی تھیں۔ مجاب نے کتاب سے سر اٹھا کر ایک نظر تائی امی کی طرف دیکھا اور پھر اپنی ماں کی طرف۔ جن کے چہرے پر کمال اطمینان تھا۔

"آپ چلیں بھابھی! میں بس یہ ایک دو جوڑے ہیں استری کر کے ابھی آئی۔ کس وقت آنا ہے مہمانوں نے؟" شیریں بیگم کا لہجہ مودب اور دھیما تھا۔

"چار تو بج گئے ہیں سات بجے کا کہا ہے انہوں نے آتے آتے آٹھ بج جائیں گے پر سب کچھ ان کے آنے سے پہلے تیار ہونا چاہیے نا۔"

"جی! یہ تو ہے بس آپ چلیں میں آتی ہوں۔" شیریں بیگم نے کہا تو خالدہ پلٹ گئیں۔

"امی یہ تائی امی آپ کو کیا ملازمہ سمجھتی ہیں۔ خود کیوں نہیں کرتیں اپنے کام' کبھی انہوں نے سیدھے منہ آپ کو یا مجھے بلایا تک نہیں اور کام ایسے کرواتی ہیں جیسے ہم ان کے نوکر ہوں۔" اسے اپنی ماں کا تائی امی سے اس طرح دب کر رہنا اور محکوموں کی طرح سب کچھ سہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ اکثر ان کے اس طرح مودب انداز پر چڑ جاتی تھی۔

"بری بات مجاب! وہ تمہاری تائی ہیں اور پھر ان کا یہ احسان کیا کم ہے ہم پر کہ تمہارے بابا کے دنیا سے جانے کے بعد انہوں نے ہم سے سر کی چھت نہیں چھینی اور ہم عزت کے ساتھ زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ تمہاری تعلیم کا ذمہ انہوں نے لے رکھا ہے کیا یہ کم ہے۔" شیریں نرم لہجے میں اسے سمجھا رہی تھیں۔

"کوئی احسان نہیں ہے ان کا ہم پر' حق ہے ہمارا یہاں اگر وہ ہماری ضرورتوں کا خیال کر رہے ہیں تو کیا ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہیں۔ اگر میری تعلیم کا خرچ برداشت کر رہے ہیں تو کیا مانی' سعدی اور عون تعلیم حاصل نہیں کر رہے۔ میرے ابو اور تایا ابو برابر کے شیئر ہولڈر ہیں اس گھر اور کاروبار میں ہمارا برابر کا حق ہے' پھر احسان کا ہے کا؟ کیا ہم ان کی جیب سے خرچ کرتے ہیں۔" شیریں بیگم جانتی تھیں کہ اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے لیکن اپنی فطری بزدلی کو کہاں لے جاتیں۔

"اور امی! اگر بالفرض — ہم حق دار نہیں بھی ہیں۔ تب بھی ہمیں تائی امی کا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا بوجھ تایا ابو اٹھاتے ہیں۔ کیا آج تک انہوں نے ہم سے کڑوے لہجے میں بات کی جب وہ ہمیں بوجھ نہیں سمجھتے تو یہ تائی امی کہاں کی تھانیدار ہیں۔"

"مجاب! مجاب خدا کے لیے چپ ہو جاؤ کیوں شامت کو آواز دیتی ہو تمہاری تائی نے یہ باتیں سن لیں تو حشر برپا کر دیں گی۔" شیریں بیگم نے خائف لہجے میں کہتے ہوئے کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔

"امی میرا خیال ہے کہ ان سے ڈرنے کے لیے آپ ہی کافی ہیں مجھے تو کم سے کم بزدلی کا سبق نہ دیں۔" مجاب کے لہجے کی تلخی اس کے صبر اور برداشت کے اختتام کا پتا دے رہی تھی۔ شیریں بیگم جان گئی تھیں کہ خالدہ بیگم نے اپنے کڑوے لہجے اور زہریلے رویے سے اس کے اندر جو تلخی بھر دی ہے وہ تلخی اب زیادہ دیر تک اس کے اندر نہیں رہ سکتی۔ ان کی اپنی زندگی تو مایوسیوں سے بھری تھی ہی۔ مجاب کب تک

اس میں ان کا ساتھ دے سکتی تھی۔ وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ تائی امی کے سامنے مروت اور لحاظ میں وہ کچھ بول نہ پاتی تھی۔ مگر وہ اندھی نہیں تھی۔ تمام حسیات رکھتی تھی۔ دیکھتی بھی تھی اور محسوس بھی کرتی تھی کہ گھر کی ہر چیز کی مالک ہونے کے باوجود وہ آزادانہ کچھ بھی نہ کرپاتی تھی کیونکہ تائی امی کی آنکھیں کسی ایکسرے مشین کی طرح ہر پل اس کا جائزہ لیتی رہتی تھیں۔ خاص طور پر اس وقت تو جیسے ان کی ساری توجہ کا مرکز اس کی ذات ہوتی تھی جب ان کے بیٹوں میں سے کوئی گھر پر ہوتا اور محجاب ان سے کوئی بات کررہی ہوتی۔ ایک خاص ناگواری ہوتی تھی جو ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے سے نظر آتی تھی اور محجاب خود میں بہت عجیب محسوس کرتی تھی۔ اس کے لیے تائی امی کا رویہ ناقابل فہم اور بعض اوقات ناقابل برداشت بھی ہوجاتا تھا۔

شام میں مہمان آئے۔ شیریں بیگم نے خالدہ بیگم اور خانساماں کے ساتھ مل کر بے حد اہتمام کیا تھا۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ ارمان کے سسرال والے خاصے امیر اور خود نمائی کا شکار لگتے تھے۔ محجاب سارا وقت کمرے میں اسٹڈی میں مصروف رہی۔ ایک پل کو بھی اس نے باہر نکل کر کسی سے ملنا یا گفتگو کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ بلکہ وہ شیریں بیگم کی مصروفیات پر بھی جی جان سے کڑھتی رہی۔ رات گئے جب شیریں بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو تھکاوٹ اور بے آرامی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔ ان کا جوڑ جوڑ دہائی دے رہا تھا بستر پر بیٹھتے ہوئے ایک کراہ جیسے ان کے لبوں سے خارج ہوئی۔ محجاب نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں، ان کے ہاتھ میں ایک ٹرے میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں جو وہ بستر پر ہی ایک طرف رکھ رہی تھیں۔ اسے اپنی ماں پر بیک وقت غصہ بھی آیا اور ترس بھی، دل درد سے بھر گیا تھا۔

"آؤ محجاب! کھانا کھالو۔ تمہاری تائی امی تو کہہ رہی تھیں کہ محجاب کو بلا لو مہمانوں کے ساتھ ہی کھانا کھالے۔ لیکن میں نے منع کردیا کہ وہ پڑھ رہی ہے، اسے ڈسٹرب نہ ہی کریں۔ میں جانتی ہوں میری بی[illegible] سب کے سامنے ٹھیک سے کھانا نہیں کھاسکتی۔ ا[illegible] جلدی سے آجاؤ میں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔" شیر[یں] بیگم نے گردن جھکائے جھکائے یہ چند الفاظ بمشکل ا[دا] کیے۔ جانتی تھیں کہ محجاب کی آنکھیں ان کے چہر[ے] کو کسی کتاب کی طرح پڑھ رہی ہوں گی اور وہ یہ بھ[ی] جانتی تھیں کہ جتنی بھی کوشش کرلیں اپنے احساس[ات] کم سے کم وہ محجاب سے نہیں چھپا سکتیں۔ ایسے م[یں] ہمیشہ محجاب ان کا ہاتھ تھام کر انہیں اذیت بھر[ے] احساس سے باہر نکال لیتی تھی۔ ابھی بھی اس نے ا[یسا] ہی کیا۔ انہیں کچھ بھی جتائے بغیر اس نے چہرے [پر] مسکراہٹ سجائی اور ان کے قریب بستر پر آبیٹھی۔

"آپ نے اچھا کیا۔ فضول میں وقت ضائع ہوتا۔ اچھا ہوا نا میں نے کل کے ٹیسٹ کی تیاری کرلی۔ آئیں کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے ایک نوالہ شیر[یں] بیگم کے منہ میں ڈالتے ہوئے بشاش لہجے میں [کہا]۔ شیریں بیگم کا بھی جیسے رکا ہوا سانس قدرے سہل [ہو] گیا۔ پھر خاموشی سے کھانا کھا کر دونوں اپنے اپنے بس[تر] پر دراز ہوگئیں۔ دونوں کی سوچیں الگ تھیں، جذبات الگ تھے۔ مگر دکھ اور درد ایک تھا۔ بے اما[ں] ہونے کی اذیت۔ بے سائباں ہونے کا کرب اور بے دقعتی کا احساس دونوں کی آنکھوں میں نمی بن کر تیر[تا] تھا۔

☆ ☆ ☆

بہت سے بے کیف دنوں کے بعد یکدم ارمان [کی] شادی کا غلغلہ اٹھا۔ وہ جو پیپرز کے بعد شدید بوریت ا[ور] اکیلے پن کا شکار تھی دل سے خوش ہوا تھی۔ تائی امی [کو] بھی ان مصروف دنوں میں شیریں بیگم اور محجاب [کی] اہمیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ سو دل میں وہ جو بھی محسوس کرتی ہوں وقتی مصلحت کے تحت انہوں نے خوش اخلاقی کا چولا پہن لیا۔ اور شیریں بیگم تو جیسے جی جا[ن] سے ان کی خدمت میں جت گئیں۔ گھر بھر کا کام ایک طرف رہا سارا سارا دن بازاروں کے چکر۔ زیادہ تر شیریں بیگم ہی بھگتا رہی تھیں۔ محجاب نے بھی تائی امی کے رویے میں واضح تبدیلی محسوس کی اور قدرے سکون کا سانس لیا۔

گھر بھر میں پہلی پہلی شادی تھی سو سب کا خیال تھا کہ جی بھر کر ہر ایک اپنے ارمان پورے کرے گا۔ شاندار ولیمہ کا مینو ترتیب دیا گیا۔ بارات کا ارینج منٹ بہت وسیع و عریض اور خوب صورت ترین شادی ہال میں کیا گیا۔ البتہ مہندی کی تقریب گھر میں ہی ہونا قرار پائی تھی۔

ارمان کی ہونے والی بیوی انگلینڈ سے ایم بی اے کی ڈگری لے کر آئی تھی۔

مزاجاً" کیسی تھی کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کیونکہ وہ کسی کے ساتھ زیادہ گھل مل کر نہیں بیٹھی تھی۔ محجاب کی بھی صرف منگنی پر اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ بھی سرسری سی اور وہ اسے خاصی مغرور لگی تھی۔ بہرحال محجاب کے لیے تو سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ ارمان بھائی کی شادی میں وہ ایک بہن والے سارے چاؤ پورے کرسکے گی۔

مہندی کا دن اپنی پوری آب و تاب اور مصروفیات کے ساتھ طلوع ہوا۔ صبح سے ہی گھر میں خاصی گہما گہمی تھی۔ تائی امی کا میکا خاصا لمبا چوڑا تھا اور تقریباً" تمام مہمانان گرامی تشریف لاچکے تھے۔ سو محجاب اور شیریں بیگم کا ایک پاؤں صحن تو دوسرا کچن میں تھا۔ جبکہ خالدہ بیگم مہمانوں کو خوش آمدید کہنے اور ان کو کمپنی دینے میں مصروف تھیں۔ عون اور سعدان نے شام تک دوستوں کے ساتھ مل ملا کر لان کو اس خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کرلیا تھا کہ دیکھنے والی نگاہ ایک پل کو مبہوت ہوتی تھی۔ پہلے لڑکے والے مہندی لے کر جاتے پھر رات میں ارمان کے سسرال والوں کو آنا تھا مہندی لے کر، محجاب مہندی وغیرہ سجانے سے فراغت پاتے ہی اپنے پورشن کی طرف بھاگی کیونکہ فنکشن شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔ دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بہت زیادہ فیشن پرست اور میک اپ کی دلدادہ نہیں تھی۔ اس لیے اس نے مہندی اور ریڈ کلر کنٹراسٹ کے جدید تراش خراش کے ڈریس کے ساتھ بہت ہلکی پھلکی جیولری کو ترجیح دی۔ نیچرل کلر کے میک اپ اور سادہ سی چٹیا میں وہ خاصی منفرد اور سادہ دکھائی دے رہی تھی۔

تقریباً" سب ہی تیار تھے دلہن کے گھر روانگی کے لیے جب اچانک شیریں بیگم کی طبیعت بگڑ گئی۔ محجاب کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے شیریں بیگم کے اکھڑے اکھڑے سانس، تیزی سے پیلی پڑتی رنگت اور پیشانی پر آنے والا سرد پسینہ اس کی جان ہوا کرنے کو کافی تھے خالدہ بیگم اپنی جگہ پریشانی کا شکار تھیں کہ ان کے لاڈلے بیٹے کی شادی میں یہ کیا رنگ میں بھنگ پڑنے والا تھا۔ انہوں نے گھبرائی ہوئی محجاب کو تسلی کے دو حرف کہے اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ بجائے اس کے کہ فنکشن کو ملتوی کیا جاتا یا سوگواری طاری کرلی جاتی۔ تمام مہمانوں کو دلہن کے گھر روانہ کردیا گیا۔ جبکہ صرف عون تھا جو محجاب کی مدد کے لیے گھر پر ہی ٹھہر گیا۔ وہی ڈاکٹر کو بلا کر لایا۔

شیریں بیگم کو مائنر سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے ان کا اچھی طرح چیک اپ کرنے کے بعد دوا تجویز کی اور رخصت ہوگیا۔ اس وقت شیریں بیگم مسکن ادویات کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ وہ ان پر کمبل درست کرتی خاموشی سے باہر نکل آئی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنے گردو پیش پر ڈالی۔ خوشبوؤں، روشنیوں میں بسا یہ گھر اس وقت کسی ویران کھنڈر کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلا لیے۔ سرخ مہندی سے سجے موم کی طرح نازک مخروطی ہاتھ لیکن جانے ان کی لکیروں میں کون سی آزمائشیں رکھ دی تھیں اس اوپر والے رحیم و کریم نے۔

"کیا دیکھ رہی ہو محجاب۔" عون بہت دھیرے سے اس کے قریب ہی سیڑھیوں پر آن بیٹھا تھا۔ اس نے رخ موڑ کر اپنے اس پیارے سے کزن کو دیکھا جو بچپن سے اس کا دوست بھی تھا اور دشمن بھی ہمراز بھی تھا اور

وقت پڑنے پر دھوکا بھی دے جاتا تھا۔ مگر جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا۔ فاصلہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ اس کی شرارتیں جوں کی توں رہیں مگر مجاب خود میں سمٹتی چلی گئی۔

"کچھ نہیں عون! امی کے بارے میں سوچ رہی ہوں..... عون میرے پاس امی کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔"

اس کی کٹورا آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں عون نے ان گہری آنکھوں سے نظریں چرالیں۔ ان آنکھوں میں بہت بار اس کی وجہ سے آنسو آئے تھے۔ مگر تب اس کو کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ معصوم آنکھیں جب آنسوؤں سے بھرتی ہیں تو سامنے والے پر کس طرح اثر کرتی ہیں۔

اس کا مٹا مٹا کاجل اور گہری آنکھیں..... آج بھی ان آنکھوں میں اول روز جیسی معصومیت، بے غرضی اور ملائمت تھی۔ اسے وہ آج بھی ویسی ہی لگی جیسے اس کی نوٹ بک پھاڑ دینے پر وہ ہونٹ ہلاتی، آنسو بہاتی، منہ بسورتی ماں کی گود میں جا چھپتی تھی۔ مگر یہ نوٹ بک نہیں تھی۔ زندگی تھی اور اس کی زندگی کا واحد آسرا شیریں بیگم ہی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوگا چاچی کو..... ہم سب ہیں نا! تم اکیلی تو نہیں مجاب۔ بہتر سوچو..... اللہ کرم کرے گا۔ چلو اٹھو شاباش دو کپ چائے بناؤ۔ مل کر پیتے ہیں۔ ابھی مہمان بھی واپس آجائیں گے اٹھو۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھاتے ہوئے قدرے خوشگوار لہجے میں بولا۔

"عون! ڈاکٹر نے کوئی خطرے والی بات تو نہیں کی نا! میری امی ٹھیک ہوجائیں گی نا۔" لفظ ٹوٹ رہے تھے کیونکہ جب مایوسی اندر کہیں پنجے گاڑ کر بیٹھ جائے تو دکھ اور اذیت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ اس نے اپنے باپ کے ہنستے مسکراتے چہرے کو ایک ہی دن میں خون میں لت پت پایا تھا۔ تقدیر کے وار انجانے اور اچانک ہوتے ہیں۔

"الٰہی امی کو کچھ نہ کرنا۔ میری امی کو مجھ سے دور نہ کرنا پلیز۔" کچن میں چائے بنانے کے دوران بھی جیسے اس کا دم اٹکا ہوا تھا۔

"میں کبھی نہیں ہنسوں گی۔ میں خوش نہیں ہواں گی اللہ جی۔ مجھے ہنسی کا بہت خراج دینا پڑتا ہے۔ بس ایک بار میری امی کو ٹھیک کردے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے میں کبھی اور کچھ نہیں مانگوں گی۔" نم آنکھوں کے ساتھ لب مسلسل دعاؤں میں مصروف تھے۔ عون کو چائے دے کر وہ واپس امی کے کمرے میں آگئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد باہر دل خوش کن آوازیں اور قہقہے بتا رہے تھے کہ مہمان واپس آگئے۔ ڈیک پر اونچی آواز میں گانے بج رہے تھے۔ خوب رونق اور ہنگامہ تھا۔ مگر وہ سب سے الگ تھلگ ماں کا ہاتھ تھامے کمرے میں ہی بیٹھی رہی۔

رات گئے تک ہنگامہ رہا۔ کسی نے کمرے میں جھانک کر نہ دیکھا یہاں تک کہ عون بھی دوبارہ پوچھنے نہ آیا۔ تین یا ساڑھے تین بجے ہنگامہ ختم ہوا اور خاموشی چھاگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سب تھک ہار کر سوچکے ہیں۔

اسے اپنی کم مائیگی اور بے وقعتی کا احساس اس سے پہلے کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا جتنا آج ہوا۔

"کیا میں اور میری ماں اس گھر اور گھر کے مکینوں کے نزدیک اس قدر غیر اہم ہیں کہ کسی کو توفیق تک نہ ہوئی کہ پوچھ ہی لیتا۔" دکھ نے جیسے اس کے دل کو اپنی گرفت میں دبوچ رکھا تھا۔

"اور عون! تم..... تم تو میرے دوست تھے۔ تمہیں بھی احساس نہیں کہ میں کتنی اکیلی ہوں۔ مجھے اس پل تمہاری کتنی ضرورت ہے۔" اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں جیسے گلہ کیا تھا۔

"لیکن نہیں میں کیوں گلہ کروں کسی سے؟..... کس لیے شکایت کروں۔ جو درد اپنا ہے اسے بھوگنا بھی خود ہی ہے یہی دنیا کا اصول ہے کون آتا ہے کسی کے دکھ میں حصہ دار بننے۔ مسکراہٹ بانٹنے کو تو سب تیار ہوتے ہیں آنسوؤں سے کون دوستی کرتا ہے۔ کوئی بھی نہیں۔" اس نے خود کو تسلی دی اسی پل شیریں بیگم نے کچھ کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

فجر کی اذانیں ہوچکی تھیں اس نے وضو کیا اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوکر اپنی ماں کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں اور پھر جلدی سے ان کے لیے ناشتا بنا کر لے آئی۔ تمام گھر والے اور مہمان گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے اور یقیناً "ان کے اٹھتے ہی مجاب کی پکار پڑنی تھی ہر طرف۔ اس نے اپنے ہاتھ سے امی کو ناشتا کرایا۔ دوا کھلائی اور تائی امی کے پورشن کی طرف آگئی۔

"مجاب! کہاں تھیں تم میں کب سے دیکھ رہی تھی۔ مہمان اٹھنے ہی والے ہیں یہ کم بخت سکینہ بھی ابھی تک نہیں آئی سارا کام پھیلا پڑا ہے۔" تائی امی بڑے مصروف سے انداز میں کچن کے دروازے تک آئیں اور بولتی ہوئی فریج کی طرف بڑھ گئیں۔

"وہ تائی امی! امی کی طبیعت ساری رات ٹھیک نہیں تھی اس لیے۔" مجاب کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ کیا تھا تائی امی اس کی ماں کا احوال پوچھ لیتیں اسے گلے سے لگا کر تسلی دیتیں کہ "اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھو ہم سب تمہارے ساتھ ہیں نا تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے' اس کی آنکھوں میں شکوے مچلے مگر وہ بدستور سر جھکائے آٹا گوندھنے میں مصروف رہی۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نے کہا تو ہے..... وہ ٹھیک ہے اب' اچھا ہاں ایسا کرو' ناشتے کی کچھ چیزیں بازار سے ریڈی میڈ آئی ہیں۔ یہ اس کی لسٹ میں رکھے جاتی ہوں شرفو کو سمجھا دینا تم بس جلدی جلدی پراٹھے بنالو میں کسی کو بھجواتی ہوں تمہاری ہیلپ کے لیے۔" وہ باہر نکل گئیں۔ اسے آج سے پہلے تائی امی اتنی کٹھور اور بے حس نہیں لگی تھیں، جتنی آج.....!

"یہ..... یہ خون کے رشتے ہیں الٰہی تو نے کیوں اتنا خالی دامن کیا مجھے؟" اشک تھے کہ بن بلائے مہمان کی طرح پلکوں کے دروازے دھڑ دھڑا رہے تھے۔ اس نے بے دردی سے پلکیں میچ لیں۔

اتنی دیر میں سکینہ بھی آگئی تو کچھ بوجھ کم ہوگیا۔ اس کے ساتھ مل کر ناشتا بنانے اور سرو کرنے کے درمیان وہ بمشکل ایک بار ہی شیریں بیگم کو دیکھنے جا سکی۔ انہیں پرسکون سویا ہوا پا کے اسے کچھ سکھ ملا تھا۔ مہمان خواتین اور لڑکیاں محض فیشن زدہ اور خود نمائی کا شکار صرف باتوں میں مصروف تھیں۔ کوئی بھی اس کی مدد کے لیے کچن تک نہ آیا سوائے سکینہ کے اس نے کام نبٹایا اور کمرے میں آگئی۔ شیریں بیگم جاگ رہی تھیں۔

"مجاب! ادھر آؤ بیٹا جی میرے پاس بیٹھو۔" شیریں بیگم نقاہت بھری آواز میں بولیں۔ مجاب دھیرے سے چلتی ہوئی ان کے بستر کے قریب آگئی اور پھر ان کا کمزور ہاتھ تھام کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"میں جانتی ہوں میرا بچہ! تم بہت تھک گئی ہوگی اس کم بخت بیماری کو بھی ابھی آنا تھا۔ کسی نے تمہارے ساتھ مدد کروائی یا....."

"ہاں امی! سکینہ تھی میرے ساتھ اور آپ پریشان نہ ہوں سب کام سکون سے ہوگیا ہے ابھی تو لڑکیاں پارلر جارہی ہیں تیار ہونے کے لیے۔ بارات پانچ بجے روانہ ہونی ہے۔ آپ چھوڑیں سب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔ کوئی درد وغیرہ تو نہیں۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں بیٹا! بس یہ بایاں بازو کچھ سن ہے۔ بہرحال یہ کوئی مسئلہ نہیں تم بارات کے ساتھ جانا کل بھی میری وجہ سے تمہیں رکنا پڑ گیا پیچھے کا نظام میں دیکھ لوں گی۔" وہ جیسے مسکرا کر اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

"نہیں امی! میرے لیے آپ کے سوا کچھ بھی نہیں یہ شادی رونق یہ سب جھمیلے بے معنی ہیں میری امی جانی۔ میں آپ کو اس طرح چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔" مجاب کا لہجہ بھیگ گیا۔ اس نے اپنا سر شیریں بیگم کے ممتا بھرے سینے پہ رکھتے ہوئے بمشکل سسکیاں روکیں۔ وہ اپنے کسی عمل سے ان کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ارے مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ٹھیک ہوں میں اب! دیکھو تو۔" انہوں نے انگلیوں سے اس کے ماتھے پر آئے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے دھیمے سے کہا۔ اس نے

سر اٹھا کر ان کے زردی مائل صبیح چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔

"کتنا بے غرض' بے لوث رشتہ ہے نا میری ماں! میرا اور تمہارا تم مجھ سے اپنے درد چھپاتی ہو کہ مجھے تکلیف نہ ہو اور میں اپنا درد تم سے بیان نہیں کرتی کہ ایسا نہ ہو انجانے میں تمہارے لیے دکھ کی وجہ بن جاؤں۔ یہ دنیا' یہ باقی کے رشتے بس دکھاوا ہی تو ہیں اور بھلا کیا ہے ان میں کچھ بھی تو نہیں۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ مسکرا دیں۔ اپنی چھوٹی سی بیٹی کے من میں اگتے درد کے سب خار محسوس کر سکتی تھیں۔ اس کے چہرے پر پھیکے تاثرات میں چھپی محرومی' اذیت اور درد کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں۔ وہ انہی کا ہی تو پرتو تھی۔ ان کی ذات کا ایک حصہ ان کے وجود سے الگ ہو جانے والا ایک ٹکڑا جو الگ ہو کر بھی جدا نہیں تھا۔

"خدایا میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے" (آمین) انہوں نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر شیریں بیگم کے بے حد اصرار پر وہ بارات کا فنکشن اٹینڈ کرنے پر تیار ہو گئی۔ ریڈ کلر کے سمپل شیفون کے سوٹ کے ساتھ لمبے بال پشت پہ پھیلائے بنا میک اپ کے بھی وہ سب سے منفرد اور نرالی چھب دکھا رہی تھی۔

"خیر ہے دنیا والو! اتنی رنگینی کے بیچ یہ سادگی؟ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔" عون سامنے کوریڈور میں ہی کھڑا تھا۔ اسے کمرے سے نکلتے دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ ایک گہری نظر اس پر ڈال کر وہ اپنی ازلی ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

"عون! تم بھول رہے ہو میری ماں بیمار ہے۔ میں آج بھی نہ جاتی اگر امی نے اصرار نہ کیا ہوتا۔ تم نے دیکھا تھا نا کل وہ کتنی تکلیف میں تھیں' میں ان کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی ورنہ میرا بس چلے تو میں ایک منٹ بھی ان کے پاس سے نہ ہلوں۔" اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے کزن دکھ سکھ زندگی کے ساتھ ہیں۔ ڈونٹ وری شی ول بی پرفیکٹلی آل رائٹ۔" اس ک دینے کا انداز بھی اس کی طرح لاپرواہی تھا۔

"ہاں اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔۔۔ وہ ہیں تو میر میری بقا ان ہی سے ہے۔" وہ کہتی ہوئی آگے بڑھ "اور اس گھر کی بقا تم سے ہے مجاب۔" عوا عنابی لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

شادی کی دھوم دھام کا اختتام اگر اس قیامت تھا تو کاش وہ ایک لحظہ بھی نہ مسکراتی۔ اپنی ماں ایک پل کو بھی الگ نہ ہوتی۔ ابھی رات ہی تو دلہ میں آئی تھی۔ کتنی بے فکری' کتنا خوش کن ماحو اس کے چاروں طرف۔ چمکتی مسکراتی آنکھ لہراتے رنگین آنچل' بے فکرے قہقہے اور ان۔ اس کی مضمحل اور بیماری کے ہاتھوں ٹوٹی ہوئی ماں خشک لبوں کی مسکراہٹ وہ سب کے درمیان بیٹھی تھیں اور سب کو خوش دیکھ کر دل سے مسکر تھیں۔ پھر پھر یہ کیا ہو گیا تھا اے خدا۔۔۔۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی ایک نامعلوم احسار تحت اس کی آنکھ کھل گئی اس نے شیریں بیگم کی ط دیکھا جو کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھیں ان کا رخ ا جانب تھا۔ چہرے پر انتہائی سکون اور ایک عجیب سکوت نظر آ رہا تھا۔ مجاب نے بہت توجہ سے ان چہرے کی طرف دیکھا۔ اور پتا نہیں کیوں اس کا دل اٹھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر ان کے بستر کے قریب آ

"امی۔۔۔ امی جانی۔" اس نے ہلکے سے ان کندھے کو ہلایا۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

"امی۔۔۔ امی آنکھیں کھولیں پلیز۔" اس آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے شیریں بیگم کا بے وجود اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ رات کے جا کس پہر وہ اس سے اور دنیا سے ناتا توڑ کے ہمیشہ لیے جا چکی تھیں۔

"نہیں۔۔۔ نہیں امی۔۔۔ ایسا نہ کریں اللہ کے آنکھیں کھولیں۔" اس نے ان کے سینے پر سر رکھ

مگر ممتا سے لبریز دھڑکتا دل اور مہربان سفینہ آج خاموش تھا۔ آج جھکے ہوئے نرم بازوؤں نے اسے خود میں نہیں سمویا تھا۔ اسی طرح بے جان پہلوؤں میں پڑے تھے۔

"امی۔۔۔ امی نہیں۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

تائی امی۔۔۔ عون۔۔۔ مانی بھائی۔۔۔ خدا کے لیے آئیں' جلدی آئیں میری امی۔" وہ ننگے پاؤں اپنے پورشن سے نکل کر بھاگی تھی اور سامنے سے آتے عون سے بری طرح ٹکرا گئی۔ عون نے اس کے وحشت بھرے لہجے اور خوفزدہ بھیگی آنکھوں کی طرف دیکھا بمشکل اس کو بازوؤں کا سہارا دیا۔

"عون۔۔۔ عون! میری امی۔" زبان نے ساتھ نہ دیا۔ وہ اس کا کالر پکڑے روتی بلکتی اس کے بازوؤں میں ہی جھول گئی تھی۔ عون لق دق کھڑا تھا۔

"کیا ہوا چچی کو۔" اس نے پاس پڑی کرسی پر اسے کسی طرح بٹھایا اور جلدی سے اپنی ماں کو بلانے دوڑ پڑا۔

وہ ایک سکتے کی کیفیت میں تھی۔ جس کی کل متاع اس سے چھین لی جائے تو پھر وہ سانس لیتے ہوئے بھی زندہ نہیں رہتا کیا تھا اس کے دامن میں؟ کیا بچا تھا کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ یہ ظالم وقت۔۔۔ جس نے اس سے باپ کا سایہ چھینا تو جیسے مہربان سائبان چھین کر زمانے کی دھوپ میں لا کھڑا کیا اور آج مہربان ماں کو چھین کر اس کے پاؤں تلے سے زمین بھی سرکا دی تھی۔ وہ ہوا میں معلق تھی بنا کسی سہارے کے۔ کڑی دھوپ میں جلتے وجود کے ساتھ۔۔۔

☆ ☆ ☆

رفتہ رفتہ زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ خاموش سی شیریں بیگم کا بے ضرر وجود بھلا کوئی کب تک یاد رکھ سکتا تھا۔ ایسے لوگ جو اپنے وجود کا احساس دلائے بغیر خاموشی سے اپنی زندگی جی جاتے ہیں۔ ان کی کمی کو کوئی محسوس تک نہیں کرتا۔ ہاں کبھی کبھار کام کی زیادتی کے باعث وہ محنتی ہاتھ ضرور یاد آ جاتے ہیں۔ مگر اس کی تو وہ ماں تھیں۔ ماں' جس کا وجود ہی چین اور سکھ سے عبارت ہوتا ہے اور جیسے وہ جاتے ہوئے چین اور سکھ سمیٹ کر لے گئی تھیں۔

"امی۔۔۔ امی آپ کیوں چلی گئیں مجھے چھوڑ کر؟" رات کی تنہائی میں اپنے کمرے کے اندھیرے میں اکثر اس کے ہونٹوں پر سسکتے ہوئے شکوے مچل جاتے۔ زندگی اس کے لیے تو ویسے ختم ہی ہو چکی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔

کھلی کھڑکی سے آتی خنک ہوا نے اس کے وجود کو کپکپا کے رکھ دیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔

فصیل زندگی اور خندق جاں
نہ گرتی ہے نہ بھرتی ہے کروں کیا
سسکتی آرزو' زخمی تمنا
نہ جیتی ہے' نہ مرتی ہے کروں کیا

زخمی لبوں پر درد پپڑیوں کی طرح جما ہوا تھا اور آنکھیں کسی ویران صحرا کی طرح خالی خالی تھیں۔ عون کو وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح لگتی۔ جو سارا دن گھر میں بے مقصد ادھر ادھر گھومتی رہتی۔ اپنے آپ سے بے نیاز کندھے پر جھولتا دوپٹہ اور بکھرے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں چہرے کے اطراف پھیلی ہوئی ہوتیں۔ کسی نے زبردستی کھانا کھلا دیا تو کھا لیا ورنہ بھوک اور پیاس سے بھی بے نیاز ہو گئی تھی وہ۔

دو پونیاں جھلاتی منہ بسورتی وہ گول مٹول معصوم سی بچی جس کے چہرے پر والدین کی محبت اور ان کے ساتھ کی آسودگی کا اعتماد جگمگاتا تھا۔ آج اس ویران چہرے پر پھیلی محرومی اور بے بسی کی تحریر نے عجیب سا سوز پیدا کر دیا تھا۔ ہر پل نم رہنے والی پلکیں اور بنا مسکراہٹ کے اس کے لب جیسے عون کے لیے بالکل اجنبی تھے وہ اس بے جان مورت میں زندگی ڈالنا چاہتا تھا۔ دوبارہ اسی طرح ہنستا کھلکھلاتا دیکھنا چاہتا تھا اسے۔ اس شام ہار سنگھار کے خاموش بزرگ درخت تلے اسے ساکت بیٹھا دیکھ کر وہ اپنے قدموں کو نہ روک پایا اور اس کے قریب چلا آیا۔

”مجاب۔“ بہت قریب آکر اس نے دھیمے سے اسے پکارا اس نے اپنی بھاری پلکیں اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

”ایک بات کہوں مانو گی؟“ عون اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے قدرے ٹھوس لہجے میں بولا۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھے گئی۔ بولی اب بھی کچھ نہیں۔ وہ اس سے قدرے ہٹ کر اسی کی طرح گھاس پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر دونوں کے مابین خاموش رہی۔ پتا نہیں خاموش تھی یا بزبان خاموشی کوئی گفتگو۔ عون نے بکھرے بالوں اور ویران آنکھوں کو دیکھا پھر نظروں کا رخ بدل لیا۔

”اس طرح مت رہو مجاب۔“ چند الفاظ میں کیا نہیں تھا۔ محبت، فکر، بے بسی، احساس...... اپنائیت۔ کتنے دن بعد مجاب سے کسی نے اپنائیت سے بات کی تھی۔ مجاب خالی خالی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”میں تمہیں ایسے نہیں دیکھ سکتا۔“ عون گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے سر جھکائے جھکائے بولا۔

”کیوں؟“ خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔

”کیونکہ...... کیونکہ مجاب تم...... تم میری ہو۔“ اب کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے ہوئے عون اس کی مزید کسی بات کا انتظار کیے بنا اٹھ کر چلا گیا۔ مجاب نے جاتے ہوئے عون کی پشت پر نظر ڈالی زخمی سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کو چھو لیا۔

”دیوانے کا خواب...... محبت...... عون صاحب جنم جلی ہوں میں...... محبت کبھی مجھے راس نہیں آسکتی...... میرا وجود محبت کے لیے نہیں بنا۔ میں نے جس کو چاہا وقت نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ جس نے مجھ سے محبت کی...... وہ مجھ سے اس طرح بچھڑا کہ پھر عمر بھر اس کا وجود ایک خواب بن کر رہ گیا۔

تم نے شاید غور نہیں کیا۔“ سر اٹھا کر بار سنگھار کے مہربان درخت کو دیکھا بے شمار پرندوں کو اپنی آغوش میں چھپائے خاموش کھڑا یہ درخت اس کے درد کا راز دار بن گیا تھا۔ اس نے بکھرے بالوں کی لٹوں کو سمیٹ کر جوڑا سا بنایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجاب بی بی...... اپنے درد کا اشتہار بنانا تو اچھی بات نہیں۔ یہ دنیا دل میں کب جھانکتی ہے مصنوعی مسکراہٹ، مصنوعی خوش دلی...... اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے...... خود کو جینا ہوگا۔ زندگی کچھ کہے۔ دل پر جو بھی گزرے۔ کسی کو اس سے کیا دینا۔ لوگوں کے نزدیک آنسوؤں کی بھلا کیا حیثیت۔ یہ آنسو اپنے اندر سمولو۔“ وہ جیسے خود کو نصیحت کر رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ سب نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر زندگی کی کچھ رمق نظر آنے لگی۔ عون بولتی آنکھیں ہر پل اس کا حصار کیے رکھتی تھیں اور جیسے جان کر بھی انجان بنی رہتی۔

”تائی امی! لائیں میں سبزی بنا دوں۔“ وہ کچن کے دروازے میں کھڑی تھی تائی جان نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا معمول سے ہٹ کر آج وہ قدرے بہتر دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے سبزی کی باسکٹ اس کے ہاتھ میں دی اور باہر نکل گئیں۔ اس دن اس نے اپنے آپ کو گھر کے کاموں میں مصروف رکھا اور خود کو بہت بہتر محسوس کیا تھا۔ مہرین اور ارمان ہنی مون کے لیے کنٹری ٹور پر گئے ہوئے تھے۔ شام میں آفتاب خان نے اسے ٹیبل پر کھانا لگاتے دیکھا تو دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اس کے قریب چلے آئے۔

”کیسی ہو مجاب بیٹا۔“ ان کا مشفق ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ محبت بھرے لہجے نے اس کی پلکوں کو بھگو دیا۔

”ٹھیک ہوں تایا ابو۔“ اسے ان سے بابا کی خوشبو آئی تھی۔ مگر وہ بابا کی طرح زندہ دل نہیں تھے۔ اپنے آپ میں گم رہنے والے خاموش سے تایا ابو کا اتنا کہہ دینا ہی مجاب کے لیے بہت تھا۔

”بہت دنوں بعد تمہیں دیکھا بیٹا...... اپنا خیال رکھا کرو...... سب کے درمیان بیٹھا کرو...... دل بہل جاتا ہے اس طرح۔“ اس کا سر اپنے کندھے سے لگائے بہت دھیمے سے اس کو سمجھا رہے تھے۔

”تایا ابو...... بابا کو کیا ہو گیا۔ کیا بابا اب کبھی واپس نہیں آئیں گے تایا ابو...... میں نے سنا ہے جب کوئی مر جاتا ہے پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ آپ بابا سے کہو نا...... اس طرح نہ جائیں۔“ گیارہ سالہ بچی کا بلکنا کسی سے دیکھا نہ جاتا تھا اور آج پھر قسمت نے اس سے ایک اور قیمتی متاع چھین لی تھی۔ آج پھر اس کے لبوں پر سوال تھا۔

اور آفتاب خان نہ اس وقت کوئی جواب دے پائے تھے نہ ہی آج، ان کی پلکوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ انہوں نے اس کا سر ہلکے سے تھپتھپایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

پھر عون کی مدد سے اسے قریب کے ہی ایک انگلش گرائمر اسکول میں جاب مل گئی۔ عون نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ جب تک رزلٹ نہیں آتا تب تک اپنے آپ کو مصروف رکھو۔ پھر آگے ایم فل میں ایڈمیشن لے لینا۔

اسکول کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔ ننھے منے بچوں کے ساتھ آدھا دن گزار کر جب وہ واپس آتی تو اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ دن کا کھانا کھا کر سو جاتی پھر شام میں اٹھ کر تائی امی کے ساتھ گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتی۔ زندگی ایک روٹین کے تحت گزر رہی تھی کہ انہی دنوں میں مہرین اور ارمان کی واپسی نے گھر میں جیسے نئی زندگی دوڑا دی۔ دعوتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی کبھار وہ بھی ساتھ ہو لیتی۔ لیکن زیادہ تر اس کی کوشش ہوتی کہ اسے گھر پر ہی رہنے دیا جائے۔

اسے تنہائی میں سکون ملتا تھا کیونکہ تنہا ہوتے ہی اس کی ماں اس کے قریب چلی آتی۔ اسے اپنی مہربان بانہوں میں بھر کر اس کے درد سمیٹ لیتی۔ اس کے باہر ایک دنیا تھی اور ایک دنیا اس کے اندر تھی۔ سارا دن وہ باہر کی دنیا میں جیتی تھی اور تنہائی اور رات کے سناٹے میں اپنے اندر کی دنیا میں۔ اس دنیا میں اس کی ماں کی ممتا کا خزانہ تھا۔ باپ کی شفقت بھری بانہوں کا سہارا تھا۔ ایک سرخوشی تھی۔ ایک سکون تھا۔ کوئی دکھ نہیں تھا۔ کوئی محرومی نہیں تھی۔

”مجاب! کیا کر رہی ہو؟“ عون جہاں کہیں اسے اکیلا بیٹھے دیکھتا آدھمکتا تھا۔ لیکن اس دن کے بعد آج تک اس نے دوبارہ ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ بس بولتی آنکھوں سے اسے سمجھانے اور بتانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور وہ نظر انداز کرتی رہتی تھی۔

”کچھ نہیں بس بچوں کے کچھ ٹیسٹ تھے وہ چیک کر رہی تھی۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بکس ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔

”تم کہاں جا رہے تھے؟“ اس نے اسے سوٹڈ بوٹڈ دیکھا تو پوچھا۔

”بس یونہی آفس تک جانے کا پروگرام ہے بابا کا اصرار ہے کہ مجھے آفس جوائن کر لینا چاہیے۔“

”تو ٹھیک ہے...... ٹھیک کہتے ہیں تایا ابو...... آخر تمہارا ایم بی اے کس دن کام آئے گا۔“

”مجھے بے زاری ہوتی ہے میں بزنس مائنڈڈ نہیں ہوں میں جاب کرنا چاہتا ہوں، یا پھر اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی بنانا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا کام جس میں creativity ہو بس دو جمع دو پانچ کا چکر نہ ہو۔“

آفتاب خان کے باقی دونوں بیٹوں کے مقابلے میں عون کا ذہن بالکل الگ تھا۔ ارمان اور سعد ان کاروباری ذہن کے مالک تھے اور والد کے ساتھ بہت خوشی سے بزنس میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ بلکہ عون اپنے بل بوتے پر کچھ کرنا چاہتا تھا۔

”تو کیا تایا ابو مان جائیں گے؟ وہ ناراض نہیں ہوں گے۔“ مجاب نے کہا۔

”ان کو ماننا چاہیے۔ اس میں بھلا ناراضی کی کیا بات۔ ان کے دو بیٹے آل ریڈی ان کے ساتھ ہیں۔ کاروبار کو بہت اچھی طرح لک آفٹر کر رہے ہیں۔ میرے ہونے نہ ہونے سے کچھ خاص فرق نہیں

پڑے گا۔ پھر مجھے وہ کیوں نہ کرنے دیں جس میں میری خوشی اور میرا سکون ہے۔ ان کو تو میرا ساتھ دینا چاہیے۔" عون کا لہجہ مضبوط اور پختہ عزم لیے ہوئے تھا۔

"میں تو چاہتا ہوں کہ تم بھی ایجوکیشن کمپلیٹ کر کے میرے ساتھ ہی ایڈورٹائزنگ میں آجاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی کری ایٹو مائنڈڈ ہو۔ ہم مل کر بہت سا کام کرسکتے ہیں مجاب۔" عون کی آنکھیں آنے والے دنوں کی خوب صورت پرچھائیوں کا سوچ کر چمک رہی تھیں۔ مجاب نے آنکھیں چرالیں۔

"ساتھ دو گی نا۔" معنی خیز لہجہ، مسکراتے عنابی لب۔

"ابھی سے کیسے کہوں۔ تم کام شروع کرو۔ اگر تایا ابو نے اجازت دی تو پھر میں کام کروں گی تمہارے ساتھ۔" مجاب نے اس کے لہجہ و مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

"یعنی تمہارے ساتھ کی امید تو رکھ سکتا ہوں نا۔" اس کی گہری آنکھیں جانے کیا اگلوانا چاہتی تھیں۔

"وقت پر منحصر ہے اور آپ شاید کہیں جانے کے لیے تیار ہوئے بیٹھے تھے۔" وہ نوٹ بکس اٹھا کر کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی کہ مبادا آج اس دشمن جاں کے سامنے چہرے کا کوئی تاثر اس کے دل کا بھید نہ کھول دے۔

"کب تک.....؟ ایک دن تمہاری یہ اداسیاں سمیٹنے کا حق پا ہی لوں گا میں۔" عون نے اس کی لہراتی ناگن سی چٹیا پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا اور کی چین گھماتا پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

ہر گزرنے والا پل اس کے دل میں مجاب کی حیثیت کو مستحکم کرتا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مجاب کا حصول اس کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں تھا۔ کوئی ظالم سماج اور رقیب والا قدیمی تصور نہیں تھا۔ گھر ہی کی تو بات تھی۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ آفتاب خان کو اس کے اس چناؤ پر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اپنی بے سہارا بھتیجی کو بہو بنانے پر بھلا انہیں کیا اعتراض ہوگا۔ سو اس طرف سے وہ بالکل بے فکر تھا۔ کہتے ہیں کہ تقدیر ہمیشہ تد ہنستی ہے اور تقدیر ابھی بھی مسکرا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت زخم دیتا ہے تو کسی طبیب کی طرح ان زخم کا علاج بھی کرتا ہے درد دیتا ہے تو درد کا درماں بھی ہے آنسو دیتا ہے تو آنکھوں میں خواب کی فصلیں اگا دیتا ہے۔ مجاب کی زندگی بھی دھوپ اور چھاؤ ایسا ہی سنگم تھی۔ ماں باپ کا پر شفقت سایہ اس زندگی کے دائرے سے بہت دور ہو چکا تھا۔ لیکن ا کے بدلے میں ایک اور محبت نے اسے اپنے مہر پروں میں سمیٹ کر اس کے زخمی احساس کو تھپکیا دینی شروع کردی تھیں۔ اس کے احساس محرومی عون کی بے لوث محبت نے کسی حد تک کم کردیا تھ اس کا دل مسکرانے کو چاہنے لگا تھا۔ آنکھیں خوا بننے لگی تھیں۔ بارش میں بھیگنا، تتلیوں کو پکڑ پھولوں کے گجرے بنانا، جھولا جھولنا یہاں تک بچوں کے ساتھ بچہ بن جانے کو دل چاہتا تھا اس کا۔

"امی..... امی جانی، کاش آج آپ ہوتیں..... آ آپ دیکھتیں مجھے مسکرانا آگیا ہے امی سچ میں میرا دا خوش رہنے لگا ہے۔ مگر میں کس کو بتاؤں کوئی بھ تو نہیں۔ آج آپ ہوتیں تو آپ کے سینے میں منہ چھ کر میں اپنی زندگی کی واحد خوشی آپ کو بتاتی....." لا کی سبز گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے اس نے جیسے خو کلامی کی۔ میرون شال اپنے گرد لپیٹے وہ سردی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پاؤں گھاس کی نمی اور ٹھنڈ ک وجہ سے گلابی ہوگئے تھے۔

"مجاب! کیا کر رہی ہو بیمار پڑنا ہے۔" تائی ام نے لاؤنج کے دروازے سے اسے باہر لان میں گھومتے دیکھا تو آواز دی۔

"نہیں تائی امی! بس ابھی آتی ہوں۔" اس نے چپل پاؤں میں اڑسے اور اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ رات سونے سے پہلے وہ کچھ وقت اپنے پورشن میں ضرور گزارتی تھی۔ اپنی امی کی پرچھائیں سے باتیں کرتی تھی۔ ان کی خوشبو اپنی سانسوں میں اتارتی تھی۔ یہاں تنہائی تھی اس کی ماں کی یادیں تھیں اور اس کے لیے سکون ہی سکون تھا۔

خالدہ بیگم نے اس کی تنہائی کے خیال سے اپنے پورشن کا ایک کمرہ اس کے لیے ٹھیک کروا دیا تھا۔ وہ جہاندیدہ خاتون تھیں۔ اپنے بیٹے کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور دلچسپی کے مرکز کو بخوبی سمجھ چکی تھیں۔ سو ہر پل اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھیں۔ مجاب کو آج تک ان کی سمجھ نہیں آئی تھی عجیب پل میں تولہ پل میں ماشہ قسم کا مزاج تھا ان کا۔ کبھی تو اسے لگتا کہ وہ اس کا بے حد احساس کرتی ہیں اور کبھی کبھی وہ ــــ یکسر اجنبی اور پتھر کی مورت کی طرح لگنے لگتیں۔ احساس و محبت سے عاری بے حس اور بے نیاز۔

مہرین خاندان سے باہر سے اس گھر میں آئی تھی۔ مگر اس کی حیثیت اور وقعت خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ تھی۔ خالدہ بیگم کی بے حد سپورٹ حاصل تھی اس کو۔ حالانکہ وہ گھریلو معاملات میں بالکل کوری تھی۔ کوئی کام بھی نہیں کرتی تھی۔ مگر پھر بھی گھر بھر کی لاڈلی بہو تھی۔ اور وہ جو اس گھر کا خون اس گھر کی آدھی مالک تھی اس کے ساتھ ان کا سرد رویہ گھر بھر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا حالانکہ وہ ہر وقت ان کا ساتھ دیتی تھی۔ ان کی خدمت میں دن رات لگی رہتی تھی مگر خالدہ بیگم کو خدا جانے کیا بیر تھا اس سے ان کا دل چاہتا تو اس سے بات کرلیتیں۔ ورنہ سارا سارا دن ماتھے کی تیوریاں چڑھائے اپنے آپ میں مگن رہتیں۔ ایسے میں مجاب کا دل تڑپ اٹھتا۔ اسے مہربان ماں کا ــــ وجود یاد آجاتا۔ درد سے بے تاب ہو کر وہ انہیں پکارے جاتی اور جواب میں کوئی آواز نہ پا کر بلکتی، روتی اور اس کا یہ درد اس کے یہ آنسو کمرے کی چار دیواریں خاموشی سے دیکھتی رہتیں۔ مگر کوئی نہیں تھا جو تسلی دیتا۔ اس کیفیت میں عون کی محبت کا احساس بھی کہیں دور جا سوتا۔

"تم بھی کچھ نہیں کرسکتے میرے لیے..... محبت کے سب دعوے جھوٹے ہوتے ہیں محبت میں بھی سوائے درد کے دکھ کے اور کچھ بھی نہیں ایک نہ ایک دن تمہاری محبت کا یہ دعوا بھی اپنی موت آپ مرجائے گا..... کیونکہ میرے نامعتبر وجود کو کس کس کی نظر میں معتبر کرسکو گے تم..... تھک جاؤ گے عون علی خان مگر میرے وجود سے لپٹے اندھیرے دور نہ کرپاؤ گے۔ میری پرچھائیں سے بھی بھاگو گے تم..... کیونکہ میں اپنے نصیب جانتی ہوں۔ جو ازل سے خالی ہاتھ، خالی دامن ہو..... اسے بھلا کیا ملے گا۔"

گلدان میں مری ہوئی تتلی اور ایک پھول
سوچوں اگر تو اس سے زیادہ نہیں ہوں میں
پچھلے دنوں سے دل کو عجب بے خیالی ہے
یہ بھی پتا نہیں ہے کہ ہوں یا نہیں ہوں میں

"یہی میری حقیقت ہے..... یہی میری زندگی۔" ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے عون کی شبیہہ سے کہا تھا۔

"یہ تم جو مجھے تنہا دیکھ کر چلے آتے ہو میرے دکھ بانٹنے..... مجھ پر محبتوں کی ٹھنڈی پھوار برسانے..... ایک دن مجھے جلتا چھوڑ جاؤ گے۔ عون..... مگر میں جانتی ہوں کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہوگا..... تم بھی مجبور ہو جاؤ گے نا۔ یہ رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آکاس بیل کی طرح وجود کے ساتھ لپٹ جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ خون چوستے رہتے ہیں..... جذبوں کا قتل کرکے نفرت اور خود غرضی کا زہر رگوں میں اتارتے وجود کو نیلا کردیتے ہیں۔ مگر پھر بھی مرتے دم تک ساتھ جڑے رہتے ہیں جانے کس جرم کا خراج وصول کرتے ہیں۔"

چند دن پہلے جو سرخوشی کا ایک عالم تھا۔ ایک عجیب سا سکھ اور نرالی سی شانتی کا جو احساس تھا وہ خالدہ بیگم کے سرد رویے سے ختم ہو گیا تھا۔ خوابوں کی دیواریں بوسیدہ ہو کر زمین بوس ہونے لگی تھیں۔ حقیقت اپنا سیاہ چہرہ لیے پھر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

"ہاں میں جانتی ہوں..... مجھے ناکردہ گناہ کی سزا ملے گی۔ کاش کوئی تو ہو جو انصاف کرے..... کاش کسی میں تو اتنی جرات پیدا ہو جائے۔" مجاب بہت تلخ ہو رہی

تھی اور یہ تلخی تو ان رویوں کا ردعمل تھی جنہیں وہ مسلسل فیس کرتی آرہی تھی اور اب اس کی روح بھی بجھنے لگی تھی۔ اس نے اپنے کسی رویے سے عون کی نہ تو حوصلہ افزائی کی تھی اور نہ ہی اسے کوئی آس دلائی تھی۔ مگر خود انجانے میں اس کی محبت کی جوت دل میں جگا بیٹھی تھی۔

سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھی مگر جیسے ہی عون کی گاڑی کی آواز سنائی دیتی وہ اپنے کمرے میں مقید ہو جاتی۔ اور پھر سارا وقت باہر نہ نکلتی۔ عون آج کل اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی اسٹیبلش کر رہا تھا سو اکثر رات دیر سے گھر آتا تھا۔ ایسے میں اگر ان کا آمنا سامنا ہو تا تو لازمی عون اسے روک کر کچھ نہ کچھ کہتا اور اگر تائی امی کی نظر اس پر پڑ جاتی تو جو کچھ وہ سوچ سکتی تھیں۔ اسے سوچ کر ہی مجاب کو جھرجھری سی آگئی۔

وہ ان کی نظروں سے بہت خائف رہتی تھی۔ پتا نہیں کیا سوچتی تھیں وہ اس کے بارے میں اسے اپنی ماں کے ساتھ خالدہ بیگم کا رویہ بہت اچھی طرح یاد تھا۔ مگر اسے یہ پتا نہیں تھا کہ آخر شیریں بیگم سے ایسا کیا قصور سرزد ہوا تھا۔ جس کی سزا خالدہ بیگم نے آخری سانس تک انہیں دی اور ان کے مرنے کے بعد مجاب کو تختہ مشق بنالیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے کمرے میں جھانکا خالدہ بیگم جائے نماز تہہ کر رہی تھیں۔

"امی..... میں آجاؤں۔" عون نے کہا تو خالدہ بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔

"کمال ہے! اب ماں کے کمرے میں آنے کے لیے بھی اجازت کی ضرورت ہے۔" وہ مسکرائیں۔ عون کمرے میں در آیا۔

"آپ مصروف تو نہیں تھیں امی..... بابا کہاں ہیں؟" عون نے کمرے میں نظر دوڑائی۔

"تمہارے بابا کی آج کسی فارن ڈیلی گیشن کے ساتھ میٹنگ ہے دیر سے آئیں گے اور میں مصروف تھی یا نہیں..... کم سے کم اتنی مصروف ہرگز نہیں اپنے بیٹے کی بات نہ سن سکوں۔" انہوں نے اس ہاتھ تھام کر اپنے پاس ہی بستر پر بٹھالیا۔

"ہاں..... اب بولو..... کیا بات ہے؟" خالدہ نے پوری توجہ اس کی طرف مبذول کی عون نے نظر ان کی طرف دیکھا پھر سر جھکالیا۔

"امی آپ کو مجھ پر کتنا بھروسا ہے میرے فیصلہ کے بارے میں آپ کا کیا اندازہ ہے؟"

"خیر ہے میرا بچہ.....؟ آج ایسی کیا بات ہو گئی" انہوں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس سنجیدگی آج انہیں عجیب لگ رہی تھی۔ کیونکہ و فیصلہ سنا دیا کرتا تھا۔

"امی پلیز بتائیں نا..... آپ کو یقین ہے کہ درست فیصلہ کرتا ہوں یا نہیں۔" عون کے لہجے اصرار تھا۔

"اوہو..... میری جان مجھے یقین ہے میرا بچہ فیصلہ نہیں کرتا۔ اب اصل مسئلہ بیان کرو کیا ہو گیا۔ خالدہ بیگم اس کے چہرے پر..... کشمکش و پیچ کی کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ مگر معاملے کی نوعیت کی انہیں ٹھیک طرح سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"امی.....! میں مجاب سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" عون نے سر اٹھا کر انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ انہیں کچھ اندازہ تو تھا مگر پھر بھی جیسے انہیں اپنے کانوں یقین نہیں آیا تھا۔ انہوں نے بے یقینی سے اس طرف دیکھا۔

"کیا کہا عون؟" وہ جیسے اس سے مزید یقین دہا چاہتی تھیں۔

"امی..... میں مجاب سے محبت کرتا ہوں اور اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔" عون کا لہجہ مستحکم تھا۔

"لیکن مجاب ہی کیوں؟ اور بھی کئی خوب صورت لڑکیاں ہیں پھر مجاب ہی کیوں آخر؟" انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کس طرح اسے یہ احساس دلائیں کہ اس کا فیصلہ سراسر غلط ہے۔

"امی..... میرا خیال ہے کہ اس میں ایک اچھی بیوی اچھی بہو بننے کی ساری خصوصیات موجود ہیں..... وہ ایک بیٹی کی طرح آپ کا خیال رکھے گی مجھے یقین ہے۔" عون کا مجاب کے اس طرح حق میں بولنا خالدہ بیگم کو جیسے طیش ہی دلا گیا۔

"ہاں مڈل کلاس لڑکیوں کی طرح یہ خدمت کے دکھاوے کر کے اس نے تمہیں تو اپنا گرویدہ بنالیا ہے مگر مجھے..... ناممکن..... میں ایسی چالوں میں ہرگز آنے والی نہیں۔"

"امی..... مجاب ایسی ہرگز نہیں ہے پلیز امی آپ تھوڑا یوز ٹو سوچیں گی تو آپ کو اس کی خوبیوں کا اندازہ ہو گا۔ کتنے مہینے ہو چکے مہرین بھابھی کو گھر میں آئے۔ کیا ایک بار بھی انہوں نے ایک کپ چائے ہی بنا کر آپ کو یا بابا کو دی ہو۔ مانی کا کوئی کام کیا ہو..... جبکہ مجاب سارا سارا دن سکینہ کے ساتھ اور آپ کے ساتھ ہاتھ بٹاتی ہے۔" عون انہیں حقیقت دکھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن خالدہ بیگم ان لوگوں میں سے تھیں۔ جن کی آنکھوں پر خود غرضی کی ایسی عینک لگی ہوتی ہے۔ جس میں سے صرف اپنی مرضی کے چہرے ہی نظر آتے ہیں۔ انسان صرف وہی دیکھتا ہے جو اس کا ذہن صحیح سمجھتا ہے اور ان کا ذہن مجاب کو کسی صورت صحیح نہیں سمجھتا تھا۔

"امی مجاب آپ کے سامنے بڑی ہوئی۔ تعلیم حاصل کی ایک ہی گھر میں رہی آپ نے اس میں کیا برائی دیکھی۔" عون آج ہر بات واضح کرنے کی غرض سے بیٹھا تھا۔

"برائی اس کی ظاہری ذات میں نہیں..... اور جو برائی ہے وہ میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ میرا ذہن اس کو تسلیم نہیں کرتا بس میں نے کہہ دیا اس کا خیال دل سے نکال دو۔" خالدہ بیگم ہٹ دھرمی سے بولیں۔

"نہیں امی..... اس طرح نہیں، آپ کو اپنے انکار کی وجہ بتانی ہو گی۔" عون ضدی لہجے میں بولا۔ خالدہ بیگم نے اس کی گہری آنکھوں سے جھانکتی ضد پرکھ لی تھی۔ وہ ان کا بیٹا تھا۔ ان کا خون..... دو سال ان کی چھاتی سے حیات کشید کرنے والا ان کا یہ لاڈلا بیٹا کس طرح ضد اور اشتعال کے معاملے میں ان پر گیا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھیں انہوں نے اپنے لہجے میں نرمی اور محبت سموتے ہوئے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"عون..... کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ اس کے لیے میں انکار کر رہی ہوں۔ میں تمہاری ماں ہوں کیا میں تمہارا برا چاہوں گی۔ کیا میں تمہاری خوشی نہیں چاہوں گی عون؟ بولو..... جواب دو۔ میں تو ہمیشہ یہ چاہتی ہوں کہ دنیا کی سب سے اچھی چیز میرے بیٹے کے لیے ہو۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر آئے بال پیچھے ہٹائے۔

"ٹھیک ہے امی..... آپ مجھے وجہ بتا دیں اگر اس میں میرے لیے یا اس گھر کی بقا کے لیے کوئی برائی ہوئی تو آج کے بعد مجاب کا نام بھی میرے ہونٹوں کے لیے اجنبی ہو جائے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" عون کے لہجے میں سچائی تھی۔

خالدہ بیگم نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا۔ وہ جانتی تھیں کہ عون اس وقت تک مطمئن نہیں ہو گا جب تک بات کی اصلیت نہیں جان لے گا۔

"کیا تم جانتے ہو مجاب کی ماں کا تعلق کس خاندان سے تھا۔" خالدہ بیگم نے اسے سچ بتانے کی ٹھان لی۔

"نہیں..... میں نہیں جانتا۔" عون ناسمجھی کے انداز میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ آخر اس معاملے کا اس کے اس مسئلے سے کیا تعلق ہے۔

"تم نہیں جانتے تمہارے دادا اور دادی امی مرتے دم تک شیریں بیگم کو قبول نہیں کر سکے۔ انہوں نے کبھی اس عورت کو پسند نہیں کیا۔ لیکن مہتاب خان کی محبت میں خاموش رہے اور مہتاب خان اس کی زلفوں کے ایسے اسیر تھے کہ ان کا دھیان کبھی اس طرف گیا ہی نہیں۔ وہ ایک عیسائی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ مہتاب خان کی خاطر بظاہر اسلام قبول کر لیا اور ہمارے گھرانے میں شامل ہو گئی۔"

انہوں نے جیسے اپنی دانست میں عون کی سماعت پر

بم پھوڑا تھا۔ عون کی نگاہوں میں چچی کا خاموش، عبادت گزار وجود در آیا۔ دوپٹے میں لپٹا ان کا چہرہ ہمیشہ پرسکوت ہوتا تھا۔ وقت پر نماز ادا کرنا ان کا معمول تھا۔ وہ بے شک جتنی بھی مصروف ہوتیں اذان ہوتے ہی اپنی ہر مصروفیت ترک کرکے فوراً" اللہ کے حضور میں حاضری دیتی تھیں اور خالدہ بیگم کی نظر میں انہوں نے بظاہر اسلام قبول کیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی تنگ نظری پر بے حد افسوس ہوا۔

"ہم جیسے تنگ نظر مسلمانوں نے دین کی خوب صورتی کو گرہن لگا کر رکھ دیا ہے۔ ہم لوگوں کی ان غلطیوں کو بھی معاف کرنے کے روادار نہیں ہوتے جو ان سے سرزد بھی نہیں ہوئی ہوتیں ناکردہ گناہوں کی سزا دینے والے خدائی فوجدار۔

امی۔۔۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب کوئی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو پھر کبھی اس کے پچھلے مذہب کی یاددہانی اسے نہ کرائی جائے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے تاکہ اسے اپنے ایمان لانے پر شرمندگی نہیں فخر محسوس ہو ۔۔۔ قرآن کے مطابق جب کوئی غیر مسلم ایمان لاتا ہے تو وہ بالکل ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا ایک دن کا نوزائیدہ بچہ ۔۔۔ اور پھر میں تو چاچو کی اس نیکی کو سلام پیش کرتا ہوں کہ وہ غیر مسلم ان کی خاطر اسلام قبول کرکے ہمارے دائرے میں شامل ہوئیں۔ کتنی بڑی سعادت نصیب ہوئی ہمارے خاندان کو امی۔" عون کے لہجے میں عقیدت گھل گئی۔

"تم جو بھی کہو مگر میں یہ پسند نہیں کرتی کہ شیریں بیگم کی بیٹی میری بہو بنے۔" ان کی وہی ایک ہٹ تھی۔

"امی وہ صرف شیریں بیگم کی بیٹی نہیں مہتاب خان کی بیٹی بھی تو ہے۔۔۔ اگر اس کی ماں پہلے عیسائی تھی تو کیا ہوا باپ تو مسلمان ہی تھا نا۔۔۔ یہ تو کوئی دلیل نہیں اسے رد کرنے کی۔ عون کو اب کوفت ہونے لگی تھی۔

"عون۔۔۔ مجھ سے بحث مت کرو۔۔۔ میں نے ایک بار انکار کر دیا تو بس کر دیا۔ اب جاؤ۔۔۔ بہت دیر ہو گئی ہے جا کر سو جاؤ۔" انہوں نے اپنی دانست میں بات ختم کر دی تھی۔

"ٹھیک ہے امی میں چلا جاتا ہوں لیکن بحث ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میرا ذہن آپ کی کسی دلیل سے مطمئن نہیں ہوا میری ڈیمانڈ ابھی بھی وہی ہے اور وہی رہے گی۔" وہ اپنی بات مکمل کرکے لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازے سے باہر نکل گیا۔ خالدہ بیگم ہلتے پردے پر نظر جمائے بیٹھی تھیں۔

"میں تمہیں کسی بھی قیمت پر ایسا نہیں کرنے دوں گی عون۔ شیریں بیگم کی بیٹی میری بہو کبھی نہیں بنے گی۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔" وہ خود سے ہم کلام تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے گزرتے گزرتے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ حیرت کی زیادتی کے باعث کمرے میں در آئی۔ نیم تاریکی اور دھوئیں نے کمرے میں موجود ہر چیز کو دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بمشکل آنکھوں کو جھپک جھپک کر اندھیرے سے مانوسیت پیدا کی۔ سامنے بیڈ پر نیم دراز وجود اب اس کے احاطہ بصارت میں آیا تھا۔

"عون۔۔۔" اس نے بہت ہلکے سے پکارا۔ عون نے لہو رنگ آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں۔ مگر بولا کچھ نہیں۔

"عون۔۔۔ یہ، یہ تم۔" دکھ کی زیادتی سے اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایش ٹرے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

"تم۔۔۔ تم اسموکنگ۔" شدید تاسف نے اسے گھیر لیا تھا۔

"کیوں۔۔۔ کیا یہ بہت مشکل کام ہے جو میں نہیں کر سکتا۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

"ہنسو مت۔۔۔ تمہاری ہنسی تمہارے چہرے اور آنکھوں کا ساتھ نہیں دے رہی۔" وہ کڑھ کر بولی۔

"کمال ہے۔۔۔ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو میرا چہرہ اور میری آنکھیں پڑھتا ہے۔۔۔ نئی خبر ہے! ویسے اور کیا کیا ہے میرے چہرے پر۔" وہ جیسے اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"مذاق مت اڑاؤ۔۔۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا ہوا ہے ورنہ میں تایا ابو کو بتا دوں گی کہ تم کتنی زیادہ اسموکنگ کرتے ہو۔۔۔ تمہیں احساس ہی نہیں کتنا خون جلا دیا تم نے اپنا۔" وہ بیڈ کے قریب کھڑی چڑ کر بول رہی تھی۔

"میرا بس چلے تو خود کو جلا دوں۔۔۔ اس دنیا ہی کو ختم کر دوں مجاب بی بی" اس کی سوچیں زہر آلود تھیں۔ کیا کروں سامنے وہ ہستی آ کھڑی ہوئی ہے کہ جس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ پھر خود کو جلا جلا کر کیوں نہ ختم کر دوں۔

"اب بول بھی چکو۔۔۔ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ ۔۔۔" وہ اس کی خاموشی سے تنگ آ کر بولی۔

"میرا مسئلہ کوئی حل نہیں کر سکتا۔۔۔ مجھے ایک طرف پڑا رہنے دو۔"

"ٹھیک ہے پھر تایا ابو ہی پوچھیں گے تم سے عون"۔ وہ تیزی سے مڑی تھی مگر اگلے ہی پل اس کا ہاتھ عون کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ وہ گھبرا کر پلٹی ۔۔۔ اس کی آنکھوں کا جلتا ہوا تاثر اور چہرے کے ناقابل فہم تاثرات اور پھر ہاتھ پر لحہ بہ لحہ بڑھتی گرفت کی سختی۔۔۔ وہ بوکھلا گئی۔

"عون۔۔۔ ہاتھ چھوڑو میرا۔۔۔"

"تمہیں کہا تھا نا۔۔۔ تم میری ہو۔۔۔ تو تم میری ہو چاہے یہ بات منوانے کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا میں کروں گا۔۔۔ میں اس زندگی کا کیا کروں گا جس میں تم نہیں ہو گی۔" آخری جملہ کہتے کہتے اس کا لہجہ شکستہ ہوتا چلا گیا اور اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مجاب نے ایک پل ٹھہر کر اس کو دیکھا تھا پھر جیسے حواس میں آتے ہی تیزی سے اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

شام میں سب ہی لان میں موجود تھے آج سوئے اتفاق آفتاب خان بھی سب کے ہمراہ تھے۔ چائے کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی جاری تھی۔

"یہ عون کہاں ہے۔۔۔ دو دن سے آفس بھی نہیں گیا وہ۔۔۔ کل میں گیا تھا اس کی کمپنی کے آفس۔۔۔ اس کے سکریٹری نے بتایا کہ وہ نہیں آئے۔" سعدان نے چائے کا گھونٹ بھر کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو خالدہ بیگم نے نظریں چرالیں۔ کسی اور کو تو نہیں لیکن انہیں بہت اچھی طرح علم تھا کہ دو دن سے عون اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلا تھا نہ ہی اس نے کھانا کھایا تھا اور وہ خود۔۔۔ اگر اس لمحے وہ اس کے سامنے اپنی ممتا کی کمزوری ظاہر کر دیتیں تو پھر ساری زندگی انہیں مجاب کے ناپسندیدہ ناقابل برداشت وجود کو سہنا پڑتا۔ سو انہوں نے اپنی ممتا کو کہیں سلا دیا تھا۔

"بچہ ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی ہوئی تھی۔

"ابھی کہاں ہے عون۔" آفتاب خان نے خالدہ بیگم سے پوچھا۔

"شاید اپنے کمرے میں ہو گا۔" انہوں نے مبہم سا جواب دیا۔

"کمال ہے وہ گھر میں ہے اور آپ نے اسے چائے پر نہیں بلایا۔ کبھی کبھی تو ہم لوگ اکٹھے ہوتے ہیں جاؤ مانی بلا کر لاؤ اسے۔" آفتاب خان نے ارمان کو اسے بلانے بھیجا اور کچھ ہی دیر بعد ارمان کے پیچھے بہت خاموش قدموں سے چلتا وہ آتا دکھائی دیا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو، سیاہی مائل ہونٹ، ستے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ ہمیشہ والے عون سے یکسر مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ خالدہ بیگم کا دل مٹھی میں آ گیا۔ آفتاب خان نے بہت گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ لیکن اس کی حالت کے حوالے سے کچھ بھی بات کرنے سے احتراز کرتے ہوئے بس اتنا کہا۔

"کیا حال ہے بیٹا جی۔۔۔ آپ نے چائے نہیں پینی تھی کیا؟؟"

"نہیں ابو۔۔۔ دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے بہت عام سے لہجے میں کہتے ہوئے قریب پڑی کرسی سنبھال لی۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مجاب نے چور نظروں سے اس کے مضمحل چہرے کو دیکھا اور پھر چائے کے برتن اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی، عون اردگرد کے ماحول سے بہت اکتایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ

دیر بعد معذرت کر کے وہ دوبارہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"خالدہ..... آپ نے عون کو دیکھا!" آفتاب خان نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو خاموش بیٹھی اسے جاتا دیکھ رہی تھیں۔

"کیا آپ کو اس سب کے بارے میں پتا ہے جو عون اس وقت فیل کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہر پریشانی میں واحد ماں کا وجود ایسا ہوتا ہے جس پر بچوں کا یقین اور اعتماد ہوتا ہے۔ اس کی بکھری ہوئی حالت اس بات کی گواہ ہے کہ وہ اس وقت شدید شکست و ریخت کا شکار ہے ایسے میں ایک ماں ہونے کے ناتے آپ اس کے بہت قریب جا کر اس کے مسئلے کو سمجھ سکتی ہیں میرا خیال ہے مجھ سے زیادہ وہ آپ پر انحصار کرے گا..... کیا آپ میرے خیال سے اتفاق کرتی ہیں۔" ہمیشہ کے کم گو اور کسی معاملے میں دخل نہ دینے والے آفتاب خان سے انہیں بالکل امید نہیں تھی کہ وہ کسی معاملے کی جزئیات پر اس حد تک غور بھی کر سکتے ہیں۔

"جی....." وہ سر جھکا گئیں کہ انہیں کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا اب وہ کیا کہتیں کہ عون کی اس حالت کی کسی حد تک وہ خود ذمہ دار تھیں۔

"صرف جی سے کام نہیں چلے گا..... اسے اپنے وجود کا احساس دلائیں۔ آپ ماں ہیں۔ یقین کریں وہ اپنا ہر درد اپنے سامنے کھول کر رکھ دے گا اسے یہ اطمینان دلا دیں کہ اس کے غم اور اس کی خوشیاں آپ کے لیے ساری دنیا سے زیادہ اہم ہیں۔" وہ رسان سے بولے۔

"کیا آپ نے اس سے پوچھا اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔" اب وہ ان کا محاسبہ کر رہے تھے۔

"نہیں....." اس بار خالدہ بیگم کچھ شرمندہ تھیں۔

"خالدہ بیگم..... ہم سب اپنی اپنی دنیاؤں میں گم ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہم اپنے بچوں سے بہت بے فکر اور لاپروا ہو گئے ہیں میرا خیال ہے گھر بار' دولت اور سوسائٹی سب کچھ بہت ضروری سہی مگر اولاد سے زیادہ اہم تو ہرگز بھی نہیں ہیں..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"..... آفتاب خان کی نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنے اندر ہی اندر کٹ رہی تھیں۔ رہ رہ کر عون کا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ انہیں اپنی خود غرضی پر افسوس ہوا۔

ایک ماں کے لیے ایک باپ کے لیے اولاد کی خوشی سے بڑھ کر بھی کچھ ہوتا ہے کیا کسی ماں کی انا اتنی اہم ہوتی ہے کہ جس پر اولاد کی خوشیاں قربان کر دی جائیں۔

"کیسی ماں تھیں وہ..... آفتاب خان ایک باپ ہو کر اپنے بچے کا چہرہ پڑھ سکتے تھے لیکن وہ ماں ہو کر اس کے احساسات کو نہ سمجھ سکیں۔ وہ ان کا بہت پیارا بہت سعادت مند بیٹا تھا۔ ہمیشہ تعلیم میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والا پورے خاندان میں اپنے اخلاق و کردار میں ایک مثال بن کر ان کا سر فخر سے بلند کیا تھا اس نے کبھی ان کی کسی بات سے روگردانی نہیں کی تھی..... کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ جس سے ان کا سر جھکا ہو۔ انہیں کسی کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہو اور اس سب کے بدلے آج تک اس نے ان سے کیا مانگا تھا۔ زندگی اس کی اپنی ذاتی تھی مگر وہ اپنی زندگی کا فیصلہ بھی ان کی رضا اور خوشی سے کرنا چاہتا تھا۔ اور جب سے اسے یہ پتا چلا تھا کہ وہ اس کی خوشی میں خوش نہیں ہیں تو وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اپنی زندگی کو خود پر حرام کر لیا تھا اس نے۔" ان کی آنکھیں بھیگ گئیں

"آپ کس سوچ میں پڑ گئیں خالدہ بیگم۔" آفتاب خان کافی دیر سے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں..... بس سوچ رہی تھی کہ ہم ماں باپ زندگی کی ہر خوشی اولاد کو دینا فرض سمجھتے ہیں مگر جب وہی اولاد اپنی کسی خوشی کا ہم سے مطالبہ کرتی ہے تو وہاں خودی اور انا کا پرچم بلند کر لیتے ہیں۔" خالدہ بیگم کی آنکھوں پر سے ضد کی پٹی اتر چکی تھی۔ سامنے کا منظر بہت واضح تھا۔ ایک معصوم وجود سے کیا جانے والا حقارت آمیز سلوک انہیں احساس دلا رہا تھا کہ آج

تک انہوں نے زیادتی کی۔ ایک بے جرم بے گناہ کو نا کردہ غلطیوں کی سزا دیتی رہیں۔ اپنے ہی خون کو اپنے ہاتھوں اذیت سے دوچار کیے رکھا انہوں نے۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" آفتاب خان ان کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ ابھی وقت ہاتھ میں ہے۔ کچھ ایسا نقصان نہیں ہوا جو ناقابل تلافی ہوتا۔ خدایا تیرا لاکھ کرم ہے۔" انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی لہجے میں گہرا تشکر اور آنکھوں میں محبت تھی۔

"آپ فکر نہ کریں ہمارے بچے خدا کی مہربانیوں کے سائے میں ہیں میں ابھی آتی ہوں.... آکر آپ کو بتاتی ہوں سب کچھ۔" وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آفتاب خان حیران تھے۔ ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ انہوں نے مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے عون کے کمرے کا رخ کیا۔ کچن سے باہر آتی مجاب پر نگاہ پڑی تو وہ بہت خلوص سے مسکرائی تھیں۔

مجاب نے حیرت سے ان کو جاتے ہوئے دیکھا کچھ نہ کچھ غیر معمولی تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

دروازہ حسب معمول ادھ کھلا تھا وہ کمرے میں داخل ہو گئیں۔ بستر پر نیم دراز عون غیر متوقع طور پر انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"آیئے امی.... آپ؟ خیریت؟.... مجھے بلا لیا ہوتا۔" اس نے بیڈ پر پاؤں سمیٹ کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ نگاہیں بکھرے ہوئے کمرے سے ہوتی ہوئی عون پر ٹک گئیں۔ ان کی آنکھیں اپنے سامنے جس عون کو دیکھ رہی تھیں وہ اس عون سے کتنا مختلف تھا۔ جس کے دم سے ان کے گھر میں رونق تھی ہنسی تھی۔ کھلکھلاہٹیں تھیں۔ یہ عون تو بجھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کو جوت تو بہت مدھم تھی۔

یہ کیا کرنے چلی تھیں وہ.... اپنی انا.... اپنے زعم میں کتنا بڑا نقصان کرنے چلی تھیں وہ۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنے بچے کو بکھیر دینا چاہتی تھیں۔ کیا ایک بار وقت ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر واپس آتا.... کبھی نہیں.... خدا نے انہیں کتنے بڑے پچھتاوے سے بچالیا۔

انہوں نے اس کے بکھرے ہوئے بال کشادہ پیشانی سے پیچھے ہٹائے۔

"عون.... یہ کیا حال بنا رکھا ہے میرا بچہ۔" لہجے میں ممتا کا تفکر اور آزردگی تھی۔

"کیا ہوا امی.... میں تو بالکل ٹھیک ہوں.... ڈونٹ وری۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

"ہوں.... میرا بیٹا اب ماں سے جھوٹ بھی کتنی تسلی سے بول لیتا ہے۔" خالدہ بیگم دھیمے سے مسکرائیں۔ اس نے سر جھکالیا۔

"بیٹا جی! ماں کی نظریں ایکسرے مشین کی طرح ہوتی ہیں اندر تک جھانک لیتی ہیں۔"

"تو پھر میرا درد کیوں نہیں دیکھ سکتیں آپ۔" اس نے شکوہ بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ مگر بولا کچھ نہیں اور وہ ان نگاہوں کا مفہوم بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ جس طرح آئینے سے گرد صاف ہو جائے تو ہر منظر واضح ہو جاتا ہے اسی طرح ان کی نگاہوں سے مصنوعی تفاخر اور ضد کی گرد ہٹی تو اب انہیں اپنے بچوں کے چہرے ان کے جذبات ان کے احساسات سبھی کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

"جلدی سے اٹھ جاؤ.... باتھ لو.... شیو کرو.... اچھے سے ڈریس اپ ہو جاؤ مجھے میرا وہی عون چاہیے.... آئی سمجھ؟" انہوں نے پیار سے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔ وہ حیران سا ان کو جاتا دیکھ رہا تھا۔

پھر ایک ہنگامی میٹنگ بلائی گئی انہوں نے آفتاب خان اور باقی سب کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ گھر بھر میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ باہر زندگی اپنے جوبن پر تھی مگر وہ لاتعلق روٹھا روٹھا سا یکسر اکیلا بیٹھا تھا۔ آفتاب خان کے

لیے یہ فیصلہ گویا زندگی کا پیغام تھا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ارمان اور سعدان نے بھاگم بھاگ انتظامات کیے۔ ہنگامی صورت میں جس جس کو بلایا جا سکتا تھا بلا لیا گیا۔

محض دو گھنٹے کے قلیل وقت میں تمام انتظامات ہو گئے۔ مہرین حیرت کے بحر بیکراں میں غوطے لگاتی مجاب کو پارلر لے گئی تھی انتہائی نفیس سے ٹی پنک اور پرپل امتزاج کے کامدانی سوٹ میں خوب صورت سی جیولری اور میک اپ کے ساتھ وہ حیران حیران سی بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔ اسے ابھی تک اپنے دل کے خالی کشکول میں خدا کی مہربانی کی اس دولت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک خواب کی سی کیفیت میں لان میں بچھے صوفے پر بیٹھی تھی۔ خاصی چہل پہل تھی۔

"او کوئی اس الو کو تو انوائیٹ کرے کہ آکر اپنا نکاح اٹینڈ کرے۔" سعدان نے با آواز بلند کہا۔

"میں کان سے پکڑ کر لاتی ہوں مسٹر کو۔" مہرین وہاں سے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

اور کچھ ہی دیر بعد کاٹن کے شکنوں سے بھرپور سوٹ میں بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بالوں کے ساتھ حیران پریشان مسٹر کو مجاب کے پہلو میں لا بٹھایا۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا یہ سب انتظام دیکھ کر.... اس کی نظر ایک طرف نک سک سے درست امی اور بابا پر پڑی جو اسی کو دیکھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔

"دیکھو بھئی.... میں دن میں کہہ کر آئی تھی کہ جناب اپنا حلیہ درست کر لیں.... مگر آپ نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اب یہ آپ کی سزا ہے انہی کپڑوں میں اسی حلیے میں دولہا کے فرائض سر انجام دینے پڑیں گے۔" خالدہ بیگم مسکرا رہی تھیں۔

"مگر آپ نے مجھے اور کچھ نہیں بتایا تھا یہ فاؤل ہے۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا۔

"دیکھو میاں نوشہ.... ابھی اپنی چونچ بند کر لیں.... یوں بھی اپنی آزادی کے دن تو اختتام پذیر ہوئے۔" سعدان اس کے کان میں گھسا۔

"اور سرپرائز بھی تو کسی چڑیا کا نام ہے.... چل اب زیادہ نخرے مت کر ایسا نہ ہو لڑکی تجھے اس حلیے کی وجہ سے ریجیکٹ کر دے۔" ارمان نے بھی اس کا کندھا تھپک کر گویا گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

ایجاب و قبول کی رسم ادا ہو گئی تھی اور ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا عون نے اب ذرا توجہ سے اپنے پہلو میں بیٹھی حسین گڑیا کو دیکھا تھا۔

"ایسا لگتا ہے باربی کے پہلو میں Jasor بیٹھا ہے۔" کسی من چلے نے عون پر چوٹ کی۔

"ہیں یہ کیا کمی نیشن ہے بھئی۔" سعدان نے کان کھجائے۔

"اصل میں ہم عون بھائی کے لیے لنگور کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتے نا" مہرین کے ایک شرارتی کزن نے ہانک لگائی۔ عون جھینپ گیا۔

"میاں صاحبزادے.... تمہارا جب اس طرح نکاح ہوگا تب پوچھوں گا تم سے۔"

اس کی نظر مجاب پر پڑی جو شرمیلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بھلا باربی کیا ہے اس ہوشربا چہرے کے آگے۔" عون نے آگے کو جھک کر سرگوشی کی تو مجاب خود میں سمٹتی چلی گئی۔

کتنی سرخوشی تھی.... ہر چہرہ بے فکری سے مسکرا رہا تھا۔ خالدہ بیگم نے عون اور مجاب کے پرسکون اور خوشی سے لبریز چہروں کو دیکھا۔ سب کے مسکراتے چہرے ان کی نگاہوں میں جھلکے اور وہ طمانیت سے مسکرا دیں۔

آج شاید انہوں نے شیریں بیگم کا قرض بھی چکا دیا تھا اور اپنے ماں ہونے کا حق بھی ادا کر دیا تھا۔

☼ ☼

متاعِ درد

کشش احمد

وہ رات کے اس آخری پہر جائے نماز پر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تہجد پڑھ کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تھے۔ اسے دعا میں کیا مانگنا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اس وقت جائے نماز پر کیوں تھی، وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی، مگر وہ یہ جانتی تھی کہ یہ ہی وہ راستہ تھا جس پر چل کر وہ سکون کی دولت حاصل کر سکتی تھی۔ دعا مانگتے وقت ایک لفظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہوا تھا۔ مگر کبھی کبھی ایک آنسو بھی تو دعا بن جاتا ہے۔ مانگنے والا یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا مانگ رہا ہے، کیوں مانگ رہا ہے، جس سے مانگ رہا ہوتا ہے وہ ضرور باخبر ہوتا ہے۔

تہجد ادا کر کے وہ سورۃ یاسین پڑھنے لگی تھی۔

"اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔"

سورۃ یاسین بمعہ ترجمہ پڑھتے وہ اب آخری آیات پڑھ رہی تھی۔ مگر نہ جانے ایک دم کیا ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

ٹیچرز کا مخصوص گاؤن پہنتے ہوئے وہ تیزی سے کلاس میں داخل ہوئی، آج یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا۔ اسے دیکھتے ہی تمام اسٹوڈنٹس کو جیسے سانپ سونگھ گیا، وہ اتنی ینگ ٹیچر کا تصور نہیں کر رہے تھے۔ ایم بی اے کی اس کی پہلی کلاس تھی اور اس نئے سمسٹر کا بھی پہلا دن تھا۔

"ہانیہ مراد! ایم بی اے فرام کراچی یونیورسٹی ان ایچ آر ایم ایس فرام لمس ان مارکیٹنگ، دو کمپنی میں ــــ منیجر کے طور پر کام کیا ہے اور اب آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ یہاں ملتان آئے صرف ایک ہفتہ ہوا ہے۔ آپ لوگوں کو میں مارکیٹنگ مینجمنٹ اور H.R.M پڑھاؤں گی۔ اب مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ میرے لیے اچھے اسٹوڈنٹس ثابت ہوں گے۔ آپ لوگ اپنا تعارف کروائیں۔" اس نے اپنا تفصیلی تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔ تمام اسٹوڈنٹ کے چہروں پر ایک خوش گوار مسکراہٹ ابھر آئی۔ سب نے آہستہ آہستہ اپنا تعارف کروایا تھا۔

"میم کیا کچھ پوچھ سکتا ہوں آپ سے؟" سب کا تعارف ہو جانے کے بعد میکال نے اس سے کہا تھا۔

"ضرور۔"

"آپ اتنی ینگ لگتی ہیں، اگر آپ ہمارے درمیان آ کر بیٹھ جائیں تو پتا ہی نہیں چلے کہ آپ لیکچرار ہیں۔" میکال کی بات پر جیسے پوری کلاس میں کھلکھلاہٹیں بکھر گئیں، خود ہانیہ بھی بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"میں صرف ستائیس سال کی ہوں۔ بائیس سال کی عمر میں اپنا فرسٹ ایم بی اے کلیئر کیا تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ جاب اور پھر پچیس سال میں، میں نے اپنا ms مکمل کر لیا تھا۔ پچھلے چار سال سے میں پنجاب میں ہی ہوں۔" دوستانہ انداز میں وہ ان کو بتاتے بے حد اچھی لگی تھی۔ تمام لڑکے لڑکیاں اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ کافی مگن انداز میں چلتا ہی جا رہا تھا، جب اچانک کچھ دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی نظریں اسے دیکھ کر ساکت ہو گئی تھیں۔ وہ ویسی ہی تھی جیسے پانچ سال پہلے تھی۔ اسے لگا جیسے شاید آج بھی وہیں کھڑی ہے، جہاں اس نے اسے چھوڑا تھا۔

پاؤں میں انگوٹھے والی چپل، کائی گرین کلر کی شلوار قمیص شاید شرٹ پر کوئی پرنٹ بھی تھا۔ جو کالی چادر کی وجہ سے چھپ گیا تھا۔ ناک میں دبی سفید نگ والی سونے کی لونگ، وہ سامنے سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ اور ہاتھ میں پکڑے جوس کے ٹن سے ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سپ بھرتی اور ہر شاپ کے باہر رک کر شیشوں کے پار چیزیں دیکھتی۔ وہ شاید ونڈو شاپنگ کر رہی تھی، کیونکہ اس کی ہاتھ میں کوئی بھی شاپنگ بیگ موجود نہ تھا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک کر کسی دکان کے باہر کھڑی گولڈ کی کوئی چیز دیکھ رہی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نظر سامنے پڑی اور پھر وہاں

سے واپس نہیں آسکی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی سے ہوسٹل تک کا سفر اس نے اپنی تکلیف دہ سوچوں کی ہم راہی کے ساتھ طے کیا تھا۔ ہاسٹل پہنچتے ہی اسے امی کی کال موصول ہوئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اتنی تھکی ہوئی تھی کہ ابھی کسی بات کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس لیے خیر خیریت بتانے کے بعد فوراً" فون بند کر دیا تھا اور سیڑھیاں چلتی اپنے روم میں آگئی۔

یہ ایک پرانے طرز کا بنا ہوا کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جسے ایک بیوہ عورت نے ورکنگ وومن ہاسٹل بنا دیا تھا۔

وہ فوراً" کھانا کھانے چل دی۔ کیونکہ تین بجے اسے ایک دوسری پرائیویٹ یونیورسٹی پہنچنا تھا' جہاں دو گھنٹے کی کلاس کا اسے بہترین معاوضہ ملتا تھا۔ اس کے بعد شام میں ایک بزنس انسٹی ٹیوٹ جاتی یہاں سے وہ رات آٹھ بجے جب وہ واپس آتی تو بے حد تھکی ہوئی ہوتی۔ مگر سوچیں اور یادیں تھیں کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں ـــــ یونیورسٹی میں' انسٹی ٹیوٹ میں' کھانا کھاتے' پڑھاتے' ڈرائیونگ کرتے' ہر جگہ وہ کہیں نہیں تھا' مگر وہ ہر جگہ تھا۔

☆ ☆ ☆

بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی میں پڑھاتے اسے تقریباً" چار ماہ سے زائد کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اسٹوڈنٹس کے درمیان وہ ایک دم مشہور ہو گئی تھی۔ اس کا پڑھانے کا انداز' اس کا خلوص' اس کی عادات وہ جیسے سب کی پسندیدہ بن گئی تھی۔ روز کی معمول کی طرح اس دن بھی کلاس میں ایک موضوع پر بحث چھڑ گئی تھی اور ہمیشہ کی طرح بحث کا آغاز میکال نے کیا تھا۔

"میم کیا یہ ضروری ہے کہ ضرورت ہی کسی چیز کے خریدنے کا پہلا اسٹیپ ہو۔ ایک انسان اس وقت بھی تو کوئی چیز خرید سکتا ہے جس کا اسے دل چاہے۔" اس نے اچانک سوال کیا تھا۔ چند لمحے کلاس میں خاموشی رہی' پھر اچانک رابیل بول پڑی۔

"تو جب تک ضرورت کا پتا نہیں چلے گا تو ایک کوئی پروڈکٹ کیوں خریدے گا' اب ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ آپ کو بھوک لگی ہے اور آپ کھانے بجائے آئس کریم کھا کر اپنی بھوک ختم کرو۔"

"ہاں' مگر بعض چیزیں انسان صرف پرسنل اٹی منٹ کی وجہ سے بھی خریدتا ہے۔" میکال نے ا بات پہ زور دیا تھا۔

باقی کلاس خاموشی سے ان کی بحث سنتی رہی تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ وہ دونوں کسی بات پر ایک دوسرے سے متفق نہیں ہوتے تھے۔ مگر یہ بحث صرف کلاس کی حد تک تھی۔ کلاس کے باہر وہ دونوں بالکل مختلف تھے۔ کلاس میں لڑائی کے باوجود ہانیہ سمجھ گئی تھی کہ ان کے بیچ کیا معاملہ ہے۔ مگر آج تک ا دونوں کے بیچ ایسا کوئی چکر نظر نہیں آیا جس پر کسی ٹیچ کسی اور کو کوئی شکایت ہوتی۔ بحث کے بعد آخر میں ہا ہی دونوں کو چپ کراتی۔ مگر آج ایک کافی مختلف چ ہوئی تھی۔ میکال کی بات سن کر نہ جانے رابیل کو ہوا وہ چلا اٹھی۔

"اوکے تم صحیح میں غلط۔ بات ختم کرو' میں تمہارے ساتھ فضول بحث کرنا ہی نہیں چاہتی' کیونکہ تم کبھی بھی مجھے صحیح کہتے ہی نہیں' ہمیشہ میری بات Deny کرتے ہو۔" رابیل کی بات سن کر پورے کلاس کو ایک دم سانپ سونگھ گیا تھا۔ میکال کا چہرہ خفت کے مارے سرخ پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ بک پر جھکا لیا۔ ہانیہ نے چاہا کہ رابیل کو ڈانٹے' مگر کچھ سوچ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے رابیل کو اکیلے میں سمجھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ دوبارہ لیکچر کی طرف متوجہ ہوئی۔ لیکچر دیتے وقت بھی اس نے رابیل کو بہت غور سے دیکھا۔ اسے وہ کافی پریشان اور الجھی ہوئی لگی تھی۔ اپنی نوٹ بک پر لکھنے کے ساتھ ساتھ وہ گاہے بگاہے میکال کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رابیل تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی آنکھیں ٹشو سے بھی صاف کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مسئلہ ان دونوں کے درمیان ہوا ہے۔ لیکچر کا ٹائم ختم ہونے کے بعد ہانیہ نے رابیل کو اسٹاف روم میں بلایا' کیونکہ اس وقت وہاں کسی کے ہونے کا امکان نہیں تھا۔

"اب بتاؤ رابیل تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔" رابیل کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھانے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں میم۔" اس کی نظریں نیچی تھیں' مگر چہرہ متورم تھا۔

"اگر کچھ نہیں ہے تو تم نے میکال کی بات پر اتنی بری طرح ری ایکٹ کیوں کیا' اس کی انسلٹ کی ہے تم نے۔"

"میم! میکال بھی تو ہمیشہ میری ہر بات سے Deny کرتا ہے۔ کبھی میری بات سے راضی نہیں ہوتا۔"

"پہلی بات یہ ہے کہ مارکٹنگ سبجیکٹ ہی ایسا ہے کہ سب اپنی اپنی رائے دیں۔ غلط ہوں یا درست ہوں' سب کے اپنے آئیڈیاز ہوتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ سب ایک ہی بات پر متفق ہوں۔ آخر میں نتیجہ تو مجھے ہی دینا ہوتا ہے نا اور دوسری بات میں نے اپنی کلاس میں دوستانہ ماحول رکھا ہوا ہے' کیونکہ میں مضمون کو خشک کر کے نہیں پڑھا سکتی اور آج تک جتنی بھی ڈسکشن ہوئی ہے کبھی تلخ بات یا ذاتیات کی بات نہیں ہوئی۔ مگر آپ آج بہت بدتمیزی پر اتر آئی تھیں۔"

"آئی ایم ساری میم' میں میکال سے بھی ایکسکیوز کر لوں گی۔" اس نے دھیمے لہجے میں معذرت کی تھی۔

"کیا کوئی پریشانی ہے تمہیں رابیل؟" ہانیہ نے اس سے پوچھا تھا۔

"نہیں میم کوئی پریشانی نہیں ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر ہانیہ کو دیکھا تھا اور وہ ہی لمحہ تھا جب اس نے رابیل کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ لی شکوہ' رنج' صدمہ' پچھتاوا نہ جانے کیا کیا نہ تھا اس میں اس تحریر نے ہانیہ کو پانچ سال پیچھے دھکیل دیا تھا۔

"کیا میں جا سکتی ہوں میم۔" رابیل نے اس سے جانے کی اجازت لی تھی۔

"شیور۔" ہانیہ کو اپنی آواز خود بھی اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

"کیوں نہیں بھول جاتی میں وہ سب' کیوں میری وحشت کم نہیں ہوتی میرے اللہ۔" اپنی کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر وہ سسکنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی میں کپل' افیئرز' اس طرح کی چیزیں بہت عام سی بات تھی۔ مگر بات پاکیزگی اور حیا کی بھی تھی۔ ہانیہ نے بہت سے کپل کو کافی فرینک بھی دیکھا۔ مگر رابیل اور میکال کے بارے میں آج تک کوئی غلط بات نہیں سنی تھی۔ یونیورسٹی سے باہر چاہے ملتے ہوں' مگر یونیورسٹی میں کبھی ایک دوسرے کے ساتھ فضول پھرتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر چند دن سے وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی اکھڑے اکھڑے نظر آرہے تھے۔

اس دن ایک بہت عجیب سی بات ہوئی۔ ہانیہ اپنی گاڑی سے باہر نکل کر مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ جب اس نے میکال کی کار کے پاس ان دونوں کو کھڑے دیکھا تھا۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ دونوں کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ وہ دانستہ تھوڑی دور ہی رک گئی تھی۔ میکال کا چہرہ بہت سرخ لگا' شاید غصے کی سبب اور ہانیہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر۔

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں' میں کہاں جاؤں؟" رابیل جیسے گڑگڑائی تھی۔

"تمہیں بس اپنی پڑی ہے' مجھے بتاؤ' میں کہاں جا کر مروں۔" اس نے میکال کو چیختے سنا تھا۔ ہانیہ کو اچانک کچھ یاد آیا تھا۔

"میں نہیں جانتی' اپنے ابو کو مناؤ کسی بھی طرح سے' تمہارے گھر والے میرا مسئلہ نہیں ہیں' پھر میں کیوں Suffer کروں۔ محبت کے راستے پر چلنے والی میں اکیلی تو نہیں ہوں' تم بھی میرے ساتھ تھے' پھر اکیلے میں ہی کیوں جلوں اس آگ میں۔" رابیل کی

آواز میں کیا کچھ نہ تھا۔ دکھ، رنج، کچھ کھو دینے کا احساس، اس بات کا اندازہ ہانیہ کو وہاں کھڑے کھڑے ہو گیا تھا۔ وہ وہاں کھڑے کھڑے سارا مسئلہ سمجھ گئی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں تکلیف میں نہیں ہوں، کیا مجھے کوئی صدمہ نہیں ہے۔" میکال کی آواز سے کرب صاف ظاہر تھا۔

"مرد کبھی مجبور نہیں ہو سکتا، جب محبت کرتے ہوئے مجبور نہیں تھا تو شادی کرتے ہوئے کیسے ہو سکتا ہے۔" رابیل کی بات اسے کچھ مانوس سی لگی تھی۔

"کیوں کیا مرد انسان نہیں ہوتا۔" میکال کی آواز سنائی دی گئی تھی۔ اس لمحے ہانیہ کو اپنے اردگرد شور ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"ہوتا ہے مجبور، جہاں میں اور تم رہتے ہیں، وہاں ہوتا ہے مجبور، تمہاری کنڈیشن ایسی نہیں ہے میں تمہیں Defend کر سکوں۔" ایک آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش نہیں کی کہ کس کی آواز ہے، اور نہ ہی اسے ضرورت تھی۔ جس آواز کو چوبیس گھنٹوں میں وہ اپنی آواز سے زیادہ سنتی تھی۔ وہ بھلا کیسے اس آواز کو بھول سکتی تھی۔

ہانیہ نے یک دم رابیل کو یونیورسٹی کی دیوار کے گرد بنی کیاریوں کی باؤنڈری وال پر بیٹھتے دیکھا تھا۔ وہ اب اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"رونے سے کیا ہوتا ہے، اگر رونے سے اسی طرح کچھ ہوتا ہے تو رو بیٹھ کر میں جا رہا ہوں۔" میکال تیزی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ شاید ذہنی طور پر اتنا الجھا ہوا تھا کہ اپنے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ہانیہ کو بھی دیکھ نہیں پایا تھا۔

یونیورسٹی کا گیٹ کافی دور تھا اور پارکنگ لاٹ فل ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنی گاڑی یونیورسٹی سے کچھ دور باہر سڑک پہ کھڑی کر دیتی تھی۔ وہ ان دونوں کے مسئلے پر غور نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی پڑنا چاہتی تھی۔ مگر وہ رابیل کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔ کلاس شروع ہونے میں ابھی بیس منٹ تھے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اور رابیل کو اس حالت میں نہ دیکھ لے اچھا خاصا تماشا لگ سکتا تھا۔ وہ بے اختیار رابیل کے پاس آئی تھی۔

"رابیل... اٹھو یہاں سے، اس طرح یہاں بیٹھ کر مت رو۔" اس نے رابیل کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا تھا۔ رابیل نے اسے دیکھ کر رونا بند کر دیا تھا۔

"میم وہ۔" اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر ہانیہ نے روک دیا تھا۔

"کوئی وضاحت مت دو، مجھ سے اپنا مسئلہ شیئر کر لو بڑی بہن کی جگہ ہوں تمہاری۔ فکر مت کرو آؤ میرے ساتھ۔" ہانیہ کے اتنے مان اور پیار بھرے انداز کو دیکھتے ہی اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بالکل اس احساس سے عاری تھی کہ وہ دونوں سڑک پر کھڑی ہیں۔ ہانیہ نے اسے اپنے ساتھ لیا اور گاڑی تک آئی۔ وہ خاموشی سے روتی ہوئی ہانیہ کے ساتھ چلتی رہی۔ اس نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہی ہے۔ پورا راستہ وہ روتی رہی تھی، ہانیہ نے اسے رونے دیا تھا۔

اس نے اپنی محبت کو بدلتے دیکھا تھا۔ زندگی کو بدلتے دیکھ رہی تھی بھلا سکون کیسے آتا... اسے وہ کیسے نہ روتی۔ ہانیہ اسے اپنے ساتھ ہاسٹل لے آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

دھڑکنوں کے نشیب و فراز کو سنوارا تھا اور بس
کاغذ پر دل کا بوجھ اتارا تھا اور بس

بس اتنا جانتا ہوں کہ آواز اس کی تھی
اتنا پتا ہے کہ اس نے پکارا تھا اور بس

دنیا کی فکر کیا تھی، زمانے کا خوف کیا
ہم کو فقط خیال تمہارا تھا اور بس

دکھوں نے اس کو میری محبت سمجھ لیا
وہ شخص مجھ کو جان سے پیارا تھا اور بس

پھر وہی آنسو، پھر وہی درد، نہ جانے ساری لڑکیوں کی قسمت ایک جیسی کیوں ہوتی ہے، کیوں کاتب تقدیر ان کی قسمت میں یہ آنسو لکھ دیتا ہے۔ ہانیہ، رابیل کو دیکھتے ہوئے یہ ہی سوچ رہی تھی۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی، مگر چہرہ ابھی بھی سرخ تھا۔ ہانیہ نے اس کے سامنے چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس رکھے تھے۔

"میم میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ پلیز تکلف نہ کریں۔" اس نے اس خاموشی کو توڑا تھا جو کافی دیر سے کمرے میں موجود تھی۔

"رزق اللہ دیتا ہے، اس سے کیا ناراضی، اگر رزق ایک بار روٹھ جائے تو واپس نہیں لوٹا کرتا، اس لیے چاہے زندگی میں کچھ ہو جائے اگر آپ کو رزق میسر آ رہا ہو، چاہے جتنا بھی سہی، اس سے منہ نہیں موڑا کرتے۔" اس نے مدھم آواز میں رابیل کو سمجھایا تھا۔ رابیل نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت اس چادر کے بغیر تھی، جس کو ہمیشہ یونیورسٹی میں اوڑھے رکھتی تھی۔ چادر کا رنگ مختلف ہوتا، مگر اوڑھنے کا انداز ایک ہی ہوتا تھا۔

پورے جسم اور سر کے گرد چادر اس کے پورے وجود کو ڈھانپے ہوتی تھی۔ صرف چہرے کا کچھ حصہ اور ہاتھ نظر آتے تھے۔ جو کسی بھی آرائش کے بغیر ہوتے تھے۔ رابیل کو پہلی بار احساس ہوا کہ ہانیہ بہت خوب صورت ہے، ایک عجیب سی کشش تھی اس کے پورے وجود میں۔ ہانیہ اپنی چادر تہ کرنے کے بعد رابیل کے پاس آ بیٹھی تھی۔

"اور دوسری بات یہ کہ میم صرف کلاس میں یا یونیورسٹی میں اور اس کے باہر میں تمہاری بڑی بہن ہوں، تم مجھے ہنی آپی کہہ سکتی ہو۔" اس کی بات سن کر رابیل مسکرائی تھی۔

"مجھے تو بہت خوشی ہوگی اگر مجھے آپ جیسی دوست اور بہن مل جائے۔"

"اب بتاؤ تمہارے اور میکال کے بیچ کیا مسئلہ چل رہا ہے۔ تم اپنا مسئلہ آسانی سے مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔" ہانیہ کی بات پر وہ کچھ دیر خاموش رہی، جیسے سوچ رہی ہو کہ آیا وہ بتائے یا نہ بتائے، پھر یک دم اس نے بتانے کا فیصلہ کر دیا تھا۔

"میں اور میکال پچھلے ایک سال سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، فرسٹ سمسٹر سے، مگر ہماری محبت آپ کے سامنے ہے، کسی کو بھی عامیانہ پن نظر نہیں آیا ہوگا۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔"

"پچھلے ایک ماہ سے یہ مسئلہ چل رہا ہے، میکال نے مجھ سے کہا کہ تمہیں اپنے گھر والوں سے بات کر لینی چاہیے، تاکہ ہماری منگنی یا نکاح وغیرہ طے ہو جائے۔ تاکہ M.B.A کے فوراً بعد ہماری شادی ہو جائے۔ کیونکہ میکال اپنے ابو کا بزنس آل ریڈی سنبھال بھی رہا ہے۔ اس نے اپنے والدین سے بات کی تو۔" اس کے حلق میں آنسو کا گولا پھنسنے لگا۔

"تو انہوں نے صاف منع کر دیا ہوگا، کیونکہ ان کے یہاں برادری سے باہر شادی نہیں ہوتی۔" رابیل کے بجائے ہانیہ نے بات مکمل کی تھی۔

"آپ کو، آپ کو کیسے پتا یہ بات؟" رابیل کو حیرانی ہوئی تھی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے، سب کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔" ہانیہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

"اور میکال کیا کہتا ہے، کیا اسے اس بات کا علم نہیں تھا۔ جب اس کے خاندان میں ایسا نہیں ہوتا تو کیوں چلا تھا اس راہ پر۔"

"وہ سمجھ رہا تھا کہ منا لے گا اپنے والدین کو۔ آخر کو تین بہنوں کا اکلوتا بھائی اور اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے گھر والے اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔ مگر اب...." ہانیہ کو کچھ چبھا تھا۔

"میں میکال کے والدین سے بات کروں گی، تم فکر مت کرو، اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اللہ پر یقین رکھو، اس سے دعا کرو اور صبر کرو،

سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے رابیل کو تسلی تھی۔

"تھینک یو سوچ ہنی آپی۔"

"چلو آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔" ہانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک ہفتہ بعد یونیورسٹی آیا تھا۔ ذہنی طور پر اتنا ڈسٹرب تھا کہ ایک ہفتے سے یونیورسٹی نہیں آپا رہا تھا اور آج آتے ہی اسے پتا چلا کہ ہانیہ نے اسے بلایا ہے۔

"میں تم سے رابیل کے اور تمہارے موجودہ مسئلے کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔" ہانیہ نے ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے میکال سے کہا تھا۔

"میم تو رابیل نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے' اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اس نے مجھ سب کچھ میرے پوچھنے پر بتایا ہے' ایک ہفتہ پہلے جس حالت میں یونیورسٹی کے گیٹ پر اسے چھوڑ کر گئے تھے' کوئی بھی نہایت غلط مطلب لے سکتا تھا۔ اس لیے اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔" میکال برق رفتاری سے اس سے نظریں چرا گیا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں' میں نے اسے کوئی دھوکہ نہیں دیا' نہ منہ چھپا کر بھاگا ہوں۔" میکال نے اس طرح نظریں جھکائے کہا تھا۔

"تم کہو تو تمہارے والدین سے میں بات کروں۔" ہانیہ نے پوچھا۔ اس نے سر اٹھا کر ہانیہ کو دیکھا تھا۔

"آپ کیا بات کریں گی' وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں۔" ہانیہ کو اس کے لہجے میں یک دم صدیوں کی تھکن اترتی محسوس ہوئی تھی۔

"اتنی ناامیدی اچھی نہیں ہوتی' ہو سکتا ہے تم اس طرح سے کنوینس نہ کر پا رہے ہو جس طرح میں کر سکوں۔" میکال نے جواب میں کچھ نہیں کہا' بس خاموشی سے ٹیبل پر پڑا اپنا سیل فون آہستہ آہستہ گھماتا رہا تھا۔

"مجھے اپنے گھر کا پتا دو' میں سنڈے کو تمہارے گھر آؤں گی۔ تمہارے والدین سے بات کرنے۔" میکال نے خاموشی سے اپنے گھر کا ایڈریس لکھوا دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ہانیہ نے تھک کر چیئر سے سر ٹکا دیا تھا۔

"شاید محبت کی تاریخ ایک جیسی ہی ہوتی ہے' خواب' تھوڑا سا سفر اور پھر ہجر کی لمبی راتیں۔" وہ سوگواری سے مسکرا دی۔ بعض اوقات درد کی شدت سے بھی آنسو نہیں نکل پاتے۔

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت میکال کے ماں' باپ کے سامنے بیٹھی تھی۔ میکال کے والد نہایت بارعب شخصیت کے حامل تھے' جبکہ امی ویسی ہی لگی تھیں جیسے سب کی محبت کرنے والی مائیں ہوتی ہیں۔

"میکال نے بتایا تھا کہ آپ ہم سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔" وہ بہت غور سے صوفے پر بیٹھی سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے میکال کے والد کو کہتے سنا۔ ہانیہ نے ایک نظر اپنے بائیں طرف صوفے پر بیٹھے میکال کی طرف دیکھا' پھر دائیں طرف بیٹھے اس کے والد کی طرف متوجہ ہوئی۔

"جی انکل۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"پلیز میری بات غور سے سنیے گا' ہو سکتا ہے آپ کچھ مائنڈ کر جائیں' مگر میرا آپ سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔"

"میں سمجھا نہیں' آخر آپ نے ایسی کون سی بات کرنی ہے۔" میکال کے والد اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"انکل میں آپ سے میکال کے سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ جو مسئلہ آج کل آپ کے گھر چل رہا ہے۔ جہاں میکال شادی کرنا چاہتا ہے۔" اس نے رابیل کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے ان دونوں کے تاثرات تبدیل ہوتے دیکھے تھے۔

"ہمیں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنی' یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے۔ کسی تیسرے کو بیچ میں آنے کی کوئی

ضرورت نہیں ہے۔" ہانیہ ان سے ایسی ہی بات کی توقع کر رہی تھی۔ ملازمہ چائے کی ٹرالی لے آئی' ہانیہ ملازمہ کا باہر جانے کا انتظار کرنے لگی۔

"ضرور یہ آپ لوگوں کا ذاتی مسئلہ ہے' مگر یہ کسی کی زندگی کا مسئلہ بھی ہے۔" ملازمہ کے چلے جانے کے بعد ہانیہ نے کہا۔

"ہمیں کسی کی زندگی سے کیا لینا دینا۔" حسن جمال کی بات پر وہ کڑھ کر رہ گئی تھی' بے حسی کی انتہا تھی۔

"یہ آپ کے بیٹے کی زندگی کا بھی سوال ہے۔" اس نے بیٹے پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں یہ میرے بیٹے کی زندگی کا معاملہ نہیں ہے۔ لڑکے ایسی محبتیں کرتے رہتے ہیں' اپنی زندگی میں' جب ایک خوب صورت بیوی ملے گی تو بھول جائے گا اس لڑکی کو۔" انہوں نے میکال کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ہانیہ کا دل چاہا سامنے پڑی چائے کی ٹرالی الٹ دے غصے کی ایک تیز لہر اس نے اپنے اندر اٹھتے ہوئے محسوس کی تھی۔ وہ بمشکل ضبط کیے بیٹھی رہی۔

"انکل ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں آپ' آپ ایک نہیں تین زندگیاں خراب کر رہے ہیں' اپنے بیٹے اس لڑکی کی۔۔۔" حسن جمال نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"آپ چاہتی کیا ہیں آخر۔"

"میں چاہتی ہوں کہ آپ ایک دفعہ رابیل سے مل لیں' تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ آپ کا بیٹا کسی بری لڑکی کے لیے آپ سے نہیں لڑ رہا ہے۔" اس نے وہ ہی بات کہہ دی جس کے لیے وہ وہاں گئی تھی۔

"حسن' ہانیہ بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے' ہمیں ایک دفعہ دیکھنا تو چاہیے کہ وہ لڑکی کیسی ہے' ہو سکتا ہے واقعی بہت اچھی ہو' آخر ہم بھی اپنے بیٹے کی پسند جانتے ہیں۔" پہلی مرتبہ عطیہ جمال نے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ ہانیہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ تو میکال کے ساتھ ہیں۔

"وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے آنٹی میں آپ کو گارنٹی دیتی ہوں' ایک استاد اپنے شاگرد کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔" اس نے پہلی بار عطیہ جمال سے کہا تھا۔

"کیوں مل لیں' جب ہم نے اپنی برادری سے باہر شادی ہی نہیں کرنی' اپنی ذات کی لڑکی لانی ہے۔" حسن جمال ایک انچ بھی اپنی بات سے نہیں ہلے تھے۔

"انکل آپ تو ماشاء اللہ سے بہت مذہبی ہیں' ہمارا مذہب تو ذات پات کے بہت خلاف ہے۔" ہانیہ کی بات پر حسن جمال کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"ہاں' مگر میں اپنے خاندان کے لیے۔۔۔ ایسی ویسی بہو نہیں لا سکتا جو پہلے سے ہی لڑکے پھانسے جس کے لیے میرا بیٹا مجھ سے لڑے۔" ہانیہ نے تاسف سے اس انسان کو دیکھا جو بدگمانی کی انتہا پر تھا۔

"ابو رابیل ایسی نہیں ہے۔" میکال نے جیسے تڑپ کر کہا تھا۔

"دیکھا۔۔۔ دیکھا آپ نے کس طرح یہ اس لڑکی کے لیے ہم سے بات کر رہا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا یہ۔" حسن جمال نے ایک نظر ہانیہ کو دیکھا' پھر سامنے بیٹھے میکال کو دیکھتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

"وہ بدتمیزی نہیں کر رہا انکل' وہ صرف آپ کی بات سے انکار کر رہا ہے اور واقعی ٹھیک کہہ رہا ہے' رابیل واقعی بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔"

"مگر ہمیں نہیں کرنی شادی وہاں' پتا نہیں بعد میں کیسی ہو ہمارے ساتھ۔ شادی سے پہلے ہمارا بیٹا ہمارے خلاف کر دیا' نہ جانے شادی کے بعد کیا کرے۔"

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ جہاں آپ شادی کریں گے' وہ لڑکی شادی کے بعد آپ لوگوں کے ساتھ اچھی ہو۔" پہلی بار حسن جمال لاجواب ہوئے تھے۔

"رابیل آگئی تو کم از کم آپ کا دل جیتنے کے لیے آپ کی خدمت ہی کرے گی۔ دوسری آگئی تو ضروری نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ ساری زندگی اچھی رہے۔ آپ کی پسند ہوگی' مگر شوہر کا دل جیتنے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ کے ساتھ بھی اچھی رہے اور رابیل وہ تو آپ کی اور احسان مند رہے گی اور زیادہ خدمت کرتی رہے گی۔ کیونکہ محبت صرف ایک انسان سے نہیں

ہوتی اس سے وابستہ ہر چیز سے ہوتی ہے۔" حسن جمال اب بھی کچھ نہیں بولے تھے۔ شاید بات ان کے دل کو لگی تھی۔

"میں جاؤں گی رابیل سے ملنے۔" عطیہ جمال نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"مگر رشتے دار اور سارے برادری والے کیا کہیں گے عطیہ! کہ ہم نے خاندان سے لڑکی نہیں لی' سب ناراض ہوں گے۔" انہوں نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔

"وہ تو ویسے بھی ہوں گے' ہم ایک کی بیٹی لیں گے تو دوسرا ناراض ہوگا۔ دوسرے کی لیں گے تو تیسرا ناراض ہوگا' اب تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔" اب کی بار عطیہ جمال نے اپنے شوہر کو سمجھایا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ سوچنے لگے۔ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں۔

☼ ☼ ☼

وہ مسکراتی آنکھوں کے ساتھ وسیع و عریض لان میں اسٹیج پر میکال اور رابیل کا نکاح ہوتے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رابیل کو میکال کے ساتھ لاکر بٹھا دیا گیا تھا۔

"cauple made for each other perfect"

ان لوگوں کو دیکھ کر ہانیہ نے دل میں سوچا تھا۔

قصہ مختصر تھا۔ اس دن ہانیہ کے بات کرنے کے بعد میکال کی امی رابیل سے ملی تھیں۔ رابیل انہیں پہلی نظر میں ہی بے حد پسند آگئی تھی اور کافی کوششوں کے بعد انہوں نے حسن جمال کو بھی راضی کرلیا تھا۔ کیونکہ ایک سوچ کا پہلو ہانیہ کھول گئی تھی۔ رابیل کے امی' ابو نے خوشی خوشی رشتہ قبول کرلیا تھا۔ اور آج رابیل کے لان میں ان دونوں کا نکاح ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں ایک عجیب سی خوشی ہانیہ کو اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ اسٹیج پر چڑھ کر ان دونوں کو مبارک باد دینے لگی تھی۔

"میم یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے' آپ ہی نے ابو کو سوچنے کا نیا رخ دیا تھا۔" میکال نے اس کے ہاتھ سے بڑا سا بوکے لیتے ہوئے کہا تھا۔

"سب اللہ کرتا ہے' اس نے تم دونوں کو ملانا تھا میں تو بس وسیلہ بنی تھی۔" ہانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا' یک دم اسٹیج پر کلاس کے دوسرے لڑکیاں اور لڑکے آگئے تو ہانیہ کو اسٹیج سے اترنا پڑا۔ دلہن بنی رابیل نے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ دیکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت کینٹ کی مارکیٹ میں گھوم رہی تھی۔ عبیر کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوچکی تھی۔ یک دم اس کے کندھے ہلکے ہوگئے تھے۔ حالانکہ وہ چاہتی تھی کہ عبیر ماسٹرز کرے' مگر عبیر کو ہانیہ کی پرابلمز کا اندازہ تھا' وہ جانتی تھی کہ ہانیہ گھر کے حالات سدھارنے کے لیے ہی ـــ خوار ہوتی پھرتی ہے' اس لیے اس نے شادی کے لیے ہاں کردیا تھا کہ گھر والوں کا بوجھ کم ہوجائے گا' معین بی کام کرنے کے بعد ایک کال سینٹر میں جاب کررہا تھا۔ ساتھ میں ایک پرائیویٹ یونیورسٹی سے ایم بی اے کررہا تھا' جو کہ اب مکمل ہونے والا تھا' ہانیہ کو محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے سینے کا بوجھ ہلکا کردیا ہو' جس بوجھ کے ساتھ وہ شہر شہر رہی تھی۔

عبیر کے لیے کچھ جیولری دیکھتے دیکھتے نہ جانے کیوں اس کا دل بھر آیا تھا۔ وہ شاپ سے نکل کر یونہی بے مقصد بازار میں پھرنے لگی۔ ہنستے مسکراتے چہرے' ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے جوڑے' بچوں کو کھلونے دلاتے ماں' باپ ایک عجیب سے احساس محرومی نے اس کے وجود کو گھیر لیا تھا۔

پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا کہ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ رات کے اس وقت اس طرح فٹ پاتھ پر بیٹھتے اسے اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا کہ اگر کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا' اگر کسی اسٹوڈنٹ نے دیکھ لیا تو وہ نہ جانے کیا سمجھے۔

آس پاس سے گزرنے والے لوگ اسے بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی ہے اور اس نے کتنے آنسو بہائے ہیں۔ جب اچانک اس کے کانوں میں ایک مانوس سی آواز ٹکرائی تھی۔

"ہنی آپی' آپ یہاں۔" وہ یک دم چونکی' آواز کے تعاقب میں دیکھا تو دل چاہا کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جائے۔ سامنے رابیل بے حد حیرت کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں وہ۔" ہانیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے' میں یہاں سے گزر رہی تھی تو مجھے شک ہوا کہ آپ بیٹھی ہیں۔" ہانیہ خاموشی سے کھڑی ہوگئی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا اور آپ رو رہی ہیں؟"

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے' بی پی ایک دم بہت لو ہوگیا تھا۔ اس لیے میں یہاں بیٹھ گئی۔" اس نے رابیل کے دوسرے سوال کو نظرانداز کردیا تھا۔

"چلیں میں آپ کو چھوڑ کر آتی ہوں۔ آپ کو اس حالت میں ڈرائیو نہیں کرنی چاہیے۔" ہانیہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"نہیں میں اب ٹھیک ہوں' میں چلی جاؤں گی۔"

"نہیں میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔ ہانیہ کی گاڑی کے پاس پہنچنے تک رابیل نے اپنے ابو کو فون کرکے مختصراً" ہانیہ کی طبیعت کے بارے میں بتا دیا تھا اور ہاسٹل چھوڑنے کی اجازت لی تھی۔

جس وقت وہ بازار سے نکلے اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ رابیل نے راستے میں رک کر سیب کا تازہ جوس ہانیہ کو پلایا اور ایک ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کرواکر اسے ہاسٹل چھوڑنے لگی تھی' ہانیہ اسے منع کرتی رہ گئی۔

"آپ مجھے اپنی چھوٹی بہن کہتی ہیں اور جب میں ایک بہن کی طرح آپ کا خیال کررہی ہوں تو آپ غیریت جتا رہی ہیں۔" ہانیہ کے شکریہ کے جواب میں اس نے کہا تھا۔ ہانیہ مسکرائی اور اللہ حافظ کہتی ہوئی اتر گئی تھی۔ کل سنڈے تھا تو ہانیہ نے کہا کہ وہ اس کی گاڑی لے جائے اور کل آرام سے لے آئے۔

☼ ☼ ☼

"آپی یہ چائے لیں۔" رابیل نے اسے چائے کا مگ پکڑایا تھا۔ اس نے مگ پکڑ کر دوبارہ سامنے دیکھنا شروع کردیا تھا۔

"آپ کو مزا آیا ہمارے یہاں۔" رابیل نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا اس نے سامنے ڈوبتے سورج سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں' بہت زیادہ' یقین کرو جب سے میں ملتان آئی ہوں آج پہلا دن ہے جو مجھے ایسا لگا کہ اپنے گھر میں آگئی ہوں۔ تمہارے والدین سے اتنی چاہت اور اپنائیت ملی ہے کہ میرا یہاں سے جانے کو دل ہی نہیں کررہا۔" وہ بے اختیار کہہ گئی۔ "تو یہیں آجائیں نا ہاسٹل چھوڑ کر۔" اس نے اتنے پیار سے کہا کہ وہ یک دم ہنس پڑی۔

"ہاں تاکہ تمہارے مزے آجائیں' خوب فائدہ اٹھایا جائے' پیپر جو پہلے سے پتا چل جائے گا۔"

"نہیں اس لیے کہ آپ دل سے مسکرانا شروع کردیں' جس تنہائی نے آپ کو نڈھال کردیا ہے اس سے نکل آئیں' رونے کے لیے کسی فٹ پاتھ پہ بیٹھنا نہ پڑے۔" ہانیہ کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ بے اختیار کانپا اس نے اپنے ہاتھ کی کپکپاہٹ چھپانے کے لیے ٹیرس کی ریلنگ مضبوطی سے تھام لی تھی اور کپ منڈیر پر رکھ دیا تھا۔

"یا اللہ اس نے یہ سب کیسے اندازہ لگایا۔"

"اور آپ کو اپنے ہاتھ کی کپکپاہٹ چھپانے کے لیے ریلنگ کو نہ تھامنا پڑے۔" اس کی نظروں نے اس کے ہاتھ کا تعاقب کیا تھا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' میں۔۔۔"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے' اس بات کا

یقین ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔" رابیل نے اپنی چائے کا آخری سپ لیا اور خالی مگ سامنے منڈیر پر رکھ دیا تھا۔

بعض اوقات لفظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں' انسان چاہتے ہوئے بھی کچھ کہنے کے قابل نہیں رہتا۔ زبان چاہتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں پاتا۔

"آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں۔" رابیل نے صرف چند لفظوں میں کیا کہہ دیا تھا وہ سمجھ سکتی تھی۔

"میں چلتی ہوں' شام ہو گئی ہے۔" وہ خاموشی سے پلٹی۔

"چلیں میں آپ کو چھوڑ کر آتی ہوں۔" ہاسٹل کے گیٹ پر اترتے ہوئے اس نے رابیل کو کچھ کہتے سنا تھا۔

"جب آپ کو لگے کہ یہ ناچیز اس قابل ہے کہ آپ اپنے اندر کا اضطراب شیئر کرنا چاہیں تو ایک پل کی بھی دیر نہ کیجیے گا۔" وہ جواب دیے بغیر اتر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہانیہ نے کلاس میں بی جی جی بنانے کا assigment دیا تھا۔ رابیل لیکچر والے دن غیر حاضر تھی' اس لیے وہ ویک اینڈ پر ہانیہ کے پاس چلی آئی ہانیہ اسے B.G.G Plot کرنا سکھا رہی تھی۔ پر ہانیہ نے محسوس کیا کہ رابیل متوجہ نہیں ہے۔ ہانیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' وہ اگلا سانس نہ لے سکی۔

رابیل اس کے لیپ ٹاپ میں تھی docment My میں موجود کچھ تصویریں دیکھ رہی تھی۔

"موصوف ہیں تو بہت ہینڈسم' مگر ہے کون؟" رابیل کی نظریں مسلسل لیپ ٹاپ کی اسکرین کی طرف تھیں۔ ورنہ وہ ہانیہ کی متغیر ہوتی رنگت دیکھ کر ضرور پریشان ہو جاتی۔ ہانیہ کو سمجھ نہ آیا وہ کیا کہے۔

نیوی بلیو ٹی شرٹ' لائٹ براؤن ٹراؤزر کچھ جگہوں سے گیلا تھا۔ ماتھے پر بکھرے بھیگے بال۔

ہانیہ نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ آنکھوں میں جمع ہونے والا گرم سیال پلکوں کے بند توڑنے کے لیے بے تاب تھا۔ یہ وہ تصویر تھی جسے پانچ سال پورے پانچ سال سے نہیں دیکھا تھا۔ کسی نے ان جانے میں پھر سے زخم کو ادھیڑا تھا۔ اس کی طرف سے مسلسل خاموشی نے رابیل کو پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"آپی آپ ٹھیک تو ہیں۔" ہانیہ نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے سر نیچے کر لیا تھا۔ مگر رابیل نے بی جی جی کے اشار پر گرتے چند قطرے دیکھ لیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہنی یار وہ نہیں آئے گا۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" وہ دونوں پچھلے پانچ منٹ سے ڈیپارٹمنٹ کی پچھلی سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ اور ماہین بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ کلاس شروع ہونے میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔

"وہ آئے گا' اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آئے گا۔" سیڑھیوں پر بیٹھی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اس نے بے حد یقین کے ساتھ کہا تھا۔ ماہین نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اسے دیکھا۔ بلیک شلوار' بلیو قمیص اور بلیک بڑی سی چادر اوڑھے وہ اسے بے حد اچھی لگی۔

"تو کیا اس کے انتظار میں کلاس چھوڑ دو گی۔" ماہین نے اس سے پوچھا تھا اور جواب بھی وہ جانتی تھی۔

"احمد کے لیے! یہ دنیا چھوڑ سکتی ہے' پھر یہ کلاس کیا چیز ہے۔" ماہین کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ کیونکہ اس نے ہانیہ کی آنکھوں کی چمک بڑھتے ہوئے دیکھی تھی' وہ پیچھے مڑے بغیر بھی بتا سکتی تھی کہ اس کی پشت پر احمد آ چکا ہے۔

"السلام علیکم۔" ماہین کو خوب صورت اور بھاری آواز سنائی دی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے پیچھے مڑتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ کو پتا ہے کہ آپ کے فراق میں یہ میری جان جلا رہی تھی' آپ پورے دس منٹ لیٹ ہیں۔" ماہین کی بات پر وہ ہنس پڑا تھا۔

"دس منٹ اور پندرہ سیکنڈ لیٹ۔" ہانیہ سے کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے کہتے سنا۔

"حساب اتنا اچھا کیسے ہو گیا۔" اس نے شرارت بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب سے آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔" احمد کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"ملاقات ہوئی ہے یا محبت ہوئی ہے۔" اس نے حتی المقدور آواز کو دھیما رکھا' تاکہ ماہین نہ سن لے' ہنی کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا تھا۔ ماہین وہیں ہانیہ کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

"تم کلاس میں نہیں جا رہیں' خواہ مخواہ کباب میں ہڈی بننے رک گئی ہو۔" احمد نے اسے چھیڑا۔

"ہنی کے بغیر مجھے تو جنت میں بھی مزا نہیں آئے گا۔" اس کی بکواس دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔

"اور آپ اچھے بھائی ہیں' بہن کھٹکنے لگی اب۔" ماہین نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تھا۔

"سر کریمی کی کلاس تھی یار' اور تمہیں پتا ہے کہ وہ کیا چیز ہیں' بس نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔" اس نے ہنی کو بتایا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کو سنتی رہی' بعض لوگوں کو صرف سننا ہی کافی ہوتا ہے نا' یہ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا۔

"کوئی بات نہیں' مجھے آپ کا انتظار کرنا اچھا لگتا ہے۔" ہنی نے اپنے بیگ سے کچھ نکال کر اسے دیا تھا' وہ zippo کا لائٹر دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

"اور سر چڑھاؤ اسے' لڑکیاں تو پتا نہیں کیسے کیسے ناز اٹھواتی ہیں اور تم۔۔۔ اور اوپر سے گفٹ کیا کر رہی' یہ لائٹر۔"

"میری ہنی عام لڑکی نہیں ہے۔۔۔ بیٹھو میں کچھ کھانے کے لیے لے کر آتا ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

12 بج کے 43 منٹ پر وہ یہاں آیا تھا اور اب 12 بج کے 49 منٹ ہو رہے تھے۔ صرف 6 منٹ کے لیے وہ یہاں اس سے کافی فاصلے پر بیٹھا تھا۔ مگر ان 6 منٹ میں پوری کائنات اسے گاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اسے لگا ساری دنیا کی خوشیاں اس کے پاس آ گئی ہوں۔ ابھی بھی وہ بے حد محبت سے اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں وہ بیٹھا تھا۔

اس سے ملتے ہی بدل سی گئی دنیا میری
وہ تھا پہلا سا میری ذات نہ تھی پہلی سی

☼ ☼ ☼

وہ سو رہی تھی کہ کسی نے آ کر ایک جھٹکے سے اس کے اوپر سے چادر کھینچی تھی' وہ ہڑبڑا کر۔۔۔ اٹھ بیٹھی تھی۔

"اٹھ جاؤ' عصر کا وقت جا رہا ہے' پھر تمہارے ٹیوشن والے بچے بھی آنے والے ہوں گے۔" امی نے کہتے ہوئے کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں' وہ پلنگ سے اتر آئی تھی۔

برآمدے میں لگے واش بیسن سے منہ دھو کر باہر صحن میں آئی تو دیکھا تخت پر معین جوتوں سمیت لیٹا ہوا ہے۔

"تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو۔" اس نے معین کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر اس نے ہانیہ کو دیکھا تھا۔

"جاب ڈھونڈ رہا ہوں۔" شکستہ لہجے میں ہانیہ نے اسے کہتے سنا تھا۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے کچھ کرنے کی' میں ٹیوشن پڑھا تو رہی ہوں' یونیورسٹی کے بعد ایک جگہ جاب بھی کر رہی ہوں اور پھر ابو اتنا تو کما ہی لیتے ہیں کہ۔۔۔"

"ابو کتنا کماتے ہیں وہ آپ بھی جانتی ہیں' بمشکل گھر کا خرچہ پورا ہوتا ہے اور آپ کو اپنی سمسٹر کی فیس کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے' یہ بھی میں جانتا ہوں۔ اب میں اتنا بھی بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنی فیس کے لیے آپ کو اور خوار کرواؤں۔" ہانیہ نے بے حد بے بسی سے اپنے اس بھائی کو دیکھا جس نے ایف ایس سی میں شان دار مارکس لیے تھے۔ مگر اب NED میں ایڈمیشن کے لیے صرف اس لیے خوار

ہوتا پھر رہا تھا کہ اس کی جیب خالی ہے۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ بی کام کرلوں۔" اس کی بات پرہانیہ کو تکلیف ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ انجینئرنگ اس کا خواب ہے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

محبت کی جس سرشار کیفیت میں وہ ہر وقت گم رہتی تھی نہ جانے کیوں یہاں آکر یہ کیفیت ختم ہوجاتی تھی۔ اس کے باپ نے ساری عمر کوئی قابل ذکر نوکری نہیں کی تھی۔ لوئر مڈل کلاس کی زندگی وہ بچپن سے لے کر آج تک گزارتی آئی تھی۔ پر نہ جانے کیوں اب یہ بہت زیادہ چبھنے لگی تھی۔

خود ہانیہ نے اسکالر شپ لیا تھا' ورنہ ایم بی اے وہ کبھی نہ کرپاتی۔ مگر پھر بھی یونیورسٹی کے بعد وہ ایک جگہ دو گھنٹے کی پارٹ ٹائم کمپیوٹر آپریٹر کی جاب کرتی۔ دو گھنٹے کے اسے تین ہزار مل جاتے اور اس کے بعد مسلسل ٹیوشنز اور ساتھ خود پڑھنا وہ یہ سب صرف اپنے لیے نہیں کررہی تھی' اسے اپنے تین بہن' بھائیوں کی فکر تھی۔ معین' عبیر اور قاسم ان کی بڑی بہن ہونے کے ناتے وہ انہیں ساری خوشیاں دینا چاہتی تھی اور بڑی اولاد ہونے کے ناتے اپنے والدین کا ساتھ۔ وہ کب کی ختم ہوجاتی' اگر احمد کا ساتھ نہ ہوتا تو۔۔۔۔

احمد کا خیال آتے ہی وہ وہاں تخت پر بیٹھے بیٹھے مسکرادی۔

احمد سے اس کی ملاقات یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے پندرہ دن بعد ہوئی تھی۔ وہ اس سے ایک سال سینئر تھا۔ یوں تو اسے وہ ہر دوسرے دن ڈپارٹمنٹ میں پھرتے دیکھتی رہتی تھی۔ مگر کبھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہاں اسے اتنا ضرور اندازہ تھا کہ وہ پورے ایچ آر ایم کے ڈپارٹمنٹ میں مشہور ـــــ ہے۔ احمد سے بات کرنے کا موقع اس وقت ملا جب اس کے ٹیچر سر حیدر نے اسے اسائنمنٹ تیار کرنے کو کہا تھا۔ اس کے پاس کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت نہیں تھی اور نہ اس کو فرسٹ سمسٹر میں جاب ملی تھی۔ اور نہ ہی سونیا اور ماہین سے دوستی ہوجانے کے باوجود اتنی بے تکلفی تھی کہ وہ ان کے گھروں میں جاکر تیاری کرتی' انہیں اپنی پریزنٹیشن تیار کرنے کو کہتی۔

"تم اتنی خاموش کیوں ہو؟" وہ اس دن کلاس آف ہونے کے باعث سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ جب ماہین نے فرنچ فرائز کی پیپر پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں' تمہیں ایسی ہی لگا ہوگا۔" اس نے ایک چپس اٹھاکر اسے کیچپ میں ڈپ کیا۔

"نہیں یار کچھ بات ضرور ہے' ورنہ تم اتنی زیادہ خاموش نہیں رہتیں۔" ہانیہ کو لگا کہ اس کی بات پر دائیں طرف بیٹھے دو لڑکوں میں سے ایک نے سر اٹھاکر ان دونوں کو دیکھا تھا۔

"نہیں تمہیں۔" اس نے انکار کرنا چاہا' مگر ماہین نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"میں مانتی ہوں کہ ہماری دوستی کو صرف پندرہ دن ہوئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے پر اعتبار نہ کریں۔ دوستی نام ہی اعتبار کا ہے اور ایک دوسرے سے اپنی ہر پریشانی شیئر کرسکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے ہم دونوں بہترین دوست بن سکتے ہیں۔"

اور اس کی یہ بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ وہ اور ماہین ایک دوسرے کی بہترین سے بڑھ کر دوست ثابت ہوئی تھیں۔ اس نے اپنا مسئلہ ماہین کو بتایا تھا۔

"بس اتنی سی بات ہے تم اس بات پر پریشان ہوتی پھر رہی تھیں۔ تم مجھے کہتیں' میں تمہیں بنا کردیتی' مگر اب مسئلہ یہ ہے کہ میرا pc خراب ہوگیا ہے کل ہی اور میں ـــــ اپنی پریزنٹیشن خود اپنے کزن سے تیار کروا رہی ہوں' مگر تم فکر مت کرو' میں کچھ نہ کچھ کرتی ہوں تمہارے لیے۔"

امید کی کرن جو روشن ہوئی تھی وہ فوراً" بجھ گئی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا مسئلہ اسی وقت حل ہوگیا تھا۔ آخری کلاس آف ہوتے ہی ماہین غائب ہوگئی تھی۔ اس نے ہانیہ کے موبائل پر میسج کرکے بتایا کہ فوٹو اسٹیٹ شاپ پر ہے۔ وہ وہیں آجائے' ہانیہ

وہاں جانے کے لیے سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ کسی نے اسے پکارا۔

"ہانیہ۔" اس نے پیچھے مڑکر اپنے مخاطب کو دیکھا تھا۔ احمد کو کھڑا دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" احمد نے قریب آتے ہوئے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" اس کے اس طرح پکارنے پر وہ گھبرا گئی۔

"آپ کو اپنی پریزنٹیشن بنانی ہے نا۔"

"جی' مگر آپ کو کیسے پتا چلا۔"

"وہ تھوڑی دیر پہلے آپ اپنی دوست سے بات کررہی تھیں تو آپ سے تھوڑے فاصلے پر میں اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔"

"اچھا وہ آپ تھے۔" ہانیہ کو یاد آیا کسی نے سر اٹھاکر ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس کا وہم نہیں تھا' وہ سچ تھا۔

"میں نے اپنے پریولیس میں اسی Topic پر پریزنٹیشن دی تھی۔ وہ اب تک میرے پاس پڑی ہے وہ آپ لے لیں۔ میں آپ کو usb لادوں گا۔"

"لیکن میرے پاس لیپ ٹاپ نہیں ہے۔" اس نے احمد کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے کہا تھا۔

"تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ آپ میرا لیپ ٹاپ لے لیجیے گا۔ میں آپ کو پریکٹس کرادوں گا۔" ہانیہ نے سر اٹھاکر اسے دیکھا۔ اسے الجھن ہوئی کہ وہ آخر اس کی اتنی مدد کیوں کررہا ہے۔

"نو تھینکس میں کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔"

"اٹس اوکے مجھے لوگوں کی مدد کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جب میرے پاس پڑی ہے تو آپ کو کیا ضرورت ہے تیار کرنے کی۔" ہانیہ کو اس وائٹ ٹی شرٹ پہنے لڑکے سے بے اختیار چڑ محسوس ہوئی' جس کی آنکھوں کی گہرائی اور ذہانت اسے پریشان کررہی تھی۔ وہ مزید انکار کرنا چاہتی تھی' مگر نہ کرسکی تھی۔ دوسرے دن وہ لیپ ٹاپ اور usb میں محفوظ پریزنٹیشن لے آیا تھا اور یونیورسٹی آف ہونے کے بعد آدھا گھنٹہ اسے سمجھاتا رہا تھا۔ لائبریری میں بیٹھے وہ اسے ٹاپک کے بارے میں کچھ سمجھا رہا تھا۔ جب اچانک ہانیہ نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظریں ہٹاکر اس کے ہاتھ کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ وہ اسکرین کی طرف اشارہ کررہا تھا۔ وہ خالص مردانہ ہاتھ نہیں تھا۔ بہت ملائم اور نازک سا ہاتھ تھا۔ وہ ابھی اس کی کلائی میں بندھے کچھ بینڈز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب اس کی محویت کو احمد نے توڑا تھا۔

"ہانیہ۔ آپ کہاں کھوئی ہوئی ہیں۔" وہ چونک اٹھی۔

"نہیں بس کچھ سوچنے لگی تھی۔" اس کی گہری نظریں ہانیہ نے اپنے اوپر محسوس کی تھیں۔

"میں نے جتنا کچھ سمجھایا ہے' آپ کو سمجھ میں آگیا ہے نا' باقی آپ ایسا کریں کہ میرا سیل نمبر لے لیں' گھر میں کچھ سمجھ نہ آئے تو مجھے فون کیجیے گا' میں سمجھادوں گا۔" اس نے اپنا نمبر اسے لکھوایا تھا۔ وہ تھینک یو کہتی ہوئی اٹھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہے سمجھ میں کیوں نہیں آرہا ہے۔" وہ لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ اور ایک چیز بار بار پڑھنے پر بھی اس کے سمجھ میں نہیں آئی تو وہ جھنجلا اٹھی۔ یک دم اسے احمد کا خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے سمجھ لے۔ مگر رات کے دس بجے کتنا آکورڈ لگے گا۔ وہ سوچنے لگی' مگر پھر بے اختیار اس کے ہاتھ احمد کے دیے ہوئے نمبر پش کررہے تھے۔ چند لمحے دوسری طرف بیل جاتی رہی' مگر احمد نے اس کی کال کاٹ کر خود اسے فون کیا تھا۔

"السلام علیکم' جی کیا حال ہیں آپ کے؟" اس کے فون اٹھانے پر احمد نے فوراً" کہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ اللہ کا شکر آپ کیسے ہیں' مجھے کچھ سمجھ نہ آیا تھا تو۔۔۔۔"

"اوہ۔ آپ بتائیں کیا سمجھ نہیں آرہا تھا۔" اس کے کہنے پر وہ اسے بتانے لگی کہ اسے کس جگہ

مسئلہ ہو رہا ہے۔ فقط دس منٹ میں ہی اس نے ایک ایک چیز کلیئر کر دی اور بڑے نامحسوس طریقے سے وہ پڑھائی کے موضوع سے ہٹ کر۔ دوسری باتیں کرنے لگے تھے۔ ہانیہ کو اس سے بات کرتے ہوئے اب کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ احمد کے بتانے پر ہی پتا چلا کہ اس کا تعلق ملتان سے ہے۔ وہاں سے گریجویشن کر کے یہاں پڑھنے آیا ہے۔ وہ کراچی یونیورسٹی ہی کے بوائز ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا اور اپنے ماں' باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے استفسار کرنے پر ہی ہانیہ نے اسے تھوڑا اپنے بارے میں بتایا تھا۔

دو دن بعد ہونے والی پریزنٹیشن ہانیہ کی توقع سے بڑھ کر اچھی ہوئی تھی۔ وہ اس کا سارا کریڈٹ احمد کو ہی دے رہی تھی۔ وہ رات کو فون پر اس کو بتا رہی تھی کہ ٹیچرز نے اس کی کتنی تعریف کی تھی۔

"پھر تو ٹریٹ ملنی چاہیے۔" احمد نے ہنستے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"ضرور کیوں نہیں' کیا چاہیے ٹریٹ میں آپ کو۔" ہانیہ نے اس سے پوچھا تھا۔

"ابھی نہیں وقت آنے پر بتاؤں گا۔" اس کا معنی خیز انداز ہانیہ کو بہت عجیب لگا' مگر اس نے زیادہ دیر اس پر توجہ نہیں دی۔

یہ ان کے درمیان بات چیت کا آغاز تھا۔ ان کے درمیان بات چیت دھیرے دھیرے بڑھنے لگی تھی۔ ہانیہ کو ہر اسائنمنٹ احمد ہی تیار کر کے دیا کرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ چاروں اس وقت کیفے ٹیریا میں بیٹھی تھیں اور کسی بات پر زور و شور سے بحث جاری تھی۔ مگر ہانیہ خلاف معمول کافی چپ تھی۔ وہ فرائز کی پلیٹ ہاتھ میں پکڑے کچھ سوچ رہی تھی کہ مریم نے اس کے آگے چٹکی بجائی تھی۔

"اے کہاں گم ہو۔"

"ہوں۔" وہ کسی خیال سے چونکی تھی۔

"کیا بات ہے تمہارا ذہن کہاں ہے۔" ماہین نے بھی اس کی غائب دماغی کو محسوس کیا تھا۔

"کہیں نہیں' تم لوگ تو بس پیچھے پڑ جاتے ہو۔" وہ بے زاری سے کہتے ہوئی فرنچ فرائز کیچپ میں ڈبو کرنے لگی۔

"میں اتنے دن سے ہنی کی رویے میں کچھ فرق محسوس کر رہی ہوں۔" ہانیہ چپس منہ میں ڈال نہ سکی تھی۔

"بیٹھے بیٹھے کھو جاتی ہے۔" مریم نے یک دم بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ اسی وقت ہانیہ کے موبائل پر کسی کا sms آیا تھا۔ اس کے پڑھنے سے پہلے ہی مریم نے موبائل اس کے ہاتھ سے اچک کر لیا تھا۔

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کر دیکھا تو سب خسارہ ہے

اس نے بلند آواز میں سب کو sms پڑھ کر سنایا تھا۔

"Behave yaur self mariam" ہنی یک دم چیخی۔

"کسی کی پرسنل چیز اس طرح نہیں پڑھتے۔"

"یہ کسی کی نہیں' میری دوست کا موبائل ہے اور میں یہ ہی تو دیکھنا چاہ رہی تھی کہ ایسی کون سی بات ہے جو اسے اتنا گم سم رکھتی ہے' پہلے شک تھا اب یقین ہو گیا ہے۔" مریم نے چڑ کر جواب دیا تھا۔ ماہین اور حنا یک دم حیران سی ہو کر مریم اور ہانیہ کو دیکھنے لگی تھیں۔

"کیا مطلب؟"

"sender کا نام دیکھو لو خود ہی سمجھ آجائے گا۔" اس نے موبائل ان دونوں کے سامنے لہرایا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے' تم غلط سمجھ رہی ہو۔" ہانیہ نے کہا تھا۔

"احمد۔" ان دونوں نے sender کا نام دیکھنے کے بعد سوالیہ نظروں سے ہانیہ کو دیکھا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"ہنی احمد کے پاس میرا نمبر بھی ہے' کسی کام سے دیا ماہین نے' مگر آج تک ایک sms میرے پاس تو نہیں آیا۔" مریم اس کی جان چھوڑنے پر راضی نہیں تھی۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو' جتنا مہربان احمد' ہنی پر ہے' اتنا کسی پر نہیں' اپنا ہر اسائنمنٹ اس کو دے دیتا ہے۔" اس بار حنا نے ہی مریم کا ساتھ دیا تھا۔

"کیا بکواس ہے' جب میں کہہ رہی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں تو کیا مسئلہ ہے' یقین کیوں نہیں آرہا تم لوگوں کو۔" ہانیہ ایک دم چیخ پڑی تھی۔ ماہین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان دونوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"اچھا بھئی ٹھیک ہے' ہمیں ہی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"تم لوگ چلو' میں اور ہنی کچھ دیر میں آتے ہیں۔" ماہین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ہانیہ کو لے کر کینٹین کے پچھلے حصے کی طرف آگئی تھی۔

"تمہیں تو کچھ کام تھا' پھر یہاں۔" اسے بینچ پر بیٹھا دیکھ کر ہانیہ کو حیرت ہوئی تھی۔

"ہم کلاس نہیں لے رہے' مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیسی بات۔" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

"ہنی جب ابھی وہ دونوں تم سے بحث کر رہی تھیں تو میں خاموش تھی' مگر میں ان کی بات سے متفق ہوں۔" ہانیہ کو غصہ آگیا' وہ کچھ بولنے والی تھی کہ ماہین نے اسے روک دیا تھا۔

"ٹھیک ہے ابھی ایسا کچھ نہیں ہے' شاید تم دونوں نے realize نہیں کیا' مگر تمہارے رویے سے یہ ہی محسوس ہوتا ہے کہ تم احمد کو پسند کرنے لگی ہو۔" ماہین نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔ ہانیہ نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔ یک دم وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی' ماہین بوکھلا گئی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں پتا ماہین' مگر مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے' جس دن اس سے بات نہ ہو وہ نظر نہ آئے تو ایسا لگتا ہے ہر سو اندھیرا ہے' کچھ اچھا نہیں لگتا اس سے بات کیے بغیر۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے اقرار محبت کر رہی تھی۔

"پاگل تو اس میں رونے والی کون سی بات ہے' جا کر اس کو کہہ دو۔"

"نہیں میں اس سے کچھ نہیں کہوں گی' شرم و حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" وہ اب اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"اچھا تم اب رونا مت' میں کچھ سوچتی ہوں۔" ماہین ہانیہ کو کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آئی۔

☼ ☼ ☼

"کل صبح دس بجے میں پچھلی سیڑھیوں پر آپ کا انتظار کروں گا۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" رات ہانیہ کو احمد کا ایس ایم ایس موصول ہوا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک پل کو رکی تھی یا تیز ہوئی تھی وہ سمجھ نہیں پائی۔ دوسرے دن وہ دس بجے اس کے سامنے تھا۔ پچھلی سیڑھیوں پہ اس وقت کوئی نہیں تھا۔

"السلام علیکم۔" ہانیہ نے اس سے کافی فاصلے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"وعلیکم السلام' کیسی ہو۔"

"ٹھیک ہوں۔" ماتھے پر آیا پسینہ ٹشو سے خشک کرتے ہانیہ نے جواب دیا تھا۔ محبت کے اقرار کے بعد وہ اس سے نظریں ملا نہیں پا رہی تھی۔ وہ خاموش رہا' کافی دیر خاموشی ان کے درمیان رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے ٹشو کو دیکھتی رہی اور وہ اس کو' ہانیہ کو اس کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی تھی۔

"آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنی تھی شاید۔" اس نے قدرے جھنجلا کر سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور بولتے بولتے رک گئی' وہ بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ کو اس طرح جھنجلاتے دیکھ کر وہ ہنس پڑا تھا۔

"ہنی کیا ہے یار۔" ہانیہ اس کی اتنی بے تکلفی پر حیران رہ گئی تھی۔

"جی۔"

"اگر اظہار محبت کروں گا تو تم بھاگ جاؤ گی یہاں سے۔" ہانیہ کے لیے سر اٹھانا اور جھکائے رکھنا دونوں مشکل ہو تا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" بہت مشکل سے اس نے یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

"وہی جو تم سننا چاہ رہی ہو ۔" اس کی بات پر ہانیہ کا دل چاہا کہ کچھ اٹھا کر اسے دے مارے۔

"کیا میں اتنا برا ہوں کہ اب آپ مجھے دیکھنا بھی پسند نہیں کر رہیں۔" ہانیہ نے شرارت سے بھرپور آواز سنی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں جا رہی ہوں۔ آپ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اچھا بابا۔ سوری ویری سوری اب سیریس۔" وہ تپے ہوئے انداز میں دوبارہ بیٹھ گئی تھی۔

"ہنی! میں تمہارے لیے اپنے دل میں ایک خاص قسم کی فیلنگ رکھنے لگا ہوں۔ جو کبھی بھی کسی لڑکی کے لیے نہیں آئی اور نہ آئے گی سوائے تمہارے وہ تین لفظ جو اس طرح کی بات کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں وہ نہیں کہوں گا کیونکہ مجھے وہ الفاظ اپنی محبت کے لائق نہیں لگتے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ میرے یک طرفہ محسوسات نہیں ہیں۔"

وہ چپ چاپ کچھ کہے بغیر اس کی بات سنتی رہی۔

"کیا ہے۔ تم بھی کچھ کہو۔ میں دیواروں سے اظہار محبت نہیں کر رہا۔" ہانیہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔

"مجھے تمہارے گلے میں پہنی یہ چین بالکل پسند نہیں۔"

اس نے آپ سے تم تک کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ وہ ایک دم ہنس پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ گلے میں پہنی چین اتارنے لگے تھے۔

"اور کچھ۔" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"مجھے تمہارے ہاتھوں میں یہ پہنے بینڈز بالکل پسند نہیں۔" احمد نے اپنے ہاتھ میں پہنے بینڈز اتار دیے تھے۔

"اور کچھ۔"

"اور مجھے تمہارے ہونٹوں کے نیچے موجود یہ تل بہت اچھا لگتا ہے۔" اب کی بار وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ اس کی ہنسی بے حد خوبصورت تھی ہانیہ کو اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا۔

"ویسے دعا دینی چاہیے۔ ماہین کو جس نے فون کر کے مجھے سب کچھ بتایا۔" اس نے شرارت سے بھرپور انداز میں کہا اور وہاں سے بھاگ گیا اور وہ ماہین کو کلاس لینے کے لیے چل پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے واقعی صحیح کہا تھا اس کی محبت کوئی عام محبت نہیں تھی۔ وہ دونوں عام محبت کرنے والوں کی طرح گھنٹوں گھنٹوں باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ نہ ہی یونیورسٹی میں کلاسز بنک کر کے deting کیا کرتے۔ وہ احمد سے باہر تو کیا یونیورسٹی میں بھی چند منٹوں کی بات کے علاوہ کوئی بات نہیں کیا کرتی تھی اور وہ بھی چند دن بعد۔

ہانیہ کا تھرڈ سمسٹر شروع ہو چکا تھا۔ احمد کا تھیسس جاری تھا۔ وہ تھیسس کے علاوہ ہانیہ کی وجہ سے یہاں رکا ہوا تھا۔ اس نے واپس ملتان چلے جانا تھا۔ ہانیہ کے لیے اپنے والدین سے بات کرنے۔

وہ آتی سردیوں کی کچھ کچھ سرد کچھ خشک ملی جلی سی دوپہر تھی۔ جب ماہین نے ہنی کو کچھ پریشان دیکھا۔ حرا اور مریم اس دن نہیں آئی تھیں۔ وہ ان کے نسبت ماہین سے زیادہ قریب تھی۔

"کیا بات ہے، اتنی پریشان کیوں ہو، کیا احمد سے جھگڑا ہوا ہے۔" ماہین کی آواز میں تشویش کا عنصر غالب تھا۔

"نہیں احمد سے کوئی جھگڑا وگڑا نہیں ہوا۔" وہ جواب دینے کے بعد خاموشی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے کپ کو دیکھنے لگی۔

"پھر گھر میں کوئی مسئلہ ہوا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ یار بس جو مسئلے چلتے رہتے ہیں وہ ہی ہیں۔ مگر۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ شاید کسی الجھن کا شکار تھی۔

"مگر کیا۔" ماہین کی پریشانی میں اضافہ ہوا تھا۔ ہنی نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے ہاتھ میں پکڑا پیپر کپ رول کر کے سائیڈ پر پھینک دیا تھا۔

"میرے سر پر بہت ساری ذمہ داریاں ہیں ماہی اور میں نے یہ سب کچھ احمد کو نہیں بتایا، بس یہ ہی پریشانی ہے کہ اسے کس طرح کس منہ سے بتاؤں۔"

"کیا؟" ماہین چیخی۔

"یعنی ایک سال ہو گیا ہے تم لوگوں کے تعلق کو اور تم نے اب تک اپنی پریشانیوں کو احمد سے شیئر نہیں کیا۔ کیا تمہیں اس کی محبت پر اعتبار نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ اعتبار ہے مگر سمجھ نہیں آتا کہ کس طرح یہ سب اسے بتاؤں۔"

"بتانا تمہیں ہی ہے ہنی چاہے آج یا کل بہتر ہے کہ آج ہی بتا دو۔"

ماہین نے اسے سمجھایا تھا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

پھر اس نے سب کچھ بتا دیا۔ اپنے گھر کے حالات، تنگ دستی، لڑائی جھگڑے سب کچھ۔ وہ دونوں انہیں سیڑھیوں پر اتنے ہی فاصلہ بیٹھتے تھے۔ جتنا پہلے روز سے اب تک بیٹھتے آئے تھے۔ آج تک احمد نے اس کا ہاتھ تک نہ پکڑا تھا اور نہ اب اسے روتا دیکھ کر دلاسا دینے کے لیے۔ وہ بس بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"ہنی تم نے مجھ سے اتنا سب کچھ چھپایا۔ کیا ابھی تک تمہیں میری محبت پر یقین نہیں آیا یا میں اس قابل نہیں کہ تم اپنی پریشانی شیئر کرو۔"

"احمد یہ بات نہیں ہے۔ میں بس الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔ خود سب کچھ برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر جب بوجھ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو اٹھایا نہیں گیا۔ تمہیں تو بتانا ہی تھا۔"

"بہت بڑی پاگل ہو تم ہنی۔ بہت بڑی۔ اتنا عرصہ تم بوجھ اٹھاتی رہیں اتنا کچھ برداشت کرتی رہیں اور مجھے ہوا تک نہ لگنے دی۔" احمد کی آواز میں دکھ واضح تھا۔

"میرے لیے تمہاری محبت ہی کافی ہے۔ میرا سب کچھ تم ہی ہو۔ میری محبت، میرا مان، میرا بھروسہ، تمہاری محبت نے تو اتنا مضبوط کیا ہے مجھے ورنہ میں تو کب کی مر چکی ہوتی۔ بس مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ کچھ عرصہ چاہیے اپنے گھر والوں کو سپورٹ کرنے کے لیے میرا ساتھ دو گے نا۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ اس وعدہ لے رہی تھی۔ اور وہ ساتھ دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ وہ دونوں شاید یہ بات بھول گئے تھے کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔

☆ ☆ ☆

ٹوٹ کر ذرا دیکھو
تم اگر بکھر جاؤ
بے بسی میں گھر جاؤ
دل سے ایک صدا دینا
مجھ کو حوصلہ دینا
میں تمہیں سنبھال لوں گا
زندگی میں چلنے کا
راستہ بدلنے کا
اک ہنر سکھا دوں گا
تم کو حوصلہ دوں گا
اور جب
سنبھل جاؤ
مجھ کو یوں صدا دینا
تم مجھے بھلا دینا
تم مجھے بھلا دینا

وہ سردیوں کی ایک اداس شام میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی اداسی ایسی کہ اسے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ رات میں گھلتی اس

شام کی طرح ہنی کو لگا جیسے وہ بھی اس شام کی طرح رات کی تاریکی میں کہیں گم ہو جائے گی۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیسی بے بسی ہے کیسی بے چینی ہے جو اس کا گھیرا کیے ہوئے ہے۔ اس نے شال کے اندر سے سیل فون نکال کر دیکھا۔ خاموش ہی خاموشی تھی وہاں۔

تین دن سے اس کی احمد سے بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کا تھیسس مکمل ہو گیا تھا۔ اور وہ ملتان اپنے والدین سے ملنے گیا تھا ہنی کے لیے بات کرنے' اس نے ڈائل کال کا بٹن پریس کیا اور کوئی 26 ویں دفعہ احمد کے نمبر پر کال کی تھی پچیس ویں کال کی طرح اس بار بھی کال کاٹ دی گئی تھی۔ ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر کالی شال میں جذب ہو گیا تھا۔ اسی وقت ایس ایم ایس کی ٹون بجی تھی۔ اس نے جلدی سے کھول کر دیکھا تھا۔

"ہنی بہت بزی ہوں۔ واپس آکر بات کروں گا۔ تم بس دعا کرنا۔"

"یا اللہ میری محبت کی حفاظت کرنا۔" بے ساختہ اس کے دل سے دعا نکلی تھی نہ جانے کیوں؟ اس کی چھٹی حس اس کو خبردار کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

احمد کو گئے پانچ دن ہو گئے تھے اور چھٹے دن وہ اس کے سامنے تھا مگر۔ وہ احمد نہیں تھا جس کو وہ جانتی تھی۔ یہ تو کسی اجنبی کی نظریں تھیں جن سے وہ انجان تھی یہ تو وہ احمد نہیں تھا جس کی ہنسی اس کو اپنے زندہ ہونے کا احساس دلایا کرتی تھی۔ وہ بہت شکستہ بہت کمزور اور بہت ہارا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کا ہارا ہوا انداز ہانیہ کے وجود سے جان نکال رہا تھا۔

"سب کچھ ختم ہو گیا ہے ہنی۔" اس نے ایک بار بھی ہنی سے نظریں نہیں ملائی تھیں جبکہ وہ اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھا ہوا بات کرتا تھا۔

"سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ یہ کہو کہ صرف تمہارے اور میرے بیچ محبت کا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔"

اس کے بے حس و حرکت ہونٹوں سے نہ جانے کیسے یہ جملے ادا ہوئے تھے۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔

"میں نے اماں کو بہت منانے کی کوشش کی ہے مگر انہوں نے کہا کہ ہمارے خاندان میں شادیاں باہر نہیں ہوتیں۔ انہوں نے بغیر پوچھے میری منگنی طے کر دی ہے۔ میں مجبور ہوں ہنی بہت مجبور۔"

ہانیہ نے سر اٹھا کر بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس مرد کو دیکھا۔ جس کی مردانگی مجبور تھی۔ جس کو زعم تو تھا کہ اس جیسی محبت کوئی نہیں کرتا۔ مگر وہ مجبور تھا کہ وہ محبت کو اپنا نہیں سکتا۔

"تم نے مجھے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا احمد۔ میں تو کہیں کی نہیں رہی۔ تمہاری محبت تو میرے لیے سہارا تھی۔ میں کیا کروں گی۔" کیا بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ کیا درد کی شدت تھی۔

"میں کہاں جاؤں' میں کیا کہوں' کیا میں انسان نہیں ہوں۔ گھر والے ہیں تو وہ نہیں سمجھ رہے۔ یہاں تم نہیں سمجھ رہیں۔ ماں نے منگنی طے کر دی۔ انکار کروں گا تو وہ بھی "لڑکی" اس کی عزت کا سوال ہے میں کہاں جاؤں سمجھ نہیں آتا۔" اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔

ہانیہ کو لگا اس نے سننے میں غلطی کی ہے۔ "اس لڑکی کی بے عزتی۔"

"اس لڑکی کی عزت اور یہاں محبت کچھ نہیں۔"

ہانیہ کو سمجھ نہ آیا کہ روئے یا ہنسے۔ اس نے محبت کو سمجھنے میں غلطی کی تھی یا انسان کو۔

"یا تو گھر والوں کو چھوڑنا پڑے گا یا تمہیں۔" احمد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا ہانیہ نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ احمد اپنے گھر والوں کو کبھی نہیں، چھوڑ سکتا۔ اگر چاہے تب بھی نہیں۔

وہ خود بھی نہیں چاہتی کہ گھر والوں کو چھوڑ دے۔

اسے صرف احمد کی بیوی نہیں اس کے خاندان کی عزت بننا تھا مگر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگا کرتا۔

"تم مجھ سے بات کیا کرو گے۔" نہ جانے کیسے

بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ شاید اپنی محبت کے گرتے ہوئے محل کو بچانے کی آخری کوشش تھی۔

"گھر میں بیوی بیٹھی ہو اور میں ایک غیر لڑکی سے بات کروں۔"

احمد نے جیسے اس کی عزت نفس کو کچلا تھا۔

ہانیہ تڑپ کر رہ گئی۔ اسے اپنا وجود ایک جونک کی مانند لگا جس پر احمد اپنے جملوں کا نمک چھڑک رہا تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔

"غیر اتنی...... اتنی آسانی سے غیر بنا دیا تم نے۔" تکلیف کی شدت اسے بات مکمل نہیں کرنے دے رہی تھی۔

"تم میری اپنی کب تھیں۔" چھڑکاؤ ایک دفعہ پھر ہوا۔ وہ پھر تڑپی احمد نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ ہنی نے پہلی مرتبہ اس کے درد کو محسوس کیا تھا۔ سرخ آنکھیں جن میں درد' ملال' تاسف' پچھتاوا نہ جانے کیا کچھ تھا۔ وہ کچھ بولتے بولتے رک گئی۔ اس کی آنکھیں اس کے درد کو بیان کر رہی تھیں۔

"چلے جاؤ احمد۔ چلے جاؤ۔" اس نے ہمیشہ احمد کو جیتتے دیکھا تھا۔ ہر میدان میں۔ پھر وہ کیسے زندگی کے میدان میں اسے ہارتا دیکھ سکتی تھی۔ اسے اپنی موت عزیز تھی مگر اسے ہارا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ گھٹنوں کے اوپر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

پھر وہ واقعی چلا گیا تھا۔ بہت دور اتنا دور کہ اس تک ہنی کی آواز نہیں پہنچی تھی۔

"وہ کہتا تھا ہنی تم میری جان ہو۔" ٹھیک کہتا تھا جاتے جاتے ہنی کی جان ساتھ ہی لے گیا۔ اب اس نے اپنے بے جان وجود کو سنبھالنے کے لیے کوشش کرنی تھی کیونکہ اس سے وابستہ لوگوں کو اس کی ضرورت تھی۔ حنا' مریم' کلاس کی سرگرمیاں' گھر کے لیے گرم جوشی وہ ہر چیز سے کٹ گئی تھی۔ ایک بے حسی سی اس کے پورے وجود پر طاری رہتی تھی۔ لوگوں کی طنز بھری نظریں بھلا اس کو نہیں چبھتی تھیں۔ ماں باپ کی لڑائیاں بھی اب تکلیف نہیں دیتی تھیں۔

وہ جیسے ان سب میں تھی ہی نہیں۔ وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ بزی رکھنے کی کوشش کرتی اور اس میں سب سے بڑا ہاتھ ماہین کا تھا جو اس کے لیے بہت کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح وہ اس چیز سے نکل آئے مگر محبت کے کنویں میں گرنے کے بعد کوئی واپس نہیں نکل پاتا۔ ایم بی اے کرنے کے بعد اسے کافی کوششوں سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی تھی۔ ایک سال بعد ہی اس کا ٹرانسفر لاہور کر دیا گیا تھا' جہاں چند مہینوں بعد ہی اسے ایک کنزیومر انڈسٹری کی کمپنی میں برانڈ منیجر جیسی سیٹ آفر ہوئی اور وہی کمپنی اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے کمس کے سارے اخراجات اٹھا رہی تھی۔ وہ ایچ آر منیجر کی پوسٹ پر کام کر رہی تھی۔ ان سالوں میں اس کے گھر والوں کے حالات بھی بہت بدل گئے تھے۔

وہ انسان سے ایک مشین بن گئی تھی۔ جسے بس کام کام اور کام کرنا تھا۔ جاب کے ساتھ ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی میں مختلف سبجیکٹ پڑھاتی رہی تھی۔ اسے جاب کرتے چار سال ہو گئے تھے۔ اسے پروموشن ملنے ہی والی تھی کہ کمپنی میں اس کے خلاف کوئی سازش ہو گئی تھی۔ جس کی سبب سے اسے جاب سے نکال دیا گیا۔ مگر فوراً ہی اسے ملتان سے بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی میں نہایت مناسب یہ جاب آفر ہوئی اس نے قبول کر لیا۔ اس کی رہائش اور ہر طرح کا خرچہ یونیورسٹی ہی اٹھا رہی تھی مگر اتنے عرصے میں کوئی دن ایسا نہ تھا جب احمد اسے یاد نہ آیا ہو۔

کوئی زخم تھا جسے دوبارہ نوچا گیا تھا۔ کوئی درد تھا جو پھر سے اٹھا تھا۔ رابیل اس کی زندگی کی کہانی سن کر خاموشی سے وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ اس کا لیپ ٹاپ ویسے ہی کھلا تھا۔ لیپ ٹاپ میں موجود نیوی بلیو ٹی شرٹ پہنے ٹراوزر کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے ویسے ہی کھڑا ہانیہ کو دیکھ کر مسکراتا رہا اور اس کے سامنے گھٹنوں پر سر رکھے وہ روتی رہی۔

دوسرے دن ہنی کو ٹی۔ سی۔ ایس کے ذریعے ایک سوری کا کارڈ اور سفید پھولوں کا بکے موصول ہوا۔ وہ حیران ہوئی کہ یہاں کون جانتا ہے کہ اسے سفید للی بہت پسند ہیں۔

اس نے کارڈ کھول کر دیکھا تو اندر رابیل لکھا تھا۔

"رابیل نے کس بات کا سوری کیا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔ پھر ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اسے سمجھ آگئی کہ اس نے کس بات کی معافی مانگی تھی۔ اس کے ہاتھ اب رابیل کا نمبر ڈائل کر رہے تھے۔

"رابیل یہ سب تم نے کیوں بھیجا ہے؟" دعا سلام کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"کل انجانے میں مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ مجھے آپ کا تصویروں والا فولڈر نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ یہ آپ کا ظرف ہے کہ آپ نے مائنڈ نہیں کیا اور مجھ سے اتنا کچھ شیئر کیا۔ مگر میں بہت شرمندہ ہوں۔" وہ کتنی زیادہ شرمندہ تھی ہانیہ کو اس کی آواز سے ہی اندازہ ہو رہا تھا۔

"آج آؤ میری طرف شام کی چائے ساتھ پیتے ہیں۔"

ہانیہ نے جیسے بات ختم کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے اپنے ساتھ بہت ظلم کیا۔ کوئی شکوہ کوئی گلہ نہیں کیا اس سے۔ اتنی آسانی سے جانے دیا۔" اس نے چائے کپ میں انڈیلتی ہنی سے سوال کیا تھا وہ دونوں اس وقت پچھلے لان میں بیٹھی تھیں۔

"وہ مجبور تھا۔ تکلیف میں تھا۔ اور میں گلے شکوے کر کے اسے اور زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔"

رابیل نے کپ پکڑتے ہوئے بغور اسے دیکھا تھا۔ کالی قمیص، سفید شلوار اور کالی ہی شال بالوں کو ڈھیلے سے انداز میں باندھے آج بھی اس کے چہرے پر ویسا ہی سوز، ویسی ہی اداسی تھی۔ جو رابیل کو اس کی طرف کھینچتی تھی۔

آج رابیل کو اس کی آنکھیں سرخ اور کافی سوجی لگی تھیں۔

"شاید وہ ساری رات روتی رہی تھی۔" رابیل کے ملال میں اضافہ ہوا تھا۔

وہ اس کے مقابل لان چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

"لیکن کوئی تو شکوہ کرنا چاہیے تھا آپ کو۔ آخر اس نے محبت کی تھی کچھ تو حق بنتا تھا اس پر۔"

"غلطی اس کی نہیں تھی رابیل غلطی میری تھی جو میں نے اپنی اوقات یاد رکھے بغیر خواب بننا شروع کر دیئے تھے اپنے آپ کو آسمان پر بٹھا کر تانا بانا بننا شروع کر دیا تھا۔"

رابیل اس کو خاموشی سے سنتی رہی تھی۔

"وہ آسمان کا چاند تھا اور میں زمین کی خاک، چاند کی روشنی زمین پر پڑ کر اس خاک کو منور تو کر سکتی ہے۔ مگر وہ خاک اڑتی اڑتی آسمان پر نہیں پہنچ سکتی۔ اس کی محبت نے میرے وجود کو منور تو کیا تھا مگر میں شاید اس کی محبت کی اونچائی پر بیٹھنے کے قابل نہیں تھی۔"

آنکھوں میں نمی لیے دھواں اڑاتے کافی کے مگ کو ہاتھ میں پکڑے وہ کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔

رابیل کو وہ کسی خوبصورت پینٹنگ کی طرح لگی تھی۔ بالکل ایک جگہ منجمد، کسی درد کو آنکھوں میں لیے۔ رابیل نے اپنے آپ کو وہاں سے اٹھتے ہوئے پایا وہ ہنی کے بالکل مقابل نیچے گھاس پر پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں سے مگ کو الگ کرتے ہوئے اس نے ہنی کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں آپی! اور آج کے بعد آپ خود کو کبھی تنہا مت سمجھنا میں ہوں آپ کے ساتھ ہمیشہ۔"

وہ روتے روتے اس کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا رہی تھی۔ ہنی دم بخود رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ عبیرہ کی شادی کے لیے کراچی گئی ہوئی تھی۔

مایوں، مہندی، بارات، ولیمہ کسی فنکشن میں ماہین اپنی امی کی بیماری کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکی تھی۔ اسی لیے وہ اس سے ملنے کے یو چلی آئی وہ کے یو میں لیکچرار تھی۔ اپنے ڈپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اسے بہت سی یادوں، بہت سی آوازوں اور منظروں نے جکڑ لیا تھا۔ وہ ان کی گرفت سے خود کو نکال نہیں پائی تھی۔

"ایک ایسی کیفیت کا نام جس میں انسان کسی چیز کو دیکھتے ہی اس چیز سے ریلٹ کرتی کوئی پرانی باتوں کو یاد کرنے لگے۔"

چلتے چلتے وہ ان سیڑھیوں تک آئی تھی جہاں وہ دونوں بیٹھا کرتے تھے۔ وہ خاموشی سے جا کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔ چھن سے کوئی اس سے کچھ فاصلے پر بائیں طرف آکر بیٹھ گیا تھا۔

"پتا ہے ہنی ہم شادی کے بعد گھومنے کہاں جائیں گے۔"

"کہاں؟"

"اسپین، مجھے اسپین بہت پسند ہے بے حد اداس مگر بے حد خوبصورت مجھے بہت عجیب طرح سے اٹریکٹ کرتا ہے۔"

"نہیں ہم اسپین نہیں جائیں گے ہم ایسٹ افریقہ جائیں گے۔"

"ایسٹ افریقہ۔" وہ چیخا تھا۔

"یہ بھی کوئی جانے کی جگہ ہے لگتا ہے تمہیں جانور بہت پسند ہیں ہاں خود بھی تو ایک بندریا لگتی ہو۔" اس نے اسے چھیڑا تھا۔

"کیا تم نے مجھے بندریا کہا۔ جاؤ میں نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ۔"

ہنی نے منہ پھلایا تھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

"اچھا مذاق کر رہا تھا۔ بتاؤ کیوں جانا ہے وہاں۔"

جواب میں اس نے بیگ سے ایک میگزین نکال کر اسے دکھایا تھا اس میں ایک شہر میں hut نما چھوٹا سا ہوٹل تھا "اس لیے" اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھی۔

"اس میں کیا خاص بات ہے۔" احمد وہ چھوٹی سی تصویر بہت غور سے دیکھنے لگا۔

درخت کی شاخوں کو جوڑ کر چیزیں بنائی گئی تھیں۔ ان میں finishing بالکل نہیں تھی۔ مگر وہ دیکھنے میں بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

"دیکھو نا کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔"

"ہنی کتنی عجیب ہو تم صرف اتنی سی چیز سے اٹریکٹ ہو کر وہاں جانا چاہتی ہو۔"

"میں چیزوں کو صرف خوبصورتی پر جج نہیں کرتی۔ جو چیز مجھے پہلی نظر میں اٹریکٹ کرتی ہے اس کے بارے میں فیصلہ کرتی ہوں۔ چاہے وہ کوئی چیز بھی ہو۔" اس نے بتایا۔

"اور میں نے کون سی نظر میں اٹریکٹ کیا تھا جناب کو۔" اس نے احمد کی نظروں میں شرارت ابھرتے دیکھی تھی اس لیے فوراً" وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

ہنی نے کسی درد سے بوجھل ہوئی آنکھوں سے "اس" خالی جگہ کو دیکھا تھا اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

اسے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی تھی۔

"اوہ محترمہ ہیر صاحبہ اگر آپ کو اپنے ہجر میں آہیں بھرنے سے فرصت مل گئی ہو تو ہم پر بھی ایک نظر کرم فرمائیے۔"

ہانیہ مسکراتے ہوئے پیچھے مڑی تھی۔ وہ دونوں فوراً" ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں اتنی دیر تک جب تک دونوں نے ایک دوسرے کے کندھے سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف نہیں کر لیے تھے۔

ماہین اسے لے کر اپنے روم میں آئی تھی۔

ایک صوفے پر بیٹھ کر اس نے پورے روم کا جائزہ لیا تھا۔ ایک جہازی سائز ٹیبل اس کے پیچھے آرام دہ کرسی، سائیڈ پر رکھا لیپ ٹاپ ایک ٹھنڈے اور گرم پانی کا ڈسپنسر اور سامنے رکھے دو صوفے۔

"چائے تو پیو گی۔" اس نے ہانیہ سے پوچھا تھا۔

"ہاں یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔" اس نے شرارتی انداز سے ماہین کو دیکھا تھا۔

"تو جاؤ شاباش میرے سب سے اوپر والی دراز میں

چائے کا سامان رکھا ہے۔ سامنے سے گرم پانی مل جائے گا خود بھی بناؤ مجھے بھی پلاؤ۔"

ہنی نے اسے گھور کر دیکھا جو بڑے مزے سے دونوں پاؤں صوفے کے اوپر رکھ کر نیم دراز تھی۔

"میں مہمان ہوں یا تم میری۔" ہنی نے دراز کھول کر اس میں سے چپس نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"یار اتنے عرصے سے تمہارے ہاتھ کی چائے نہیں پی۔ آج پلا دو نا۔ میری جان نہیں ہو تم۔" اس کے عاشقانہ انداز پر ہنی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ماہین نے غور سے اسے دیکھا جو چائے کے مگ کے اندر ٹی بیگ رکھ کر اس میں اور چینی ڈال رہی تھی۔

"لو پکڑو۔" ہنی چائے کا مگ اس کو تھماتے ہوئے خود اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"ملتان میں کہیں نظر آیا وہ۔" تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ماہین نے اچانک اس سے پوچھا تھا۔ ہنی کپ ہونٹوں تک لے جاتے لے جاتے رک گئی تھی۔

"اگر مل بھی گیا تو کیا' میں نہیں چاہتی کہ کبھی اس سے سامنا ہو۔" نامحسوس طریقے سے اس نے کپ منہ سے لگایا تھا۔ جواب ماہین کے توقع کے عین مطابق تھا۔

"آنٹی تمہارے لیے بہت پریشان رہتی ہیں۔"

ہنی اس کا مطلب سمجھ گئی مگر خاموش ---- رہی تھی۔

"ہر بات میں تمہارا جواب خاموشی ہوتی ہے آخر تم کیوں نہیں کسی رشتے کے لیے ہاں کر دیتیں۔ بھول جاؤ سب کچھ پلیز۔" اب کی بار اس کی آواز میں اور انداز دونوں میں جھنجلاہٹ واضح تھی۔

"کیا بھولنا اتنا ہی آسان ہے۔" بہت مدھم سے اس نے ہنی کے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوتے سنے تھے۔ ایک پل کے لیے وہ چپ ہو گئی تھی۔

"دل اور روح کسی اور کو دے کر اب جسم کسی اور کو سونپ دوں' کیسے ہو گی یہ منافقت مجھ سے۔" وہ ماہین کو سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ جبکہ ماہین کو یہ فکر تھی کہ آنٹی سے کیا ہوا وعدہ پورا کیسے کرے۔ جو پرسوں اسے فون پر کہہ رہی تھیں۔

"میں چاہتی ہوں کہ ماہین کی منگنی کر کے ہی بھیجوں اب۔ اتنا عرصہ اس نے خود کو ہماری وجہ سے خوار کیا ہے مگر میں اب اور نہیں چاہتی معین ماشاء اللہ اس قابل ہو گیا ہے کہ ذمہ داریاں اٹھائے میں چاہتی ہوں کہ جیسے ہی معین کا ایم بی اے مکمل ہو میں ہانیہ کی شادی کر دوں۔ مگر یہ مان کر ہی نہیں دے رہی۔

تم سمجھاؤ اسے۔ تمہاری بات تو مانتی ہے نا۔" آنٹی فون پر رو پڑیں ---- ماہین سمجھ رہی تھی۔ وہ ہنی کو منانے کی مگر اب اسے اپنی ساری محنت ضائع ہوتے نظر آ رہی تھی وہ آج بھی وہیں کھڑی تھی۔ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔

"ہنی دیکھو تم نے اپنے گھر والوں کے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔ اب ایک احسان اور کر دو۔ شادی کے لیے ہاں کر دو۔"

ماہین کی بات پر جیسے اس کو جھٹکا لگا تھا۔

"احسان کیسا یہ سب میرا فرض تھا۔ ذمہ داری تھی وہ میری۔"

"تو اب اپنے ماں باپ کی خواہش کا احترام کرو۔ یہ بھی تمہارا فرض ہے۔ بھول جاؤ احمد کو۔"

"کوئی اپنی مرضی سے نہیں مرتا۔" بے ساختہ جواب ماہین کو ملا تھا۔

"احمد کو بھولنا ایسے ہی ہے جیسے مرنا' جیتے جی وہ میری زندگی سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ ہاں مر جاؤں تو اور بات ہے۔"

"تو پھر مر جاؤ۔" ماہین جیسے چیخ پڑی تھی۔

ہنی ششدر رہ گئی تھی۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس کی جگہ تاسف اور گہرے دکھ نے لے لی۔ ماہین نے اس کی آنکھوں میں جاگتے دکھ اور تاسف سے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔

وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ ماہین اس کے پیچھے اسے روکنے آئی۔ مگر وہ

بری طرح اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

ماہین اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی مگر اس وقت اس کا بلاوا انچارج کی جانب سے آ گیا تھا۔ وہ وہاں چل دی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ جس خاموشی کے ساتھ گئی تھی۔ اس سے زیادہ خاموشی کے ساتھ ملتان واپس آ گئی۔ اور کسی نے اس کی خاموشی کو نوٹ نہیں کیا تھا مگر رابیل اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔

"ہنی آپی وہاں کیا مسئلہ ہوا ہے۔" وہ اس سے ملنے ہاسٹل آئی تھی۔

"نہیں۔ کیا مسئلہ ہو سکتا ہے تم خود سوچو۔"

وہ بظاہر تو مسکرائی تھی۔ مگر اس کی مسکراہٹ رابیل کو مصنوعی لگی تھی۔

"نہیں مسئلہ ہے۔ پلیز بتائیں۔" وہ جیسے گڑگڑائی تھی۔ ہانیہ نے لیپ ٹاپ چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"جب سفر لمبا ہو جائے اور قدم تھکنے لگیں اور منزل کا نام و نشان آپ کے سامنے نہ ہو تو انسان ایسا ہی ہو جاتا ہے۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا تھا۔ رابیل کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ بول پڑی۔

"امی میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔"

"آپ کی شادی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ کو اپنی امی کی بات مان لینی چاہیے۔" رابیل بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"مگر کیوں کروں۔ کیا میری سزا ختم ہو گئی۔"

"آپ کی سزا خود ساختہ ہے ہنی آپی۔ آپ نے خود کو اذیت میں ڈالا ہوا ہے احمد کی وجہ سے شادی نہ کرنا بے حد غلط بات ہے۔"

"میں ابھی گھر والوں کو نہیں چھوڑنا چاہتی جب تک معین کوئی بہت اچھی جاب نہ کرنے لگے۔ اور جہاں تک احمد کی بات ہے تو مجھ میں منافقت نہیں ہے۔ اگر اپنے ساتھ غلط کر رہی ہوں تو کیا دوسرے کو بھی اس میں شامل کر لوں۔ جب میں کسی دوسرے کو محبت نہیں دے سکتی تو دھوکا بھی کیوں دوں۔"

ہانیہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اب تم کافی بنا کر پلاؤ ساتھ میں وہ کوکیز بھی رکھ دینا جو میں کل لائی تھی۔" اس نے رابیل کا گال تھپتھپا کر کہا اور ساتھ ہی کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

رابیل جز بز ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"اس کے بجائے اگر آپ یہ کہیں۔ کہ بکواس بند کرو تو زیادہ بہتر رہے گا کہ آپ کا انداز تو ویسا ہی ہے۔"

وہ تپے ہوئے انداز میں ٹیبل سے اترتے ہوئے بولی۔

جواب میں ہانیہ ہنستے ہوئے اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

ہانیہ جیسے تھم سی گئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بے تحاشا اضطراب پوشیدہ تھا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اسے پانچ سال پیچھے دھکیلا ہو۔

وہ احمد کو دیکھ کر ملی جلی کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔ جب اس کی نظر اس کی انگلی تھامے چار سال کی بچی پر پڑی اسے یک دم ہوش آ گیا۔ اس کے چونکنے کو محسوس کر کے وہ بھی جیسے ہوش میں آ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری تھی۔ جبکہ ہانیہ کی آنکھوں میں رت جگوں کا عذاب واضح تھا۔ نارسائی کی جس آگ میں وہ پچھلے پانچ سال سے جل رہی تھی۔ وہ آگ جیسے بھڑک اٹھی تھی۔

وہ چلتا ہوا اس کے بالکل قریب آیا تھا۔ اتنا کہ ان کے بیچ صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

"کیسی ہو ہنی۔" اس کا لہجہ آج بھی ویسا ہی کچھ کہتا ہوا تھا۔ یا ہانیہ کو لگا تھا ہنی نے بغور اسے دیکھا تھا۔

کالے لائٹ کرلی ہیئرز' ہاف وائٹ شرٹ' ڈارک براؤن ڈریس پینٹ اور آنکھوں میں ویسی ہی چمک۔

کسی نے چپکے سے اس کے کانوں میں کچھ کہا تھا۔

"ہانیہ تمہیں پتا ہے یہ جو سرائیکی سرزمین کے لوگ ہوتے ہیں ان کی آنکھوں میں کالی ڈوریاں ہوتی ہیں جیسے کسی نے کاجل کی لکیریں آنکھوں میں بھری ہوں۔ احمد کی آنکھیں بھی ویسی ہی ہیں۔"

ماہین نے اس سے کہا تھا۔ تب وہ کتنا ہنسی تھی۔ پھر نجانے کتنی بار ان کالی ڈوریوں نے ساری ساری رات رلایا تھا۔ اور آج بھی اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟"

"میں الحمدللہ ٹھیک ہوں۔ تم یہاں ملتان میں کیسے؟"

"میں یہیں جاب کرتی ہوں۔ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی میں۔"

اس نے مختصراً بتایا تھا۔

"پاپا۔ آئس کریم کھانی ہے چلیں۔" وہ دونوں بچی کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔

"یہ میری بیٹی ہے۔" اس نے کہا اور جھک کر اس بچی کو گود میں اٹھالیا۔

ہنی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوما تھا۔

"چلو کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ کسی روبوٹ کی مانند اس کے پیچھے چلنے لگی تھی۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی مگر کر نہ سکی۔

وہ اسے لے کر شاپنگ مال کی فوڈ کورٹ کی طرف آیا تھا۔ ہنی اور اپنے لیے چاکلیٹ فلیور اور اپنی بیٹی کے لیے اسٹرابری فلیور لے کر وہ ٹیبل پر آبیٹھا تھا۔

ہانیہ نے بے حد حیران ہو کر ٹرے میں موجود میں کپ کو دیکھا۔ جو اس نے اپنے اور اس کے سامنے رکھے تھے۔

"کیا اس کو ابھی تک یاد ہے کہ میں چاکلیٹ فلیور بہت شوق سے کھاتی ہوں۔" اس نے کپ کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

"پاپا میں جھولوں میں جاؤں۔" اس نے آئس کریم کا اسپون منہ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ جس کی وجہ سے آدھی آئس کریم منہ اور آدھی اس کی فراک پر گری تھی۔

"اونو۔" اس نے منہ بنایا تھا۔

ہانیہ نے جلدی سے ٹرے میں پڑے ٹشو اٹھا کر آئس کریم صاف کی تھی۔

احمد بہت غور سے اس کے اس سارے عمل کو دیکھ رہا تھا۔

"علیزے بیٹا یہاں آرام سے بیٹھ کر کھاؤ اور پھر چلی جانا۔"

"اور سناؤ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟" اس نے ہنی سے پوچھا تھا۔

"گزر کیا رہی ہے۔ بس ایک جگہ ٹھہر ہی گئی ہے یہ زندگی۔"

اس کے دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔

"بس کچھ خاص نہیں جاب میں گزر رہی ہے۔" دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"تم سناؤ تمہاری بیوی کیسی ہے۔ بابا۔ ماما کیسے ہیں اور اس کے علاوہ کتنے بچے ہیں تمہارے۔"

"بابا۔ ماما ٹھیک ہیں۔ وہیں گاؤں میں۔ ایک ہی بیٹی ہے میری علیزے تم نے شادی کرلی۔" بیوی کا ذکر اس نے گول کردیا تھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس سوچا نہیں۔ اس بارے میں تم نے بتایا نہیں تمہاری بیوی کیسی ہے۔" اس کی بات پر احمد کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

"سنبل کو مرے تین سال ہو چکے ہیں۔" اس نے آئس کریم کا مگ پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔

وہ ششدر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سنبل کو مرے تین سال ہو چکے ہیں۔ دوسرے بچے کی پیدائش پر کچھ پیچیدگیاں ہو گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے بچہ اور ماں دونوں نہ بچ سکے تھے۔"

احمد کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور آنسو تواتر اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

"یا اللہ میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا کہ اس کا گھر اجڑ جائے۔"

"تمہارا بھی تو دل اجڑا تھا۔" کوئی اس کے اندر سے بولا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

کوئی شور تھا جو اچانک اس کے اندر برپا ہو گیا تھا۔ وہ گیلری کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

دسمبر کی آخری دنوں کی سرد ترین رات تھی۔ اور وہ کسی شال، سوئیٹر حتی کہ ڈوپٹے سے بھی بے نیاز تھی۔ ننگے پیروں سے ٹھنڈے فرش کی ٹھنڈک اس کے پیروں میں گھس رہی تھی مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز تھی۔ جب پورے وجود میں ہی آگ لگی ہو اور آگ اندر باہر ہر جگہ ہو تو باہر کی سردی کیا بگاڑ سکتی تھی۔ اس کے دل کو قرار نہیں آرہا تھا نہ جانے کتنے عرصے بعد پھر ایسی رات اس کی زندگی میں آئی تھی۔

اس نے دھیمے سے لہجے میں معذرت کی۔

مجھ سے بولا سنو
میرے لیے یہ ممکن نہیں
کہ تمہیں اب دلاسوں میں رکھوں
اب تعلق توڑنے میں ہی بہتری ہے
مجھے بھول جاؤ
ہو سکے تو معاف کردینا
برے الفاظ میں یاد رکھنا نہیں
دل یہ سن کر بہت رو دیا تھا
اس قدر کہ اب تک سنبھل نہ سکا
تم بڑے سفاک ٹھہرے
سنو!
میں تمہیں معاف کیسے کروں گی
یہ الگ داستان ہے
مگر رات کے آخری پہر میں روز
پلکیں بھگوتی ہوں
سر سجدے میں رکھ کر اسے
ایک ہی بددعا دیتی ہوں
خدایا اسے اتنی خوشیاں دینا
کہ اس کا دامن تنگ پڑ جائے

اس نے بھی تو اس کی خوشیوں کی دعا کی تھی۔ پھر یہ دکھ اس کی زندگی میں کیسے آگیا۔

"ہنی مجھے لگا کہ تمہاری آہ لگ گئی ہو مجھے۔ مگر تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں جان بوجھ کر نہیں چھوڑا تھا۔"

اس کے لہجے میں گھلی اداسی وہ اب تک محسوس کررہی تھی۔

"یا اللہ۔" اس کے لب پھڑپھڑائے تھے۔

پھر یک دم جیسے اسے سکون مل گیا ہو۔

چند لمحوں کے بعد اس نے خود کو جائے نماز کے اوپر پایا وضو کا پانی اس کے چہرے سے ٹپک ٹپک کر جائے نماز میں جذب ہو رہا تھا۔ نفل پڑھ کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تھے۔ اسے دعا میں کیا مانگنا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اس وقت جائے نماز پر کیوں تھی وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی مگر وہ یہ جانتی تھی کہ یہی وہ راستہ تھا جس پر چل کر وہ سکون کی دولت حاصل کرسکتی تھی۔

دعا مانگتے وقت ایک لفظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہوا تھا۔ مگر کبھی کبھی ایک آنسو بھی تو حرف دعا بن جاتا ہے۔ مانگنے والا یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا مانگ رہا ہے۔ کیوں مانگ رہا ہے مگر جس سے مانگ رہا ہوتا ہے۔ وہ ضرور باخبر ہوتا ہے۔

تہجد ادا کر کے وہ سورہ یاسین پڑھنے لگی۔

"اس کی شان یہ ہے کہ جو وہ کسی چیز کا ارادہ کرلیتا ہے تو اسے فرماتا ہے کہ ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

صبح یونیورسٹی میں اس کا چہرہ متورم دیکھ کر سب نے ہی پوچھا کہ کیا ہوا ہے وہ سب سے کہتی رہی کہ طبیعت خراب ہے اور آخر میں تنگ آکر رابیل پر بگڑ گئی۔

"طبیعت خراب ہے۔ کیا اب طبیعت بھی خراب

نہیں ہو سکتی۔" رابیل بے حد حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی جو کچھ غیر معمولی ہونے کا چغلی کھا رہا تھا۔

"میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی ہنی آپی آپ ہاسٹل واپس چلی جائیں۔"

"چلی جاؤں گی کلاس لے کر۔" دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے آرام دہ کرسی سے ٹیک لگالی تھی۔

"میں آپ کے لیے چائے بھجواتی ہوں۔" رابیل باہر نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی ہنی کے سیل پر ایس ایم ایس کی ٹون بجی تھی۔

"ہنی! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، بہت اہم بات کرنی ہے۔"

چند الفاظوں پر مشتمل اس کا ایس ایم ایس کو پڑھ کر ہنی کی پریشانی کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے کوئی ریپلائی دینے کے بجائے سیل فون سائیڈ پر رکھ دیا تھا اور اسٹوڈنٹ کی جمع کرائی گئی رپورٹ دیکھنے لگی تھی۔

اچانک روم میں اس کے موبائل کی آواز گونجی اس نے اٹھا کر دیکھا تو احمد کا ہی فون تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے وہ اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے احمد کو یہ بتایا تھا کہ وہ آج بھی پانچ سال پرانا نمبر استعمال کرتی ہے۔ اچانک اس نے کال کاٹ کر موبائل آف کرکے دراز میں رکھ دیا۔ مگر اب وہ کام کی طرف بھی توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔

"اب۔ اب کیوں آئے ہو احمد۔ ابھی تو میں نے گر کر دوبارہ اٹھنا سیکھا تھا۔ ابھی تو اپنی محبت کی لاش کو دفنایا تھا۔ پھر سے تم کیوں آگئے قبر کو کھودنے کے لیے۔"

وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے رپورٹ کو دیکھتے سوچ رہی تھی۔ اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہاسٹل میں آگئی تھی۔ دو دن ہاسٹل میں پڑی رہی سیل فون آف کرکے۔۔۔۔

✡ ✡ ✡

"آپ دو دن سے کہاں تھیں۔ جانتی ہیں میں کتنا پریشان تھی میں ہاسٹل بھی گئی پتا چلا کہ آپ کسی دوست کے ہاں گئی ہوئی ہیں سیل بھی آف تھا آپ کا کہاں تھیں آپ۔"

رابیل نے دو دن بعد اسے دیکھتے ہی چھوٹتے کے ساتھ کہا تھا۔ اس کی آواز سے پریشانی صاف ظاہر تھی۔ ہانیہ کو افسوس ہونے لگا کہ وہ نہ جانے کیسے اس پرخلوص لڑکی کا دل توڑتی رہی تھی۔

"میں ہاسٹل میں ہی تھی۔ بس کسی سے ملنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ طبیعت سیٹ نہیں تھی۔ اس لیے چوکیدار کو منع کردیا تھا۔" رابیل کی طرف دیکھے بغیر ہی اپنے بیگ سے چیزیں نکالتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں آپ کا یہ انداز کس وجہ سے ہے۔ آپ کیوں کترا رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔" رابیل کی سرد آواز نے اسے سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ ٹیبل کی دوسری طرف سینے پر ہاتھ باندھے جانچتی نظروں کے ساتھ اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کیا جانتی ہو تم؟"

"وہ آیا تھا یہاں۔"

ہنی فوراً" بول نہ سکی کہ "کون آیا تھا یہاں۔"

مگر رابیل نے اس کی نظروں میں موجود سوال کو پڑھ لیا تھا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گئی تھی۔

"پرسوں آپ سے ملنے یہاں کوئی احمد نام کا لڑکا آیا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے آف ٹائم میں آیا تھا۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ میں دیر سے گھر جا رہی تھی۔ گیٹ کیپر سے آپ کے بارے میں بات کرتے وہ مجھے نظر آیا تھا۔

اس نے صرف اتنا بتایا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے اس لیے آپ یونیورسٹی نہیں آرہیں۔"

"تو وہ یہاں بھی پہنچ گیا۔" ہنی بڑبڑائی تھی۔

"آپ کی احمد سے ملاقات کیسے ہوئی اور اب وہ آپ کو تنگ کیوں کررہا ہے؟" اس نے مختصراً" اپنی اور احمد کی اس دن والی ملاقات کا بتایا۔

"میں اس کا فون ریسیو نہیں کررہی تھی اور پھر سیل بھی آف ہو گیا تھا۔ اس لیے شاید پریشان ہو کر آیا

ہے۔"

اس نے بیگ سے فون نکال کر آن کیا تھا۔

چند منٹ بعد ایک کے بعد ایک اسے ایس ایم ایس کا ڈھیر موصول ہوا تھا۔ جس میں سے آدھے سے زیادہ احمد کے ہی تھے۔

"یہ چاہ کیا رہا ہے؟"

"آج پوچھوں گی اس سے چلو ابھی کلاس لینی ہے مجھے۔"

وہ وہاں سے اٹھتے ہوئے بولی تھی مگر اس کا ذہن مسلسل احمد کی طرف تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ احمد کا نمبر کب سے ٹرائی کررہی تھی مگر وہ مسلسل آف جا رہا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"نہ جانے احمد کا نمبر کیوں آف جا رہا ہے۔ سب خیریت ہو اللہ۔" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی تھی۔

احمد کے لیے اس کی فکر، محبت سب کچھ ویسا ہی تھا یہ ابھی اسے وہاں بیٹھے بیٹھے اندازہ ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی کرلیتی مگر احمد کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔

اس کو اچانک یاد آیا کہ اس کے پاس احمد کے گھر کا ایڈریس اور لینڈ لائن نمبر بھی ہے۔

اس نے اپنا بیگ کھول کر اس کی اندر کی جیب سے پانچ سال سے بند پڑا وہ کاغذ نکالا تھا۔ اس کے بیگ تبدیل ہوتے رہتے تھے مگر ہمیشہ یہ کاغذ ایک سے دوسرے بیگ میں منتقل ہوتا رہتا مگر آج تک کبھی بیگ سے باہر نکال کر پھینکنے کی ہمت نہیں کرسکی تھی۔ ایک بار احمد نے اسے اپنا گھر کا ایڈریس اور نمبر لکھوایا تھا۔

"جانے یہی ایڈریس اور فون نمبر ہے یا تبدیل ہو گیا ہے۔" سوچتے ہوئے اس نے نمبر ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔" بیل کے بعد وہاں سے کوئی بولا تھا۔

"جی یہ احمد صاحب کا گھر ہے۔" اس نے پوچھا تھا۔

"جی یہ انہی کا گھر ہے۔ مگر وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔" وہ لڑکی شاید ملازمہ تھی۔

"دراصل میں کافی دیر سے ان کا موبائل ٹرائی کررہی ہوں وہ مل نہیں رہا۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کب تک آئیں گے۔"

"وہ جی علیزے بی بی آج جھولے سے گر گئی تھیں ان کے جی ماتھے پر کافی گہری چوٹ آئی ہے۔ انہیں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں اور موبائل شاید گھر پر ہے۔"

"او میرے خدا۔" اسے بے اختیار تشویش ہوئی۔

"آپ کون ہیں۔ جی۔" اس کے پوچھنے پر وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ آیا اپنے بارے میں بتائے یا نہ بتائے پھر اس نے نہ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میں ان کے آفس سے بات کررہی ہوں۔ جب آجائیں گے تو دوبارہ فون کرلوں گی۔" اس نے بات کرکے فون رکھ دیا۔ مگر اپنے آپ کو پریشانی سے نکال نہ پائی تھی۔

"نہ جانے کیسی ہوگی علیزے۔ کتنا خون نکلا ہوگا اس کا۔" اسے براؤن سلکی بالوں والی بے حد خوبصورت چار سالہ بچی یاد آئی۔ جو اس انسان کے وجود کا ٹکڑا تھی۔ جسے وہ اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتی تھی۔

اس نے احمد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا مگر ٹائم دیکھ کر رک گئی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔

وارڈن سے پرمیشن لینا اتنا مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ مسز علی سے اس کی کافی اچھی بات چیت تھی۔ مگر اس وقت جانا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے کل جانے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت اس کے ذہن سے سب کچھ نکل گیا تھا۔

صرف یاد تھی تو احمد کی پریشانی۔

✡ ✡ ✡

"آئیں۔ اندر آئیں۔" ملازمہ اسے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ اس وقت وہ احمد کے گھر میں موجود تھی۔

"آپ بیٹھیں میں صاحب کو بلاتی ہوں۔"

وہ اسے بٹھا کر احمد کو بلانے چلی گئی تھی۔
چند سیکنڈ بعد اپنے کرتے کی آستین فولڈ کرتے احمد اندر داخل ہوا تھا۔
"تم۔" اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔
"میں علیزے سے ملنے آئی تھی۔" اس کی بے تابی دیکھ کر وہ مزید حیران ہوا۔ اس کی یہ حیرانی ہانیہ کو شرمندہ کر گئی تھی۔
اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ احمد کو نہایت خوشگوار حیرت ہوئی ہے۔
"وہ دراصل کل تمہارا سیل آف جا رہا تھا۔ اس لیے میں نے تمہارے گھر فون کیا تو مجھے علیزے کے بارے میں پتا چلا۔"
"مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ آؤ تمہیں علیزے کے کمرے میں لے کر چلوں۔"
وہ اسے لیے علیزے کے کمرے میں داخل ہوا۔
کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے سنگل بیڈ پر لیٹی علیزے نظر آئی جس کے ماتھے پر پٹی بندھی تھی اور نقاہت و کمزوری چہرے سے ہی ظاہر تھی۔ وہ سیدھا اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔
"علیزے اٹھو۔ دیکھو ہانیہ آنٹی آئی ہیں۔"
"اسے لیٹا رہنے دو۔"
"اس کو کھانا کھلانا ہے۔ پھر دوا بھی دینی ہے۔ اپنی آیا کے ہاتھ سے تو کچھ نہیں کھا رہی۔ چوٹ کے ساتھ بخار نے کافی چڑچڑا کر دیا ہے اسے۔"
"اس کا کھانا لے کر آؤ میں کھلاتی ہوں۔"
وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی بس پتا نہیں کون سی محبت اس کو علیزے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ احمد نے مسکراتے ہوئے ہانیہ کو دیکھا جو بڑے پیار سے علیزے کو اٹھا رہی تھی وہ باہر نکل گیا۔
"شاباش ایسے بیٹھ جاؤ۔ علیزے نے اپنا روم کتنا پیارا سیٹ کیا ہے۔" وہ اس سے باتیں کرتے اس کے روم کی تعریف کر رہی تھی۔

"لگتا ہے علیزے کو باربیز بہت پسند ہیں۔"
نے کمرے میں ایک کونے میں پڑے شلیف کو د
ہوئے کہا تھا جس میں پورا doll House سیٹ
شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ علیزے نے سہلایا
اسی وقت احمد نوڈلز کا پیالہ ہاتھ میں لیے آیا۔
گو کہ ہانیہ کو نوڈلز کھلانے میں بے حد مشکل پیش آ رہی تھی۔ مگر اس نے بہت پیار سے اس کو نوڈ
کھلائیں۔
احمد کافی عرصے بعد اپنی بیٹی کو اس قدر خوش دیکھ ر
تھا۔
اس نے تقریباً" چار گھنٹے وہاں گزارے۔ اور آ
ہوئے علیزے نے وعدہ لیا کہ وہ دوبارہ آئے گی۔ احم
کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی علیزے سے مانو
ہو جائے گی دوائی کھلا کر وہ ہاسٹل واپس آ گئی رات کو احم
نے اسے فون پر بتایا کہ علیزے کی طبیعت کافی بہتر
ہو گئی ہے۔ اس نے احمد کو تسلی دی کہ وہ کل آرام
آفس جائے۔ وہ علیزے کے پاس چلی جائے گی۔
ان پورے پانچ سال میں پہلی مرتبہ اس رات و
بہت پرسکون سوئی تھی۔ نہ جانے کیوں۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

وہ بے یقینی کے عالم میں اپنے سے چند انچ کے فاصلے پر پڑے ring box کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اس طرح بدکی جیسے کوئی سانپ نکل کر اسے ڈس لے گا۔
اس نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے احمد کو دیکھا اب بھی بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ وہ اس وقت ایک ہوٹل میں احمد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ احمد نے بہت مشکلوں سے اسے ساتھ چلنے کو راضی کیا تھا مگر ہنی کے وہم و گمان میں بھی یہ چیز نہیں تھی کہ وہ اس طرح سے ہنی کو پرپوز کر دے گا۔
"یہ کیا ہے۔" اس کے لہجے میں برف کی ٹھنڈک تھی یا کانچ کی چبھن احمد کو اندازہ نہیں ہوا تھا۔
"انگیجمنٹ رنگ۔" وہ ایک لمحے کو گڑبڑا گیا تھا۔

"کیوں؟"
"کیونکہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں؟"
کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"
"یہ تمہیں اب خیال آیا ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ مجھے چھوڑتے ہوئے یہ یاد نہیں تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" پانچ سال سے دل میں مچلتا شکوہ آج لبوں سے ادا ہو گیا تھا۔
"میں مجبور تھا ہنی اس وقت۔ تمہیں سب کچھ بتایا تھا۔"
"اور اب۔"
"امی کو گاؤں فون کر کے پوچھا تھا۔ راضی ہیں وہ اور ابا بھی۔" احمد نے ٹیبل پر دھرے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا مگر ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں اس نے ہاتھ پیچھے کیا تھا۔
وہ بے حس و حرکت اس کو دیکھ رہی تھی۔
کیا یہ انسان واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ یا صرف اپنی مجبوریاں یاد رہتی ہیں اس کو اسے لگا جیسے پہلی مرتبہ وہ اسے دیکھ رہی ہو۔ ہلکے کرلی بالوں والا وہ لڑکا کبھی اس کی زندگی ہوا کرتا تھا۔ دل نے کبھی پر اعتراض کیا وہ اب بھی اس کی زندگی تھا۔ بھلا کبھی زندگی بھی بدلی ہے۔
ہانیہ کا دل چاہا کہ وہ اتنے زور سے چیخے کہ پوری کائنات میں صرف اس کی چیخ کی گونج ہو۔
ہوٹل کا خواب ناک منظر' دور بجتا دھیمے سروں پر پیانو پر رومانٹک میوزک اردگرد لوگوں کی ہلکی ہلکی آوازیں کچھ بھی نہ رہے بس اس کی چیخوں کی آوازیں ہوں۔
"جیسی تاریکی میرے اندر ہے۔ ویسی تاریکی باہر کیوں نہیں۔" بھیگتی آنکھوں کے ساتھ اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے سوچا تھا۔
"تم دنیا کے خود غرض ترین انسان ہو۔ پہلے مجبوری کی بنا پر چھوڑ دیا اور اب مجبوری ہی کی وجہ سے اپنانا چاہ رہے ہو۔ کاش تمہارے لیے میرے دل میں کوئی جگہ

نہ ہوتی۔" وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ احمد چپ چاپ اس کا شکوہ سنتا رہا تھا۔ پانچ سال پرانا چھالا تھا۔ پھٹنے پر تکلیف تو ہونی ہی تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر آنسو سارے ضبط اور بند توڑ کر نکلتے ہی آرہے تھے۔

"ہنی میری بات سنو۔ میں کل بھی تم سے محبت کرتا تھا۔ آج بھی کرتا ہوں۔ اور ساری زندگی کرتا رہوں گا۔ محبت کوئی موسم نہیں جو بدل جائے۔" اس نے رسان سے سمجھایا تھا۔

"اس وقت میں ایسی حالات میں تھا یا تو والدین کو چھوڑنا پڑتا یا پھر تمہیں۔"

"اور تم نے مجھے چھوڑ دیا۔" وہ مسکرائی تھی۔ درد میں ڈوبی مسکراہٹ۔

"اگر تمہیں نہ چھوڑتا تو شاید ساری زندگی کے لیے تم پر ایک دھبا لگ جاتا تمہاری وجہ سے والدین کو چھوڑ دیا۔

تمہاری عزت کہیں نہیں ہوتی۔ میں نے صرف تم سے محبت ہی تو نہیں کی۔ عزت بھی تو کی ہے کیسے برداشت کرتا میں کہ تم اس معاشرے میں معتوب ٹھہرتیں۔"

وہ بہت گم سم انداز میں اس کو دیکھ رہی تھی اس نے کبھی اس طرح تو سوچا ہی نہیں۔ ہمیشہ محبت کو ہی قصور وار ٹھہرایا۔

یہ تو سوچا ہی نہیں کہ وہ بھی اس معاشرے کا حصہ ہے۔

"تم نے ہمیشہ مجھے قصوروار ٹھہرایا یہی سمجھا کر میں نے تمہیں دھوکہ دیا۔ مگر اللہ جانتا ہے کہ تنہا راتوں میں تم ہی ہمیشہ میرے ساتھ ہوتی تھیں۔"

"صرف تنہا راتوں میں۔" ہنی کو کچھ چبھا تھا۔

"سنبل بہت اچھی لڑکی تھی۔ اور بہت ہی اچھی بیوی بھی۔ میں نے کوشش کی کہ تمہیں بھلا دوں۔ اس سے محبت کرسکوں۔ مگر میں کامیاب نہ ہوسکا۔ تمہاری آہوں پر گھر تعمیر کیا تھا۔ ٹوٹنا تو تھا اسے۔"

وہ اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی۔ وہ وہاں سے بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔

احمد کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اتنی کہ وہ بمشکل سن رہی تھی۔

"سنبل کو تمہارے بارے میں بتایا تھا میں نے وہ مجھے کہتی تھی کہ اس سے ملوائیں احمد۔ جس لڑکی نے آپ کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ مگر میں تمہارے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے نفرت کرو اور خوش رہو۔ مگر اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھا اور تم سے مل کر پتا چلا کہ تم شادی شدہ نہیں ہو تو ایسا لگا جیسے پانچ سال پہلے مانگی دعاؤں کو قبولیت کا درجہ مل گیا ہو۔"

"دعا۔" وہ چونک اٹھی تھی۔

"یہ دعا کی بات کررہا ہے۔ اف میرے اللہ۔ کیا اسے اللہ نے بھیجا ہے۔ میری التجاؤں کی صورت میں۔ کیا یہ میرے لیے ہی بنا تھا۔"

"نہیں۔" احمد نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ کرسی کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ باہر نکل آئی۔

وہ ذہنی ابتری کا شکار تھی۔ مگر سامنے موجود ایک منظر نے اس کے قدم روک دیے تھے۔ وہ تقریباً" دو ڈھائی مہینے کی بچی یا بچہ تھا۔ جسے اچھی طرح کمبل میں لپیٹا ہوا تھا اور اس کی ماں اسے اس کے باپ کی گود میں دے رہی تھی۔ باپ نہایت محبت سے کبھی بچے اور کبھی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر چار سال کا بچہ بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ جسے روکنے کے لیے اس کی ماں اسے آواز دے رہی تھی۔

اسے یک دم کسی تکلیف کا احساس ہوا شاید کسی محرومی کا' وہ بھاگتی ہوئی اپنی گاڑی تک آئی اور اسٹیئرنگ سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کل آئیں گی۔"

"اگر تمہیں نہ چھوڑتا تو شاید ساری زندگی کے لیے تم پر ایک دھبا لگ جاتا کہ تمہاری وجہ سے اپنے والدین کو چھوڑ دیا تمہاری عزت کہیں نہیں ہوتی۔

...ں نے تم سے صرف محبت ہی تو نہیں کی عزت بھی کی ...ہے۔ کیسے برداشت کرتا میں کہ تم اس معاشرے میں ...توب ٹھہرتیں۔" کافی کا مگ ہاتھ میں لیے بالکونی کی ...ار کے ساتھ ٹیک لگائے اس کے کانوں میں مختلف ...ازیں گونج رہی تھیں۔

...اسے واپس آئے چھ گھنٹے ہوچکے تھے۔ احمد کی ...ف سے مسلسل آنے والی کالز اب بند ہوچکی ...یں۔

وہ اس بات پر حیران تھی کہ اس نے فوراً" انکار ...وں نہیں کیا۔

"ہنی میری بچی۔ شادی کرلے۔ اب میں بہت ...یشان رہنے لگی ہوں۔" امی کی آواز اس کے کانوں ...ں گونجی تھی۔

"تم نے ہمیشہ مجھے ہی قصوروار ٹھہرایا یہی سمجھا ہے ...ہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا مگر میرا اللہ جانتا ہے کہ ...ا راتوں میں تم ہی میرے ساتھ ہوتی تھیں۔"

"تمہاری آہوں پہ گھر کی تعمیر کی تھی۔ ٹوٹنا تو تھا ...ے۔" کوئی مسلسل اس کے کانوں میں شکوہ کررہا ...ا۔ پچھلے پانچ سالوں کی فلم اس کے ذہن میں چلنے لگی ...ی۔ اور اس کی آنکھیں انہیں منظر میں کھو گئی ...یں۔ پھر اچانک اس نے منظر بدلتے دیکھا تھا۔

...دو میاں بیوی' بیوی کے ہاتھ میں بچی۔ آگے چلتا ...بصورت بچہ اس کے دل میں کسی احساس محرومی نے ...لہ بنائی۔ اسے اپنے گال بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے ...ھے۔ وہ روتے روتے تنگ آگئی تھی۔ اب بس کردینا ...اہتی تھی۔

"اگر پانچ سال پہلے تم مجھے مل گئے ہوتے تو شاید ...ج یہ منظر میرا بھی ہوتا۔" وہ روتے روتے بڑبڑائی ...ی۔ کافی کا مگ ٹھنڈا برف ہوچکا تھا مگر اس کا پورا وجود ...ل رہا تھا۔

"تم اب بھی اس منظر کا حصہ بن سکتی ہو۔" اس کے دل سے صدا آئی۔ وہ چونک اٹھی۔

"آپ کل آئیں گی نا۔" ایک معصوم التجا ایک بار ...ر ابھری۔ شاید دل کے کسی کونے سے۔

"اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھا تو ایسا لگا جیسے میری دعاؤں کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔"

اس کے بہتے ہوئے آنسو ایک دم رک گئے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے لگا جیسے ستاروں کی چمک مزید بڑھ گئی ہو۔

"تم اگر اپنی دعا کی قبولیت کہہ سکتے ہو تو میں کیوں نہیں۔" ایک خود کلامی اس کے منہ سے ادا ہوئی۔ آسمان کو تکتے تکتے کب اس کے پورے وجود میں سکون اترنا شروع ہوا اسے پتا نہ چلا۔ اسے لگا کہ وہ احمد کی نہیں اس کی اپنی پانچ سال پہلے مانگی دعاؤں کا ثمر ہے۔

"اور بات میں اللہ سے بڑھ کر سچا اور کون ہے۔"

مانگی گئی دعا پوری ہوگئی تھی۔ ہانیہ کے ہونٹ بے اختیار مسکرا اٹھے تھے۔ فیصلہ ہوگیا تھا۔ اندر کمرے میں داخل ہو کر اس کے ہاتھ اپنے موبائل کی جانب بڑھے تھے کیوں کہ اسے بہت ساری فون کالز کرنی تھیں۔

امی سے بات کرکے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ پورے دل سے ہنسی تھی۔ کیونکہ امی کا جواب حسبِ منشا تھا۔ اس کی انگلیاں اب احمد کا نمبر ڈائل کررہی تھیں۔

"اور بات میں اللہ سے بڑھ کر سچا اور کون ہے۔"

☆

ناولٹ

سفینہ یاسمین

آس دے دوال

"سلمٰی... سلمٰی جان! جلدی سے ناشتا دے دو' آج مجھے اپنے دوستوں سے ملنے جانا ہے۔" فرہاد نے بستر پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

"ابھی لائی جی۔" باورچی خانے سے سلمٰی کی جوابی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد سلمٰی ٹرے میں ناشتا سجائے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ آج صبح ہی صبح کون سے دوستوں سے ملنے جا رہے ہیں جناب؟"

بھئی بیگم صاحبہ! چھٹی کے دن تو اس طرح نہ کیا کرو آج اتوار ہے اور آج کا دن دوستوں سے گپ شپ کر کے گزارنا چاہتا ہوں' بس! اتنی سی بات ہے۔"

"اچھا جناب! ملئے دوستوں سے میں آپ کو منع تو نہیں کر رہی۔" سلمٰی نے بہت جلد ہتھیار ڈالے تھے۔

ہلکی پھلکی باتوں کے دوران فرہاد نے ناشتا کیا اور پھر اپنے دوست اختر کی طرف روانہ ہو گیا۔ فرہاد ایک شریف لیکن غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اپنی محبت کو پالینے کے بعد بہت خوش تھا۔ جونہی وہ اختر کے گھر میں داخل ہوا اختر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آؤ فرہاد! آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"کیوں بھئی اختر صاحب! خیریت تو ہے؟" فرہاد نے سوال کیا۔

"ہاں یار خیریت ہی ہے تم سے ایک خط پڑھوانا تھا اور پھر اس کا جواب بھی لکھوانا ہے۔" اختر جو کوراان پڑھ تھا جیب سے ایک خط نکالتے ہوئے بولا وہ فرہاد کے اچھے دوستوں میں شامل تھا لیکن ان پڑھ تھا اس لیے خط و کتابت کے لیے فرہاد ہی کا سہارا لیتا تھا۔ فرہاد نے خط پڑھ کر اختر کو سنا دیا جو خاصے محبت بھرے انداز میں لکھا گیا تھا اور یقیناً" کسی لڑکی ہی کا تھا۔

"لو بھئی! اختر! خط تو میں نے سنا دیا لیکن میرا مشورہ مانو تو اس قسم کی حرکتیں چھوڑ دو۔"

؟ہاں جی اس قسم کی حرکتیں چھوڑ دو۔" اختر نے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

"خود تو دو سال تک ہماری بھابھی سے عشق فرمایا اب شادی ہو گئی ہے تو حاجی ثناء اللہ بن گئے ہو' ارے بھئی کسی دوسرے کی دال گل رہی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے آخر؟ ہم بھی محبت کرنے کا حق لے کر پیدا ہوئے ہیں۔"

"اچھا بھئی اچھا! تم بھی عشق لڑاؤ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" فرہاد نے ہنستے ہوئے کہا پھر اختر کو خط کا جواب لکھ کر دیا اور اس سے اجازت لینے کے بعد تانگے میں بیٹھ کر اپنے گاؤں کی طرف چل دیا' جہاں اس کا سب سے گہرا اور قریبی دوست الماس رہتا تھا وہاں پہنچا تو فرہاد کو پہلے الماس کی امی کا سامنا کرنا پڑا۔

"السلام علیکم خالہ جان۔" الماس کی امی نے فرہاد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔

"خالہ جان الماس کہاں ہے؟"

"کیا بتاؤں بیٹے صبح سے اپنے کمرے میں گھسا بیٹھا ہے کئی دن ہو گئے ہیں سارا سارا دن کمرے میں گھسا

رہتا ہے نہ کھانے کا ہوش ہے اور نہ پہننے کا' پتا نہیں میرے بچے کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ اچھا ہوا تم آ گئے ہو ذرا اس سے پوچھو تو سہی کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔"

"خالہ جان! آپ فکر نہ کریں میں ابھی اس کی طبیعت درست کردوں گا۔" یہ کہہ کر فرہاد الماس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ الماس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کافی دیر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد جب اس نے دروازہ کھولا تو فرہاد کو دیکھتے ہی خوش ہو گیا۔

"ارے..... فرہاد! تم کب آئے؟"

"جناب! آیا تو کافی دیر سے ہوں جناب نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔"

"سوری یار! دراصل طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے لیٹا ہوا تھا۔"

"بھئی کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟ خالہ جان بھی شکایت کررہی تھیں۔ اگر طبیعت خراب ہے تو کوئی دوا وغیرہ لیتے' چلو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟" فرہاد نے کہا اور پھر اٹھ کر الماس کی کلائی پکڑلی۔

"چلو اٹھو۔" کہہ کر فرہاد نے الماس کی کلائی کھینچی تو الماس کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ فرہاد نے دیکھا کہ الماس کی کلائی پر جگہ جگہ جلنے کے تازہ نشان تھے۔ جیسے سگریٹ سے داغ رکھا ہو۔

"ارے یہ کیا؟ یہ تمہاری کلائی کیسے جلی؟" فرہاد نے حیرت سے سوال کیا۔

"ارے چھوڑو فرہاد بھائی! میرے روگ کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ مجھے کوئی دوا نہیں لینی۔ دوسری بات تم نے پوچھی ہے کہ کلائی کیسے جلی؟ تو وہ میں بتا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر الماس نے پاس رکھے ہوئے اگردان میں سے سلگتی ہوئی اگربتی نکالی اور اپنی کلائی پر رکھ دی۔ اگربتی کی سلگتی ہوئی آگ نے الماس کی کلائی پر ایک اور نشان بنایا اور بجھ گئی۔

"ایسے جلی ہے میری کلائی..... " الماس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

فرہاد کو الماس کی اس حرکت پر شدید حیرت ہوئی کہ بیٹھے بٹھائے آخر اسے کیا ہوگیا؟ جب شدید استفسار پر بھی الماس نے کچھ نہ بتایا تو وہ ذہنی طور پر بے حد پریشان ہوگیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر الماس کی اس حالت کی وجہ کیا ہے؟ چاروناچار فرہاد نے اس سے اجازت لی اور اس کے کمرے سے باہر نکل آیا لیکن باہر نکلتے ہی اسے ایک مرتبہ پھر حیرت کا شکار ہونا پڑا کہ اس کے باہر نکلتے ہی الماس نے ایک مرتبہ پھر دروازہ بند کر لیا تھا اور اسے باہر تک چھوڑنے بھی نہیں آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

واپسی پر سارا راستہ وہ الماس کی کیفیت کے بارے میں ہی سوچتا رہا دوسرے دن حسبِ معمول دوکان پر بیٹھا تھا کہ اختر آپہنچا۔

"فرہاد بھائی' ذرا یہ خط تو پڑھ کر سنا دو۔" اختر نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یار اختر دوکانداری کے وقت میں ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں شام کو گھر پر بیٹھ کر پڑھیں گے۔" فرہاد نے برا سامنہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن اختر کے شدید اصرار کرنے پر اسے خط پڑھ کر سنانا ہی پڑا اور شام کو جواب لکھنے کا وعدہ بھی کرنا پڑا اور پھر شام کو دکان بند کرنے کے بعد وہ اختر کے پاس جا پہنچا۔

اختر کے لیٹر کا جواب لکھتے ہوئے باتوں ہی باتوں میں الماس کا ذکر آیا تو فرہاد نے اسے اس کی موجودہ حالت کے بارے میں بتایا۔

"یار فرہاد! یہ اپنا الماس تو پاگل ہو گیا ہے۔ بھلا لڑکیوں کے پیچھے اپنی زندگی عذاب بنانے کی کیا ضرورت ہے اب ایسی بھی کیا محبت کسی کی بے وفائی کو بندہ اپنی جان کا روگ ہی بنالے۔"

"تم اپنی چھوڑو تمہیں دیکھ کر تو ہمیشہ مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آتا ہے۔

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

جواب میں اختر کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔

"ہاں بھئی ہم تو اس پر عمل کرتے ہیں۔" اختر نے ان بے نیازی سے جواب دیا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ الماس کی موجودہ حالت سی لڑکی کی وجہ سے ہے۔" فرہاد نے پرسوچ انداز میں سوال کیا۔

"جی ہاں! اور لڑکی بھی ایسی جسے آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"میں بھی اور الماس بھی۔" فرہاد نے حیرت زدہ انداز میں پوچھا۔

"کیا وہ بھی ہم تینوں کو جانتی ہے؟" فرہاد نے فوراً ہی دوسرا سوال داغا۔

"ظاہر ہے اگر ہم تینوں اسے جانتے ہیں تو وہ بھی ہمیں جانتی ہے۔"

"کون ہے وہ؟" فرہاد نے اختر کے جواب پر حیران ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"بے مثال حسن کی مالک انتہائی خوب صورت لڑکی ہے اور تمہاری ذات کے ساتھ تو اس کا گہرا واسطہ رہا ہے۔" اختر کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور فرہاد کے ذہن میں اختر کی بات سن کر کئی قسم کی شکلیں بننے اور بگڑنے لگیں آخر بے چین ہو کر اس نے بے ساختہ کہا۔

"اختر پہیلیاں نہ بجھواؤ سیدھی طرح بتاؤ کہ وہ لڑکی کون ہے؟"

"بتا دیں گے ایسی بھی کیا جلدی ہے آخر مجھے تمہاری دوستی بھی تو عزیز ہے اگر میں نے تمہیں بتا دیا تو تمہارے دل پر کیا گزرے گی؟ مجھے اس بات کا اندازہ تو لگا لینے دو۔" اختر نے کندھے اچکاتے ہوئے شان بے نیازی سے جواب دیا۔ اختر کی باتیں سن کر فرہاد کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور دل میں طرح طرح کے خدشات سر ابھارنے لگے کہ آخر ایسی کون سی لڑکی ہے جس کے پیچھے الماس دیوانہ ہوا پھر رہا ہے' میری زندگی کے ساتھ اس کا گہرا تعلق رہا ہے اور اس کے بارے میں کوئی بات مجھے شاک بھی گزر سکتی ہے۔

لیکن وہ کوئی اندازہ قائم نہیں کرسکا۔ پھر وہ خشک انداز میں مخاطب ہوا۔

"دیکھو اختر اگر تم نے مجھے کھل کر نہ بتایا تو میری اور تمہاری یہ آخری ملاقات ہوگی۔"

"ارے ارے ناراض کیوں ہوتے ہو اگر ضرور جاننا چاہتے ہو تو میں تمہیں طریقہ بتاتا ہوں اس پر عمل کرو۔"

"ابھی ابھی تم نے خط لکھا ہے نا؟ اس کے آخر میں چند سطروں کا اضافہ کردو اٹھاؤ کاغذ پنسل۔" فرہاد نے حیرت سے وہ خط اٹھالیا جو ابھی ابھی اس نے تحریر کیا تھا اور سوالیہ نظروں سے اختر کی طرف دیکھا۔

"لکھو! کیا آپ یہ تحریر پہچانتی ہیں کہ یہ خط کس کی ہینڈ رائیٹنگ میں لکھا ہوا ہے اگر جانتی ہیں تو اس بات کا جواب ضرور دیں۔" فرہاد نے حیرت زدہ نظروں سے اختر کی طرف دیکھا اور خط پر چند الفاظ کا اضافہ کردیا لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے ایسی کون سی لڑکی ہے جو الماس کے پاگل پن کا سبب ہے اختر کے پاس اس کے لیٹر آتے ہیں اور اس کی ہینڈ رائٹنگ تک پہچانتی ہے' وہ عجیب سی ذہنی کشمکش کا شکار واپس آگیا اور بستر پر لیٹ گیا سلمٰی کے بلانے کے باوجود وہ سیدھے منہ اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن شام کو وہ اختر کے پاس پہنچا تو خط کا جواب آچکا تھا اس نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے خط لیا اور پڑھنے لگا لکھا تھا۔

ڈیئر اختر!

تمہارا خط ملا پڑھ کر دل کو کچھ سکون محسوس ہوا ویسے تو سکون نام کی چیز میرے لیے شجر ممنوعہ ہے لیکن پھر بھی دل چاہتا ہے کہ کبھی کبھی کسی لمحے' کسی پل' کسی وقت' سکون کا ایک لمحہ ہی میسر آجائے اختر میری زندگی عذاب بن چکی ہے۔ میں بغیر جرم کے سزا بھگت بھگت کر تنگ آچکی ہوں اب تو دل کرتا ہے کہ موت کو گلے لگالوں بہرحال تم نے پوچھا ہے کہ یہ تحریر کس کی

ہے تو میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ تحریر فرہاد کی ہے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ خط پڑھے گا بھی فرہاد اور اس کا جواب بھی وہی لکھے گا۔

فرہاد صاحب آپ کو آپ کی خوشیاں مبارک ہوں خوشیاں بھی کسی کسی کا مقدر ہوتی ہیں نصیب نصیب کی بات ہے۔ ہم نے تو اب خوشیوں کی امید ہی چھوڑ دی ہے، جب تک زندہ ہوں تب تک زندگی کا زہر تو پینا ہی پڑے گا۔

کیسی تنہائیاں اک شخص نے سونپی ہیں مجھے
مجھ سے اب کوئی بھی تنہا نہیں دیکھا جاتا

اگلے خط تک اجازت دیجیے۔

والسلام۔

خط پڑھنے کے بعد فرہاد کے ذہن میں پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگیں پھر اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں اختر کو مخاطب کیا۔

"اختر! کون ہے یہ لڑکی؟"

"یار عجیب بھوندو قسم کے انسان ہو ابھی بھی تمہیں پتا نہیں چلا کہ یہ لڑکی کون ہے؟" اختر نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"یار تم تو جانتے ہو کہ میں لڑکیوں کے معاملے میں کبھی سیریس نہیں ہوتا لیکن جگہ جگہ پنگا ڈالنا میرا شوق ضرور ہے۔ بس میں گاؤں گیا تو الماس سے میری شرط لگ گئی الماس کا کہنا تھا کہ میں اس لڑکی کو "پٹا" نہیں سکتا کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی ہے لیکن میں نے کہا کہ میں ثابت کر سکتا ہوں وہ تم سے سچی محبت نہیں کرتی۔ اتفاق سے اس کا خط جو الماس کے نام تھا میرے ہاتھ لگ گیا میں نے اس لڑکی کو وہ خط دکھایا تو یہ بلیک میلنگ کام آ گئی اور اس کے خط مجھے بھی آنے لگے جو میں نے الماس کو دکھا دیے شرط تو میں جیت گیا لیکن اب مجھے افسوس بھی ہے شاید الماس اس سے سچا پیار کرتا تھا۔" اختر نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اپنی بات کو ختم کیا۔

"یعنی اب وہی لڑکی الماس کو چھوڑ کر تمہیں خط لکھ رہی ہے؟" فرہاد نے سوال کیا۔

"ہاں، لیکن الماس کو بھی لکھتی ہے۔" اختر نے جواب دیا۔

"یار بہت ہی گرے ہوئے ذہن کی مالک ہے وہ لڑکی آخر وہ ہے کون؟ یہ تو مجھے ابھی تک پتا نہیں چل سکا۔" فرہاد نے بے چینی سے پوچھا۔

"شائستہ۔۔۔!" اختر نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ نام سنتے ہی فرہاد کے ہاتھ میں موجود چائے کا کپ زمین پر آ رہا۔

"شائستہ شائستہ۔" اختر کی آواز اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی اور اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اس نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چل رہی تھی۔ ایک بھولی بھالی معصوم صورت گڑیا جیسی بچی۔۔۔ پھر ذرا منظر صاف ہوا۔۔۔ ساتھ بیٹھا ہوا بچی سے ذرا زیادہ عمر کا بچہ۔۔۔ دونوں ریت پر بیٹھے کھیل رہے تھے بچی ریت کے گھروندے بنا رہی تھی بچہ پاس بیٹھا ایک چھوٹی سی انگوٹھی کو الٹ پلٹ رہا تھا بچی نے ریت کا پیارا سا گھر بنایا اور پھر موٹی موٹی معصوم ـــــ آنکھیں اٹھا کر بچے کو دیکھا اور کہا

"فلہاد دیتھو میں نے کتنا کھو بچھولت دھر بنایا ہے" (فرہاد دیکھو میں نے کتنا خوب صورت گھر بنایا ہے)

"فرہاد، فرہاد! اپنے آپ کو سنبھالو یار کہاں کھو گئے ہو؟" اختر نے فرہاد کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور رندھی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"کون سی شائستہ کے بارے میں بتایا ہے تم نے شائستہ منظور؟"

"ہاں! اور میں اسی لیے تمہیں نہیں بتا رہا تھا کہ آخر وہ تمہاری منگیتر رہی ہے اس کے بارے میں تمہیں اس قسم کی باتیں سن کر ضرور تکلیف پہنچے گی۔" اختر نے جواب دیا۔

"نہیں اختر! ایسی کوئی بات نہیں بھلا میرا اس سے کیا تعلق؟ ہاں اس کا نام سن کر یکدم ذہنی جھٹکا ضرور لگا ہے کیونکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شائستہ اس قسم کی لڑکی ہو سکتی ہے شاید وہ اتنی دیر تک میرے نام کے ساتھ منسوب رہی ہے اس وجہ سے مجھے اس طرح لڑکوں کے ساتھ اس کا فلرٹ کرنا اچھا نہیں لگا۔" کچھ دیر اختر کے پاس بیٹھنے کے بعد فرہاد نے اس سے اجازت لی اور سیدھا گھر چلا آیا۔

☼ ☼ ☼

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا "میرا اس سے کیا تعلق؟" لیکن وہ مسلسل ذہنی ہیجان میں مبتلا تھا جب سے اس نے شائستہ کا نام سنا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نادیدہ آگ میں جل رہا ہو۔ شائستہ اس کی منگیتر اور بچپن کی ساتھی تھی انہوں نے ایک ساتھ کھیل کود کر ہوش کی وادیوں میں قدم رکھا تھا جب شائستہ نے ہوش سنبھالا تو اس کے گھر والوں نے اس کو پردے کا پابند ہونے کی تلقین کی جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ ادھر فرہاد تعلیم کے سلسلے میں شہر چلا گیا جہاں سلمٰی سے اس کی محبت شروع ہوئی۔

وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا ادھر ماضی کے اوراق پلٹتے چلے گئے۔

شائستہ کے خاندان اور فرہاد کے خاندان میں گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ گھریلو ماحول بھی خاصا مذہبی تھا۔ شائستہ کے والد کی وفات کے بعد فرہاد کے خاندان اور شائستہ کے خاندان کے گھریلو تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے اور ان ہی دنوں ان کی منگنی کر دی گئی فرہاد کی عمر اس وقت سات سال اور شائستہ کی عمر اس وقت چار یا پانچ سال کی ہو گی فرہاد نے جب ہوش سنبھالا تو اس نے اس رشتے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی پرائمری پاس کرنے کے بعد وہ شہر چلا گیا اور کچھ عرصے کے بعد اس کے گھر والے بھی شہر میں شفٹ ہو گئے اور وہیں سلمٰی سے اس کی محبت شروع ہوئی گھر والوں کے لاکھ روکنے اور سمجھانے کے باوجود فرہاد اور سلمٰی کی محبت میں کوئی کمی نہ آئی آخر کار فرہاد کے والدین اس کا رشتہ لے کر سلمٰی کے گھر گئے جسے قبول کر لیا گیا۔

آج اچانک اختر کے منہ سے شائستہ کا نام سن کر اسے بیتا ہوا بچپن یاد آ گیا تھا۔ اور پتا نہیں دل کے کون سے تار جھنجھنا اٹھے کہ اسے کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا شائستہ کے نام نے اس کی زندگی کے پرسکون سمندر میں ہلچل پیدا کر دی تھی پتا نہیں کیوں دل میں اک ٹیس سی اٹھنے لگی تھی وہ بے چین ہو کر بستر سے اٹھا اور گھر سے باہر نکل آیا تمام رات اس عجیب ذہنی خلفشار کا عالم رہا لیکن صبح تک وہ بالکل پرسکون ہو چکا تھا کیونکہ اس نے ذہنی طور پر ایک فیصلہ کر لیا تھا دوسرے دن اس نے یہ چھان بین کی کہ اختر گاؤں میں شائستہ کے پاس لیٹر کس طرح پہنچاتا ہے جس کا اسے علم ہو گیا۔ اختر شائستہ کے گھر میں ملازم لڑکے کے ہاتھوں خط پہنچاتا تھا اور وہی لڑکا خط کا جواب لاتا تھا اس جانچ پڑتال کے بعد اس نے ایک لیٹر تحریر کیا۔

ڈیئر شائستہ!

میں بڑے افسوس کے ساتھ تمہیں مخاطب کر رہا ہوں دل تو نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں خط لکھوں لیکن دو سال قبل یعنی میری شادی ہونے تک ہمارے خاندانوں میں اچھے تعلقات رہے ہیں اس بات نے مجھے مجبور کر دیا ہے یا شاید یہ وجہ رہی ہو کہ ایک عرصہ تک تم میرے نام کے ساتھ منسوب رہی ہو اس لیے تمہاری آج کل کی "مصروفیات" کے بارے میں جان کر برداشت نہیں کر سکا۔

کیا تمہیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں کہ تم ایک اعلا خاندان سے تعلق رکھتی ہو آج تمہاری حرکتوں کے بارے میں جان کر میرا سر شرم سے جھک گیا ہے اس کے باوجود کہ میرا تم سے کوئی رشتہ، کوئی ناتا نہیں ہے تمہارے کردار کے بارے میں جان کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے بیک وقت دو، دو لڑکوں کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھانا تمہارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہونا چاہیے۔

میں نے تو ایک عرصے سے تمہیں نہیں دیکھا لیکن اگر تمہاری جوانی اتنی ہی بے لگام ہو رہی ہے تم اپنے آباؤ اجداد کی عزت نیلام کرنے پر تل ہی گئی ہو تو کیا

تمہیں اپنے خاندان یا اس کے ہم پلہ کوئی انسان نظر نہیں آیا خدا کے لیے اپنے مرحوم باپ کی عزت کا احساس کرو اور اپنے آپ کو سنبھالو۔

فقط۔

☼ ☼ ☼ فرہاد علی سید

خط لکھنے کے بعد فرہاد نے اس لڑکے تک پہنچایا اور کہا کہ "یہ اختر نے بھیجا ہے اسے شائستہ تک پہنچا دو" خط لکھنے کے بعد کئی دن تک وہ عجیب سے جذبات و احساسات کا شکار رہا شاید وہ آج بھی شائستہ کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ اس بات کو بھول گیا کافی دنوں کے بعد اختر سے ملاقات ہوئی تو اس نے اختر سے پوچھا۔

"کہاں غائب ہو بھائی۔ آج کل نظر ہی نہیں آتے کیا خط لکھنے کے لیے کوئی منشی رکھ لیا ہے؟"

"یار خط کیا لکھنا ہے کئی دن ہو گئے وہاں سے کوئی خط ہی نہیں آیا تمہاری اس دن کی حالت کی وجہ سے تم سے دوبارہ کہا بھی نہیں ایک اور دوست سے لکھوا کر دو تین خط بھیجے لیکن جواب نہیں آیا پھر میں نے کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی میں تو صرف شغل ہی کر رہا تھا۔"

اختر کا جواب سن کر نہ جانے کیوں اسے خوشی سی محسوس ہوئی کہ اس کے لکھے ہوئے خط کا اثر ہو گیا ہے۔ اختر کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی فرہاد کے پاس آ پہنچا جو اس کا بالکل واقف نہیں تھا سلام دعا کے بعد اس نے دریافت کیا۔

"فرہاد آپ کا نام ہے؟" اس نے جواب اثبات میں دیا تو وہ آدمی بولا۔

"آپ کے لیے ایک پیغام ہے آپ کے دوست الماس نے کہا ہے کہ آپ فوراً گاؤں پہنچیں اگر بیٹھے ہیں کھڑے ہو جائیں کھڑے ہیں چل پڑیں جتنی جلد ممکن ہو سکے گاؤں پہنچیں۔" پیغام دے کر وہ آدمی چلا گیا تو فرہاد نے دوکان بند کی اور تانگے میں بیٹھ کر گاؤں کی طرف چل دیا الماس کے پاس پہنچ کر اس نے دریافت کیا۔

"خیریت تو ہے الماس ایسا سخت قسم کا پیغام میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"

"پیغام؟ کیسا پیغام؟" الماس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا مطلب۔ کیا تم نے پیغام نہیں بھیجا کہ فوراً میرے پاس پہنچو۔" فرہاد نے حیرت سے سوال کیا۔

"نہیں یار! میں کیا بے وقوف ہوں جو ایسا پیغام بھیجوں گا کیا مجھے پتا نہیں کہ اس وقت تم دوکان پر ہو اور تمہیں دوکان بند کر کے آنا پڑے گا۔ مجھے کام ہوتا تو کیا خود نہیں آ سکتا تھا لگتا ہے کسی نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہے ذرا یہ تو بتاؤ کہ پیغام دیا کس نے ہے؟"

"یار میں تو اس آدمی کو جانتا بھی نہیں اسے مجھ سے مذاق کرنے کی کیا ضرورت؟" پھر اس نے الماس کو پیغام ملنے کا سارا ماجرہ تفصیل سے کہہ سنایا وہ دونوں اپنی اپنی جگہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے کہ آخر وہ آدمی کون تھا اور اس نے ایسا مذاق کیوں کیا؟ ابھی بھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ اتنے میں الماس کی چھوٹی بہن سارہ کمرے میں داخل ہوئی جس کی عمر تقریباً سات سال ہو گی اور اس نے آتے ہی فرہاد کو مخاطب کیا۔

"فرہاد بھائی! آپ کو باجی شائستہ بلا رہی ہیں۔"

"شائستہ..... مجھے بلا رہی ہیں؟" فرہاد نے حیرت سے سوال کیا۔

"جی!" سارا نے معصومیت سے جواب دیا۔

"کہاں ہے وہ؟" فرہاد نے دریافت کیا۔

"اپنے گھر میں! میں پڑھنے گئی تھی ان کے گھر تو انہوں نے کہا کہ جاؤ فرہاد تمہارے گھر میں آئے ہوئے ہیں انہیں کہو شائستہ آپ کو بلا رہی ہے۔" فرہاد نے حیرت زدہ انداز میں الماس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی عجیب نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تعجب ہے شائستہ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں۔" اس نے حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر شائستہ کے گھر کی طرف چل دیا دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے خدا خدا کر کے وہ شائستہ کے دروازے پر پہنچا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ

دروازے پہ دستک دی چند لمحوں بعد ہی دوسری جانب قدموں کی چاپ بلند ہوئی جو آہستہ آہستہ دروازے پر آ کر ختم ہوئی اور پھر ایک مترنم آواز بلند ہوئی۔

"کون؟"

"فرہاد۔" اس کی زبان سے ایک ہی لفظ نکل سکا۔ دروازہ کب کھلا اسے اندازہ نہیں ہو سکا دل اور دماغ اس وقت عجیب کیفیت کا شکار تھے۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایک شعلۂ جوالہ کو اپنے سامنے موجود پایا۔

سرو قد، متناسب بدن، سرخ و سپید رنگت، دل کش نقوش، کتابی چہرہ، صراحی دار گردن اور لمبے لمبے سیاہ بالوں کی مالک یہ لڑکی اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔

"آپ..... آپ کون؟" وہ اس نے لکنت زدہ انداز میں دریافت کیا۔

"مجھے شائستہ کہتے ہیں۔" اس نے اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کو گھنی پلکوں کے غلافوں کے پیچھے چھپاتے ہوئے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

وہ سکتے کی سی کیفیت میں وہیں کھڑا رہا کوئی سوال کیا نہ اس نے مزید کچھ پوچھا وہ سوچ رہا تھا کہ بچپن کی ننھی منی شائستہ اور اس شائستہ میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ گو بچپن کے دنوں کے بعد وہ اسے آج پہلی بار دیکھ رہا تھا لیکن اتنے سے عرصے میں وہ اتنی دلکش اور اتنی خوب صورت ہو جائے گی اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔

الماس اگر اس کا دیوانہ ہوا پھر رہا تھا تو اس میں اس بے چارے کا کیا قصور؟ وہ تھی ہی ایسی کہ جو بھی اسے دیکھے دیوانہ بن کے رہ جائے۔ لیکن نہیں..... اتنی پیاری، اتنی خوب صورت لڑکی..... نہیں نہیں..... الماس اس کے قابل کہاں۔

"یہیں کھڑے رہیں گے یا اندر بھی آئیں گے۔" ایک مدھر آواز بلند ہوئی جس نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا اور وہ ہوش میں آ گیا۔ جتنی خوب صورت وہ خود تھی اتنی ہی خوب صورت اس کی آواز تھی بولتی تھی تو — بالکل یوں لگتا جیسے کسی قدیم اور پراسرار مندر میں نقرئی گھنٹیاں سی بج اٹھی ہوں۔

"آئیے اندر تشریف لائیے۔" اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا لیکن فرہاد کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔

"لل..... لیکن میں آپ کے گھر والوں کا سامنا کیسے کر سکوں گا؟ انہیں کیا جواب دوں گا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔" فرہاد نے کپکپاتی ہوئی آواز میں سوال کیا اسے اپنے آپ پر حیرت بھی تھی۔ شاید اس پر رعب حسن طاری ہو گیا تھا وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ایسی کوئی بات مت سوچیں۔ جب میں نے آپ کو بلایا ہے تو سوچ سمجھ کر ہی بلایا ہے گھر میں اس وقت بڑے بھیا کے علاوہ کوئی نہیں..... اور وہ سو رہے ہیں اور جب وہ سو رہے ہوں تو چاہے ان کے سامنے ڈھول بھی بجا دیا جائے وہ نہیں اٹھتے۔"

شائستہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچتے ہوئے کہا، شائستہ کا ہاتھ لگتے ہی فرہاد کو اپنے جسم میں کرنٹ سا دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سحر زدہ سے انداز میں اندر داخل ہوا شائستہ اس کے ساتھ چل رہی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات اس کے ساتھ چل رہی ہو۔

شائستہ اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی جو دوسرے کمروں سے بالکل الگ تھلگ تھا شاید مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شائستہ نے اسے ایک پلنگ پر بٹھایا اور پیڈسٹل فین چلا کر اس کا رخ فرہاد کی طرف موڑ دیا۔

"آپ بیٹھیے میں ابھی آئی۔" اور پھر وہ بجلیاں گراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ فرہاد کا دل دھک دھک کر رہا تھا نہ جانے کیوں اس کا نظروں کے سامنے سے ہٹنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس آ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ میں پلیٹ اٹھا رکھی تھی جس میں نفاست سے کٹے ہوئے آم سلیقے سے سجے ہوئے تھے اس نے پلیٹ فرہاد کے سامنے رکھی اور دوسرے ہاتھ میں موجود پیپسی کی دو بوتلیں ٹیبل پہ رکھ دیں اور خود کرسی پر فرہاد کے سامنے بیٹھ گئی۔

"کھائیے نا۔" اس نے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔

اس نے سحر زدہ سے انداز میں آم کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور بغیر کوئی بات کیے کھانے لگا لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ یہ بد تہذیبی ہے تو اس نے پلیٹ اٹھا کر شائستہ کے سامنے کردی اور اسے بھی ساتھ شریک ہونے کو کہا کافی اصرار کے بعد اس نے بھی آم کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور کھانے لگی۔ آم کھاتے ہوئے فرہاد نے سوال کیا۔

"ہاں تو شائستہ! اب یہ بتائیے کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا؟"

"بس مجھے پتا چلا کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ آپ سے ملنے اور آپ کو دیکھنے کو دل چاہا' سو میں نے آپ کو بلالیا..... اور ایک لمبے عرصے کے بعد آپ کو دیکھا ہے یقین کریں کہ مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے شائستہ! لیکن تمہارے بارے میں جو کچھ میں آج کل سن رہا ہوں مجھے اس سے بے حد دکھ پہنچ رہا ہے۔"

"جی ہاں فرہاد صاحب! ہر انسان کو صرف اپنے دل کا دکھ محسوس ہوتا ہے دوسروں کا دکھ درد کوئی محسوس نہیں کرتا۔ دکھوں کو سہہ کر بھی ہمیشہ ہنستے رہنا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔" شائستہ نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" فرہاد نے سوال کیا۔

"مطلب بھی بتا دوں گی لیکن پہلے ایک بات کی وضاحت کردوں کہ جو کچھ آپ نے دیکھا اور سنا ہے وہ یکطرفہ ہے میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ وہ دونوں ہی خوش فہمی کا شکار ہیں بس خط پر خط لکھتے رہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں ہی ڈھیٹ ہیں اور میں بھی انہیں بے وقوف بنا رہی ہوں کیونکہ خود بے وقوف بن چکی ہوں اس لیے چاہتی ہوں کہ جو دکھ میں نے اٹھایا ہے اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں بانٹ دوں آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے گھروں میں پردے کی کتنی پابندی ہے آپ اتنے قریبی ہونے کے باوجود کتنے سالوں کے بعد یہاں آئے ہیں اور وہ بھی اگر باقی گھر والے ہوتے تو آپ میری جھلک تک نہ دیکھ سکتے ..... باہر میں جاتی نہیں۔

میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہہ رہی ہوں کہ اختر اور الماس میری گرد کو بھی نہیں چھو سکتے بات صرف خط و کتابت کی حد تک ہے دونوں نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور دونوں میرے ہاتھوں بے وقوف بن رہے ہیں مگر آپ کا خط ملنے کے بعد میں نے ان حرکتوں سے توبہ کرلی ہے خدا گواہ ہے اس کے بعد نہ تو میں نے انہیں کوئی خط لکھا نہ ان کا کوئی خط وصول کیا لیکن اسی دن سے میں آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھی کیونکہ آپ کی باتیں پڑھنے کے بعد میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی تھی۔"

"کون سا سوال؟"

"ارے ..... باتوں باتوں میں مجھے کولڈ ڈرنک کا خیال ہی نہیں رہا۔" شائستہ نے چونکتے ہوئے کہا اور پھر ایک بوتل اٹھا کر فرہاد کو پکڑا دی بوتل پکڑاتے ہوئے اس کا ہاتھ فرہاد کے ہاتھ سے ٹکرایا تو اسے اپنے جسم میں سنسنی سی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی شائستہ کے جسم سے بھینی بھینی مسحور کن خوشبو اٹھ رہی تھی شاید وہ کوئی اعلا قسم کا پرفیوم استعمال کرتی تھی۔

فرہاد نے بوتل ختم کرکے ٹیبل پہ رکھی تو وہ دوسری بوتل اٹھا کر اسے پکڑانے لگی۔ اس کے انکار پر بولی

"یہ دونوں بوتلیں اور آم میں نے آپ ہی کے لیے منگوا کر فریج میں رکھے ہوئے تھے۔"

"کیا مطلب؟ کیا تمہیں پتا تھا کہ میں آؤں گا اس کا مطلب ہے کہ....."

"اب آپ نے اندازہ لگا ہی لیا ہے تو میں چھپاؤں گی نہیں شہر سے میں نے ہی آپ کو بلوایا تھا۔"

فرہاد سوچ رہا تھا کہ شائستہ نے اسے کیوں بلایا گرمی میں سفر کرکے آیا تھا۔ پیڈسٹل فین کی ٹھنڈی ہوا سے اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی شائستہ نے اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگی تو وہ ہڑبڑا گیا اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شائستہ نے سینے پر ہاتھ

ٹھ کر اسے دوبارہ لٹادیا اور بولی۔

"میں تو سدا کے لیے آپ کی خدمت کرنا چاہتی ی لیکن آپ نے یہ حق مجھے نہیں دیا کم از کم آج کا ن تو یہ حق مجھ سے نہ چھینیں آج تو آپ میرے ہمان ہیں۔"

وہ لاجواب ہو گیا پتا نہیں شائستہ کے ہاتھوں کے س کا نشہ تھا یا تھکاوٹ کا اثر کہ وہ بے خود سا ہو گیا شاید اس کی آنکھ لگ گئی تھی لیکن اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے پیروں پر گرم پانی کے قطرے گر رہے ہوں آنکھیں کھول کر دیکھا تو شائستہ بدستور وہیں بیٹھی اس کے پاؤں دبا رہی تھی اور اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر ٹپ ٹپ اس کے پیروں پر گر رہے تھے وہ پریشان ہو گیا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ارے شائستہ تم رو رہی ہو کیا بات ہے؟"

فرہاد نے بے اختیار اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پلنگ پر بٹھا دیا لیکن شائستہ کی آنکھوں سے تو جیسے سیلاب امڈ آیا تھا وہ اس کے پاس بیٹھ کر اسے چپ کرانے لگا لیکن شاید شائستہ کے ضبط کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ شائستہ نے اس کے سینے سے سر ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرہاد گھبرا گیا ایک دم اسے خیال آیا کہ شائستہ کے بڑے بھیا بھی تو گھر میں موجود ہیں اگر ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ ادھر آگئے تو..... کیا ہو گا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا اور شائستہ کو دلاسے دینے لگا۔

"شائستہ آخر بات کیا ہے تم رو کیوں رہی ہو؟"

"آپ کو بچپن یاد ہے۔" شائستہ نے آزردگی سے دریافت کیا اور فرہاد کی آنکھوں کے سامنے بچپن کے بہت سے مناظر گھومنے لگے اس نے دیکھا کہ شائستہ بیٹھی ہوئی ریت کے گھروندے بنا رہی ہے ایک بچے نے اس کا بنایا ہوا گھروندہ توڑ دیا اور شائستہ رونے لگی فرہاد اس بچے سے لڑ پڑا اور اسے اتنا مارا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا شائستہ نے اپنی توتلی زبان میں کہا۔

"فرہاد تم تو میرا بنایا ہوا گھروندہ روز توڑ دیتے تھے آج الماس نے توڑ دیا تو تم نے اسے مارا۔"

"میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا جو تمہیں رلائے گا میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"اچھا....." شائستہ نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ لو۔" اس نے اپنی چھوٹی سی انگوٹھی اتاری اور فرہاد کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

پتا نہیں وہ کب تک ماضی کی یادوں میں کھویا رہتا لیکن شائستہ کی آواز نے اسے چونکا دیا وہ کہہ رہی تھی۔

"یاد ہے فرہاد ایک روز تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا لیکن اس دن سے لے کر آج تک شائستہ صرف روتی ہی رہی ہے پہلے تمہاری جدائی کی وجہ سے اور پھر تمہاری بے وفائی کی وجہ سے ..... خوشیاں مجھ سے روٹھ گئی ہیں فرہاد اور اس کے ذمہ دار صرف تم ہو! تم نے تو اپنی محبت حاصل کرلی تم تو اپنی دنیا میں خوش ہو لیکن میری دنیا تو تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہوتی تھی جب تم ہی نے مجھے ٹھکرا دیا تو میرے پاس باقی کیا بچا؟ میری تو دنیا ہی اجڑ گئی فرہاد....."

شائستہ بول رہی تھی اور فرہاد کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر دیواروں سے سر ٹکرانے لگے اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ کوئی کسی کو اتنی شدت سے بھی چاہ سکتا ہے اس کا دل زخمی ہو رہا تھا لیکن وقت گزر چکا تھا فرہاد کی شادی ہو چکی تھی اگر اسے پہلے سے اندازہ ہوتا کہ شائستہ اسے اتنا چاہتی ہے تو شاید وہ کسی اور سے محبت نہ کرتا۔

"جانتے ہو فرہاد!" شائستہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"جانتے ہو کسی لڑکی کے لیے یہ باتیں کہنی کتنی مشکل ہوتی ہیں۔ لیکن میں تنگ آچکی ہوں فرہاد! الماس اور اختر کو تو صرف زندہ رہنے کا بہانہ بنا رکھا ہے میں نے' آج میں تمہارے سامنے خود اپنی زبان سے اقرار کرتی ہوں کہ میں کل بھی تم سے محبت کرتی تھی اور آج بھی صرف تم سے محبت کرتی ہوں ذرا سوچو کہ جو لڑکی اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' صرف تمہارے خواب دیکھتی ہو' جو بچپن سے یہی سنتی آئی ہو کہ

تمہاری شادی فرہاد سے ہوگی جس کے من مندر کے دیوتا صرف تم ہو اسے جب تمہاری شادی کا دعوت نامہ ملا ہوگا اس کے دل پر کیا گزری ہوگی آخر مجھ میں کیا کمی تھی جو میں ٹھکرائی گئی دنیا والوں کی باتیں سنیں گھر والوں کی باتیں سنیں اور خاموش رہی مگر کب تک فرہاد! کب تک میں بے جرم کسی گناہ کی سزا بھگتے جاؤں؟"

یوں زندگی کا زہر پیے جا رہے ہیں ہم
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہے ہیں ہم

"تمہارے لکھے ہوئے خط نے دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکا کر شعلے کا روپ دے دیا ہے فرہاد

یقین کرو فرہاد! اگر اب تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں اپنی جان دے دوں گی جتنا جلنا تھا جل چکی۔ اب مجھ میں اور ہمت نہیں خدا کے لیے مجھے اپنا لو فرہاد۔"

شائستہ نے اپنی طویل گفتگو کو جس فقرے پر ختم کیا اسے سن کر فرہاد سناٹے میں رہ گیا۔

"شائستہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم جانتی ہو کہ میں شادی شدہ ہوں میری بیوی ہے جو مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے اور میں بھی اسے بہت چاہتا ہوں۔ تمہارا خطا وار ہوں گناہ گار ہوں کہ میری وجہ سے تمہارے دل کو ٹھیس پہنچی۔ لیکن شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ کیونکہ میں جانتا نہیں تھا کہ تم مجھے اس شدت سے چاہتی ہو جو ہونا تھا وہ ہو چکا مجھے اس بات سے بھی انکار نہیں کہ میرے دل میں بھی تمہاری باتیں سننے کے بعد تمہارے لیے ہمدردی اور محبت کے شدید جذبات پیدا ہو گئے ہیں لیکن اب کیا ہو سکتا ہے اس لیے میرا مشورہ مانو اور گزرے ہوئے کل کو بھول جاؤ۔"

"فرہاد میرے ایک سوال کا جواب تو دو؟" شائستہ نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"پوچھو؟" فرہاد کا جواب اثبات میں پا کر شائستہ گویا ہوئی۔

"یہ بتاؤ کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے اس کا مذہب کیا ہوتا ہے؟"

"ظاہر ہے اگر کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوگا تو مسلمان اور اگر کسی عیسائی کے گھر پیدا ہوگا تو عیسائی ہو گا۔"

"غلط بالکل غلط۔" شائستہ نے پرزور انداز میں کہا۔

"جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اگر کسی مسلمان کا بچہ پیدا ہوتے ہی مسلمان کے گھر سے اٹھا کر کسی ہندو کے گھر دے دیا جائے یا کسی ہندو کا بچہ مسلمان کو دے دیا جائے تو ہوش سنبھالتے ہی وہ ان کی رسومات اور رہن سہن دیکھے گا اور ان کی تعلیمات پا کر پروان چڑھے گا جب وہ جوان ہوگا تو اس کا مذہب وہی ہوگا جس کی بچپن میں اسے تعلیم دی گئی ہو گی اور اب تم یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری گردن پر تلوار رکھ دی جائے اور تم سے کہا جائے کہ اپنا مذہب تبدیل کر لو ورنہ تمہاری گردن اتار دی جائے گی تو تم کیا جواب دو گے؟"

"میرا جواب یہی ہوگا کہ گردن بے شک اتر جائے لیکن میں اپنا مذہب ہرگز تبدیل نہیں کر سکتا!"

"یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں فرہاد! میرے ذہن میں بچپن سے یہی بات نقش ہے کہ تم میرے جیون ساتھی ہو مجھے بتاؤ کہ میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں؟ فرہاد میں اس زندگی سے بے حد تنگ ہوں میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ ساری زندگی تمہاری اور تمہاری بیوی کی خدمت کروں گی اور اسے کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی، میں اس کی کنیز بن کر رہنے کے لیے بھی تیار ہوں، تم مجھے اپنا لو فرہاد! میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہوگی کہ میں اپنے محبوب کی محبت کی خدمت گزاری کر رہی ہوں، آج اور ابھی مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو، اس کے بعد ہی میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گی آج تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہی ہوگا فرہاد...!" شائستہ التجا کر رہی تھی اور فرہاد کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کس دوراہے پر آکھڑا ہوا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔)

☼ ☼

روشنی بخاری

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کُہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

زنداں کی بلند دیواروں کے اُس پار کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے ڈھیروں مناظر نظروں سے گزرتے ہیں آوازیں سماعتوں سے ٹکراتی ہیں آزاد اور پر لطف زندگی چاروں طرف رقصاں ہوتی ہے۔ آزادی ایک حسین اور تابناک چیز ہے اس کی قدر و قیمت و اہمیت اس سے پوچھیں جس پر جیل کی چھوٹی سی دنیا میں کائنات محدود کردی جاتی ہے۔
کرن میں ——— نیا سلسلہ "روداد قفس" کے نام سے شروع کیا جارہا ہے جیلوں میں قید خواتین کے حالات و واقعات پر مبنی۔ آخر ایسے کون سے مسائل و حالات تھے جن کی وجہ سے وہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے پر مجبور ہوئیں۔ اس سلسلے کی کوئی کہانی آپ کے پاس ہے تو ہمیں روانہ کریں۔ ہم نوک پلک سنوار کر اسے شائع کریں گے۔

"ٹھک ٹھک ٹھک۔" دستک کی آواز بلند ہوئی تو ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ایک دلکش نسوانی آواز سنائی دی۔
"کون؟"
"کوریئر سروس۔" جواباً" ایک مردانہ آواز بلند ہوئی اور دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔
دروازے کی اوٹ سے جو حسین سراپا نمودار ہوا بلاشبہ اپنی آواز ہی کی طرح خوب صورت تھا۔ پارسل ہاتھ میں اٹھائے شاہان کی نظریں اس کے ملکوتی چہرے سے ٹکرائیں تو وہیں جمی رہ گئیں۔
ایک طویل عرصے سے وہ ایک پرائیویٹ کوریئر سروس میں ملازمت کر رہا تھا۔ ڈور ٹو ڈور ڈاک کی ترسیل اس کے فرائض میں شامل تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ اور طرح طرح کے چہرے دیکھنے میں آتے تھے لیکن آج کچھ ایسا ہوا تھا کہ اسے اپنے آپ پر جیسے اختیار ہی نہ رہا تھا۔ ایسا ہی دلکش اور مسحور کن چہرہ تھا جس نے اس کے دل میں اتھل پتھل مچادی تھی۔ وہ بے خودی کے عالم میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ نمودار ہونے والے وجود نے شاید اس کی گستاخ نظروں کی بے باکی کا اندازہ لگالیا تھا اس نے بے اختیار اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈوپٹے کا زاویہ درست کیا اور بولی۔
"جی فرمایئے؟" اور شاہان چونک کر واپس آگیا بالکل یوں جیسے اس کے پاتال میں گرتے ہوئے وجود کو کسی نے بالوں سے پکڑ کر یک لخت زمین پہ پٹخ دیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر بولا۔
"جج جی.... وہ آپ کا کوریئر ہے۔ میڈم نیناں بصیر آپ ہی ہیں؟" جملے کے اختتام تک اس کا انداز استفہامیہ ہوگیا تھا۔
"جی! میں ہی ہوں۔ فرمایئے؟" اور شاہان نے بادل ناخواستہ خوب صورت پیکنگ والا وہ پارسل اس کی طرف بڑھادیا نیناں نے ہاتھ بڑھا کر پارسل وصول کیا تو اس کا ہاتھ شاہان کے ہاتھ سے مس ہوگیا۔ اس نے جلدی سے پارسل جھپٹتے ہوئے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔
لیکن شاہان کے پورے وجود کو جیسے ہائی وولٹیج کا الیکٹرک شاک لگا تھا اور وہ اپنی اس کیفیت پر سٹپٹا کر رہ گیا۔
اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور دل ہی دل میں خود کو صلواتیں سناتے ہوئے رسیونگ سلپ اس کی جانب بڑھائی۔

"سگنیچر پلیز۔" نیناں نے ہاتھ آگے بڑھا کر سلپ تھامی اور پھر سوالیہ نظروں سے شاہان کی طرف دیکھا تو شاہان نے اس کا مدعا سمجھتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں موجود بال پوائنٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔ نیناں نے سلپ پر نظریں جمائے بے خیالی میں ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کے نتیجے میں شاہان کو ہائی وولٹیج کا ایک مزید الیکٹرک شاک برداشت کرنا پڑا۔ نیناں نے جلدی سے بال پوائنٹ پکڑا اور سٹپٹاتے ہوئے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ اس دوران ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ تو شاہان کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چھپا معذرت خواہانہ انداز اسے بہت بھلا لگا تھا۔
ٹھیک اسی وقت اندرونی سمت سے ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز سنائی دی بالکل یوں جیسے کوئی چیز اونچائی سے نیچے گری ہو۔ اس کے ساتھ ہی زوردار چیخوں کی آواز بلند ہونے لگی یہ نان اسٹاپ آواز یقیناً" کسی بچے کے حلق سے برآمد ہو رہی تھی رسیونگ سلپ اور بال پوائنٹ نیناں کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا اور پھر اس کے حلق سے بھی ایک سریلی چیخ برآمد ہوئی۔
"ہائے میری بچی۔" اور پھر بدحواسی کے انداز میں نیناں غڑاپ سے دوازے کی اندرونی سمت غائب ہوگئی شاہان ہچکچاہٹ آمیز انداز میں چند لمحے کھڑا سوچتا رہ گیا اندر سے کسی چیز کے گرنے کی آواز پھر کسی بچے کی بے ساختہ چیخیں اور ہائے میری بچی کا نعرہ جہاں اس بات کی تصدیق کر گیا تھا کہ رونے والا بچہ نہیں بچی ہے وہیں کسی اچانک حادثے کی طرف اشارہ بھی تھا۔
"ہائے میری بچی۔" کا یہ مختصر نعرہ ایک ماں کی ممتا اور اپنی بچی کے لیے بے پایاں محبت کا اظہار تو ضرور تھا لیکن شاہان کے دل میں کئی شیش محلوں کے چھناکے سے ٹوٹ جانے کا سبب بھی تھا۔
حسن و خوب صورتی کا وہ مجسمہ اکیلا نہیں تھا بلکہ وہ کم از کم ایک بچی کی ماں تو ضرور تھی اور یہ بات شاہان کے لیے کسی سانحے سے کم نہ تھی۔ ایک مرتبہ جی میں آئی کہ چپ چاپ چلا جائے لیکن کم بخت دل اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ دل اس کا تھا لیکن دھڑکنیں کسی اور کی اسیر تھیں۔ چند لمحے وہ اپنے آپ سے نبرد آزما رہا لیکن پھر دل نے دماغ کو شکست دے دی اور اس کے قدم بے ساختہ اندرونی سمت اٹھتے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

"ٹرن.... ٹرن۔" ٹیلی فون بزر چلایا اور پھر ایک خوب صورت نسوانی ہاتھ نے ریسیور اٹھالیا۔
"ہیپی ویڈنگ اینورسری نیناں ڈارلنگ۔"
دوسری جانب سے ایک محبت بھری مردانہ آواز سنائی دی اور نیناں نے ایک ادا کے ساتھ ماتھے پر بکھر جانے والی زلفوں کی ایک شریر لٹ کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
"بس رہنے دو، سارے دن کے بعد اب فرصت ملی ہے تمہیں؟"
"اوہو! نیناں ڈارلنگ تمہیں پتا ہے پردیس میں رہنا کتنا مشکل کام ہے؟ سارا دن بیل کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ جیسے ہی کام سے فارغ ہوا بھاگا بھاگا اپنے اپارٹمنٹ پہنچا ہوں اور فوراً" تمہیں کال کر رہا ہوں۔ پتا ہے آج کے دن میں تمہیں کتنا مس کر رہا ہوں۔"
"ساری لفظوں کی جادوگری ہے۔ اگر مجھے اتنا ہی مس کرتے تو کیا ان چار سالوں میں ایک چکر بھی پاکستان کا نہیں لگا سکتے تھے؟"
"جان تمہیں تو پتا ہے کہ پاکستان میں جاب کتنی مشکل سے ملتی ہے کتنا عرصہ دفتروں کے چکر کاٹتا رہا جوتیاں چٹخاتا رہا لیکن اپنی جان کے لیے کچھ نہ کرپایا تمہارے اور علیزہ کے لیے ہی تو میں نے یہ قدم اٹھایا تھا غیر قانونی طریقے سے جان ہتھیلی پہ رکھ کر دوبئی پہنچا ہوں جو کچھ کر رہا ہوں تمہارے لیے ہی تو کر رہا ہوں اور تم آج بھی دل جلانے والی باتیں کر رہی ہو۔ آج تو ہماری شادی کی سالگرہ ہے کیا تمہیں میرا بھیجا ہوا گفٹ نہیں ملا؟"

"ہاں' ہاں مل گیا گفٹ لیکن کب تک ان بے جان چیزوں سے دل بہلاؤں شادی میں نے ان بے جان چیزوں سے نہیں تم سے کی ہے۔ ہر سال گفٹ بھیج دیتے ہو لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ان چار سالوں میں' میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھ پائی۔"

"نیناں ڈارلنگ! تمہاری ہر بات درست ہے لیکن جب میں تمہارے ساتھ تھا تب تم انہی بے جان چیزوں کے لیے مجھ سے جھگڑا کرتی تھیں اور اب جب میں نے تمہارے لیے ان چیزوں کے انبار لگا دیے ہیں تو اب تم میرے لیے تڑپ رہی ہو۔ سچ میں انسان کتنا خود غرض ہے کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ اللہ کی بندی میں یہاں کوئی عیش نہیں کر رہا۔ دن رات شدید محنت کرتا ہوں۔ اپنا پسینہ بہا کر اس کے بدلے تمہارے لیے آسائشیں خریدتا ہوں یہ بھی تو سوچو کہ جدائی کی یہ سزا میں بھی تو کاٹ رہا ہوں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی' مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ راتوں کی یہ تنہائی اور سونا بستر میری جان لے لے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ساری آسائشیں تم نے فراہم کر دی ہیں لیکن ایک تنہا عورت صرف ایک معصوم بچی کے ساتھ زندگی کیسے کاٹ سکتی ہے؟ تصور کرو' میں تھک گئی ہوں' پتا ہے آج علیزہ کو کرنٹ لگ گیا تھا میں اسے کس طرح اسپتال لے گئی' کس طرح میں نے خود کو اور بچی کو سنبھالا یہ میں ہی جانتی ہوں اگر تمہارا واپسی کا ارادہ نہیں بنتا تو اپنے اس "تحفے" کو بھی وہیں منگوالو۔ میں کہاں تک اس کا خیال رکھوں تمہارا بھیجا ہوا گفٹ وصول کرنے دروازے تک گئی تھی تو اس نے کرنٹ لگوا لیا۔ ایک دن چھری سے ہاتھ کاٹ لیا تھا۔ کسی کروٹ چین نہیں تمہاری بیٹی ہے نا تم پر ہی گئی ہے۔"

"دیکھو نیناں فضول باتیں نہیں کرو تم ماں ہو اس کی میں اتنی دور پردیس میں تمہاری اور علیزہ کی یاد کے سہارے وقت گزار رہا ہوں فون کرتا ہوں تم سے محبت بھری باتیں کرنے کے لیے لیکن تم فون پر بھی جلی کٹی سنانے بیٹھ جاتی ہو۔ پتا نہیں کیوں تم شروع دن سے میرے ساتھ یہی سلوک کر رہی ہو۔ کاش جتنی خوب صورت تم خود ہو اتنی ہی خوب صورت تمہاری سیرت بھی ہوتی۔"

"ہاں' ہاں میں تو ہوں ہی بد سیرت تیزاب پھینک دو میرے چہرے پر تاکہ صورت بھی ویسی ہو جائے جلن ہوتی ہے نا میری خوب صورتی سے؟"

"اللہ تمہیں عقل دے نیناں..... لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا ہو گا نہیں! میرے ہی مقدر پھوٹے تھے جو میں نے تم سے شادی کی واہ بصیر چوہان! تمہیں بھی پوری دنیا میں اور کوئی نہیں ملی۔" اس نے سخت غصے کے عالم میں ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور لائن بے جان ہو گئی نیناں نے ایک نظر ریسیور کو گھورا اور پھر اس نے بھی ایک دھماکے سے ریسیور واپس پٹخ دیا۔

☆ ☆ ☆

جونہی وہ اندرونی کمرے میں داخل ہوا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بچی ساکت ہو چکی تھی اور دیوار پر موجود الیکٹرک بورڈ کے قریب بے سدھ پڑی تھی۔ جبکہ دیوار پر موجود الیکٹرک بورڈ کی ساکٹ میں شو کی جگہ ایک اسٹیل کا چمچہ پھنسا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاہان کو ایک ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ ہوا کیا ہے؟ نیناں بچی کا سر گود میں رکھے زارو قطار رو رہی تھی اور اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں آنسو دیکھ کر شاہان تڑپ کر رہ گیا وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔

"معافی چاہتا ہوں میڈم! لیکن بچی کی چیخیں سن کر خود کو روک نہیں پایا بچی کو الیکٹرک شاک لگا ہے آپ بیٹھیے میں دیکھتا ہوں۔" اور نیناں آہستہ سے بچی کو خود سے الگ کرتے ہوئے ایک سائیڈ پر ہٹ گئی۔ شاہان نے جلدی سے بچی کی نبض چیک کی جو بڑی سست روی سے چل رہی تھی۔

"اسے فوراً اسپتال لے جانا پڑے گا۔" اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد شاہان کی موٹر سائیکل فراٹے بھرتی ہوئی ہاسپٹل کی سمت اڑی چلی جا رہی تھی۔ نیناں بچی کو گود میں لیے اس کے ہمراہ تھی دو تین گھنٹے کی مصروفیت کے بعد جب شاہان واپس نیناں کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو بچی مکمل طور پر ہوش میں تھی اور اس کی حالت بھی کافی حد تک بہتر تھی۔

"میں کس طرح سے آپ کا شکریہ ادا کروں اگر آج آپ نہ ہوتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔" نیناں نے تشکر آمیز نگاہوں سے شاہان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکریے کی کوئی ضرورت نہیں' انسانیت کے ناتے یہ میرا فرض تھا ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"جی ضرور!" نیناں نے استفہامیہ انداز میں شاہان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں میرا مطلب ہے کہ آپ کے شوہر یا دوسرے فیملی ممبرز.....؟" نیناں نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔

"علیزہ کے علاوہ میرا اور کوئی سہارا نہیں اور بصیر دبئی میں ہوتے ہیں پچھلے چار سال میں انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں کہ ہم لوگ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔"

"اوہ..... ویری سیڈ۔" نیناں کے مختصر جواب نے شاہان کو آزردہ کر دیا اتنی خوب صورت لڑکی اور پھر اتنی معصوم اتنی پیاری بچی ..... شاہان کو اس شخص کی بد قسمتی پر ترس آیا جو انہیں چھوڑ کر دبئی جا بیٹھا تھا اور یہی بات شاہان کے لبوں پر بھی آ گئی نیناں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔

اس نے پہلی مرتبہ شاہان کی پرسنالٹی پر غور کیا تھا تیکھے نقوش اور اونچے لمبے قد کا مالک شاہان مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور ایک اس کا شوہر تھا جس کی شکل تھی نہ صورت' پانچ فٹ قد' سیاہ رنگت پر پھولا ہوا جسم۔ اچانک ہی اس کے اندر ایک سرکش سی لہر اٹھی جو اپنے ساتھ بہت کچھ بہا لے گئی۔ اس کی سوچ کا انداز تبدیل ہو چکا تھا اور اب وہ گہری نظروں سے شاہان کا مشاہدہ کر رہی تھی اس کی نسوانی حسیات نے اس پر چند لمحوں میں ہی یہ راز آشکار کر دیا کہ شاہان کی نظروں میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات ہیں اور اس کا آج کا یہ اقدام صرف انسانی ہمدردی کے ناتے نہیں تھا۔

"میڈم اگر آپ ناراض نہ ہوں تو کیا میں بچی کا پتا کرنے دوبارہ حاضر ہو سکتا ہوں؟" شاہان نے قدرے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں دریافت کیا اور نیناں کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"صرف بچی کا نہیں آپ میرا پتا کرنے بھی آ سکتے ہیں۔" اور شاہان بھونچکا رہ گیا اسے شاید اتنی جلدی نیناں سے اس بے باکی کی توقع نہ تھی۔ بہرحال جو بھی تھا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں؟ اس کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے اور وہ خوشی سے سرشار ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"تم یہ گھر چھوڑ دو۔" شاہان نے کہا۔

"اگر گھر چھوڑ دوں تو پھر کیا کریں گے میں رہوں گی کہاں؟" نیناں نے بے اختیار سوال کیا۔

"وہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو میں سارا انتظام کر لوں گا۔" شاہان نے پر اعتماد انداز میں جواب دیا۔

بچی کو کرنٹ لگنے کے اس چھوٹے سے حادثے نے دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا۔ شاہان بلا ناغہ بے دھڑک یہاں آتا تھا۔

شروع شروع میں تو صرف دن کے وقت ہی اس کے چکر لگا کرتے تھے لیکن پھر اکثر اوقات وہ رات میں بھی یہیں رکنے لگا تھا۔ دونوں کسی ان دیکھی قوت کے تحت آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے تھے اور اب وہ اتنا آگے بڑھ چکے تھے کہ واپسی کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا شاہان اکثر نیناں اور علیزہ کو اپنی موٹر بائیک پر آؤٹنگ کے لیے لے جاتا تھا۔ کئی مرتبہ باہر کھانا کھاتے اور اکثر اوقات پارکوں کی سیر کی جاتی دونوں

ایک دوسرے میں اتنا گم ہو گئے کہ انہیں اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور اردگرد کا ہوش ہی نہ تھا لیکن "تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں" اور اس طرح کی باتیں تو ویسے بھی زیادہ عرصہ چھپی نہیں رہ سکتیں سو یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلی آواز خالہ پروین نے اٹھائی انہوں نے نجمہ سے کہا۔

"ہائے ہائے لچھن تو دیکھو مہارانی کے شوہر بے چارہ پردیس میں دھکے کھا رہا ہے اور یہ یہاں گل چھرے اڑا رہی ہے وہ موا مسٹنڈا سارا سارا دن پھٹ پھٹی پہ لیے گھومتا ہے اور راجکماری یوں اس کے گلے میں بانہیں ڈالے پھرتی ہے جیسے اسی کی بیوی ہو پتا نہیں کون نامراد ہے توبہ 'توبہ کیا زمانہ آگیا ہے۔"

اور پھر اسی طرح کی چہ میگوئیاں ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری زبان پر گردش کرتی پورے علاقے میں پھیل گئیں اور یہی تہیں بات مردوں سے بھی چھپی نہ رہ سکی اور پھر وہ مرزا توقیر بیگ ہی تھے جنہوں نے بصیر چوہان کا نمبر ڈائل کیا اور تمام حالات و واقعات دوبئی تک منتقل کر دیے۔

اس رات نیناں نے بصیر کی کال موصول کی تو وہ سخت غصے میں تھا اس نے نیناں کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی اور اسے بہت سخت سست کہا لیکن نیناں شرمندہ ہونے کی بجائے مزید بھڑ گئی اور جنونی انداز میں بولی۔

"مجھے تم سے طلاق چاہیے بصیر۔ اگر تم جان ہی چکے ہو تو یہ بھی جان لو کہ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، تمہیں تمہارا دوبئی مبارک! مجھے طلاق کے کاغذ بھجوا دو۔" بصیر نیناں کی بات سن کر سخت طیش میں آ گیا اور اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈ پڑا لیکن سننے والا کون تھا؟ نیناں نے تو ریسیور دیوار پر دے مارا تھا اور اب یہی سب کچھ اس نے شاہان کو کہہ سنایا تھا جس کے جواب میں شاہان نے اسے گھر چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔

"میرے پاس گھر بھی ہے اور ضروریات زندگی کی تمام اشیاء بھی۔۔۔ لیکن میرا گھر سونا پڑا ہوا ہے کیونکہ تمہاری طرح میں بھی اس دنیا میں تنہا ہوں۔ والدین ٹرین کے ایک حادثے میں وفات پا چکے ہیں چونکہ اکلوتا تھا اس لیے تب سے اب تک اکیلا ہوں اور یہ اکیلا پن مجھے اپنی ذات کے ادھورا ہونے کا احساس دلاتا تھا لیکن اب مجھے تمہارا ساتھ مل گیا ہے اب میں اکیلا نہیں رہا 'میں ادھورا نہیں رہا۔ تمہیں پا کر میں مکمل ہو گیا ہوں نیناں۔

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو

اگر تم تیار ہو تو میرا گھر حاضر ہے۔" شاہان نے جذباتی انداز میں کہا اور پھر کچھ دیر کی بحث و تکرار کے بعد نیناں بھی شاہان کے خیال سے متفق ہو گئی اور پھر وہ دونوں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں تمام پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

بصیر کا برا حال تھا کبھی وہ طیش میں آ جاتا تو کبھی سخت افسردہ و رنجیدہ ہو جاتا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر واپس پاکستان پہنچ جائے 'نیناں کی تلخ گوئی جہاں اس کے ذہن و دل پر ہتھوڑے برسا رہی تھی وہیں اس کی بے وفائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا وہ نیناں سے شدید محبت کرتا تھا اور علیزہ میں تو اس کی جان تھی لیکن نامساعد حالات اور فاقہ کشی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ان سے علیحدگی پر تیار ہو گیا تھا اور پھر بڑی مشکلوں کے بعد کسی نہ کسی طرح دوبئی آن پہنچا تھا اور یہاں آ کر بھی وہ بیوی اور بیٹی کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکا تھا سوتے وقت بیوی کی شبیہہ آنکھوں کے سامنے ہوتی تو کام کرتے ہوئے ننھی علیزہ کی قلقاریاں اس کی سماعتوں میں گونجتی رہتی تھیں۔

اس نے دن رات محنت اور مشقت کر کے حالات کو شکست دی تھی۔ وہ اپنی بیٹی اور اپنی بیوی کی عسرت زدہ زندگی کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ غربت سے تو نکل آیا تھا لیکن اس مصیبت سے کیسے نکل پائے گا جو اچانک اس کے سر آن پڑی تھی۔ اس کا

ے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حالات کو تو ں نے شکست دے دی تھی لیکن اپنی تقدیر سے کیسے ۔ یہ اس کے بس میں نہیں تھا لیکن وہ اپنے گھر کو ا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا وہ اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچانا تا تھا۔

نیناں کے باغیانہ الفاظ اس کے کانوں میں زہر دل رہے تھے لیکن وہ پھر بھی اس کے پاس پہنچنا چاہتا اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن اس کا ذریعہ اس کی سمجھ ں نہیں آ رہا تھا۔ فون تو اس دن کے بعد سے اسے ہ ڈیڈ ہی ملا تھا اور واپس پہنچنے کے لیے اسے فتاری دینا پڑتی کیونکہ وہ ناجائز طریقے سے دوبئی چا تھا اور دوبئی میں غیر قانونی طریقے سے رہنے والے ب جب واپس پاکستان جانا چاہتے تھے تو خود کو رفتاری کے لیے پیش کر دیتے پھر پندرہ سے بیس دن میں جیل میں گزارنا پڑتے اور پھر انہیں حکومت کی ف سے سرکاری خرچے پر بائی ایئر ڈی پورٹ کر دیا ا لیکن وہ اتنے دن گزارنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ں کا تو ایک ایک لمحہ مشکل سے گزر رہا تھا وہ پل پل گاروں پہ لوٹ رہا تھا وہ یہ رسک نہیں لے سکتا تھا وہ تو کر پاکستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر وہ گرفتاری کیونکر دیتا۔

سوچوں کا ایک بحر بے کراں تھا جس میں وہ کسی تنکے ی طرح ڈوبتا ابھرتا رہا۔ لیکن کوئی بات اس کی سمجھ ں نہ آئی اس نے ریموٹ اٹھا کر اضطراری انداز میں ی وی آن کر دیا۔ اردو چینل تھا جس پر کوئی گلوکار ایک وب صورت غزل پیش کر رہا تھا۔

مجھ کو مری حیات سے باہر نکال کر
تم کو ملا ہے کیا مجھے مشکل میں ڈال کر

تم سے بچھڑ کے میں کہیں اچھی گزارتا
کیا پا لیا ہے آج ان زخموں کو پال کر

غزل کے بول سن کر اس کے دل کے تار جھنجھنا ٹھے اسے یوں لگا کہ شاید شاعر نے اسی کے جذبات کے عکاسی کی ہے۔ گلوکار نے بھی خوب دل لگا کر تان اٹھائی۔

دے کر دکھوں کے پھول اور تمغہ جدائی کا
تاکید کر رہے ہیں کہ رکھنا سنبھال کر

اس کے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور آنکھوں کے سامنے ایک جالا سا تن گیا۔ اب وہ پوری طرح غزل کے الفاظ اور گلوکار کی سحر انگیز آواز میں گم ہو چکا تھا۔

ٹھوکر لگی ہے اس طرح سنبھلا نہ جا سکا
اے دوست میرے پھر کوئی ایسا کمال کر

مانا کہ ہم سے درد کا رشتہ نہیں رہا
کیوں جا رہے ہو اس طرح یوں ہم کو ٹال کر

اور اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس کے تخیل کے پردوں میں نیناں کی خوب صورت شکل نمودار ہوئی جو اس سے ہاتھ چھڑا کر اس سے کہیں دور جا رہی تھی اور ننھی علیزہ ماں کا پلو پکڑے روتی بلکتی اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ اس کا گھر 'اس کی گرہستی پر جیسے بجلی گر گئی تھی اور آن کی آن میں سب کچھ جل کر خاک ہو گیا تھا۔ ادھر گلوکار کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

ہم کو ملا کے خاک میں خوش ہو گئے ہیں وہ
جو چل رہے ہیں خاک پر دامن سنبھال کر

اس کے حلق میں جیسے کانٹے اتر آئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا کھڑا ہو اور سورج آگ برسا رہا ہو۔ اسے شدید پیاس محسوس ہوئی اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور سائیڈ ٹیبل پر سے گلاس اٹھانے کی کوشش کی لیکن گلاس اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر فرش پر آ رہا اور کرچی کرچی ہو گیا۔ اسی وقت گلوکار نے غزل کا مقطع کہا۔

ہمدم کسی کی یاد نے بے حال کر دیا
اب کیا کریں گے ہم کوئی ساغر اچھال کر

بصیر نے غصیلے انداز میں ٹی وی آف کیا اور ریموٹ دیوار پر کھینچ مارا۔

☆ ☆ ☆

نیناں اور شاہان ایک دوسرے میں گم تھے۔ شاہان کے گھر شفٹ ہوئے آج نیناں کو تیسرا دن تھا اور اس کے دل میں کسی قسم کا کوئی پچھتاوا یا ملال ہرگز نہیں تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ لیکن آج اس پرسکوت سمندر میں تلاطم پیدا ہو گیا تھا اور پہلی بار نیناں کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔

رات کے تقریباً" ساڑھے گیارہ کا وقت تھا دونوں آپس میں محبت بھری گفتگو کر رہے تھے کہ ساتھ والے کمرہ سے علیزہ کی زور زور سے رونے کی آواز بلند ہوئی اور ان تین دنوں میں ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ علیزہ ہمیشہ رات کو نیناں سے لپٹ کر سوتی تھی۔ لیکن یہاں آ کر نیناں اسے سلانے کے بعد شاہان کے کمرے میں آجاتی۔ جونہی علیزہ کی آنکھ کھلتی وہ رونے لگتی اور نیناں بھاگی بھاگی واپس علیزہ کے کمرے میں آجاتی بہلا کر، پچکار کر اور علیزہ کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اسے سلاتی اور واپس شاہان کے کمرے میں چلی جاتی بچی شاید اس نئے ماحول سے اور اس نئی تبدیلی سے ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی اور رات میں تین چار مرتبہ جاگ کر ضرور رونے لگتی۔ شاید بچی تنہائی سے ڈر جاتی تھی۔ نیناں جانتی تھی کہ آہستہ آہستہ وہ اس ماحول کی عادی ہو جائے گی۔ لیکن شاید شاہان کو نیناں کا رات کو اس طرح بار بار اٹھ کر علیزہ کے کمرے میں جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کل بھی اس کے تاثرات کچھ خراب ہوئے تھے لیکن نیناں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"چھوٹو نا جان بچی ہے آہستہ آہستہ ایڈجسٹ کر لے گی موڈ خراب نہ کریں۔" اور شاہان مسکرا دیا تھا۔ لیکن آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ نیناں علیزہ کو سلا کر واپس شاہان کے کمرے کی طرف گئی تو اس کا دروازہ اندر سے بند پایا اس نے آہستہ سے دروازہ تھپتھپایا لیکن جواب ندارد۔۔۔۔ نیناں نے ذرا زور سے دروازہ بجایا تو شاہان کی تلخ آواز سنائی دی۔

"جاؤ اسی کے پاس بار بار اٹھ کر جانے کی زحمت سے تو بچ جاؤ گی۔"

"پلیز شاہان ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ، بچی ہے وہ معصوم ہے نا سمجھ، میں نے اسے سلا دیا ہے۔" نیناں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"تو کون سا مر گئی ہے دوبارہ اٹھ جائے گی۔ جاؤ اسی کے پاس۔" جواباً" شاہان کی دھاڑ بلند ہوئی اور نیناں دھک سے رہ گئی۔ ٹھیک اسی لمحے علیزہ پھر زور زور سے رونے لگی۔ شاہان کی دھاڑ کافی بلند تھی جسے سن کر بچی شاید دوبارہ ڈر گئی تھی۔ چند لمحوں تک نیناں ساکت و جامد کھڑی دروازے کو تکتی رہ گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر آندھی اور طوفان کی طرح علیزہ کے کمرے کی طرف لپکی اور پھر وہ ننھی علیزہ پہ پل پڑی اور ننھی علیزہ کے پھول جیسے رخسار سرخ ہو گئے نیناں جنونی انداز میں تھپڑوں سے علیزہ کو پیٹ رہی تھی اور ساتھ ساتھ چلاتی جا رہی تھی۔

"زندگی عذاب کر دی میری تم مر کیوں نہیں جاتیں۔ کون سا سانپ نکل آتا ہے کمرے میں جو بار بار چیخنے لگتی ہو؟" اور ننھی علیزہ زور زور سے چلانے لگی۔ اسے شاید اپنی ماں سے ایسے سلوک کی توقع نہ تھی اور ایسا ہوا بھی تو پہلی مرتبہ تھا۔

اس کی چار سالہ زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلوک ہوا تھا۔

"چپ کرو آواز نہ نکلے تمہاری۔" نیناں دھاڑ رہی تھی لیکن علیزہ کو اتنی سمجھ ہی کہاں تھی؟ جب اس کا رونا بند نہیں ہوا تو تھک ہار کر نیناں بھی بستر پر گر گئی اور رونے لگی۔ بچی بہت دیر تک روتی، بسورتی رہی لیکن نیناں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی پھر پہلے علیزہ سوئی یا نیناں اس کا اندازہ دونوں کو نہ ہوا۔

☼ ☼ ☼

بصیر کے ذہن میں اچانک ایک آئیڈیا آیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے یہ خیال اس کے ذہن میں پختہ ہوتا چلا گیا وہ جانتا تھا کہ اگر اسے پاکستان جلدی پہنچنا ہے تو اس سے بہتر اور کوئی دوسرا طریقہ ہو ہی نہیں سکتا تھا اس نے ریسیور اٹھایا اور جابر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ چند

ں کے بعد ہی دوسری جانب سے جابر کی پھاڑ کھانے ی غراہٹ بلند ہوئی۔

"جابر ہیر۔"

"جابر بھائی میں بصیر بات کر رہا ہوں آپ کے ہاں ر کرنے آیا تھا، پینٹ کا کام۔۔۔۔!" اور دوسری جانب ر لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی پھر شاید اسے پہچان کیا تھا۔

"بصیر! وہ پاکستانی؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"جی جی! جابر بھائی! مجھے آپ سے ایک ضروری کام ن پڑا ہے کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں۔" بصیر نے مینان کی طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"آجاؤ۔" دوسری جانب سے جھٹکے دار لہجے میں اب دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو ئی۔

جابر انڈین نژاد تھا اور دوبئی میں کئی ایسے دھندوں کی ریرستی کر رہا تھا جنہیں عرف عام میں دو نمبر کہا جاتا تھا تہائی اکھڑ مزاج اور ہاتھ چھٹ قسم کا بندہ تھا اور بصیر جو تہا کا محنتی آدمی تھا اور اعلا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ں نے محنت کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی تھی ر دوبئی تو وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ اسے پیسہ کمانا تھا۔۔۔۔ ت سارا پیسہ اور اس کے لیے اس نے یہاں آ کر ہر وہ کام کیا تھا جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا تھا اس نے زدوری بھی کی تھی، ہیلپر بھی رہا تھا اور پینٹ کا کام بھی کیا تھا۔ جابر سے اس کی ملاقات اسی کام کے دوران ہوئی تھی جب وہ جابر کے ایک ہوٹل میں پینٹ کا کام کر رہا تھا۔ اس کی محنت اور جانفشانی سے خوش ہو کر جابر ہی نے ایک جگہ فون کر کے اس کے لیے معقول کام کا بندوبست کیا تھا جابر حیران بھی ہوا تھا کہ اعلا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ رنگ کا کام کر رہا تھا پھر اس کی مجبوریاں جان کر اس نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اچھی جگہ سیٹ کروا دیا تھا اور آج وہی جابر۔۔۔۔ بصیر کو پھر یاد آ گیا تھا۔

بصیر کو لگ رہا تھا کہ اب اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پھر تقریباً" آدھے گھنٹے بعد بصیر مرشد بازار میں خوشبویات کی اس بہت بڑی دوکان کے سامنے کھڑا تھا جس کی عقبی سمت جابر کا دفتر تھا۔ جابر کے دفتر میں داخل ہونے سے پہلے اس کی تلاشی لی گئی جس پر اس نے کوئی اعتراض نہ کیا طویل الجثہ جابر ایک بہت بڑی ٹیبل کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر براجمان تھا اور کسی گینڈے سے مشابہ نظر آتا تھا۔ بصیر نے سلام کیا تو اس نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"بولو؟ کیا کام ہے؟" بصیر ابھی پوری طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ جابر کی مخصوص غراہٹ آمیز آواز بلند ہوئی۔

"وہ جابر بھائی! مجھے فوراً" پاسپورٹ بنوانا ہے کچھ مسئلہ ایسا ہو گیا ہے کہ فوری طور پر پاکستان۔۔۔۔"

"تین دن سے پہلے نہیں مل سکتا۔" بصیر کی بات درمیان ہی سے کاٹتے ہوئے جابر کی غراہٹ آمیز آواز بلند ہوئی۔

"تین ہزار درہم خرچ ہوں گے، پہلے کاؤنٹر پر جمع کروا دو، تین دن بعد وہیں سے پاسپورٹ وصول کر لینا اب جاؤ۔" اور بصیر تھوک نگلتے ہوئے اٹھ کر دفتر سے باہر نکل آیا۔

جابر کا رویہ اس کا بات کرنے کا انداز عجیب، غریب تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا ہی ہے اور پھر وہ رقم ادا کرنے کے بعد واپس اپنے اپارٹمنٹ آ گیا۔ یہ تین دن اس نے کس طرح گزارے تھے وہی جانتا تھا۔ ٹھیک تین دن بعد وہ نا صرف پاسپورٹ وصول کر چکا تھا بلکہ اسی رات کی فلائٹ سے واپس پاکستان جانے کی تیاری بھی کر چکا تھا۔ علیزہ کے لیے، نیناں کے لیے، اس نے خوب شاپنگ کی، علیزہ کے لیے کھلونے، چاکلیٹ اور نیناں کے لیے بھی بہت ساری چیزیں شامل تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نیناں کے نین کہیں اور لڑ چکے ہیں وہ یہ سب کرنے پر مجبور تھا اس کا دل نینا کو بے وفا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ضرور کوئی نہ کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی نیناں کو، وہ روٹھ گئی تھی اس سے۔

"میں منالوں گا اس کو۔۔۔ اس دوری پر معافی مانگ لوں گا اس سے۔۔۔ محنت ہی کرنی ہے نا؟ وہیں پاکستان میں کر لوں گا۔" اس نے سوچا وہ ایئرپورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھا ان ہی سوچوں میں غلطاں تھا جب ایک آواز پر اسے بے اختیار چونکنا پڑا۔

"مسٹر بصیر چوہان؟" ایئرپورٹ سیکیورٹی کے دو آفیسرز! اس کے قریب موجود تھے جن کی سوالیہ نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"جی کیا بات ہے؟" اس نے حیرت زدہ انداز میں سوال کیا۔ تو سیکیورٹی اہلکار کا ہاتھ مضبوطی سے اس کے کندھے پر آجما۔

"یو آر انڈر اریسٹ، جعلی پاسپورٹ استعمال کرنے کے جرم میں آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"تڑاخ۔۔۔" تھپڑ اتنا ہی زوردار تھا کہ نیناں الٹ کر نیچے جا گری۔۔۔ وہ تو فرش پر بچھے دبیز قالین کی مہربانی تھی کہ نیناں کو مزید کوئی چوٹ نہیں آئی ورنہ جس انداز میں وہ اچھل کر نیچے گری تھی اگر صرف فرش ہوتا تو نیناں کے جسم کی کوئی نہ کوئی ہڈی یقیناً" اپنی جگہ تبدیل کر چکی ہوتی۔ لیکن یہ تھپڑ بھی خوب صورت اور دھان پان سی نیناں کے لیے کچھ کم نہیں تھا! اس کے سرخ و سپید گال پر انگلیوں کے واضح نشان ثبت ہو گئے تھے اور ان میں سے خون جھلک رہا تھا۔

وہ جہاں گری تھی وہیں کے وہیں ساکت پڑی رہ گئی۔ اس تھپڑ کی گونج نے اس کی روح تک کو زخما دیا تھا، وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ مردانہ وجاہت کا وہ شاہکار جسے اس نے اپنی محبت کی عبادت گاہ میں دیوتا کے رتبے پر فائز کیا تھا اس کے ساتھ یہ سلوک بھی کر سکتا ہے؟ وہ جس کے لیے اس نے اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ ڈالا تھا، وہ جس کے لیے اس نے اپنی گرہستی کو آگ لگا دی تھی، وہ جس کے لیے اس نے اپنی دنیا اور اپنی عاقبت دونوں خراب کر لی تھیں اس کا یہ روپ بھی ہو سکتا ہے؟

"نہیں نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا، مجھے وہم ہوا ہے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔" اس نے حیرت اور بے یقینی کے عالم میں سوچا لیکن حلق میں گھلتی ہوئی کڑواہٹ، آنکھوں سے بہنے والا نمکین پانی اور رخسار سے اٹھتی ہوئی ٹیسیں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں اس پر دل کھول کر ہنس رہی تھیں، قہقہے لگا رہی تھیں اور یہ سب کچھ حقیقت کا احساس دلانے کے لیے ناکافی نہیں تھا۔

"حد ہوتی ہے۔۔۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے! اس گھر میں یا تو میں رہوں گا یا پھر۔۔۔ یا پھر یہ بچی سمجھیں تم۔" شاہان دھاڑ رہا تھا پھر وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا اور کچھ ہی دیر کے بعد زوردار آواز کے ساتھ دھڑ سے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی وہ ڈیوٹی پر جا چکا تھا اور نیناں۔۔۔ وہ ساکت و جامد وہیں پڑی تھی۔

"کیا ہے یہ سب؟ کیوں ہے؟ یہ سب تو ٹھیک نہیں ہے! کیا اسی لیے اس نے یہ قدم اٹھایا تھا؟ کیا اس کا یہ فیصلہ غلط تھا؟ کیا اسے واپس چلے جانا چاہیے؟ لیکن نہیں! واپس کہاں؟ وہ تو ساری کشتیاں جلا کر آئی ہے۔" نیناں سوچ رہی تھی ایک لاوا تھا جو پک رہا تھا اندر ہی اندر اسے جھلسائے دے رہا تھا پھر اس کے اندر نفرت کی ایک لہر انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور اس کا پورا وجود جیسے زہر میں ڈوب گیا۔ اس کی مٹھیاں آہستہ آہستہ بھنچنے لگیں اور تنفس کی رفتار تیز ہو گئی اس کے نتھنے تیزی سے پھول اور پچک رہے تھے اور سانسوں کی آوازیں یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی ناگن پھنکار رہی ہو وہ دھیرے دھیرے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اب اس کا رخ صحن کی طرف تھا۔

بہت مشکلوں سے اس نے شاہان کا موڈ درست کیا تھا لیکن بمشکل دو دن گزرے تھے اور آج۔۔۔ آج پھر وہی ہوا تھا اس نے معمول کے مطابق ناشتا تیار کیا تھا شاہان کے کپڑے پریس کیے تھے اور اب شاہان کے ساتھ بیٹھی ناشتا کر رہی تھی کہ اچانک صحن میں کھیلتی علیزہ کے رونے کی آواز سن کر وہ بے اختیار صحن کی

ب لپکی تھی جب شاہان نے مضبوطی سے اس کی ئی تھام کر اسے واپس بٹھا دیا تھا۔

"نہیں! رونے دو اسے ناشتا کیے بغیر نہیں اٹھو گی ۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو شاہان! بچی ہے وہ میری ، رے وجود کا حصہ ہے وہ۔"

"غلاظت ہے وہ گندگی ہے تمہارے شوہر کی۔ ی کے وجود کا حصہ ہے وہ تمہارے وجود کا نہیں۔" ہان دھاڑتے ہوئے بولا وہ سخت طیش میں آگیا تھا۔

"غلط بات نہیں کرو شاہان! وہ صرف میرے شوہر ، نہیں۔۔۔ میری بھی بیٹی۔۔۔"

"تڑاخ۔۔۔" نیناں کی بات مکمل ہونے سے پہلے ، شاہان کا ہاتھ گھوما تھا اور وہ اچھل کر فرش پر جا گری ی۔

اور اب۔۔۔ اب وہ صحن کی طرف جا رہی تھی ہان ڈیوٹی پر جا چکا تھا اور اس کا رخ صحن کے درمیان ں زمین پر لیٹی ننھی علیزہ کی جانب تھا جو اب بھی رو ہی تھی۔ نیناں کے دھیرے دھیرے اٹھتے ہوئے م عین علیزہ کے پاس جا رکے اور پھر وہ گھٹنوں کے ں بیٹھتی چلی گئی۔ چند لمحے خاموشی سے علیزہ کی شکل یکھتی رہی پھر بولی۔

"میری بیٹی نہیں ہو تم! غلاظت ہو تم۔۔۔ گندگی ہو م اپنے باپ کی۔۔۔ اور تمہارا باپ۔۔۔ تمہارا باپ نسان نہیں ہے۔ شیش ناگ ہے وہ، جس نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے جب سے میں نے اس سے ناد ی کی ہے میں یہ زہر پی رہی ہوں، قطرہ، قطرہ زہر لایا ہے اس نے مجھے۔۔۔ سمجھیں تم؟" وہ چیخی! لیکن س بے چاری کو اتنی عقل ہی کہاں تھی وہ تو اپنی معصوم معصوم آنکھوں سے اپنی ماں کو تکتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔

ماں۔۔۔ جس کے قدموں تلے جنت ہے، جس کی محبت کی مثالیں دی جاتی ہیں وہ ہمک ہمک کر رو رہی تھی بازو لہرا رہی تھی کہ اس کی ماں اسے اٹھا کر سینے سے لگا لے گی لیکن اس کی ماں۔۔۔ وہ اپنے حواسوں میں ہی کب تھی وہ تو جنونی انداز میں اپنی ہی کہے جا رہی تھی اس بات سے بے خبر کہ ساتھ والی چھت پر موجود خاتون پروفیسر ازکی نا صرف اس سارے ڈرامے کو بغور دیکھ رہی ہیں بلکہ حرف بہ حرف اس کی گفتگو بھی سن رہی ہیں جبکہ نیناں کہہ رہی تھی۔

"لیکن اب۔۔۔ اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، یہ زندگی میری اپنی ہے، یہ فیصلہ بھی میرا اپنا ہے، میں کسی کو اس میں زہر نہیں گھولنے دوں گی، نہ تمہارے باپ کو۔۔۔ اور نہ تمہیں، تمہارا باپ ایک شیش ناگ ہے اور تم۔۔۔ تم اس کی سنپولی ہو، غلاظت ہو تم۔۔۔ گندگی ہو تم اس کی۔۔۔ تمہارے اندر اس کا زہر بھرا ہوا ہے اور آج میں یہ زہر نچوڑ دوں گی! میری بیٹی نہیں ہو تم۔۔۔ سمجھیں۔۔۔ میری بیٹی نہیں ہو تم۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی اور پھر اس کے دونوں ہاتھ روتی بلکتی ننھی علیزہ کے گلے پر جم گئے۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، بچی نے ہاتھ پاؤں مارے، ننھے حلق سے چند گھٹی گھٹی خرخراہٹیں بلند کیں اور پھر ساکت ہو گئی، بچی مر چکی تھی۔۔۔ لیکن نیناں ابھی تک اس کا گلا دبوچے چیخ رہی تھی۔

"میری بیٹی نہیں ہو تم۔۔۔ میری بیٹی نہیں ہو تم۔" پروفیسر ازکی کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹ کر کانوں تک آ پہنچی تھیں اور وہ حیرت و خوف کے عالم میں منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئیں کافی دیر کے بعد ان کے حواس کچھ درست ہوئے تو وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ پہنچیں اور پھر اگلے ہی لمحے وہ ریسیور کانوں سے لگائے بول رہی تھیں۔

"ہیلو، پولیس اسٹیشن۔۔۔!"

☼ ☼

رمشا خالد

غیرت مند

اس نے کمرے اور برآمدہ دھونے کے ساتھ ساتھ کھڑکیوں اور دروازوں کو بھی خوب رگڑ رگڑ کر دھویا تھا' وانپو لگانے کے بعد سب پنکھے فل رفتار پر کھول کر برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے' ناقدانہ نظروں سے اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے لگی۔ چم چم کرتے درودیوار نے ساری تھکن سمیٹ کر طمانیت سے سرشار کردیا تھا۔

اپنے فرضی کالر اٹھا کر اپنا کندھا تھپکتے ہوئے اس نے خود کو شاباش دی اور کیاریوں میں پڑا پائپ اٹھا کر سرخ اینٹوں والا صحن دھونے لگی' کچن کے دروازے میں کھڑی اماں منع کرتی رہ گئیں۔

"آج اتنا کام کیا ہے یہ کل کرلینا' ارے بیمار پڑ جاؤ گی' انسان ہو مشین نہیں۔" مگران کی آواز' شڑاپ شڑاپ' میں ہی کھو گئی' دعا نوٹس لیے بغیر تندہی سے اپنے کام میں مصروف رہی' ڈیوڑھی کے پاس نکاسی آب کا بہت اچھا انتظام تھا۔ سلور بھاری ڈھکن ہٹا کر مضبوط جالی دار ہول سے سارا پانی گزارنے کے بعد کمر پر ہاتھ رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

رمضان المبارک کی آمد آمد تھی' اس پر صفائی کا بھوت سوار ہوا تو کل کا سارا دن لگا کر پودوں کی تراش خراش کی' گھر کے جالے اتارے' پنکھے صاف کیے' مسالے کے ڈبے صاف کرنے تک کچن کی انتہائی تفصیلی صفائی کی اور آج گھر کا کونا کونا دھو ڈالا پائپ لپیٹ کر ایک کونے میں ڈالتے ہوئے اس میں اتنی ہمت باقی نہیں تھی کہ اپنے قدموں پر چل کر اندر کمرے میں جاسکے کپڑے ویسے ہی گیلے تھے وہ ان کی پروا کیے بغیر صحن میں لگے واحد املتاس کے پیڑ کے گیلے فرش پر بیٹھ گئی۔ اینٹوں میں بسی پانی کی تازگی پیروں کے رستے اندر سرائیت کرنے لگی۔ اس نے تنے سے سر ٹکا دیا۔

صحن میں دائیں' بائیں طویل کیاریاں تھیں۔ کہیں ان میں موتیے' چنبیلی اور گلاب کے پودے لگے تھے تو کہیں اماں نے سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ سامنے برآمدہ تھا جس کے دائیں طرف کچن اور بائیں طرف اوپر کو جاتی سیڑھیاں اور اس سے آگے تین کمرے تھے۔ عصر کے بعد کا وقت تھا' دھیمے دھیمے چلتی ہوا میں گلاب' موتیا اور چنبیلی کی ملی جلی خوشبو ہلکورے لے رہی تھی اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں' ابھی اسے اونگھتے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ڈیوڑھی پار دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑانے لگا۔ وہ اچھل ہی تو پڑی تھی۔ اس اچانک افتاد سے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوگئی تھی اس سے پہلے کہ وہ حواس قابو کر کے اٹھتی اندر سے اماں خدایا خیر کا ورد کرتی تیز تیز قدموں سے باہر کو لپکیں' دعا بھی ان کے پیچھے ہولی' شہر کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ بچے بھی مل کر گلی میں شور مچاتے تو دل ہولنے لگتا تھا۔ آنے والے ابا تھے جوش سے سرخ ہوتا چہرہ غیر معمولی رفتار سے چلتا تنفس' آنکھوں میں تیرتی نمی اور چہرے کے ناقابل فہم تاثرات دونوں ازحد پریشان ہوگئی تھیں' وہ بار بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتے مگر باوجود کوشش کے کہہ نہیں پارہے تھے اس لیے ہونٹ بھینچ کر سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گئے' اماں اور وہ ہولتی ہوئی ان کے پیچھے لپکیں' وہ صحن کے بیچوں بیچ آسمان کی طرف منہ کر کے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھے' دوسرے سے گدی مسلتے تیز تیز سانس لے رہے تھے' دعا لپک کر برآمدے سے پلاسٹک کی کرسی اٹھا لائی' اماں جلدی سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر لائیں۔

"حیا کے ابا! خدارا اب بتا بھی دیجیے آخر ہوا کیا ہے' کیوں اتنے بدحواس ہیں؟ میرا تو بلڈ پریشر گرا جارہا ہے۔" اماں کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" پریشانی سے ان کا ہاتھ چھوا' وہ مسکراتے ہوئے اثبات میں سہلانے لگے۔

"پھر ہوا کیا۔" اماں چڑ گئیں۔

"مت پوچھو نیک بخت' کچھ مت پوچھو' چھوٹا منہ ہے اتنی بڑی بات کیسے بتاؤں۔" ان کی آواز لرز رہی تھی' اتنا کہہ کر چپ ہوگئے' خود کو سنبھالنے لگے مگر دل سنبھل ہی تو نہیں رہا تھا۔

"اللہ پاک نے ہم گناہ گاروں پر اپنے کرم کی انتہا

کردی ہے۔ ارے اپنے گھر کا بلاوا بھیجا ہے۔" ان کی آواز رندھ گئی' آنکھوں میں بڑی مشکل سے ٹکے آنسو ڈاڑھی بھگونے لگے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ اللہ کا واسطہ ہے صاف صاف بتائیے۔" اماں ان کی بات کو سمجھتے ہوئے سمجھ نہیں پارہی تھیں۔ بے یقینی سے پوچھا۔

"تم بیٹھو' میں بتاتا ہوں۔" وہ گھونٹ گھونٹ پانی حلق سے اتارتے اتھل پتھل دل کو سنبھالنے لگے' دعا نے کچھ فاصلے پر پڑا موڑھا اٹھا کر اماں کو دیا اور ابا کے ہاتھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے متجسس سی کرسی سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

"اب بتائیے بھی ابا۔" اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔

"جس فارماسیوٹیکل کمپنی سے میں نے حال میں سودا کیا ہے' ان کی طرف سے رمضان المبارک میں عمرے کے دو ریٹرن ٹکٹ ملے ہیں۔"

"واقعی ابا۔" دعا کی خوشی سے لرزتی چیخ بے ساختہ تھی جبکہ اماں ان کی حالت بالکل ابا کی سی ہو رہی تھی' لرزتے ہونٹ اور آنکھوں سے چھم چھم برستے شکرانے کے موتی' صحن حرم کی رونق دیکھنے اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اذانیں سننے کی تمنا تو ازل سے دونوں کے سینے میں مقید تھی۔ ابا سرکاری ملازم تھے' جوانی میں فکر معاش نے مہلت نہ دی اس کے بعد زندگی کے بکھیڑوں نے روکے رکھا' ریٹائرمنٹ کے بعد واجبات کی رقم سے میڈیکل اسٹور کھول لیا کہ ذمہ داریاں بھی تو پوری کرنی تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں حیا اور دعا' حیا کی تین سال پہلے شادی اور دعا کی منگنی کرچکے تھے' بچیوں کے فرائض سے فارغ ہو کر شریک حیات کے ہمراہ اللہ کے گھر کی زیارت کو جانے کا مصمم ارادہ تھا' خواہ اخراجات کے لیے اپنا گھر ہی کیوں نہ بیچنا پڑے' اماں کے شوق کا تو یہ عالم تھا کہ حج اور عمرے کی تمام دعائیں حفظ کر رکھی تھیں کہ کبھی تو بلاوا ہوگا' اگر نیت سچی ہو اور دل میں تڑپ ہو تو بلاوا آہی جاتا ہے' صبح میڈیکل اسٹور جاتے ہوئے ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کا نصیب کھلنے والا ہے۔ دعا کچھ دیر دونوں کو روتی آنکھوں سے ہنستا دیکھتی رہی پھر اپنے آنسو صاف کرتی' برآمدے میں رکھے فون اسٹینڈ کی طرف بھاگی تاکہ جلد از جلد یہ خوشخبری حیا کو سنا سکے۔

☼ ☼ ☼

پھر پاسپورٹ بنوانے' دیگر کاغذی کارروائیاں مکمل کروانے اور ملنے ملانے میں دن تیزی سے گزرتے چلے گئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ان کے جانے کے بعد دعا کہاں رہے ظاہر سی بات تھی وہ گھر میں اکیلی تو رہ نہیں سکتی تھی۔ شیخ صاحب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے' شیخانی جی کے بھی صرف ایک بھائی تھے جو سات سمندر پار رہتے تھے اور ایک بہن جو اتفاق سے دوسرے محلے میں رہتی تھیں ان کے ہاں دعا کے رہنے میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ ان کے منجھلے بیٹے صائم کے نام کی انگوٹھی دعا کے ہاتھوں میں سجی تھی' لوگوں کی انگشت نمائی کے ڈر سے خالہ نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا یہ مسئلہ نجانے کب تک انہیں پریشان رکھتا۔ حیا نے آکر ہر غم غلط کردیا تھا۔

"اماں! آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں بھلا بہن کے گھر کے ہوتے دعا کو کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ اپنے ایک سالہ بیٹے ارسلان کو کندھے پر ڈال کر تھپکتے ہوئے بولی دو دن پہلے ہی اس کے شوہر اسے چھوڑ کر گئے تھے۔

"مگر حیا دوسرے شہر کی بات ہے تمہاری خالہ کو نجانے کیسا لگے' اور تمہارے سسرالیوں اور داماد صاحب کو اچھا نہ لگا تو؟" اماں کو یہی تشویش تھی۔

"دوسرے شہر کی آپ نے خوب کہی اماں' حیدر آباد کون سا سات سمندر پار ہے کراچی کے پچھواڑے ہی تو ہے اور خالہ اب بھی آپ کی وہی چھوٹی بہن ہیں جو آپ کے ہر فیصلے کو ہمیشہ سے سر آنکھوں پر بٹھاتی آرہی ہیں دعا کے رشتے کے بعد سے تو آپ نے خالہ کو ہوا ہی بنا دیا ہے وہ سنیں گی تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔ جہاں تک میرے سسرال والوں کی بات ہے وہ روشن خیال بھلے لوگ ہیں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا جلال کو تو بہت اچھا لگے گا۔" ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں یقین دلایا اور پھر شام کو جب جلال اور حیا کی ساس نے فون کرکے دعا کو بھیجنے پر اصرار کیا تو انہیں مطمئن ہونا ہی پڑا مگر دعا وہ تو یہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی اور صاف انکار کردیا۔

"اماں میں اکیلی رہ لوں گی مگر حیا کے گھر کسی صورت نہیں۔" اس کے اٹل لہجے پر اماں سر پکڑ کر رہ گئیں۔ حیا کو پتا چلا تو وہ انہیں تسلی دیتی دعا کے پاس چلی آئی جو ہر فکر سے بے نیاز بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ممتاز مفتی کی "لبیک" میں کھوئی تھی۔

"کیا ہے؟" اسے کڑے تیوروں سے اپنی طرف گھورتا پاکر اس نے کتاب پر سے نظریں ہٹائیں۔

"اماں! کو دیئے گئے تمہارے حالیہ بیان کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔" حیا نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر ریک میں رکھی اور خود اس کے قریب کہنی کے سہارے نیم دراز ہو کر سر ہتھیلی پر ٹکا دیا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو۔" وہ منمنائی۔

"اف اللہ' دعا تم اتنی سی بات آج تک بھلا نہیں پائیں۔"

"وہ اتنی سی بات تھی۔" وہ چلائی۔

اسے تین سال پہلے کی وہ دوپہر اچھی طرح یاد تھی جب شادی کے بعد پہلی بار حیا' جلال بھائی کے ہمراہ ملنے آنے والی تھی' بہنوئی سے ملنے کا اشتیاق اور نئی نئی رخصت ہوئی بہن سے ملنے کی چاہ' اس سے ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو رہا تھا کبھی دروازے سے جھانکتی تو کبھی چھت پر منڈیر سے لٹک جاتی' خدا خدا کرکے ان کی آمد ہوئی۔ گلی چھوٹی تھی اس لیے گاڑی خالہ لوگوں کے گیراج میں پارک کرکے دونوں پیدل گلی میں داخل ہو رہے تھے گندمی رنگت' بڑی بڑی آنکھیں اور اتنی ہی بڑی مونچھوں کے حامل بارعب سے جلال سومرو سفید کلف لگے شلوار قمیص میں کندھوں پر اجرک ڈالے بہت زبردست لگ رہے تھے ان کے پہلو میں حیا چادر لیے خراماں خراماں شرمائی گھبرائی بہت جچ رہی تھی۔ اسے چادر میں دیکھ کر دعا کو حیرت ہوئی کیونکہ شادی سے پہلے وہ صرف دوپٹہ لیتی تھی۔ اس سے پہلی کہ وہ نیچے جاکر ان کی آمد کی خبر نشر کرتی گلی میں "صنوبر' صنوبر۔" کی آواز گونج اٹھی۔ اس نے گردن موڑی گلی کے دوسرے طرف سے بھولا بادشاہ دوڑتا آرہا تھا۔ بھولے بادشاہ کا نام تو کچھ اور تھا مگر محلے میں اسی نام سے مشہور تھا جب بھی گھر کا دروازہ کھلا پاتا بھاگ جاتا اور سر پٹ دوڑتا "صنوبر صنوبر" کی صدائیں لگاتا رہتا۔

وہ اپنے بچپن سے اسے اسی حالت میں دیکھ رہی تھی' بڑے بتاتے تھے اسے کسی صنوبر نامی لڑکی سے محبت ہوئی تھی۔ شادی کرنا چاہتا تھا مگر گھر والے راضی نہ ہوئے بہت مشکلوں سے سالوں منت سماجت کرکے انہیں منایا بہت کٹھنائیاں پار کرنے کے بعد اس کی شادی صنوبر سے طے ہو ہی گئی بہت ارمانوں سے بارات گئی صنوبر کا حنائی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے دنیا فتح کرلینے کے خمار میں واپسی کے سفر میں وہ مقدر کا سکندر بنا بیٹھا تھا مگر تقدیر کے کھیل ہمیشہ نرالے ہی ہوتے ہیں گاڑی سامنے سے آتے تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا گئی اسے معمولی چوٹیں آئیں مگر اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں قید جذبوں کی حدت لیے حنائی ہاتھ پل بھر میں بے جان ہوگیا۔

"تم تک آنے سے پہلے موت کو بھی پہلے مجھ پر سے گزرنا ہوگا۔" سرخ لباس میں سرخ خون میں ڈوبی بے جان مورت کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے اپنے ہی لفظ کانوں میں گونجے اور وہ ہوش کھو بیٹھا' وہ دن اور آج کا دن وہ آوارہ گلیوں میں بھٹکتا اپنی صنوبر کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا' اسے تاسف سے دیکھتے ہوئے وہ مڑنے کو تھی کہ وہ ہوگیا جو وہم و گمان میں نہ تھا۔ حیا کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے چوڑیوں سے سجے حنائی ہاتھ دیکھ کر نہ جانے بھولے بادشاہ کو کیا ہوا اس نے بے اختیار صنوبر صنوبر کہتے اس کے ہاتھ تھام لیے' حیا کی چیخ نکل گئی۔ جلال سومرو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹکے سے بھولے بادشاہ کو اس کے چاک گریبان سے

پکڑ کر پیٹنا شروع کردیا اور اتنا مارا‘ اتنا مارا کہ بس‘ ایک انسان دوسرے انسان کو ۔۔۔ وحشیانہ انداز میں پیٹ سکتا ہے‘ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی‘ سامنے جو کچھ ہورہا تھا اس کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹی‘ لرزش نے چلنا دو بھر کردیا تھا‘ وہ دیوار سے ٹکاکر بیٹھتی چلی گئی‘ نیچے حیا ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی‘ سارا محلہ اکٹھا ہوگیا تھا‘ بھولے بادشاہ کی حالت دیکھ کر اندازہ تو جلال کو بھی تھا یہ نارمل نہیں‘ مگر اس کے باوجود اس نے ہاتھ نہ روکے‘ وہ پاگل ہی سہی مگر اس نے اس کی بیوی کو ہاتھ لگانے کی جرات تھی‘ اس کے نزدیک یہ اس کی غیرت پر تازیانہ تھا۔ بالآخر محلے والوں نے بڑی مشکل سے جلال کو سنبھالا‘ تب تک بھولا بادشاہ بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے گھر والوں کو پتا چلا تو وہ بپھر گئے۔ وہ تو جلال پر کیس کرنا چاہ رہے تھے‘ مگر شیخ صاحب کے منت سماجت کرنے پر پرانی محلے داری کا پاس رکھتے چپ ہوگئے تھے۔

”بیٹا! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ داماد کا معاملہ تھا۔ شیخ صاحب جھجکتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکے۔

”انکل میں غیرت مند مرد ہوں‘ بے غیرت نہیں‘ جو نامحرم کو اپنی عزت کا ہاتھ پکڑتا دیکھ کر چپ رہتا۔“ وہ کچھ سننے پر تیار نہیں تھا۔ جلال سومرو کی ہٹ دھرمی اور غصے نے ان سب کو خائف کیا تھا۔ مگر گزرے تین سالوں میں حیا کو مطمئن اور خوش حال دیکھ کر ساری پریشانی رفع ہوگئی تھی۔ بقول حیا وہ بہت کیرنگ تھا۔ ساس‘ سسر سے بھی انتہائی عزت سے پیش آتا تھا۔ اب تو سب اس واقعے کو بھول چکے تھے۔ سوائے دعا کے‘ وہ بہت حساس تھی‘ پہلے دن سے ہی جلال سومرو کا ڈر کچھ ایسا اس کے دل میں بیٹھا تھا کہ لاکھ اس کے شائستہ رویے کے وہ اس سے اپنی بے تکلفی سلام دعا سے آگے بڑھا نہیں پائی تھی۔ اب بھی یہ ہی وجہ تھی جس کی وجہ سے وہ حیا کے گھر جانے پر راضی نہیں ہورہی تھی۔

”دیکھو دعا! اس ٹریجڈی کو ذہن پر سوار مت کرو‘ تمہارے دل میں جلال کا جو ڈر بیٹھا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے‘ ان کی جگہ ان کے جیسا کوئی اور غیرت مند مرد ہوتا وہ بھی ایسا کرتا‘ نارمل روٹین میں وہ بہت نرم مزاج اور اچھے ہیں ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا‘ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔“ لحہ بھر کے وقفے سے وہ پھر بولی۔

”تم اماں‘ ابا کا سوچو‘ وہ کس قدر خوش تھے تمہارے انکار نے انہیں کتنا پریشان کردیا ہے اور کچھ تو ان کے لیے مان جاؤ۔“ اسے چپ دیکھ کر حیا نے سمجھاتے ہوئے منت کی تو اماں‘ ابا کی پریشانی کے خیال سے اسے راضی ہونا ہی پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں‘ ابا کی پیکنگ کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی پیکنگ بھی شروع کردی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کہیں رہنے جارہی تھی‘ سمجھ نہیں آتا تھا کیا لے کر جائے اور کیا چھوڑ جائے۔ پھر ابا‘ اماں کی روانگی کا دن بھی آ پہنچا‘ جلال سومرو ایک رات پہلے ہی آگئے تھے۔ ان ہی کی گاڑی میں اماں‘ ابا کو ایئرپورٹ پہنچانے کے بعد وہ لوگ حیدر آباد روانہ ہوئے۔ جلال نے اس کے ساتھ آنے پر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”بھئی یوں تو ہمیں سالی صاحبہ دستیاب ہی نہیں ہوتیں‘ چلیں اسی بہانے کچھ دن ہی سہی مگر اپنی بہن کے ساتھ گزارنے کا موقع تو ملے گا۔“ سومرو منزل کے پورچ میں دعا کا سامان گاڑی سے اتارتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا‘ وہ شرمندہ سی ہوگئی تھی۔ حیا کی ساس بہت شفیق خاتون تھیں‘ بہت محبت سے ملیں‘ باقی سب نے بھی خوشدلی سے خوش آمدید کہا تھا۔ سومرو منزل جو باہر سے ایک عمارت رکھتی تھی‘ اندر سے تین حصوں میں منقسم تھی‘ درمیانی حصے میں حیا کے ساس سسر اور جیٹھ رہتے تھے‘ صحن میں دائیں دو دروازے تھے‘ ایک حیا کی دیورانی اور دوسرا حیا کے پورشن میں کھلتا تھا۔ اس نے پہلی بار حیا کا گھر دیکھا تھا۔ چھوٹا سا صحن‘ اس کے آگے برآمدہ جس میں ایک طرف جھولا اور دوسری طرف آسٹریلین طوطوں کا پنجرہ تھا‘ اس کے آگے لاؤنج جو بیک وقت ڈرائنگ روم کا کام بھی دیتا تھا‘ دو بیڈ روم اور ایک اسٹور‘ حیا نے گھر کو خوب صورتی اور سلیقہ سے آراستہ کر رکھا تھا۔

”حیا! تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے‘ بس پھولوں کی کمی ہے۔“ وہ پھولوں کی دیوانی تھی‘ گھوم پھر کر جائزہ لینے کے بعد بولی‘ حیا نے یہ ہی بات رات کے کھانے پر جلال سے کہہ دی‘ اگلے ہی دن وہ رنگ رنگ کے گلابوں کے گملے لے آئے‘ وہ ایک بار پھر ان کے خلوص سے شرمندہ ہوگئی۔ سب اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ حیا کی دیورانی اور جیٹھانی نے اس کے اعزاز میں اپنے اپنے پورشنز میں افطار ڈنر بھی دیے تھے۔ اماں‘ ابا اور خالہ کے فون بھی آتے رہتے تھے۔ حیا اسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔ وہ انکل (حیا کے سسر) کی اسٹڈی سے پڑھنے کے لیے کوئی نہ کوئی کتاب لے آتی‘ بہت جلد اس کا دل یہاں لگ گیا تھا۔ قریب سے دیکھنے پر اس نے جلال سومرو کو سلجھا ہوا نفیس انسان پایا تھا۔ وہ غصہ کے تیز ضرور تھے‘ مگر حیا جیسی ٹھنڈے مزاج کی لڑکی سے اچھی نبھ رہی تھی۔ اس مختصر سے عرصہ میں بغیر کسی شعوری کوشش کے خود بخود ان کا نام اس کی گڈ بک میں درج ہوچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

کافی دیر سونے کے بعد دعا کی آنکھ کھلی‘ ایئر کولر کی ٹھنڈک اور کمرے کی تاریکی سے پلکیں پھر بوجھل ہونے لگیں‘ آلکسی سے کروٹ بدلی‘ گھڑی کے ریڈیم ڈائل سے نظر ٹکرائی تو وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی‘ عصر کا وقت تنگ ہورہا تھا۔ جلدی جلدی نماز پڑھ کر کچن میں آگئی۔ حیا افطار کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

”حیا! تم تو مجھے ناکارہ کرکے چھوڑو گی‘ سارا دن آرام کر کرکے میں تو اب بے زار ہوچکی ہوں‘ لاؤ میں مدد کرادوں۔“

”سب کچھ تیار ہے‘ سالن صبح بنالیا تھا‘ چاول دم پر ہیں‘ پکوڑے اور سموسے بس میں تلنے لگی ہوں۔“ کڑاہی میں تیل ڈالتے ہوئے وہ مصروف سی بولی۔

”سویٹ ڈش بنائی ہے۔“ وہ فریج کھول کر جائزہ لینے لگی۔

”نہیں ٹائم ہی نہیں بچا بنانے کا‘ ایسا کرو تم جو کھانا چاہو بتادو میں جلال کو فون کردیتی ہوں‘ وہ بیکری سے لیتے آئیں گے۔“

”نہیں بابا میں نے کچھ نہیں کھانا‘ بلکہ آج کچھ بناکر کھلانا چاہ رہی تھی۔“ وہ فریج سے دو بڑے پیلے پیلے آم اور مینگو جوس کا ڈبا اٹھاتے ہوئے بولی۔

”شوق سے مگر دیکھ لو‘ ٹائم بہت کم ہے۔“

”ہوجائے گا۔“ اس نے تسلی دیتے ۔۔۔ ہی آم کا چھلکا اتار کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے شروع کردیے۔ بلینڈر میں مینگو جوس‘ تھوڑے سے آم کے ٹکڑے اور چینی ڈال کر بٹن دبادیا‘ ایک منٹ میں مینگو سیرپ تیار تھا۔ اسے باؤل میں ڈال کر باقی کے مینگو پیس اس میں ڈال کر ٹھنڈا کرنے کے لیے فریزر میں رکھ دیا۔ پانچ منٹ میں سویٹ ڈش تیار کرکے وہ پھر فارغ تھی۔ جب تک اس نے برتن سیٹ کیے اور حیا نے تلنے کا کام نبٹایا‘ جلال بھائی بھی آگئے اور افطار کا ٹائم بھی ہوگیا۔ رات کے کھانے کے بعد ابا کا فون آیا تو وہ ان سے بات کرتے کرتے آبدیدہ ہوگئی۔ وہ کہاں ان کے بغیر رہنے کی عادی تھی۔ جلال بھائی اور حیا کے آگے تو آنسو کنٹرول رکھے‘ مگر کمرے میں جاکر جی بھر کر رونے کا ارادہ تھا۔ وہ تراویح پڑھ کر لاؤنج میں آئی تو حیا کی جیٹھانی صائقہ اور دیورانی مائدہ آئی بیٹھی تھیں۔ ان کو سلام کرکے تواضع کا انتظام کرنے کچن میں آگئی‘ اس کی بنائی سویٹ ڈش کا باؤل ویسا کا ویسا رکھا تھا۔ کھانے کے بعد ابا کا فون آجانے کی وجہ سے میٹھا کھانے کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا۔ وہ ٹرے میں باؤل کے ساتھ چمچہ اور پیالے سیٹ کرکے لے آئی۔

”ارے دعا! یہ کیا تکلف کیا‘ یقین کرو اس وقت معدے میں بالکل گنجائش نہیں۔“ اسے ٹرے کے ہمراہ آتا دیکھ کر صائقہ بھابھی بولیں۔

"آپ چکھیں تو سہی، پھر دیکھیں یہ کیسے خود بخود ہضم ہوتی جاتی ہے۔" اس نے بصد اصرار پیالے بھر بھر کر تینوں کو تھمائے اور اپنے لیے نکال کر فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

"بھئی کل ہمارا شاپنگ پر چلنے کا ارادہ ہے، حیا نے تو چلنا نہیں، چنانچہ اسے کہنا بے کار ہے، ہاں تم چلنا چاہو تو موسٹ ویلکم۔" مائدہ بھابھی بولیں، جبکہ صائقہ بھابھی اور حیا مزے سے سویٹ ڈش سے انصاف کر رہی تھیں، ان کے چہرے پر پسندیدگی کے تاثرات دیکھ کر اس کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

"حیا کیوں نہیں جائے گی۔" اس نے اچنبھے سے پوچھا، وہ تو شاپنگ کی شوقین ہوا کرتی تھی۔

"دراصل ہمارے غیرت مند دیور صاحب کو گوارا نہیں ان کی بیوی اکیلے بازاروں میں گھومے، اس لیے اپنے ساتھ ہی شاپنگ پر لے کر جاتے ہیں۔"

"اچھا۔" اسے حیرت ہوئی یہ بات حیا نے آج سے پہلے تو نہیں بتائی تھی۔

"ویسے ایک طرح سے اچھا ہی ہے، ہمارے شوہر صاحبان تو گنی چنی رقم پکڑا کر بے فکر ہو جاتے ہیں۔ مہنگائی کا کہو تو ایک ہی جواب ملتا ہے۔ کون کہتا ہے مہنگی چیز خریدو، اب انہیں کون سمجھائے، دو سال پہلے تک پانچ سو میں جس کوالٹی کا کپڑا ملتا تھا اب وہ پندرہ سو میں ملتا ہے۔" مائدہ بھابھی نے رونا رویا تو صائقہ بھابھی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اس لیے تو جناب! مجھے ان کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ عید کے کپڑے تو میں ایک ماہ پہلے ہی ان کے ساتھ جا کر لے آئی ہوں، باقی رہے جوتے، جیولری اور چوڑیاں یہ سب خریدنے کا مزا تو چاند رات میں آتا ہے۔" وہ مطمئن سی بولیں۔

"تو پھر دعا تم چل رہی ہو کل؟" وہ سوچ میں پڑ گئی، کہیں اس کا جانا جلال بھائی کو برا نہ لگے۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" اسے متذبذب دیکھ کر حیا نے فوراً "ہامی بھری۔ وہ جانتی تھی جلال اپنی پسند ناپسند اور نظریات کسی تیسرے پر تھوپنے کے عادی نہیں تھے۔ باتوں کا رخ ادھر ادھر سے ہوتا پڑوسیوں کی طرف پھر گیا۔

"صغیر صاحب کی بہو کیسے ہر عید پر سرخ رنگ کا جوڑا چڑھا لیتی ہیں۔" صائقہ بھابھی بولیں۔

"تین بچوں کی اماں بن گئی، مگر دلہناپا نہ گیا۔" مائدہ بھابھی نے ناک چڑھائی۔

"ریڈ کلر اس پر بالکل سوٹ نہیں کرتا۔" حیا نے بھی حصہ لیا۔ دعا کا دل ابھی بیٹھ کر باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر ماہ مقدس کا پاس کیے بغیر انہیں غیبت جیسا مکروہ فعل انجام دے کر اپنی نیکیاں ضائع کرتا دیکھ کر وہ برتن سمیٹتی اٹھ گئی، اگر ان کی زبانوں کو نہیں روک سکتی تھی تو کم از کم ایسی محفل کا حصہ نہ بن کر اپنے اعمال نامے کو محفوظ تو رکھ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

حیا اور دعا افطار کے بعد لاؤنج میں بیٹھی اپنے سامنے پھیلائے ڈھیروں گفٹ پیکس کھولتی بے حد مسرور تھیں۔ آج خالہ آئی تھیں، دعا کے ساتھ ساتھ حیا کے لیے بھی عیدی لائی تھیں۔ اتنے اہتمام سے جتنے اہتمام سے اماں بھجواتی تھیں۔

"خالہ اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے تکلف کرنا چاہا تھا۔

"ارے پگلی! ان چیزوں کی بھلا ضرورت تھوڑی ہوتی ہے، ارے یہ تو لڑکی کے میکے کا مان ہوتا ہے۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا تو اماں کی یاد نے بے ساختہ اسے آبدیدہ کر دیا۔ آج کا سارا دن مصروف گزرا تھا۔ خالہ لوگوں کے جانے کے بعد صائقہ بھابھی نے مہندی والی کو بلوا لیا، سب نے شوق سے ہتھیلیاں سجوائیں، مصروفیت میں سارا دن وقت ہی نہیں ملا، اب کہیں جا کر عیدی دیکھنے کی فرصت ملی تھی۔

"بھئی ماننا پڑے گا صائم کی پسند لاجواب ہے۔ خالہ بتا رہی تھیں۔ تمہارے لیے ساری شاپنگ اس نے خود جا کر کی ہے۔" حیا نے اسے منگیتر کے حوالے سے

را۔

"یہ تو آپ کو مجھے دیکھ کر اندازہ ہو جانا چاہیے۔" اس نے گردن اکڑائی، دونوں کھلکھلا کر ہنس ...باہر سے قدرے شور کی آوازیں آ رہی تھیں، دعا ...دیکھنے کا ارادہ کرنے ہی لگی تھی کہ جلال چلا آیا۔

"مبارک ہو بھئی، عید کا چاند نظر آ گیا ہے۔" ...وش مبارک دی، ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا ڈبا بھی تھا۔

"خیر مبارک، خیر مبارک۔" دونوں کی تیاریاں ...ل تھیں اس لیے اطمینان سے بولیں۔

"چلو پھر اماں کی طرف چلتے ہیں، سب ادھر ہوں ...ے، مبارک دے کر پھر شاپنگ پر چلتے ہیں، ویسے لینا کیا ...یا ہے؟"

"کپڑے تو لے لیے تھے چھوٹی چھوٹی چیزیں جیسے ...وتا، جیولری، چوڑیاں وغیرہ رہتی ہیں، وہ پھیلاوا سمیٹتی ...وئی بولی پھر سب کو مبارک باد دے کر ارسلان کو ...صائقہ بھابھی کی طرف چھوڑا اور خود چادر اوڑھنے لگی ...یک چادر دعا کی طرف بھی بڑھائی۔

...بازار میں رش ہو گا تم بھی اوڑھ لو۔"

"تم میاں بیوی کے ساتھ جا کر میں خوامخواہ کباب ...میں ہڈی بنوں گی۔" چادر اوڑھتے وہ شرارت سے بولی۔

"کوئی بات نہیں، کبھی کبھی ہڈی بھی چلتی ہے۔" وہ بھی جواباً اسی لہجے میں بولی دونوں ہنستی ہوئی گاڑی میں آ بیٹھیں۔

بازار کھچا کھچ بھرا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر چیز مفت میں بٹ رہی ہو اور لوگ اسے لینے کو بے تاب ہوں، دو تین دکانوں میں گھومنے کے بعد کہیں جا کر حیا کو جوتا پسند آیا تھا۔ جلال بغیر ماتھے پر بل ڈالے اسے لیے پھرتے رہے، دعا کو ان کی یہ بات اچھی لگی تھی ورنہ صائم کے ساتھ کبھی بازار جانا ہوتا تو وہ پہلے جتا دیتا تھا "صرف ایک دکان میں لے کر جاؤں گا" اور اور نہیں پھروں گا" جیولری کی دکانوں پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اوپر سے جیولری اتنی خوبصورت کہ دعا نے بلا ضرورت دو تین ایئر رنگز خرید ڈالے جبکہ حیا جلال کے ساتھ آنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جی بھر کر خریداری

کررہی تھی دس بجنے شاپنگ ختم ہوئی' گاڑی میں بیٹھتی حیا ٹھٹکی۔
"کچھ رہتا ہے کیا؟" جلال نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"چوڑیاں تو لی ہی نہیں۔" اسے خود پر حیرت ہوئی کیسے وہ یہ مین آئٹم بھول گئی۔
"دعا تم نے بھی یاد نہیں دلایا۔"
"چوڑیاں تو میں نے بھی لینی ہیں۔' میں تو خود بھول گئی تھی۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔
"چلو پھر' مگر ذرا جلدی کرنا۔" شاپنگ بیگز پچھلی سیٹ پر ڈھیر کرتے ہوئے ہدایت کی۔ بازار میں جگہ جگہ چوڑیوں کی دکانیں اور اسٹالز لگے تھے' روشنی کا انتظام اتنا خوبصورت کہ ہر چوڑی دمک رہی تھی۔ حیا کو پہلی نظر میں مطلوبہ رنگ کی چوڑیاں پسند آگئی تھیں۔ جبکہ دعا دو تین ڈیزائنز میں اٹکی تھی' سب خوبصورت تھیں سمجھ نہیں آرہا تھا کون سی لے' مشورے کے لیے حیا کی طرف دیکھا تو دھک سے رہ گئی وہ جو چوڑیاں پیک کروانے کے لیے دکاندار کی طرف بڑھا رہی تھی۔
"یہ چوڑیاں۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ

چوڑی والے نے اس کا نازک ہاتھ اپنے بھدے میں دبوچ لیا' دبا دبا کر تولا' پھر پھرتی سے چوڑیاں چ شروع کردیں کچھ فاصلے پر کھڑے جلال کی نظ اچانک افتاد پر متذبذب نظر آتی حیا پر پڑی اس ابھی تک چوڑی والے کی گرفت میں تھا۔ جلال ا طرف بڑھا دعا پوری جان سے لرز گئی برسوں پ دوپہر کا منظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ حیا کا ہاتھ ہوش و خرد سے بے گانہ شخص نے پکڑ اس کے غیرت مند بہنوئی نے اس کا کیا حشر کیا ت منظر یاد آتے ہی اس نے جھرجھری لی آج وہی ہاتھ شکل سے لوفر نظر آتے چوڑی والے نے ا پورے ہوش و حواس میں پکڑنے کی جرات کی اب جلال جس نے پاگل کا قصور معاف نہیں کیا نجانے اس ہوش مند کا کیا حشر کرنے والا تھا۔ اس خشک ہوگیا' پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف د
وہ سانس لینا بھول گئی۔ جلال' حیا سے ایک قدم فاصل پر آکر رک گیا۔
دعا نے بے اختیار آنکھیں میچ لیں۔ عین اسی وق چوڑی والے نے چوڑیاں چڑھا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دی وہ جلال کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اپنی نازک کلا اس کی نظروں کے سامنے چھنچھنائی۔
"کیسی لگ رہی ہیں۔" جلال نے جواب دیے بغی جھٹکے سے جھک کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا اور---- اپ ہاتھوں سے چوڑی والے کے ہاتھ میں تھمادی۔
"اس میں بھی بالکل ایسی چوڑیاں چڑھا دو۔" و مسکراتے ہوئے بولا۔ خوف سے آنکھیں میچے کھڑی دعا نے یہ جملہ سن کر جھٹکے سے آنکھیں کھول کر غور سے سامنے دیکھا جہاں جلال اپنے ہاتھوں سے اپنی عزت کا ہاتھ غیر محرم چوڑی والے کے ہاتھ میں تھما کر محبت پاش نظروں سے بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے غیرت مند بہنوئی کی۔ "غیرت مندی" کے اس اعلا مظاہرے اور دوہرے معیار دعا کے ذہن میں' آنکھوں میں' چہرے پر حیرت ہی حیرت بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

☆ ☆

بقیہ: افراز علی نازش

ہیں۔ تو یہاں کے کچھ بنیاد پرست کہتے ہیں کہ پنجابی کا مطلب ہے صرف پنجابی۔ تو اب صرف پنجابی پروگرام ہی کرتا ہوں ورنہ اس ایف ایم کا مقصد یہ تھا کہ پنجاب کے پورے رنگ اس میں پیش کیے جائیں۔"

☆ "ایف ایم کی کمائی معقول ہوتی ہے---- پہلی کمائی کیا تھی؟"

* "دبئی ریڈیو سے جب پہلا پروگرام کیا تھا تو مجھے 1 ہزار درہم ملا تھا اور اس وقت درہم آٹھ روپے کا تھا۔ اس وقت میری سیلری دو ہزار درہم تھی تو جب مجھے ایک پروگرام کا ایک ہزار درہم ملا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری لاٹری نکل آئی ہو اور یہاں پاکستان میں ریڈیو کی پہلی کمائی 500 روپے تھی۔ ایف ایم کی انڈسٹری میں بہت بدنصیبی ہے ہمارے آرجے کی کہ ان سے ٹائم زیادہ لیا جاتا ہے اور محنت کا معاوضہ بہت کم دیا جاتا ہے۔ بس انسان اپنے شوق کی وجہ سے لگا رہتا ہے۔"

☆ "آپ کے دوستوں کا حلقہ تو ماشاء اللہ کافی وسیع ہوگا۔ اپنے مسائل ان سے شیئر کرتے ہیں یا گھر والوں سے؟"

* "جی ماشاء اللہ دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے مگر اپنے مسائل اپنی پرابلمز صرف اپنے آپ سے شیئر کرتا ہوں کیونکہ دنیا ہمیشہ خوش ہونے والوں کے ساتھ ہوتی ہے میں اپنے مسائل کا حل خود ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیونکہ میں جب کسی مسئلہ کا شکار ہوتا ہوں تو سوچ لیتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آزمائش ہوگی میں گھبراتا نہیں' نہ ہی شور مچاتا ہوں نہ ہی مایوس ہوتا ہوں---- میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ٹینشن میں آپ کو زیادہ ایکٹو ہونا چاہیے تاکہ ٹینشن کا حل ڈھونڈ سکیں۔ کوئی کسی کے مسائل حل نہیں کر سکتا۔"

☆ "کبھی کسی کا دل توڑا؟"

* سوچتے ہوئے---- "ہاں ایسا ہوا ہے اور شاید اس کا دل توڑا جب ہی میری شادی نہیں ہوئی۔ میری ایک دوست جس سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس نے میرا لائف اسٹائل بدلنے میں اہم رول ادا کیا اس نے مجھے شادی کے لیے پرپوز کیا لیکن میں نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا کہ دوستی کا مطلب شادی نہیں ہوتا اور مجھے اپنی اس غلطی کا احساس آج تک ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اور شاید اس کی بددعا ہے کہ آج بھی میری زندگی میں کوئی نہیں ہے۔"

☆ "آپ نے ماشاء اللہ کافی ترقی کی ہے مگر پھر بھی اپنا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں---- کیا سوچتے ہیں؟"

* "اپنا فیوچر اچھا دیکھتا ہوں اور فیوچر کے بارے میں سب ہی سوچتے ہیں اور میں آپ کو بتاؤں کہ جنوری 2012ء سے میں گائنی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنا رہا ہوں اور یہ شاید پہلا انسٹی ٹیوٹ ہوگا جس میں خواتین کی بیماریوں کے بارے میں ریسرچ ہوگی اور یو این او اور کینیڈا کے تعاون سے ہم یہ انسٹی ٹیوٹ قائم کریں گے اور آنے والے سالوں میں میرا پورا فوکس اس انسٹی ٹیوٹ پر ہوگا اور بحیثیت مرد کے میں اپنے معاشرے کی خواتین سے معافی مانگنا چاہتا ہوں کہ ہم نے ان کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں اور ان کی صحت کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا اور یہ ادارہ اس لیے قائم کیا جارہا ہے کہ خواتین کی صحت کا خیال رکھا جا سکے۔ خواتین کی 74 بیماریاں ایسی ہیں جو سولہ سال کی عمر سے شروع ہوتی ہیں اور تاحیات رہتی ہیں اور ان پر نہ حکومت نے توجہ دی نہ ہی کسی اور ادارے نے---- تو ان شاء اللہ جنوری 2012ء سے میں اس کا آغاز کروں گا۔"

☆ "کوئی اشتہاری مہم بھی شروع کریں گے؟"

* "جی میڈیا کے لوگ میرے ساتھ ہیں اور وہ ان شاء اللہ اس کو ضرور کوریج دیں گے تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ یہ ادارہ کس طرح خواتین کی مدد کر سکتا ہے اور مجھے امید ہے کہ آنے والے چار پانچ سالوں میں میں اپنی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کے لیے بہت کچھ کر سکوں گا۔"

☆ "ریڈیو سے آپ کا تعلق ہے کبھی موڈ خراب میں پروگرام کیا؟"

* "الحمدللہ میرا موڈ بہت کم خراب ہوتا ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ موڈ خراب میں پروگرام کیا ہو۔ میں ایک زندہ دل اور ہنس مکھ انسان ہوں نہ میں بور ہوتا ہوں نہ اپنے آپ کو بور ہونے دیتا ہوں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ موڈ کی خرابی آپ کے خون کو جلاتی ہے میں اپنے آپ کو فریش رکھتا ہوں اور جب میں فریش ہوں گا تو میرے الفاظ بھی صاف ستھرے اور فریش ہوں گے۔ اگر کچھ ڈیپریس ہوتا بھی ہوں تو اپنے آپ کو گیمز میں یا دوسرے کاموں میں مصروف کرلیتا ہوں۔"

☆ "اپنے پرستاروں کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

* "میں اپنے پرستاروں سے ایک بات کہنا چاہوں گا کہ ہم بے شک ان کے لیے ایک آئیڈیل ہوتے ہیں لیکن ہماری ایک اپنی پرسنل لائف بھی ہوتی ہے۔ جیسے اگر میں رات کو ایک یا دو بجے سوتا ہوں تو یہ میرا حق ہے۔ اس وقت اگر مجھے کوئی کال کرکے کہے کہ آپ کیا کر رہے تھے اور میں کہوں کہ میں سو رہا تھا اور اس وقت وہ سوری کی بجائے یہ کہے کہ مجھ سے تھوڑی سی بات کرلیں تو پھر مجھے تھوڑا غصہ آتا ہے۔ میری اپنی ایک مختصر سی پرسنل لائف ہے۔ جب میں آپ کو اتنا ٹائم دے دیتا ہوں اور ریڈیو کے علاوہ دن میں بھی آپ سے بات کرلیتا ہوں تو پھر پلیز مجھے رات کو پریشان نہ کیا کریں۔"

☆ "سیر و سیاحت کا شوق ہے؟"

* "سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ چکا ہوں اور مجھے بائے روڈ سفر کرنا بہت پسند ہے اور جس ملک میں بھی جاؤں وہاں بھی بائے روڈ ہی سفر کرتا ہوں اور یہاں پاکستان میں تو اپنی کار پہ ہی سفر کرتا ہوں۔"

☆ "اتنی سیر و سیاحت کی اور لڑکی کوئی پسند نہیں آئی؟"

* "بس دیکھ لیں۔۔۔ میری قسمت مجھے یاد ہے کہ جب میری امی زندہ تھیں تو ہر وقت ان کا بھی ایک ہی سوال ہوتا تھا اور اس وجہ سے میں اکثر ان سے ناراض بھی رہتا تھا۔ جب گھر آتا تھا تو پہلی بات وہ یہی پوچھتیں کہ کوئی کڑی (لڑکی) پسند آئی۔"

☆ "آدھی دنیا آپ نے گھومی، کوئی خاص بات نوٹ کی؟"

* "ہاں بالکل مجھے آسٹریلیا کے شہر پرتھ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں میں نے ایک خاص بات نوٹ کی کہ وہاں لوگ صبح کے اوقات میں اپنی ٹرانسپورٹ استعمال نہیں کرتے بلکہ گورنمنٹ کی بسیں چلتی ہیں اور امیر غریب انہی بسوں میں سفر کرتے ہیں پانچ بجے تک یہ سہولت ہوتی ہے ٹھیک پانچ بجے پبلک ٹرانسپورٹ بند ہوجاتی ہے اور پانچ بجے کے بعد ایک خاص جیسے ہمارے یہاں طارق روڈ یا لبرٹی مارکیٹ کھلا ہے باقی تمام بازار پانچ بجے بند ہوجاتے ہیں اور پھر اپنی پرائیویٹ گاڑی لے کر کہیں بھی اپنی مرضی سے جا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ نا صرف انرجی بچاتے بلکہ یہ احساس بھی اجاگر کرتے ہیں کہ امیر غریب ایک ہیں اور اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں۔"

☆ "آپ فضول خرچ ہیں کہ کفایت شعار؟"

* "میں بہت فضول خرچ ہوں۔ بچت جیسی عادت مجھ میں نہیں ہے۔ جو کماتا ہوں خرچ کرتا ہوں کیونکہ رازق اللہ ہے۔ اس پر میرا پختہ یقین ہے۔ کسی کو ضرورت ہو، کسی کو میری مدد کی ضرورت ہو تو اپنے ہاتھ کو روکتا نہیں ہوں۔ میرے جیب میں روپے بھی ہوں تو میں انکار نہیں کرسکتا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر میرے پاس ہے اور کہوں کہ میرے پاس نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگلی دفعہ میرے پاس نہیں ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اللہ نے مجھے دیا ہے تو میں دوسروں کی مدد کیوں نہ کروں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے افراز علی نازش سے اجازت چاہی۔

۞

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

تکبر! دوزخ کا راستہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا۔

"جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا اور جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔ وہ دوزخ میں نہیں جائے گا۔"

اس حدیث مبارکہ کو سامنے رکھ کر سب سوچیں کہ ہم کتنے متکبر اور کتنے ایمان والے ہیں۔ غور کریں کہ جس نے مال و دولت دیا ہے۔ اسے اختیار بھی ہے کہ واپس لے لے پھر کیا ہوگا؟ اللہ پناہ میں رکھے۔ رہا "ایمان" تو یہ تو بڑی حفاظت سے جان کے ساتھ رکھنا ہے۔ ادھر ادھر ہوگیا تو مسلمان نہ رہا، اگر ایمان رہا تو دوزخ نہیں جنت کا حق دار ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل ہمیں تکبر سے بچائے اور ایمان کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

لبیبہ زبیر۔۔۔ رحیم یار خان

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دیانت

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا۔ "یا امیر المومنین! آسمان اور زمین کے درمیان کیا کچھ ہے؟"

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "قبول ہونے والی دعا۔"

آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا "مشرق اور مغرب کے درمیان کتنی مسافت ہے؟"

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا! "سورج کے ایک دن رات چلنے کی مسافت۔"

آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا! "پانی کا ذائقہ کیا ہے؟"

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "جو زندگی کا ذائقہ ہے۔"

فوزیہ ثمرین، ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

نور زینت

○ آپ کسی انسان سے سب کچھ چھین سکتے ہیں۔ لیکن اس کے جذبے کبھی نہیں۔

○ بد دعا کبھی زبان سے نہیں دی جاتی وہ آنسو جو پلکوں میں اٹک جائے بذات خود ایک بد دعا ہوتا ہے۔

○ ناپسندیدہ لوگوں سے پیار کرو ان کا کردار بدلا جائے گا۔

○ محبت چہروں سے نہیں دلوں سے، روحوں سے کی جاتی ہے۔ چہرے بدل سکتے ہیں چہرے ایک جیسے ہو سکتے ہیں لیکن روحیں اور دل ایک جیسے نہیں ہوسکتے۔

○ آنسو کبھی بھی آپ ہی آپ نہیں بہتے دل پہ چوٹ لگتی ہے تو آہ لبوں تک آتی ہے۔

○ ایک پل میں دل کے ٹھکانے بدل جاتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات ایک پل ہی ساری زندگی پر محیط ہوجاتا ہے۔

○ احساس کی دولت سے محروم دل، بنجر زمین کی مانند ہوتا ہے۔

مہوش۔۔۔ کراچی

محبت

بالکل اچانک جب آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا آپ کے اندر اگنا شروع ہوگیا ہے۔ محبت ایک دوسرے کے اندر اگتا ہے۔ پہلے تو کسی بیج کی طرح

دوسرے کے اندر فنا ہونا' اپنا آپ مٹا دینا پھر آگیا۔ جوں جوں محبت بڑھتی ہے ایک دوسرے کے اندر جڑیں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں اس پودے کو ہر روز تازہ محسوسات اور جذبوں کی کھاد' آنسوؤں کا پانی' دوسرے کی سانسوں کی ہوا اور من کی پر حرارت دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کبھی آپ کو اپنا آپ مرجھاتا ہوا محسوس ہو تو سمجھ لیں کہ دوسرے کے من کی زمین پتھریلی ہو گئی ہے اور اس نے آپ کے اندر سے اپنی جڑیں بے دردی سے سمیٹ لی ہیں۔ جب آپ ایک دوسرے کے اندر اگتے ہیں تو محبت پھول بن کر کھل اٹھتی ہے اور اس کی خوشبو آپ کے پورے بدن میں پھیل جاتی ہے۔ دوسرے کا وجود اور آپ کا وجود ایک ہو کر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

محبت بڑی شفاف ہے کسی آئینے کی طرح' اس پر ہلکا سا ناگواری کا کوئی میلا چھینٹا بھی فوراً" دکھائی پڑ جاتا ہے۔ ہر سچی اور خالص چیز کے ساتھ یہی مسئلہ ہے۔ تھوڑا سا ناخالص احساس بھی یک دم بری طرح محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس لیے کسی ایک میلے لفظ' جملے' کج ادائی یا دل کی کسی غافل دھڑکن سے محبت کے سیب کو کیڑا لگ جاتا ہے۔

(مظہر الاسلام کی کتاب "محبت مردہ پھول کی سمفونی" سے ماخوذ)

صدف عبداللہ۔۔۔ لاہور

اندیشہ

ایک تجھے پا لینا ہی منزل تو نہیں
میں یہ بازی جیت گیا تو کیا ہو گا
اشکوں کی اک مالا روز پروتا ہوں
ہجر کا موسم بیت گیا تو کیا ہو گا

فوزیہ ثمرٹ۔۔۔ گجرات

سنو ہمدم

بہت سی ڈگریاں لے کر
اکٹھا کر کے اتنا علم
ہنر پر دسترس پا کر
نشاط چاہت دل کے
چھلکتے لفظ آنکھوں سے
اگر پڑھنے سے قاصر ہو
تو۔۔۔
ان پڑھ ہو

ام رومان جٹ۔۔۔ عبدالحکیم

رہنما

ایک صاحب سے ان کے دوست نے کہا۔
"تم کہہ رہے تھے کہ بلی کو کہیں دور جنگل میں چھوڑ آؤ گے مگر یہ تو یہیں نظر آ رہی ہے۔"
دوست نے جواب دیا۔ "ہاں میں اسے چھوڑ تو آیا تھا مگر میں خود بھٹک گیا اور واپس آنے کے لیے مجھے اس کا پیچھا کرنا پڑا۔"

اقرا۔۔۔ لاہور

بچھڑنا

بچھڑنے کی اذیت کو
اگر تم جاننا چاہو
تو کچھ پل کو
ذرا یہ سانس اپنی روک کر دیکھو
تمہیں محسوس ہو گا کہ
بچھڑنا
موت جیسا ہے۔

سدرہ وزیر۔۔۔ خوشاب (پیل)

کچھ لفظ تراشے ہیں ہم نے

☆ زندگی کا مقصد مسرت نہیں بلکہ تکمیل انسانیت ہے۔

☆ خوب صورتی دوسروں کے چہروں پہ نہیں اپنی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

☆ بہترین دوست وہ ہے۔ جو نیکی کی ترغیب دے نا کہ بدی کی۔ بس یہ پہچان ہو کہ یہ نیکی واقعی نیکی ہے۔

☆ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ تمہارا رب تم سے کتنی محبت کرتا ہے تو اس کے نزدیک ہو تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔

☆ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے کہ سچ بول کر ہار جاؤ۔

☆ اگر تم نے نیکی کا ارادہ کیا اور تمہیں موت آ پہنچی تو تمہیں اس نیکی کا اجر ملے گا۔

☆ جو منزل جتنی زیادہ مشکل اور محنت و مشکلات سے ملتی ہے وہ اتنی پر سکون ہوتی ہے۔

☆ لوگ رات کو سوتے وقت گھر کے دروازوں کو تالا لگا دیتے ہیں' لیکن ان احمقوں کو کون سمجھائے کہ چور دروازہ کھٹکھٹا کر نہیں آتے۔

☆ انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھتے' وہ مرے' بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

☆ محبت کے سودے میں عورت ہمیشہ گھاٹے میں رہتی ہے۔ فائدہ تو ہمیشہ مرد کا ہوتا ہے' جہاں سے چلتا ہے وہیں واپس آ جاتا ہے۔ مگر عورت مٹ جاتی ہے فنا ہو جاتی ہے مگر واپس نہیں لوٹتی۔

فوزیہ احسان۔۔۔ جہلم

خیال میرا خوشبو جیسا

☆ بزدلی در حقیقت یہ ہے کہ اپنے حق کے لیے آواز نہ اٹھائیں۔

☆ زندگی کا کوئی بھی فیصلہ کرنے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے کہ جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ آخر کار ہمیشہ کے لیے پچھتاوا بن جاتا ہے۔

☆ کسی کا دل مت دکھائیں کہ دعاؤں سے اثر زائل ہونے لگتا ہے۔

☆ جو چیزیں اختیار میں نہ ہوں انہیں بھلانا ہی بہتر ہے ورنہ خود کو بھول جائیں گے۔

☆ زندگی میں بے عیب لوگ مت تلاش کریں ورنہ آپ اکیلے رہ جائیں گے۔

سمیرا مغل۔۔۔ جل ہن

پھولوں جیسے لفظ

○ اولیا اللہ کے آگے ایسے رہنا چاہیے جیسے شیر کے آگے بکری بندھی ہو۔

○ مہندی کی طرح پس جائے گا تو کف محبوب کی رنگینی کا شرف حاصل کر لے گا۔

○ جن کنوؤں کا پانی اصلاً" کڑوا ہو اس میں خواہ سینکڑوں من کھانڈ بھی ڈال دو تو وہ میٹھے نہیں ہوں گے' اسی طرح انسان کی فطرت ازلی بھی نہیں بدلتی۔

○ خبردار! تیرے نفس کا کتا تیرے دل کے بائیں پہلو میں گھات لگائے بیٹھا ہے۔

○ اپنے اندھیرے من میں شوق (الٰہی) کا دیا روشن کر شاید تجھے تیرا کھویا اصل اثاثہ جو تیرے من میں ہی روپوش ہے مل جائے۔

تسنیم چوہدری۔۔۔ آکسفورڈ۔ یوکے

کچھ لفظ لکھے ہیں دل سے

○ رات کی تنہائی میں انسان کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو زمانے بدلتے ہیں اور طوفان کا رخ موڑ دیتے ہیں۔

○ اگر انسان کا دل غلاظت سے لتھڑا ہوا ہو۔ تو بے شک وہ دنیا کی بہترین خوشبو کیوں نہ استعمال کرلے مگر اس کی گندگی کی بدبو نہیں جاتی۔

○ پاؤں کبھی غلط راہ پر نہیں اٹھتے جب تک آپ خود نہ چاہیں۔

○ خواب اور تعبیر دو علیحدہ چیزیں ہیں جنہیں ایک کرنا آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

○ لوگ اتنے بے اعتبار کبھی نہیں ہوتے۔ جتنا ہم ان پر اپنی توقع کا بوجھ لاد دیتے ہیں۔

○ ریچھ کی دوستی بہت مہنگی ہوتی ہے۔ اگر وہ خوش ہو جائے تو گلے لگا لیتا ہے۔

فوزیہ ثمرٹ' گجرات

کرنیں

☆ خیر کو سمجھنے کے لیے شر اور شر کو جاننے کے لیے خیر کو تخلیق کیا گیا ایک دوسرے کی ضد ساتھ ساتھ خیر اور شر کا اپنا ایک الگ وجود موجود ہے اگر خیر کا تصور نہ بھی ہو تو شر کسی اور نام سے موجود رہے گا اس لیے کہ دونوں کو تخلیق کرنے والی ایک ہی ذات ہے۔

☆ انسان آگاہ ہو یا بے خبر وہ ہمیشہ آرزو مند رہتا ہے لیکن زندگی کی اصل آرزو کسی جستجو میں ہے۔

☆ ازل کو جاننے کے لیے ابد اور ابد کی پہچان کے لیے ازل کا علم ضروری ہے لیکن ازل اور ابد الگ الگ وجود میں موجود ہیں زندگی ازل ہے تو موت ابد۔ ازل ابتدائے حیات ہے اور ابد مقام ہے جہاں موت کے بعد حیات ہی حیات ہے۔

☆ تلاش کا سفر اتنا ہی قدیم ہے' جتنا ہستی کا سفر' ہر پیدا ہونے والے کے ساتھ ان کی تلاش بھی پیدا ہوتی ہے جو شخص خود کو تلاش کرے وہ سب کچھ پالیتا ہے۔

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان

سنہری باتیں

○ دولت کی مستی سے اللہ کی پناہ مانگو کیونکہ اس کے نشے کو سوائے موت کے کوئی دوسری چیز نہیں اتار سکتی۔ (حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

○ کوئی ہے جو میرے سارے خزانے لے لے اور وہ مجھے آنکھ عطا کردے جو حسن آشنا ہے۔ (خلیل جبران)

○ سچی محبت یہ بھی ہے کہ بچھڑ جانے کے بعد بھی اس کی کسک محسوس کرو۔ (بلراج سائن)

○ خوش اخلاقی ایک ایسا ہیرا ہے جو پتھر کو بھی کاٹ سکتا ہے۔

○ اللہ جس کو زمین پر عاجز کرنا چاہتا ہے اس سے عاجزی چھین لیتا ہے۔ (شیخ سعدی)

سدرہ وزیر۔۔۔ خوشاب

موسم

چڑیا پوری بھیگ چکی ہے
اور درخت بھی پتہ پتہ ٹپک رہا ہے
گھونسلہ کب کا بکھر چکا ہے
چڑیا پھر بھی چہک رہی ہے
انگ انگ سے بول رہی ہے
اس موسم میں بھیگتے رہنا کتنا اچھا لگتا ہے

تسنیم چوہدری کسفورڈ یو کے

شکر پارے

☆ بڑھیا بیوی' بوڑھا کتا اور نقد روپیہ تین وفادار دوست ہیں۔
☆ غریبوں کو قانون پیستا اور امیر قانون کو پیستے ہیں۔
☆ ڈھول کی آواز اس لیے ہوتی ہے کہ اس کا پیٹ خالی ہے۔
☆ رات کا وقت شریروں کے لیے دن ہے۔
☆ جس کو عقل نہیں وہ پچھلی باتوں کی فکر کرتا ہے۔
☆ زبردست کا ہاتھ چلتا ہے اور غریب کی زبان۔
☆ جسم منہ کے ذریعے سے تباہ ہوجاتا ہے۔
☆ شکاری پرندے گایا نہیں کرتے۔
☆ بوڑھے کتے بلاوجہ نہیں بھونکتے۔
☆ ایک لمبی زبان زندگی کو چھوٹا بنادیتی ہے۔
☆ جہاں محبت پتلی ہو عیب موٹے نظر آتے ہیں۔
☆ منحوس خبریں اکثر درست ثابت ہوتی ہیں۔

انیقہ انا۔۔۔ چکوال

دکھ

مجھے اداس دیکھ کر
اس نے کہا
میرے ہوتے ہوئے
تمہیں کوئی دکھ نہیں دے سکتا
پھر ایسا ہی ہوا
کہ بعد میں جتنے بھی
دکھ ملے سب اسی نے دیے

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

صدف عبداللہ، کی ڈائری میں تحریر

اعتبار ساجد کی غزل

مجھے ایسا لطف عطا کیا جو نہ ہجر تھا نہ وصال تھا
مرے موسموں کے مزاج داں، تجھے میرا کتنا خیال تھا

کہیں خون دل سے لکھا تو تھا ترے سال ہجر کا سانحہ
وہ ادھوری ڈائری کھو گئی، وہ نہ جانے کون سا سال تھا

کسی اور چہرے کو دیکھ کر تری شکل ذہن میں آگئی
ترا نام لے کے ملا اسے، مرے حافظے کا یہ حال تھا

کبھی موسموں کے سراب میں، کبھی بام و در کے عذاب میں
وہاں عمر میں نے گزار دی جہاں سانس لینا محال تھا

کبھی تو نے غور نہیں کیا کہ یہ لوگ کیسے اجڑ گئے؟
کوئی میر جیسا گرفتہ دل، ترے سامنے کی مثال تھا

ترے بعد کوئی نہیں ملا جو یہ حال دیکھ کے پوچھتا
مجھے کس کی آگ جلا گئی، مرے دل کو کس کا ملال تھا

مشعال جنید، کی ڈائری میں تحریر

سوہن ملاہی کی غزل

مرے حوصلوں کے یقین نے مجھے رفعتوں سے ملا دیا
کڑے راستوں کے حساب نے مجھے منزلوں سے ملا دیا

میں گھومتا تھا گلی گلی نئے دوستوں کی تلاش میں
مرے دوستوں کی تلاش نے مجھے دشمنوں سے ملا دیا

میں گرا تو میرے وجود کو، میری بے بسی نے کیا امر
مری پستیوں کے نزول نے، مجھے وسعتوں سے ملا دیا

مجھے دوستوں نے خبر نہ دی، مجھے منزلوں نے صدا نہ دی
مرے راستوں کے غبار نے، مجھے قافلوں سے ملا دیا

میں نے چاہتوں کی کتاب سے بھی گھاؤ راہی مٹا دیے
مرے آنسوؤں کے نصاب نے، مجھے راحتوں سے ملا دیا

سونیا ربانی، کی ڈائری میں تحریر

ظفر اقبال کی غزل

کھڑکیاں کس طرح کی ہیں اور در کیسا ہے وہ!
سوچتا ہوں، جس میں وہ رہتا ہے گھر کیسا ہے وہ

کیسی وہ آب و ہوا ہے جس میں وہ لیتا ہے سانس
آتا جاتا ہے وہ جس پر رہگزر کیسا ہے وہ

میں تو اس کے ایک اک لمحے کا رکھتا ہوں شمار
اور میرے حال دل سے بے خبر کیسا ہے وہ

اس کا ہونا ہی بہت ہے وہ کہیں ہے تو سہی
کیا سروکار اس سے ہے مجھ کو ظفر کیسا ہے وہ

نوشین اقبال نوشی، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

اس کو فرصت ہی نہیں وقت نکالے محسن
ایسے ہوتے ہیں بھلا چاہنے والے محسن

یاد کے دشت میں پھرتا ہوں ننگے پاؤں
دیکھ تو آ کے کبھی پاؤں میں چھالے محسن

کھو گئی صبح کی امید اور اب لگتا ہے
ہم نہیں ہوں گے کہ جب ہوں گے اجالے محسن

حاکمِ وقت کہاں، میں کہاں، عدل کہاں
کیوں نہ خلقت کی زباں پر لگائیں تالے محسن

وہ جو اک شخص متاعِ دل و جاں تھا نہ رہا
اب کون بھلا میرے درد سنبھالے محسن

نبیلہ عزیز، کی ڈائری میں تحریر
خوبصورت غزل

بے رخی اُس نے کی عہدِ زمانہ کر کے
ہم بھی محفل سے اُٹھ آئے ہیں بہانہ کر کے

کتنی باتیں جو نہ کہنا تھیں، لکھ بھیجی ہیں
اب پشیماں ہیں قاصد کو روانہ کر کے

کوئی ویرانہ ہستی کی خبر کیا لیتا
خود بھی ہم بھول گئے دفن خزانہ کر کے

وہ اگر آنکھوں میں رہتا تو بہت خوش تھے تابش
اُس نے کیا ظلم کیا دل میں ٹھکانہ کر کے

شافعہ اعوان، کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی نظم

احتساب،

ہوا!
جو گندم کی پہلی خوشبو کے لمس سے لے کے
کڑوے بادام کی مہک تک
زمیں کے ہمراہ رقص میں تھی
گمان یہ ہوتا ہے
اس رفاقت سے تھک چکی ہے
اور اپنی پازیب اُتار کر
اجنبی زمینوں کی سرد باہوں میں
سو رہی ہے
فضا میں سناٹا دم بخود ہے
ہوا کی خفگی ہی بے سبب ہے
کہ ابنِ آدم نے اپنے پیمان سے بڑھ کر
کوئی نیا بم بنا لیا ہے

کرن عدنان، کی ڈائری میں تحریر
احمد ندیم قاسمی کی نظم

عجیب دُنیا
عجیب تر اس کے رہنے والے
کہ شہر کو دشت میں بدل کر پکارتے ہیں
کہ ہم اکیلے ہیں
کائنات ایک عظیم صحرا ہے
جس میں مثلِ غزال ہم اپنے ہمدموں کی تلاش میں
ہر طرف رواں دواں ہیں
مگر متاعِ سفر ہماری فقط زمیں اور آسماں ہیں
عجیب دُنیا
عجیب تر اس کے رہنے والے
کہ شہر کو دشت میں بدل کر پکارتے ہیں
کہ ہم تو تخلیق کار ہیں
ہم تو ریت سے گلستاں اُگاتے ہیں
سنگ سے آئینے بناتے ہیں
ہم تو تعمیر ہیں، ہم تو ارتقا ہیں
عجیب دُنیا
عجیب تر اس کے رہنے والے
کہ خود ہی اپنے غنیم ہیں اور خود ہی
اپنے ندیم ہیں!
اپنے شاہکاروں کو آگ میں جھونک کر بلکتے ہیں
پھر یہی راکھ شاہکاروں میں ڈھالتے ہیں
بگڑ رہے ہیں، سنور رہے ہیں، اُلجھ رہے ہیں
سنبھل رہے ہیں
ازل کے دن سے بدلتے آئے ہیں
اب تک بدل رہے ہیں

ریحانہ علی احمد، کی ڈائری میں تحریر
مظفر بخاری کی غزل

جنگل، پہاڑ، ارض و سماں سوچتے رہے
کیا حکم تھا؟ کہ شاہ و گدا سوچتے رہے

تھی مختصر حیات! جو سوچوں میں کٹ گئی
جانے تمام عمر ہم کیا سوچتے رہے

انسانیت کے نام کی تذلیل کے لیے
تھے آدمی، جو بن کے خدا سوچتے رہے

ہم سے ہماری ذات کا عقدہ نہ کُھل سکا
ہم کون ہیں؟ یہ بات سدا سوچتے رہے

جب ہم کو اپنے ہاتھ سے تخلیق خود کیا
پھر کس لیے جزا و سزا سوچتے رہے

جب بھی ملے وہ دے کے گئے زخم ایک نیا
ہم زندگی میں جن کا بھلا سوچتے رہے

جس حرف سے ہماری خطائیں معاف ہوں
سجدے میں ایسا حرفِ دُعا سوچتے رہے

ارم آفتاب، کی ڈائری میں تحریر
ارشد معراج کی نظم

محبت کہاں پرانی ہوتی ہے،

کبھی ترکِ تعلق سے محبت مر نہیں سکتی
خلا بے اس درخشت سے صدا آباد رہتے ہیں
جنوں کی انتہا کب ہے؟
کبھی سورج بھی ڈوبا ہے؟
سمندر کا کہیں پرانا ہوتا ہے؟
کبھی تارے مدارِ وقت سے آگے نکلتے ہیں
پتنگے آگ میں جلنے سے ڈرتے ہیں
ازل سے تا ابد یہ اک تسلسل ہے
زمینوں اور زمانے سے کہیں آگے
تمہارے اور میرے جسم و جاں کی
داستانوں سے کہیں آگے!

سونیا ربانی، کی ڈائری میں تحریر
وصی شاہ کی غزل

کیسا مفتوح سا منظر ہے کئی صدیوں سے
میرے قدموں پہ میرا سر ہے کئی صدیوں سے

خوف رہتا ہے نہ سیلاب کہیں لے جائے
میری پلکوں پہ تیرا گھر ہے کئی صدیوں سے

اُس کے پانی میں بھی پہلے سا وہ ٹھہراؤ نہیں
تو بھی بے چین سمندر ہے کئی صدیوں سے

اشک آنکھوں میں سلگتے ہوئے سو جاتے ہیں
یہ میری آنکھ جو بنجر ہے کئی صدیوں سے

کون کہتا ہے ملاقات میری آج کی ہے
تو میری روح کے اندر ہے کئی صدیوں سے

اے میری ماں میں ہر ایک دھوپ سے لڑ سکتا ہوں
میرے سر پر تیری چادر ہے کئی صدیوں سے

میں نے جس کے لیے ہر شخص کو ناراض کیا
روٹھ جائے نہ یہی ڈر ہے کئی صدیوں سے

شگفتہ سلیمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

عقیلہ ——— لاہور

اکیلے تم نہیں، ہم بھی شبِ تنہائی رکھتے ہیں
مگر یادوں سے اپنا رشتہ یکجائی رکھتے ہیں
انہیں نزدیک سے دیکھا تو یہ عقدہ کھلا ہم پر
کہ دریا نام ہے قطرے سے کم گہرائی رکھتے ہیں

صدف عبداللہ ——— لاہور

بساطِ عشق یہ دو تا تو اس یقین کا ہے
کہ نقدِ جاں بھی ہم اس کھیل میں لگا بیٹھے
وہی ہے رات مگر کشتگانِ شب، ساجد
غلط نویدِ سحر پر دیے بجھا بیٹھے

صبا احمد ——— کراچی

وہ جو کہتا تھا کہ بچھڑ جاؤں گا تو مر جاؤں گا
اب اسے ڈھونڈنے جاؤں تو کہاں پاؤں گا

رابعہ اعجاز ——— لاہور

میں اُجڑ گیا سو اُجڑ گیا اس کے حق میں دعا ہے یہ!
کہ جہاں رہے وہ سکھی رہے مری سوچ اس کے سوا ہے کیا

شافعہ ——— کراچی

ہم ہجر زدہ سودائی تھے، جلتے رہے اپنے شعلوں میں
اچھا ہے کہ تو محفوظ رہا، تو نے یہ عذاب نہیں دیکھا
بس اتنا ہوا، ہم تشنہ دہن لوٹ آئے بھرے دریاؤں سے
کوئی اور فریب نہیں کھایا، کوئی اور سراب نہیں دیکھا

بشریٰ الطاف ——— گجرات

کوئی غم ہو کوئی دکھ ہو، درد کوئی ہو عدیم
مسکرانا ہی پڑ جاتا ہے زمانے کے لیے

مہک سہیل ——— لاہور

کاغذوں میں تو کوئی احساس کا عنصر نہیں
رنگ اڑتا جا رہا ہے کیوں تری تحریر کا
درد لکھ کر دے دیے ہیں اس نے سارے ہی عدیم
اس نے حصہ دے دیا مجھ کو مری جاگیر کا

الماس علی ——— کراچی

کوئی ہجوم دہر میں کرتا رہا تلاش
کوئی رہِ حیات سے تنہا گزر گیا
ملنا تو خیر اس کو نصیبوں کی بات ہے
دیکھے ہوئے بھی اس کو زمانہ گزر گیا

ذکیہ ——— لاہور

لوحِ جبیں پہ جس طرح لکھی گئیں مسافتیں
اتنا چلے کہ راستے اپنا نصیب ہو گئے

ہما کاشف ——— ملتان

جب کسی کو کوئی امید وفاؤں کی نہ تھی
مجھے اس پل ترا پیمانِ وفا یاد آیا

فوزیہ ——— پشاور

یاد کر کے اب اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدیم
بھول جانے کے سوا اب کوئی بھی چارہ نہ تھا

شبنم شاہد ——— کراچی

شوق اور ضبطِ شوق میں دن رات کشمکش
دل مجھ کو، میں ہوں دل کو پریشاں کیے ہوئے

ریحانہ ——— لاہور

چلو آج کوئی بچپنے کا کھیل کھیلیں ہم
بڑی مدت ہوئی بے ساختہ ہنس کر نہیں دیکھا

صبیحہ ——— لاہور

الجھا رہی ہے مجھ کو یہ ہی کشمکش مسلسل
وہ آ کیسا ہے مجھ میں یا میں اس میں کھو گیا ہوں

سائرہ ——— لاہور

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

نوشی ——— گاؤں بدو مرجان

میری رگوں میں مشرقی تہذیب تھی رواں
اس نے نہ جانے کیوں مجھے بزدل سمجھ لیا

صائمہ جبیں ——— کراچی

ایسا گم ہوں تیری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

فاکہہ فردوس ——— بہاول پور

عمر گزری ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوا
اس کو بیری ہے کہ مجھ کو ہے ضرورت اس کی
اتنی شدت سے تو میں نے بھی نہیں چاہا تھا
مجھ سے دیکھی نہیں جاتی محبت اس کی

حمیرہ مہتاب ——— کراچی

راہوں کی مشکلات میں کھوئے تو غم نہ تھا
رونا تو اس کا ہے سرِ منزل بھٹک گئے

شہرت زرین، ثمینہ عظمت ——— میانوالی

ہم کہ ٹھہرے دشت و فلک کے وہ مسافر!
کہ جن کا یقین ٹوٹ جائے پہنچ کر منزلوں کے ساتھ
بنا لیا ہے اس شہر میں اک شیشے کا گھر
آئے ہیں میرے چاہنے والے پتھروں کے ساتھ

دُرِ ثمین ——— سرگودھا

جانے کیا ہو گیا ہے راستوں کو
گھر سے نکلیں تو گھر نہیں ملتا
ہم اسی قافلے میں ہیں شاید
جس کو اپنا سفر نہیں ملتا

آمنہ ناز محمد ——— میرپور ساکرو

اک جھیل ہے آنکھوں میں جو آباد بہت ہے
صدیاں یونہی رونے کو تیری یاد بہت ہے
یہ کیا کہ بلکتا ہی پھرے دل شام و سحر
تو رب ہے تو اک ہی فریاد بہت ہے

عذرا ناصر ——— کراچی

سوگوار لوگوں کی، بے قرار لوگوں کی
زندگی میں کوئی بھی ضابطہ نہیں ملتا

زینب صدیقی ——— کوٹ چھٹہ

دل سمندر بھی ہو اگر امجد
پیاس غم کی بجھا نہیں سکتا

ثمینہ عظمت شاہ ——— میانوالی

ہم سے نسیم سحر کے لہجے میں بات کر
ہم وہ لوگ نہیں جنہیں اونچا سنائی دے

شمع حسام ——— سلانوالی

کل میں انہی رستوں سے گزرا تو بہت رویا
سوچی ہوئی باتوں کو سوچا تو بہت رویا
دل میرا ہر اک شے کو آئینہ سمجھتا ہے
ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھا تو بہت رویا

فوزیہ، نادیہ ——— کراچی

گو جاں سے تھی پھر بھی پلٹ آیا، کہ مجھ سے
دیکھی نہ گئی آئینہ خانے کی اداسی

ندا یوسف ——— کراچی

شرم آتی ہے کہ اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہیں

افشین شاہد ——— کراچی

اس کی باتیں پتھر سی
اور شیشہ بے چارہ میں
پہلے بھیگی پلکیں میری
بھیگ گیا پھر سارا میں

ثمینہ ——— میانوالی

ڈر شب کا وہاں کیوں نہ بھلا تیز بہت ہو
جس گھر میں دیا ایک، ہوا تیز بہت ہو
صدیوں کے مسافر بھی پلٹ آئیں گے ایک روز
یہ شرط کہ رفتارِ صدا تیز بہت ہو

درخشاں صغیر ——— کراچی

جیسے چاہو اسے احساس جدائی دے دو
رشتہ پیار کا رکھو تو عبادت جیسا
ہم بھرے شہر میں تنہا تو نہیں تھے لیکن
کوئی رشتہ نہ ملا پھر تیری چاہت جیسا

بشریٰ چودھری ——— بہاول پور

یاد آتا ہے سکوتِ شب میں اکثر وہ مجھے
کھینچ لاتا ہے میرے اندر سے وہ باہر مجھے
کچھ خبر لے آؤ، فروری کی بار تو
اب بہت سونا لگے اس کے بنا یہ گھر مجھے

نرگس یاسمین ——— کھاریاں

ان سے ضرور ملنا بڑے سلیقے کے لوگ ہیں
سر بھی قلم کریں گے تو بڑے احترام سے

طیبہ کرن ______ چمن

اُن کے ہونے سے ہے وابستہ میری آنکھ کا رزق
اپنے خوابوں سے کہو دوست کہ آتے جائیں

ریحانہ ناز ______ ڈلوال

سمیٹ کر لے جاؤ اپنی یادوں کے قصے
اگلی چاہت میں تمہیں ان کی بھی ضرورت ہوگی

ندا، فضہ ______ کراچی

لبوں پہ حرف نہ کوئی سوال رکھتا تھا
کبھی میں ضبط میں اتنا کمال رکھتا تھا
خبر کہاں تھی مجھے ہی وہ بھول جائے گا
اک اک چیز جو میری سنبھال رکھتا تھا

ثنا مجید ______ کورنگی کراچی

دو دلوں کے درمیاں زنجیر کی صورت رہا
کس نے توڑا کیسے ٹوٹا رابطے کو کیا پتا

سائرہ لقمان ______ کوئٹہ

ہم نے کب اس سے ملاقات کا وعدہ چاہا
دُور رہ کر تو اسے ۔ اور بھی زیادہ چاہا
یاد آیا وہ ہمیں اور بھی شدت سے
بھول جانے کا اسے جب بھی ارادہ چاہا

صائمہ جیمی ______ کراچی

ہم بھی کیا لوگ ہیں خوشبو کی روایت سے الگ
خود بہ ظاہر نہ ہوئے تجھ کو چھپانے کے لیے
ترکِ دُنیا کا ارادہ ہی کیا تھا کہ وہ شخص
آ گیا خواہشِ دُنیا کو جگانے کے لیے

عظمیٰ غلام نبی ______ کراچی

وہ کون ہے اس سے تو میں واقف بھی نہیں ہوں
وہ مجھ کو کسی اور کا ہونے نہیں دیتا
بچے کی طرح چیختا رہتا ہے مسلسل
کیا خوف میرے شہر کو سونے نہیں دیتا

ندا، بینش ______ فیصل آباد

مجھے اُڑنے کی خواہش اور سفر کا حوصلہ دے گا
پھر اس کے بعد میرے پَر میری آنکھیں جلا دے گا

سدرہ اسلم ______ کہروڑ پکا

صبح کے اُجالوں میں ڈھونڈتا ہے تعبیریں!
دل کو کون سمجھائے، خواب خواب ہوتے ہیں

کرن عدنان ______ کراچی

خموشی اُس گرہ کو کھولتی ہے
جو کھل سکتی نہیں لفظ و بیاں سے
کبھی اپنی طرف بھی لوٹ آنا
اگر فرصت ملے کارِ جہاں سے

آمنہ امتیاز ______ کراچی

ہوتی ہے صداقت میں خامشی کی گہرائی
صرف شور ہوتا ہے حرفِ بے صداقت میں

مشعال جنید ______ کراچی

یہ نئے نقش قدم میرے بھٹکنے سے بنے
لوگ جب ان پر چلیں گے راستہ بن جائے گا
میرے سینے میں ابھی اک جذبۂ بے نام ہے
ضبط کرتے کرتے حرفِ مدعا بن جائے گا

سدرہ وزیر ______ خوشاب بیل

ساری حقیقتوں کو خواب کر کے
عمر بھر کی خوشیاں سراب کر کے
بدل گیا ہے وہ چاہتوں سے فراز
میری عادتوں کو خراب کر کے

ارم ______ کراچی

بچھڑ کے مجھ سے اگرچہ اُداس وہ بھی تھا
پتہ چلا کہ زمانہ شناس وہ بھی تھا
میرے زوال سے پہلے ہی مجھ کو چھوڑ گیا
غضب کا ستارہ شناس وہ بھی تھا

تسنیم چوہدری ______ آکسفورڈ لوکے

ایسی گھڑی بھی آ گئی پچھتا رہے ہیں لوگ
ہجرت جو کر کے آئے ہیں اپنی زمین سے
مسرور ہوں تو آ کے ملے سب خلوص سے
کچھ سانپ جھانکتے تھے مگر آستین سے

ہماری مصنفہ نازیہ کنول نازی کی والدہ پچھلے کئی دنوں سے سخت علیل ہیں۔ ادارہ کرن مشکل کی اس گھڑی میں نازیہ کنول نازی کے ساتھ ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی والدہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور ان کا سایہ اہلِ خاندان پر قائم رکھے۔ (آمین)

قارئین سے نازیہ کی والدہ کے لیے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

ریحانہ امجد بخاری

مسکراتی کرنیں

قابلِ دید

ایک کنجوس نے اپنی نئی کار اپنے دفتر کے سامنے روکی۔ ابھی اس نے کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ قریب سے گزرنے والے ٹرک نے ایسی زور کی ٹکر ماری کہ کار کا دروازہ دور جا گرا۔ پولیس انسپکٹر پہنچا تو وہ شخص چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"اتنی قیمتی کار کا یہ حشر.....! میں نے یہ کار کل ہی خریدی تھی۔ کتنی ہی مرمت ہو جائے مگر یہ کبھی بھی پہلے جیسی نہیں ہو سکے گی۔" انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

"میں نے آپ جیسا شخص پہلے نہیں دیکھا۔ آپ کو کار کے نقصان کی اتنی فکر ہے۔ یہ احساس نہیں ہے کہ حادثے میں آپ کا ایک ہاتھ کندھے سے غائب ہے۔" کنجوس نے اپنے کندھے پر ایک نظر ڈالی اور بے ساختہ بولا۔

"اوہ میرے خدا..... اس کا مطلب ہے کہ میری نئی قیمتی گھڑی بھی گئی۔"

اقصیٰ علی..... لاہور

خیر خواہ

شوہر نے بیوی سے کہا۔

"بیگم! آج میرا دوست ڈنر پر آ رہا ہے۔" بیوی نے کہا۔

"آپ جانتے تو ہیں کہ آج ملازمہ چھٹی پر ہے۔ ابھی برتن دھونے کے لیے پڑے ہیں۔ صفائی کرنا ہے۔ میلے کپڑوں کا ڈھیر باتھ روم میں پڑا ہے اور منا بھی بیمار ہے۔"

"جانتا ہوں، سب کچھ جانتا ہوں۔" شوہر نے اطمینان سے کہا۔

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ نے اپنے دوست کو ڈنر کی دعوت دے ڈالی۔" بیوی نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ بے وقوف شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اس لیے ڈنر پر بلایا کہ اچھی طرح دیکھ لے۔ شادی کے بعد گھر کی کیا حالت ہوتی ہے۔" شوہر نے کہا۔

شاکرہ احمد..... خانیوال

دو شوقین

"میں اس عورت کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔" ایک پریشان حال شوہر نے عدالت سے کہا۔

"یہ عورت خواب گاہ میں بکریاں پالنے پر مصر ہے۔ خواب گاہ میں اتنی بدبو پھیلی ہے کہ اب میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رہ سکتا۔" جج نے اپنا سر ہلایا۔

"یہ تو واقعی بہت بری بات ہے۔ لیکن کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول دو۔ اس سے بو کم ہو جائے گی۔"

"کیا!" شوہر چیخ اٹھا۔

"اگر میں کھڑکی کھول دوں تو میرے سارے کبوتر اڑ نہیں جائیں گے۔"

بشریٰ ناز..... غالب مارکیٹ

پتنگ بازی

ہم پتنگ بازی کو کھیل مانتے ہیں۔ کیونکہ بقول یوسفی!

"جہاں کھیل میں دماغ پر زور پڑا۔ کھیل کھیل

نہیں رہتا۔ کام بن جاتا ہے۔" اور پتنگ بازی میں بوجھ دماغ کے بجائے کوٹھے پر پڑتا ہے۔ اس کھیل میں بندے کو کوٹھے پر جانا پڑتا ہے اور ہم کوٹھے پر آنے جانے والوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔

ہم نے ایک پتنگ باز سے پوچھا۔

"یہ پیچ لڑانے سے فائدہ۔"

کہا۔ "کلائی مضبوط ہوتی ہے۔"

پوچھا۔ "مضبوط کلائی کا فائدہ؟"

کہا۔ "پیچ لڑانے میں آسانی ہوتی ہے۔"

پیچ بھی سیاست کی طرح پر پیچ ہوتے ہیں مگر پتنگ بازی سیاست بازی میں یہ فرق ہے کہ ہمارے ہاں اول الذکر کے لیے ڈور اور آخر الذکر کے لیے بیک ڈور کی ضرورت ہوتی ہے۔ امریکا اور روس نے خلائی جہازوں کے ذریعے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ خدا تک پہنچنے کے لیے خلائی شٹل کا سہارا لینے کا منصوبہ ہی بنا رہے ہیں۔ جبکہ ہم نے پتنگ بازی میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ ہر سال "بذریعہ پتنگ" کئی لوگ خدا تک پہنچ جاتے ہیں۔

(ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب "جوک در جوک" سے انتخاب)

شافعہ اعوان۔۔۔ کراچی

حادثہ

ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"کیا کبھی تمہیں ٹرین کا کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔"

"ہاں!" دوست نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"ایک مرتبہ میں ٹرین میں کوئٹہ جا رہا تھا۔ میرے سامنے والی نشست پر باپ اور بیٹی بیٹھے تھے۔ ٹرین ایک سرنگ سے گزری تو ڈبے میں اندھیرا چھا گیا میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہو گیا کہ میں نے لڑکی کی بجائے اس کے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔"

سائرہ۔۔۔ لاہور

ذہین ڈاکٹر

ایک خاتون اپنی پڑوسن کو بتا رہی تھیں۔

"ڈاکٹر نے مجھے کھانا پکانے سے منع کر دیا ہے۔"

"کیوں خیریت؟ کیا آپ بیمار ہیں۔" پڑوسن نے اظہار ہمدردی سے پوچھا۔

"میں نہیں۔۔۔ میرے شوہر بیمار ہیں۔" خاتون نے جواب دیا۔

رانی ۔۔۔۔۔۔ کراچی

ذہانت

ایک پاگل مٹھی بند کیے ہوئے درخت کے نیچے بیٹھا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اسے ذرا ذرا کھول کر دیکھتا تھا۔ اس کے ایک ساتھی نے قریب آ کر پوچھا تھا۔

"مٹھی میں کیا دبائے بیٹھے ہو دوست۔" اس نے کانی آنکھ سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم خود ہی بوجھو؟" ساتھی سر کھجا کر بولا۔

"تتلی؟"

"غلط۔" اس نے پھر دماغ پر زور دے کر کہا۔

"چڑیا؟"

"بالکل غلط۔" ساتھی نے تالی بجا کر کہا۔

"ہاتھی۔"

"شاباش۔" پاگل نے خوش ہو کر کہا۔

"اس کا اب رنگ بھی بوجھو۔"

فوزیہ ثمرین۔۔۔ گجرات

چکنا چور

مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔ "میری کمر ٹوٹ کر بالکل چکنا چور ہو گئی ہے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "شاید تمہاری کمر کسی بڑے حادثے کی وجہ سے ٹوٹ گئی ہے۔"

مریض نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میری کمر کسی حادثے کے باعث نہیں ٹوٹی بلکہ میری کمر کو مہنگائی کے بوجھ نے توڑ کر بالکل چکنا چور کر دیا ہے۔"

ماجدہ انصاری۔۔۔ کراچی

میاں کے لیے

کئی ڈشیں وہ پکاتی ہے اپنی ماں کے لیے
بچا کے رکھتی نہیں ہے مگر میاں کے لیے
تلاش کر کوئی اسٹاپ در میاں کے لیے
نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
سوار ڈیڈی کے کاندھوں پر ہیں سبھی بچے
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے
نڈھال ہو چکا بیگم کی گفتگو سن کر
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے
خجل ہوں دے کے بیوٹی کریم جاناں کو
میں جیسے گملا اٹھا لایا گلستاں کے لیے
کرایہ دار نے خالی کیا جو بالآخر
مکاں میں باقی تھا کیا مالک مکاں کے لیے

انتخاب: افروز خانم۔۔۔ لطیف آباد
(نسیم سحر)

جھوٹے مرد

ایک طویل سفر کے دوران ایک پچپن، ساٹھ سالہ خاتون نے اپنے ایک ہم عمر مسافر سے محض وقت گزارنے کی خاطر علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ مرد زیادہ جھوٹے ہوتے ہیں۔"

مرد نے کہا۔

"محترمہ! چھوڑیے ان فضول باتوں کو، میں تو آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ باوجود اتنی عمر کے آپ کا حسن و جمال قیامت ڈھا رہا ہے اور آپ اتنی پرکشش ہیں کہ میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔" خاتون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور وہ شرما کر بولیں۔

"وہ عورتیں کتنی غلط ہیں جو مردوں کو خواہ مخواہ جھوٹا قرار دیتی ہیں۔"

عانیہ۔۔۔ کراچی

گرجنے کے بعد

حکیم سقراط اپنے زمانے کا بہترین فلاسفر اور عظیم انسان تھا اس نے جان بوجھ کر ایک جھگڑالو اور تند مزاج عورت سے شادی کی تھی تاکہ حکیم کی ذات میں غصہ اور کینہ نہ رہے۔

ایک مرتبہ حسب عادت اس کی بیوی نے لڑائی جھگڑا کیا اور سقراط کو سخت برا کہا پھر پانی سے بھری بالٹی ان کے سر پر انڈیل دی۔

اس ساری کارروائی کے بعد سقراط نے کمال تحمل سے صرف اتنا جواب دیا۔

"کیا گرجنے کے بعد برسنا بھی ضروری تھا۔"

مہوش فاروق۔ کراچی

برجستگی

میاں کسی سوچ میں غرق تھے کہ بیوی نے ٹھوکا دیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" میاں نے نہایت نمناک آواز میں جواب دیا۔

"تاج محل کا خیال آیا تو سوچا تمہاری قبر پر کس قسم کا کتبہ ٹھیک رہے گا۔" بیوی فوراً بولی۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ سادگی کا زمانہ ہے۔ بس مرزا مرحوم کی بیوی کافی ہو گا۔"

اسماء۔۔۔ لاہور

وضاحت

پادری صاحب ایک خوب صورت عورت کا ہاتھ تھامے ایک تقریب میں پہنچے تو ایک خاتون نے خوشگوار حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "فادر! یہ آپ کی وہی بیوی ہیں جن کے حسن کے ہم نے بہت چرچے سنے ہیں۔"

"خاتون۔۔۔! یہ میری واحد بیوی ہیں۔" پادری صاحب نے وضاحت کرنے کے انداز میں کہا۔

نسرین مصطفیٰ۔۔۔ اسلام آباد

✲ ✲

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

چکن کستوری

اجزا :

چکن بون لیس (کیوبس میں) ایک کلو

ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
پیاز (درمیانے سائز کی)	دو عدد (پسی ہوئی)
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
کچا پپیتا (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ (چوپ کرکے)	چھ تا آٹھ عدد
فریش کریم	آدھا کپ
کوکنگ آئل	آدھا کپ

گارنشنگ کے لیے :۔

پیاز کے لچھے، کھیرے کے سلائس اور ٹماٹو کیچپ

ترکیب :

کریم کے سوا تمام مسالے چکن کی بوٹیوں پر لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے ایک طرف رکھ دیں۔ اب کریم بھی شامل کریں اور ان بوٹیوں کو سیخوں پر چڑھا کر دہکتے ہوئے کوئلوں پر سینک لیں اور سیخوں کو گھماتی رہیں تاکہ تمام اطراف سے یکساں طور پر پک جائیں اور اس دوران کسی برش کی مدد سے آئل بھی لگاتی رہیں تاکہ ذائقہ اور لذت بڑھ جائے۔ تیار ہونے پر کیچپ کھیرے اور پیاز کے لچھوں کے ساتھ پیش کریں۔

انوکھے چپس

اجزا :

چھلے اور کٹے آلو	600 گرام
پانی	نصف کپ
مکھن	30 گرام
میدہ	75 گرام
انڈے	تین عدد
تیل	ڈیپ فرائنگ کے لیے

ترکیب :

کٹے اور چھلے آلوؤں کو ابال لیں، اب اتنا ملیں کہ تمام آلو یکجان ہو جائیں کوئی گٹھلی نہ رہے۔ ایک برتن میں پانی اور مکھن ملا کر ابال آنے دیں۔ جب مکھن پگھل جائے تو چھنا ہوا میدہ ملا کر اتنا چمچہ چلائیں کہ میدہ برتن کے کنارے چھوڑ کر گیند کی شکل اختیار کرلے، اب اس میدے کو بلینڈر میں ڈال دیں۔ ساتھ ہی انڈے ایک ایک کرکے شامل کرتی رہیں اور بلینڈر چلا دیں اب آلو بھی ملا کر بلینڈ کرلیں۔ ایک پائپنگ بیگ میں یہ مرکب بھر کر گرم تیل میں پانچ سینٹی میٹر لمبا ٹکڑا ڈالتی جائیں۔ جب اچھی طرح سنہری ہو جائے تو نکال کر جاذب کاغذ پر رکھ دیں۔ پیش کرتے ہوئے نمک چھڑک دیں۔

آلو کے کباب

آلو	ایک کلو گرام (چھلے اور کٹے ہوئے)
انڈے کی زردی	دو عدد
کریم	دو کھانے کے چمچے
میدہ	حسبِ ضرورت
انڈے	دو عدد (پھینٹے ہوئے)
ڈبل روٹی کا چورا	ڈیڑھ کپ
تیل	تلنے کے لیے
نمک	حسبِ ذائقہ

چھلے آلو ابال لیں۔ ٹھنڈا کرکے مکس کرلیں۔ اس میں کریم اور زردیاں ملا کر ریفریجریٹر میں تیس منٹ کے لیے رکھ چھوڑیں۔ اب آلو نکال کر ان کے لمبے کباب تیار کریں۔ ہر کباب پر پہلے میدہ اچھی طرح سے لگائیں اس کے بعد انڈے میں ڈیپ کریں۔ پھر ڈبل روٹی کا چورا اچھی طرح لگائیں۔ اب ان کبابوں کو ٹرے میں ڈھک کر تین منٹ کے لیے ریفریجریٹر میں رکھ دیں پیش کرنے سے قبل تیل میں ڈیپ فرائی کریں۔ سنہرے کباب تیار ہیں۔ کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

چٹ پٹی سلاد

اجزا :

چھوٹے آلو	ایک کلو گرام
سیاہ رائی دانے	ایک چائے کا چمچہ
پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن	ایک جوا
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
تازہ دھنیا	1/4 کپ کٹا ہوا
نمک	حسبِ ذائقہ

آلو ابال لیں، چھیل کر یونہی رکھ لیں۔ اب فرائنگ پین میں تمام مسالے خشک بھون لیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو آلوؤں پر چھڑک دیں۔ لذیذ سلاد تیار ہے۔

فرنچ شاشلک

مرغی کا گوشت (بون لیس) ایک کلو

پیاز	دو عدد
ہرے سیب	دو عدد
انڈا	ایک عدد
شملہ مرچیں	دو عدد
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
تیل	دو کپ
لال ٹماٹر	دو عدد
نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
چائنیز نمک	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو چائے کے چمچے
چاول	آدھا کلو (ابلے ہوئے)

گوشت کے کیوبز کاٹ لیں۔ پیاز، شملہ مرچ اور سیب کے بھی باریک قتلے کاٹ کر رکھ لیں۔ گوشت، پیاز، شملہ مرچ، ٹماٹر اور سیب کو سویا سوس، نمک، چائنیز نمک، سرکہ، سیاہ مرچ پاؤڈر، انڈا، کارن فلور ملا کر رکھ دیں۔ شاشلک اسٹک پر ایک ایک بوٹی اس کے بعد پیاز، ٹماٹر، شملہ مرچ اور سیب کے قتلے پرو دیں۔ گہرے فرائنگ پین میں تیل گرم کریں اور ان سیخوں کو گھما گھما کر تل لیں۔ اور چاروں جانب سے براؤن کرلیں۔ ابلے ہوئے چاولوں کے اوپر رکھ کر پیش کریں۔

☆ ☆

حسن و صحت

ادارہ

اپنے بالوں کی خرابی کا علاج خود آپ کے پاس ہے

ہم میں سے ہر ایک خوب صورت گھنی زلفوں کے خواب دیکھتا ہے مگر بہت کم لوگ ایسے بالوں کے لیے کوئی صحیح قسم کی تدبیر کرتے ہیں سوائے اس کے کہ کبھی کبھار بالوں کا مساج کر لیں یا مہندی لگالیں۔

لیکن اس کی دیکھ بھال کا ہمارے پاس وقت کہاں ہوتا ہے؟ جبکہ قدرت نے ہمیں جو تحفہ دے رکھا ہے اس کی دیکھ بھال کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے اگر ہم اپنے بالوں میں خوشگوار تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے بالوں پر ہفتے میں چند مرتبہ کچھ منٹ خرچ کرنے ہوں گے۔

اور جب ہمیں اپنے بالوں کے لیے کسی تیر بہدف نسخے کی تلاش ہو تو ہمارے باورچی خانے کی الماریاں ہی ہمارے لیے خزانہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

نقصان زدہ Damaged بال

یہ آج کل خواتین کا ایک عام مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں آپ کم از کم یہ کر سکتی ہیں کہ اپنے سر کو آگے جھکائیں اور گردن کے پچھلے حصے سے لے کر آگے تک برش کریں۔ اس سے آپ کی خون کی گردش میں یکسانیت پیدا ہو گی اور ہیئر آئل بھی برابر برابر تقسیم ہو جائے گا۔ اب ایک چوتھائی کپ سیسم آئل میں تین چار قطرے لیونڈر یا بیسل آئل ڈال کر بالوں کی جڑوں میں مساج کریں۔ پچاس پچاس گرام روز مری اور Thyme ایک لیٹر پانی میں ابال لیں۔ اب ایک تولیہ اس پانی میں بھگو لیں پھر اس تولیہ کو آدھے گھنٹے کے لیے سر کے گرد لپیٹ لیں۔ اس کے بعد جڑی بوٹی والے محلول سے سر پر شیمپو کر لیں۔ آپ دو انڈوں میں ایک لیمن جوس ڈال کر اسے بھی سر میں لگا کر بالوں کو اس حالت میں بیس منٹ کے لیے چھوڑ سکتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں آپ کے سر کے بال نرم ہو جائیں گے۔

ایک اور ہیئر پیک حاضر ہے۔

آپ یہ بھی کر سکتی ہیں کہ تین چائے کے چمچے مایونیز کے لے کر اس میں پاؤڈر کی شکل میں آملہ، سکاکائی اور ریٹھا ملا کر اس کا پیسٹ بنا لیں اور اسے بالوں میں لگا کر تیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں پھر اس کے بعد بالوں کا ہربل شیمپو کر لیں۔

خشکی

یہ بیماری بالوں کی جڑوں کی صفائی نہ ہونے اور غیر صحتمندانہ طرز زندگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بال تیزی سے گرنے لگتے ہیں اور دانے بھی نکل آتے ہیں۔ ڈینڈرف نیند پوری نہ ہونے، طویل بیماری، اندرونی کمزوری، غیر متوازن غذا، دباؤ، کافی مقدار میں پانی نہ پینے اور ورزش نہ کرنے کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔

ایک متوازن غذا کھائیں زیادہ سے زیادہ سلاد (یقیناً "ہیوی ڈریسنگ کے بغیر) تازہ پھل، ہری سبزیاں لیں۔ زیادہ سے زیادہ جوس پئیں۔ ایک دن میں بارہ گلاس پانی پئیں۔ بالوں کو گرم کوکونٹ آئل سے مساج کریں۔ بالوں کی جڑوں میں لیمن جوس لگائیں۔ ایک گھنٹے کے لیے اس حالت میں رہ کر پھر بالوں کو شیمپو کریں۔ اس کے ساتھ ہی لائف اسٹائل میں تبدیلی بھی ضروری ہے۔ مہندی بھی بالوں کو گرنے اور سفید ہونے سے روکتی ہے۔ اسے ہفتے میں کم از کم ایک بار بالوں میں لگائیں۔ اس سے آپ کے بال زیادہ کنڈیشنڈ نظر آئیں گے۔

بالوں کا وقت سے پہلے سفید ہونا

وقت سے پہلے بالوں کے سفید ہونے کا عمل اچھا تیل استعمال کر کے روکا جا سکتا ہے جس میں براہمی اور آملہ بھی شامل ہو۔ کیونکہ یہ دونوں جڑی بوٹیاں بالوں کو قدرتی طور پر کالا کرتی ہیں۔ پچاس گرام پاؤڈر آملہ لیں اور اسے ڈرائی روسٹ کریں یہاں تک کہ اس کی راکھ بن جائے۔ اسے ٹھنڈا کر کے اس میں ایک لیٹر کوکونٹ آئل ملا کر بیس منٹ تک ہلکی آنچ پر گرم کر لیں اور ٹھنڈا ہونے دیں۔ اس سے بالوں کی جڑوں میں مساج کیا جا سکتا ہے۔ اضافی تیل اسٹور کر کے ہفتے میں دو بار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مہندی بھی بالوں کو کالا کرتی ہے۔

بالوں کا خشک ہونا

خشک بالوں کو مسلسل کنڈیشننگ اور ہیمپرنگ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ایسے بال خاصے برے لگتے ہیں۔

آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہیں؟

بالوں کی جڑوں میں پابندی سے گرم زیتون کے تیل اور آدھا کپ شہد سے مساج کریں جس میں ایک چمچہ تازہ کریم ملی ہوئی ہو۔ اب اپنے بالوں کو آدھے گھنٹے کے لیے "کلنگ فلم" میں لپیٹ لیں اور پھر ہلکا سا ہربل شیمپو کر لیں۔ بالوں کی خشکی کی اعتبار سے یہ عمل ہفتے میں ایک یا دو بار کیا جا سکتا ہے۔

خشکی سے بالوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے جن میں سے بعض نقصانات یہ ہیں۔

کمزور باریک بال

اس قسم کے بال "غیر کنڈیشنڈ" نظر آتے ہیں جن کو فوری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے ایسے بال ہوتے ہیں وہ یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہر بار جب وہ کنگھی کرتے ہیں ان کے بال گرتے ہیں۔

اس سلسلے میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟

بالوں کو مضبوط بنانے کے لیے بہت آہستگی سے انہیں گرم کاسٹر آئل سے مساج کریں اور پھر ان کی تھراپی کریں۔ اس کے ساتھ ہی پانچ پانچ چمچے شہد اور بادام کا تیل لے کر ہیئر پیک بنائیں اور اسے بالوں کی جڑوں میں لگائیں اور پھر تھراپی کریں۔ ایک ماہ تک ہفتے میں تین بار یہ عمل دہرائیں۔

تیل والے بال

جن خواتین کے Oily Hair ہوتے ہیں وہ مسلسل اپنے بے رونق اور ڈھیلے بالوں میں زندگی کی رمق پیدا کرنے کی تگ و دو کرتی رہتی ہیں۔

آپ اس کے لیے کیا کر سکتی ہیں؟

چار چمچے فلر مٹی (Fuller Earth) تین چمچے سرکہ، آدھی بوتل ایپل سڈرا میں ملا کر ہیئر پیک بنائیں اور اسے بالوں کی جڑوں میں لگا کے بیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں اور پھر شیمپو کریں۔ اس سے بال نا صرف نرم ہوں گے بلکہ ان میں قدرتی چمک بھی پیدا ہوگی۔

ایسے بالوں کو دو موسمبیوں کے جوس میں، ایک لیموں کا رس اور تھوڑا سا پانی ملا کر بھی اس سے شیمپو کیا جا سکتا ہے۔

بے رونق ڈھیلے بال

دیکھ بھال نہ کرنے سے بالوں کا یہ حال ہوتا ہے پھر آپ جو کچھ کھاتے پیتے ہیں اس کا اظہار بھی بالوں سے ہوتا ہے۔

"آپ کیا کر سکتی ہیں؟"

بالوں کی جڑوں میں گرم بادام کے تیل سے مساج کریں۔ پھر ایک ایسا مکسچر لگائیں جس میں دو پسے ہوئے کیلے، دو چمچے مٹی، دو موسمبیوں اور ایک لیموں کا جوس ملا ہوا ہو۔ اسے بیس منٹ تک لگا رہنے دیں اور پھر شیمپو کر لیں۔ یہ "فروٹ سلاد ہیئر پیک" آپ کے بالوں میں غضب کی تبدیلی لے آئے گا۔ ہاں اگر آپ کو بالوں سے پھلوں کی خوشبو آئے تو آپ اسے آدھے لیٹر پانی میں ایک چمچہ لیمن جوس اور دو چمچے جیرانیم آئل ملا کر دھو سکتی ہیں۔

بالوں کے سرے (Splitends)

زیادہ تر لوگ، جو اپنے بالوں کا خیال نہیں رکھتے اس مسئلے کا شکار ہو سکتے ہیں خاص طور پر خشک بالوں والے اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

آپ کیا کر سکتے ہیں؟

کسی پروفیشنل سیلون میں اپنے بالوں کے سرے کٹوائیں کم از کم تین مرتبہ آپ کو یہ کام کرانا چاہیے تاکہ آپ مکمل طور پر "اسپلٹ اینڈز" سے نجات حاصل کر سکیں۔

آپ اپنے بالوں کو گرم ناریل یا زیتون کے تیل سے مساج کر سکتے ہیں اور اس کے بعد Turban تھراپی کروا سکتے ہیں۔ کلپ، ربربینڈ اور نوکیلے برش استعمال کرنے سے گریز کریں۔ جب بال گیلے ہوں تو برش نہ کریں۔ اس کے بجائے بال خشک ہو چکے ہوں تو چوڑے دندانے والے کنگھے سے کنگھی کریں۔

آپ مندرجہ ذیل کونیک پروٹین کنڈیشنر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ دو انڈوں میں ایک چمچہ وہیٹ جرم آئل اور دو چمچے ایپل سڈرا سرکے میں ملائیں اور بالوں کی جڑوں میں مساج کریں۔ پھر بالوں کو شاور کیپ سے ڈھک کے پندرہ بیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔

ہلکے سے ہربل شیمپو کریں۔ چار ہفتوں میں آپ کو فرق نظر آجائے گا۔

مختلف قسم کے بال

ایسے بالوں کی نشاندہی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ بالوں کی جڑوں میں گریس لگی ہو اور اس کے سرے خشک ہوں۔ آپ کو دو مختلف قسم کا ٹریٹمنٹ اپنے بالوں کو دینا پڑے گا۔

بالوں کی جڑوں کو ادھ کٹے لیموں، اورنج جوس اور بالآخر شہد سے مساج کریں۔ پھر شیمپو کرنے سے پہلے نصف گھنٹے کے لیے اپنے بالوں کو Cling Film میں باندھ لیں۔ ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ آپ کو یہ عمل دہرانا چاہیے۔ آپ کو خود فرق نظر آجائے گا۔

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

صابرہ یوسف۔۔۔۔دریا خان

س: کوئی اچھا سا شعر اپنی پسند کا سنا دیں۔

ج: اچھا شعر وہ بھی تم کو کمال ہے۔

مصباح الماس۔۔۔۔ملتان

س: بھیا! انسان یہ جانتے ہوئے بھی اتنا پیار کیوں کرتا ہے کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں؟

ج: ہائے بے چارہ انسان۔

سلمیٰ لوہار۔۔۔۔شکار پور

س: بھیا! بعض لوگ دھوکا دے کر مسکراتے ہیں بعض دھوکا کھا کر، بتائیے جیت کس کی ہوتی ہے؟

ج: دونوں معاملوں میں ہماری۔

نازیہ حسین۔۔۔۔راولپنڈی

س: ذوالقرنین جی!

"جب وہ چوہے پھر کو" کی قسط نہ ہوئی۔ دوبئی میں بیٹھے، بیٹے کا خط یا ٹیلی فون ہو گیا جو ہر ماہ اپنی ماں کو یہ ہی کہتا ہے کہ اگلے ماہ آؤں گا۔ آئندہ ماہ ان شاء اللہ ضرور آؤں گا اسی طرح کرتے کرتے دو سال گزر گئے پر بیٹا ابھی تک نہ آیا۔

ج: خوش ہو جاؤ کہ بیٹا آگیا ہے ماں کا اس مہینے۔

نغمانہ تجمل حیدری۔۔۔۔پنڈ دادن خان

س: اگر کوئی بہار میں روٹھ جائے تو؟

ج: خزاں کا انتظار کریں۔

روزینہ ملک۔۔۔۔ایمن آباد

س: تجھ سے لفظوں کا نہیں روح کا رشتہ ہے میرا
تو میری سانسوں میں تحلیل ہے خوشبو کی طرح

ج: اے لڑکی ہوش کے ناخن لو یہ دنیا والے تمہارے اس شعر کو کیا سمجھیں گے، معلوم ہے؟

لالہ صحرائی۔۔۔۔بھکر

س: لڑکیوں نے آپ کو ذوالقرنین کے بجائے ذوقی اور نین کیوں بنا دیا ہے؟

ج: تم ہی سروے کر کے نتائج سے ہمیں آگاہ کرو۔

عارفہ تبسم۔۔۔۔شور کوٹ

س: ذوقی بھیا! ہار کے معنی ہیں شکست۔ پھر خوشی کے موقع پر یا جیت کے موقع پر ہار کیوں پہنائے جاتے ہیں؟

ج: تاکہ تصویر کے دونوں رخ مدنظر رہیں۔

محمودہ خانم آرزو۔۔۔۔مانسہرہ

س : نین! اگر تمہیں کوئی دریا میں ڈوبنے کے بجائے نینوں میں ڈوبنے کو کہے تو کیا کرو گے؟
ج : دریا میں ڈوب جاؤں گا۔

ارسہ یعقوب...... شاہ کوٹ

س : لڑکیاں تو ڈوپٹہ بدل بہنیں اور مرد پگڑی بدل بھائی بنتے ہیں۔ چلیں ہم دونوں عینک بدل بہن بھائی بن جائیں کیا خیال ہے جناب کا؟
ج : پڑوسی کی عینک ہے جو تصویر میں دیکھتی ہو۔ پوچھنا پڑے گا اس سے۔

نسرین خانزادہ...... تھاروشاہ

س : اس مادہ پرست دور میں دوستی جیسی پاکیزہ اور مقدس نعمت بھی اپنی پہچان کھو گئی ہے آخر انسان کس بھروسے پر جیے؟
ج : صحیح دوست کی شناخت کس طرح کرے؟

رفیعہ انجم...... قلعہ سوبھا سنگھ

س : یہ آپ نے آج نیا ڈریس پہنا ہوا ہے، کہیں جانے کی تیاری ہے کیا؟
ج : جانا نہیں ہے آج۔ کچھ لوگوں نے دیکھنے آنا ہے مجھے۔

زیب چوہدری...... ملتان

س : سچ سچ بتایئے آپ کو رشتہ کیوں نہیں ملتا ہے کیا کمی ہے آپ میں ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک تو ہیں۔
ج : یہی میں بھی سمجھتا ہوں لیکن......

کاظمہ سید...... راولپنڈی

س : نین بھیا! اگر آپ کے دل میں سبزیاں اگائی جائیں تو؟
ج : تو کیا ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ بس کریلے کی فصل سے پرہیز فرمایئے۔

زیبی باجوہ...... گوجرہ

س : بھیا جی اگر آپ کو ٹیلی ویژن والے "میلہ" پروگرام کا میزبان بنا دیں تو قبول کریں گے؟
ج : شوق سے قبول کریں گے۔ بس وہ پروگرام، نیلام گھر نہ ہو۔

سحر نوری...... تھرپارکر

س : یہ تو بتائیں اگر آپ کو چاند پر بھیجا جائے تو وہاں سب سے زیادہ کون یاد آئے گا؟
ج : چاند پر ہمیں مریخ کے لوگ یاد آئیں گے۔

رضیہ حمید...... شکارپور

س : سنا ہے آپ کلاسیکی موسیقی اور پکے راگ راگنیوں پر سر دھنتے ہیں؟
ج : بی بی! اگر آپ نے یہ نہیں سنا ہو گا کس کس کا سر دھنتے ہیں۔

عارفہ بیگم...... کراچی

س : ذوقی بھیا! کسی کی شہرت کو چار چاند ہی کیوں لگتے ہیں چار سورج کیوں نہیں لگتے؟
ج : بھئی سمجھو نا! اتنی دہکتی ہوئی شہرت میں لوگ بھسم ہو جائیں گے۔

طاہرہ مرزا...... واہ کینٹ

س : لوگ نیکی کرنے میں پہل کیوں نہیں کرتے؟
ج : ہم تو پہل ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرحت انصاری...... کراچی

س : نین بھیا! اگر میں آپ کو عید کارڈ ڈاک کے بجائے کبوتر کے ذریعے بھیجوں تو اسے کون سا ایڈریس سمجھاؤں؟
ج : کبوتر کے ذریعے نہیں، مرغی کے ذریعے بھیجو! چکن تکہ ہم شوق سے کھاتے ہیں۔

غزالہ انیس غزل...... کراچی

س : ذوقی بھائی! کیا سوال کے جوابات کے لیے آپ کے دماغ میں کمپیوٹر فٹ ہے یا کوئی ساتھ دیتا ہے؟
ج : کیا کمپیوٹر ساتھی نہیں ہوتا۔

صباحت یاسمین...... گجرات کھاریاں

اس دفعہ کرن...... لیٹ ہو گیا تو بیس ستمبر کو میں اسکول سے واپسی پہ سیدھی پاکستان بک سنٹر چلی گئی۔ گھر پہنچنے تک اتنی گرمی لگ چکی تھی کہ فین ڈھونڈنے کی بجائے کرن سے ہی اس کا کام لینا شروع کر دیا۔ خود بخود ہی صفحہ 288 کھلا تھا۔ جانے پہچانے سے لفظ تھے۔ فوراً" سے بیشتر خط کے ابتدائی حصہ کی طرف نظریں دوڑائیں...... او...... اوہ میرا منہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اسی ادھ کھلے منہ کے ساتھ خط کا پہلا نصف حصہ پڑھا اور کھوئی کھوئی سی آواز میں اقرا تک اطلاع پہنچائی۔

میرا لیٹر آیا ہے، اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر خط کے اختتام تک وہ توصیفی و تنبیہی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں شکوہ کناں نظروں سے کرن کو...... کیا میرا "ساتھ ساتھ" اس قابل بھی نہیں تھا کہ کہہ دیتیں ہم معذرت خواہ ہیں! خیر چند ہی لمحوں میں یہ بات دل سے جھٹک کر الٹے پاؤں چلتی اداریہ تک آئی۔

نن...... نہیں، یقیناً" کرن کے صفحہ نمبر دس کو میرے ساتھ شرارت سوجھی ہے اور صفحہ نو نے ہمسائیگی کا حق ادا کیا ہے۔ پہلی دفعہ میں کرن کے صفحات کو اتنی آہستگی اور اس قدر ڈر کے ساتھ الٹ رہی تھی مبادا دو صفحات ایک ساتھ نہ پلٹ دوں۔ وہ ساعت، ساعت مبارک تھی وہ لمحہ، لمحہ سکوں تھا جب میں نے ارنی کو ہنستے بولتے چلتے پھرتے دیکھا، وہ ارنی جو چند روز قبل تک میرے ذہن کے پردے پر نمودار ہونے والی ایک شبیہہ تھی۔

کہیں کرن نے میری محبت میں...... مگر نہیں کرن ایسی محبت تو ہم میں سے کسی سے نہیں کرتا۔

تو کیا کرن نے مجھے چلنا سکھا دیا؟ میرا پہلا شرمایا، لجایا، گھبرایا، لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا قدم، اور شفیق ماں کی طرح مجھے تھامے ہوئے کرن...... مجھے دونوں ہی بہت بھلے لگے۔

سرورق بہترین تھا۔ جیولری، مہندی، میک اپ، ڈریس، ماڈل سب نے ہی دل موہ لیا۔

اداریہ کی تھرڈ لاسٹ لائن پڑھ کر لگا عید کی اس سے مختصر اور جامع تعریف کبھی پڑھی ہی نہیں۔ نعت پڑھ کر بے اختیار دل چاہا کسی اچھے نعت خواں سے یہ سنی جائے۔

"عید پھر آ گئی" دلچسپ رہا مگر فنکار برادری کی اکثریت بھی عام آدمی کی طرح وہی بار بار دہرائی جانے والی بات کرتی نظر آئی۔

نبیل بھائی نے بہنوں کے سوالات کے جوابات بہت اچھے بہت سچے دیئے۔

"فوزیہ یاسمین" مشرقی عورتوں کے مخصوص رنگوں...... وفا، گھرداری، اعزہ سے محبت کی اوڑھنی اوڑھے بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

"ہما کاشف" کا نام پہلی بار سنا، حیرت ہے کہ ریڈیو کی adict اقرا نے کبھی ذکر نہیں کیا۔

"در دل" کی اس ماہ کی خوب صورتی زری کے حساس جذبات کا اچھوتا بیان ہے۔ دل آور شاہ شاید ہی دوستی اور محبت میں سے کوئی ایک نبھائے، ایسے لوگ بہت skillful ہوتے ہیں۔ موتیں، محبتیں...... سب ایک ساتھ نبھانے کا آرٹ خوب جانتے ہیں۔

"ساتھ ساتھ" کا تھیم اچھا تھا۔ بعض چیزوں، بعض باتوں، بعض معاملات، بعض انسانوں کو ہم اپنی منزل سمجھ بیٹھتے ہیں جبکہ وہ محض منزل تک رسائی کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں۔ "سوہرا تے جوائی" فرحانہ ناز ملک نے بہت خوبی سے ایک رومینٹک اسٹوری میں ایک اور مگر ذرا انوکھی لو اسٹوری کی مدد سے مزاح کا رنگ بھرا۔

سمیرا حمید نے اپنی ہیروئن کو بہت پریکٹیکل اپروچ والی دکھایا۔ جو حالات کی چھوٹی موٹی تنگی ترشی کو سر پر سوار نہیں کرتی صرف اپنی زندگی میں تازہ ہوا کا گزر چاہتی ہے۔

انیلہ جی! محبت کرنے والا اور اتنی دور رس سوچ؟ جلیسے مان ہی لیتے ہیں کوئی محبت کے باوجود بھی Ground reallities کو اتنی اچھی طرح سمجھ جانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

عقیلہ جی! دل کٹ کر رہ گیا مگر پھر سوچا یہ بھی تو ہم ہی ہیں' ہمارا ہی کوئی ایک چہرہ!

"اورے پیا" کے متعلق بس اتنا ہی کہ پچھلے ماہ سے جو امیدیں لگا رکھی تھیں ان میں سے صرف 98 فیصد پوری ہوئیں۔ وہ رنگ کچھ پھیکا سا لگا جس کے فسوں میں ہم اگست سے تھے۔

لگے ہاتھوں "دست کوزہ گر" پر بھی تبصرہ کرتی چلوں' اختتام تک ادھار رکھنے سے ڈر ہے کہ کہیں اختتام تک ہم نہ رہے ادھار چکانے کو تو..... خیر نمل کے اس وقت کے محسوسات جب خرم اسے احساس دلاتا ہے کہ اس کی مرضی اس کے ماں باپ کے لیے چنداں اہمیت کی حامل نہیں' ان کا بیان تھوڑا مفصل ہونا چاہیے تھا۔ (میری ناقص رائے کے مطابق' کیونکہ جب یہ صرف پڑھنے سے ہمارے اندر کرب کا اک تیز راگ چھڑ گیا تھا تو پھر اس لڑکی پر کیا کیا نہ بیتی ہوگی) ان کی جوڑی بہت اچھی ہے۔ کچھ غلط نہ سمجھیے گا۔

روشنی بخاری کے ناولٹ "جرم محبت" کے حوالے سے کیا کہوں؟ کیا محبت اتنا بڑا جرم ہے؟ ہمارے ہاں تو مجرم دندناتے پھرتے ہیں پھر ان مجرموں کو اتنی اذیت ناک سزا کیوں؟ جو معذور بھی ہیں' ارے انہیں تو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا!

عائشہ کے افسانے کا تھیم اچھا تھا مگر پیش اس انداز سے کیا گیا کہ بے حد عام لگا۔

نازیہ جی! مزا آیا۔ قادرین جیسے ہیرو تو یوں بھی اپنے اپنے' دیکھے بھالے لگتے ہیں۔ قادرین نام بھی بہت خوب صورت ہے۔

علی سید کی سب سے اچھی بات..... جی ہاں ان کا گجرات سے ہونا۔ "کرن کرن خوشبو" تو سراسر اپنے نام کی تفسیر ہے۔ "یادوں کے دریچے" اور "مجھے یہ شعر پسند ہے" پسند آئے۔ "مسکراتی کرنیں" ہر بار کی طرح مسکان کا تحفہ لیے آئیں۔ "دستر خوان" میں سے فروٹ کریم ڈیلائٹ اور "کرن کتاب" سے انڈین پوری کھیر ٹرائی کرنے کا ارادہ ہے۔ "حسن و صحت" کے مفید مشوروں پر ہم سے عمل کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ذوقی بھیا کی باتیں تو اتنی نئی نکور ہیں لگتا ہے ابھی ہی کہی ہوں..... انیقہ انا نے حسب معمول خوبی سے تبصرہ کیا۔ اب اجازت دیں۔

یاسمین کنول.....پسرور

ستمبر کا شمارہ قدرے تاخیر سے ملا۔ "من کا ملے تو اچھا ہے" نے متاثر کیا۔ "دست کوزہ گر" اچھا جا رہا ہے۔ "او رے پیا" مکمل ناول بے حد اچھا لگا علی سید کی باتوں نے متاثر کیا۔

ستمبر کا شمارہ عید نمبر تھا اور سرورق بہت خوب صورت اور دیدہ زیب تھا۔ دلہن بڑی پیاری اور تیکھے نقوش کی مالک تھی۔ مہندی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ عید کا ذکر چوڑیوں' مہندی اور ہار سنگھار کے بغیر تو ممکن نہیں۔

لیکن عید کو گزرے کئی ہفتے ہو چکے۔ کرن نے عید میں اپنا حصہ ذرا دیر سے ڈالا ہے۔

مستقل سلسلے حسب معمول اچھے تھے۔ اللہ کراچی میں امن و امان کو یقینی بنائے اور کراچی کے مکینوں کو سکون قلبی بخشے بلکہ کراچی پہ کیا موقوف ہے پورے ملک کا یہی حال ہے۔ عذاب الٰہی کو دعوت دی جا رہی ہے انسانوں کو انسانوں پر ظلم و ستم کا بازار بند کر دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے (آمین ثم آمین)

مدیحہ مغل.....گوجرانوالہ

کرن! کے تمام اسٹاف کو سب سے پہلے بیسٹ وشز' ٹائٹل گرلز کمال کی ہوتی ہیں اور سب سے پہلے "حمد و نعت" سے سلسلہ شروع ہوتا ہے دل و روح معطر ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی اور اپنے محبوب کی محبت ہمارے دلوں میں اسی طرح ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔

سلسلے وار ناولز میں نبیلہ عزیز کا ناول بہت اچھا ہے "کرن کرن خوشبو" میں بہت کچھ زندگی سنوارنے کے لیے ملتا ہے اگرچہ ہم لوگ سمجھیں تو.....

"مسکراتی کرنیں" میں مسکراہٹیں پڑھ کر تو بندہ واقعی مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ "دستر خوان" سے تو کوئی دلچسپی نہیں اس لیے اس سے ذرا دور ہی رہتے ہیں۔

"نامے میرے نام" تو میرا پسندیدہ سلسلہ ہے سب سے پہلے "حمد و نعت" کے بعد تو شروع ہی پیچھے سے کرتے ہیں۔ پلیز میری ایک فرمائش ضرور نوٹ کر لیں۔ ساحر لودھی کا انٹرویو ضرور شامل کریں۔

آخر میں مدیرہ صاحبہ سے نہایت گزارش سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس خط کو مہربانی سے شائع ضرور کر دیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے (آمین)

ام رومان.....عبدالحکیم

کرن بارہ کو ملا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ عید کے حوالے سے بہت ہی خوب صورت ٹائٹل تھا۔ کرن کے ٹائٹل ہمیشہ ہی خوب صورت ہوتے ہیں حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد سب سے پہلے مستقل سلسلوں کی طرف دوڑے خیر سے اپنی موجودگی باعث راحت بنی اس کے بعد فوزیہ جی کا "دست کوزہ گر" پڑھا۔ فوزیہ جی! بس جلد از جلد خرم اور نمل کی شادی کروائیے مجھے اگلی قسط کا نہایت بے چینی سے انتظار ہے۔ نبیلہ عزیز کا "در دل" بے حد اچھا جا رہا ہے عدیل اور مدحیہ کا ٹکراؤ نہایت دلچسپ لگتا ہے۔ زری بے چاری کے ساتھ تو بالکل بھی برا نہیں ہونا چاہیے آپی جی! یہ خاموش محبت کرنے والی لڑکیاں تو بے حد معصوم ہوتی ہیں۔ "مجھ سے ملیے" فوزیہ یاسمین سے ملاقات خوب رہی۔ "یادوں کے دریچے" میں سب کے انتخاب پسند آئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ ہمارے وطن کے حالات بہتر کرے خصوصاً کراچی کے حالات پڑھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن میں امن و امان پیدا کرے اور ہمیں بھی ہدایت دے اور ہمارے حکمرانوں کو بھی ہدایت دے تمام قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بھی ملک و قوم کی سلامتی کے لیے دعا کریں۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو (آمین)

سدرہ وزیر.....خوشاب (پیل)

اس دفعہ کرن تھوڑا لیٹ ملا ٹائٹل دیکھ کر دل خوش ہو گیا جس ناول نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا وہ "اورے پیا" ہے جس نے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ کرن کے تمام سلسلے زبردست تھے خاص کر "قارئین کی عدالت میں" پلیز آپ اس سلسلے میں "عائشہ ثنا اور ڈاکٹر عامر لیاقت" سے بھی ملاقات کروائیں در ثمن اور مریم عزیز سے بھی کرن

کے لیے کچھ لکھوائیں شادی کے بعد وہ بالکل ہی غائب ہو گئی ہیں اس کے علاوہ آپی آپ سے ریکوسٹ بھی کہ میں فرحت اشتیاق کی بہت بڑی فین ہوں میں ان کو گفٹ دینا چاہتی ہوں اور ان سے ان کا آٹوگراف سمیت ناول لینا چاہتی ہوں پلیز آپی میں ان کی بہت بڑی فین ہوں کیا مجھے ان کا نمبر یا ایڈریس مل سکتا ہے۔ دوسری صورت میں نہیں تو آپ میرا نمبر تو فرحت آپی کو دے سکتی ہیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

شمیم صدر دین رحمانی..... صفدر آباد

کرن کا ٹائٹل وہ بھی اتنی پیاری دلہن بہت خوب تھا۔ لیکن اتنا غصہ آیا کہ میری کوئی چیز بھی شامل نہیں نہ شعر نہ کوئی تحریر کوئی بات نہیں مرضی آپ کی۔ لیکن اب یہ میرا آخری خط ہے پلیز اس بار ضرور شامل کیجیے گا۔
"مجھ سے ملیے" میں فوزیہ یاسمین کا انٹرویو بہت پسند آیا باقی سارا ڈائجسٹ اور اس کے تمام تر سلسلے بہت اچھے تھے۔ سب کے سب دل کو بھا گئے۔ اس بار اتنا ہی اگر یہ خط شائع ہو گیا تو آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی امید ہے کہ آپ امید نہیں توڑیں گی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

آمنہ اقبال..... کراچی

اس دفعہ کرن خاصا لیٹ ملا۔ ٹائٹل پر بنی دلہن کے سرورق نے دل موہ لیا۔ خاص کر مہندی بہت پسند آئی۔
حمد و نعت سے فیض یاب ہونے کے بعد سب سے پہلے "دست کوزہ گر" کی جانب قدم بڑھائے۔ بہت خوب فوزیہ جی' آپ کا ناول بہت خوب صورتی سے آگے کی جانب رواں دواں ہے۔
"روداد نفس" اپنے نام کی عملی تفسیر جسے پڑھ کر ایک پل کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی کسی زنداں میں قید صدیوں سے رہائی کے منتظر ہیں۔ مگر کوئی سبیل بہرحال نظر نہیں آرہی۔ آپ کے اس نئے سلسلے نے شروع سے ہی ہمیں اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ ایسے اندوہناک واقعات' دل کو دہلا دینے والی حقیقت پر مبنی کہانیاں' جانے ہم کب سمجھیں گے اور کب تک یہ ناحق ظلم ہوتا رہا ہے' ناکردہ گناہ جو نا چاہتے ہوئے بھی سرزد ہو جاتا ہے۔ جو پوری

زندگی پر محیط ہو جاتا ہے اور
روشنی بخاری بھی ایسے
آئی ہیں۔
محبت کہنے کو تو بہت خوب
اس کی سزا اتنی بھیانک کیوں
نشان ہے۔ جس کا جواب ناجا
اس کے باوجود معصوم بلکہ بے
میں آہی جاتی ہیں۔ شاید ناز
ہیں۔ "جرم محبت" بھی ایسی
ہزاروں سوالوں کو جنم دیا مگر جوا
باقی تمام ناولز اور سلسلے بہتر
بہت خوب صورتی سے لفظوں
لے کر آتی ہیں۔ اللہ کرے زو
خط کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ اب

حنیفہ اعوان عمہوش اعوان

ایک مرتبہ پھر ہم کرن کی محفل
ہیں' قوی امید ہے کہ ہمارا یہ محب
سے بچ کر پیارے کرن میں جگہ بنا
پچھلی مرتبہ جب بہت زیادہ ا
سب سے پہلے نامے میرے نام
وہاں سے ہمارا خط ایسے غائب تھا
سینگ بہت زیادہ افسوس ہوا او
مشکل سے بھیجا ہوا خط ردی کی
گیا۔ چھوڑیں ایک فرمائش پہلے
کر رہے ہیں fm101 اسلام آ
علی احمد اور fm101 اسلام آباد
رانی کا انٹرویو ضرور شامل کریں "
عاطف اسلم کو بھی شامل کریں وہ
ہیں' اس خط میں تبصرہ نہیں کر سکتے
یہ خط آپ تک کب پہنچے گا' پلیز جب
پہنچے آپ ضرور شائع کیجیے گا۔

قدر ٹھہرتے ہیں
کی کہانیاں لے کر
حساس ہے۔ مگر
ایک ایسا سوالیہ
دے سکتا۔ مگر
اس کے سحر
دل جو رکھتی
ی۔ جس نے
تمام مصنفین
رئین کے لیے
آئندہ تفصیلی
ے
..... اٹک
ہونے آئے
دی کی ٹوکری
د کرن ملا تو
ڑ لگائی لیکن
کے سرے
آیا کہ اتنی
بیٹ میں چلا
اور اب بھی
جے رضوان
یو سر صدف
رالت میں"
رٹ گلوکار
نہیں پتا کہ
ط آپ تک

☆ ☆